بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
جون 2013
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 6000 روپے

مستقل سلسلے

جون 2013
جلد 27 شمارہ 10
قیمت 50 روپے

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: ۲۰۱ بی، پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

شعاع کا جون کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

انسانی تاریخ عروج و زوال کی بے شمار داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ زمانوں کی باگ ڈور اسی خالقِ کائنات کے ہاتھ میں ہے۔ وہی عزت و ذلت دینے پر قادر ہے۔ بڑے بڑے فرعون جب اللہ کی پکڑ میں آئے تو نشانِ عبرت بن گئے۔ بلاشبہ اللہ کی پکڑ بہت شدید ہے۔ اور انسان ظالم بھی ہے اور جاہل بھی کہ وہ تاریخ سے عبرت حاصل نہیں کرتا۔

الیکشن کو روکنے کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ 11 مئی کو ڈرے سہمے عوام نے اپنے ووٹ کا حق استعمال کیا اور خوف کا حصار توڑ کر اپنے گھروں سے نکلے۔ پہلے کسی انتخابات میں یہ منظر دیکھنے میں نہیں آئے۔

نتائج اگرچہ بہت غیر متوقع نہ تھے پھر بھی بہت سے لوگوں کے خواب ٹوٹے اور خواہشیں تشنہ کام رہیں جس کا ردِ عمل بھی سامنے آرہا ہے۔

شکست و فتح سیاست کے کھیل کا حصہ ہے اور اہلِ سیاست کے لیے یہ کوئی نئی یا انہونی بات نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ اہلِ ظرف اختیار و اقتدار پا کر بے قابو نہیں ہوتے۔ زبان و بیان میں شائستگی اور افعال میں کردار کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ہار جائیں تو اپنا اعتماد اور حواس برقرار رکھتے ہوئے خوش دلی سے ہار کو تسلیم کرتے ہیں۔ مہذب قوموں کا یہی رویہ ہوتا ہے۔

وطنِ عزیز اس وقت بے شمار مسائل کا شکار ہے۔ ان مسائل پر قابو پانے اور ان سے نکلنے کے لیے ایک مشترکہ حکمتِ عملی اور بہترین لائحہ عمل کی ضرورت ہے۔ تمام اختلافات بھلا کر اور مل بیٹھ کر ہی ان مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔

اس شمارے میں،

- نعیمہ ناز کا مکمل ناول — "ہم کیوں ملے"
- فاخرہ جبیں کا مکمل ناول — "برف زاروں کی تتلی"
- صائمہ اکرم اور مہوش افتخار کے ناولٹ،
- عالیہ بخاری اور رخسانہ نگار عدنان کے ناول،
- سلویٰ علی بٹ، صدف آصف، فرزانہ حبیب، مہوش ملک، آمنہ محسن اور شیریں ملک کے افسانے،
- بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا۔ مختار مسعود کی کتاب پر تبصرہ،
- اینکر، ماڈل اور اداکارہ ژالے سرحدی سے ملاقات،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں — احادیث کا سلسلہ،
- خط آپ کے، شاعری بیچ بولتی ہے، شعاع کے ساتھ ساتھ اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

سکوت فکر کو اذن مقال دیتا ہے
مرا سخی سرِ دستِ سوال دیتا ہے

وہ اپنے دستِ ہنر سے نکھارتا ہے شبیں
وہی تو موسمِ گل کو جمال دیتا ہے

کبھی خوشی کبھی غم دے کے آزماتا ہے
مرا کریم مجھے حسبِ حال دیتا ہے

اسی نے چاند ستاروں کو بخش دی ہے ضیا
وہی جو رات کو دن سے اجال دیتا ہے

اسی کے ذکر سے پائی ہے تازگی ثروت
اسی کا ذکر نہ کرنا ملال دیتا ہے

ثروت ظفر

مرے رسولؐ کہ نسبت تجھے اجالوں سے
میں تیرا ذکر کروں صبح کے حوالوں سے

نہ میری نعت کی محتاج ذات ہے تیری
نہ تیری مدح ہے ممکن مرے خیالوں سے

تو روشنی کا پیمبر ہے اور مری تاریخ
بھری پڑی ہے شبِ ظلم کی مثالوں سے

ترا پیام محبت تھا اور میرے یہاں
دل و دماغ ہیں پُر نفرتوں کے جالوں سے

یہ افتخار ہے تیرا کہ میرے عرش مقام
تو ہم کلام رہا ہے زمین والوں سے

احمد فراز

تقدیر سے متعلق احکام و مسائل

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"ہمیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث سنائی وہ (خود بھی) سچے تھے اور انہیں (اللہ کی طرف سے بھی) سچی خبر ملی۔ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا)

"انسان کا مادہ تخلیق اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس دن (قطرے کی صورت میں) جمع رہتا ہے' پھر اتنی ہی مدت کے لیے (جمے ہوئے خون کی) پھٹکی یا لوتھڑا بن جاتا ہے' پھر اتنا ہی عرصہ گوشت کا ٹکڑا بنا رہتا ہے' پھر اللہ تعالیٰ اس کے پاس ایک فرشتہ بھیجتا ہے جسے چار باتوں (کے لکھنے) کا حکم دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"اس کے اعمال' اس کی عمر اور اس کا رزق لکھ دے اور یہ بھی کہ وہ بد قسمت ہوگا یا خوش قسمت۔"

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! ایک آدمی جنتیوں والے عمل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے' پھر اس پر (تقدیر کی) تحریر غالب آجاتی ہے اور وہ جہنمیوں والا عمل کر کے جہنم میں داخل ہو جاتا ہے (اسی طرح) ایک آدمی جہنمیوں والے اعمال کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ جہنم سے ایک ہاتھ دور رہ جاتا ہے' پھر اس پر (تقدیر کا) لکھا غالب آجاتا ہے' چنانچہ وہ جنتیوں والا عمل کر کے جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔"

(بخاری شریف)

فوائد و مسائل :

1۔ تقدیر کا مطلب یہ ہے کہ ابد تک جو کچھ بھی ہونے والا ہے' اس کا علم پہلے سے اللہ کو ہے اور اس نے اسے لکھ رکھا ہے۔ اب جو کچھ ہوتا ہے' وہ اس کے ازلی علم کے مطابق ہی ہوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ نے گناہ گار کو گناہ کرنے پر مجبور کیا ہے۔ انسان اللہ کی دی ہوئی طاقت ہی سے نیکی یا گناہ کرتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو یہ اختیار چھین لیتا لیکن وہ ایسا نہیں کرتا' البتہ اسے پہلے سے معلوم ہے کہ فلاں بندہ اس اختیار کو صحیح طریقے سے استعمال کر کے اس کی خوشنودی حاصل کر لے گا اور فلاں بندہ اس اختیار کے غلط استعمال کی وجہ سے اللہ کو ناراض کر کے سزا کا مستحق ہو جائے گا۔

2۔ انسان کے نیک و بد اعمال' اس کی عمر' اس کا رزق اور اس کا جنتی یا جہنمی ہونا ایک خاص وقت پر اللہ کے بتانے سے فرشتوں کے علم میں آتا ہے اور وہ لکھ لیتے ہیں' اگرچہ یہ فیصلے ازل میں ہو چکے ہیں اور لوح محفوظ میں درج ہو چکے ہیں۔

3۔ ماں کے پیٹ میں انسان کی تخلیق کے مختلف مراحل ہیں۔ ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں تبدیلی بتدریج ہوتی ہے لیکن پہلے چالیس دن تک اس کی کیفیت مادہ تولید سے قریب تر ہوتی ہے جبکہ دوسرے مرحلہ میں وہ دیکھنے میں خون سے زیادہ مشابہ محسوس ہوتا ہے۔ تیسرے مرحلے میں اعضا بننے لگتے ہیں لیکن مجموعی طور پر وہ نرم گوشت کے ٹکڑے سے مشابہ نظر آتا ہے۔

4۔ ہر انسان کی عمر مقرر ہے۔ اس سے پہلے فوت نہیں ہو سکتا' لہٰذا بندے کو جان کے خوف سے ایمان ترک نہیں کرنا چاہیے بلکہ ایمان کی حفاظت کے لیے جان قربان کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

5۔ ہر انسان کا رزق مقرر ہو چکا ہے جو اسے بہر حال ملنا ہے' بندے کی آزمائش اس چیز میں ہے کہ وہ اس کے حصول کے لیے کون سے ذرائع اختیار کرتا ہے۔ مقررہ رزق حلال طریقے سے بھی مل جائے گا اور جو چیز تقدیر میں نہیں' وہ ناجائز ذرائع اختیار کرنے سے بھی نہیں ملے گی' اس لیے اللہ پر توکل کرتے ہوئے رزق حلال حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

6۔ کسی شخص کے بارے میں بایقین جنتی یا جہنمی ہونے کا فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بات صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ کون جنت میں جانے والا ہے اور کون جہنم کا ایندھن بننے والا ہے' البتہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھنا ضروری ہے اور کسی نیک آدمی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے یہی کہنا چاہیے کہ ہمارے خیال میں وہ نیک آدمی تھا اور ہم اللہ کی رحمت سے امید رکھتے ہیں کہ وہ جنت میں جائے گا' البتہ جن افراد کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یا اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتا دیا ہے' ان کے جنتی یا جہنمی ہونے کے بارے میں یقین رکھنا چاہیے مثلاً "ابولہب اور اس کی بیوی کا جہنمی ہونا' جیسے سورۂ لہب میں مذکور ہے یا عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم کا جنتی ہونا وغیرہ۔

7۔ کسی غیر مسلم یا گناہ گار کو تبلیغ کی جائے اور وہ قبول نہ کرے تو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ اسے ہرگز ہدایت نہیں ملے گی کیونکہ اس کا علم صرف اللہ کو ہے ممکن ہے آخری وقت میں ہدایت نصیب ہو جائے' جیسے ایک یہودی لڑکے کو مرض الموت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام لانے کو کہا' تو وہ اسلام لے آیا اور فوت ہو گیا۔

8۔ مومن کو نیکیوں پر فخر نہیں کرنا چاہیے بلکہ اللہ کا خوف رکھتے ہوئے استقامت کی دعا کرتے رہنا چاہیے۔ حضرت یوسف علیہ اسلام نے دعا فرمائی تھی۔ "اے زمین اور آسمان کے بنانے والے! تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا دوست اور کارساز ہے' مجھے اسلام کی حالت میں فوت کرنا اور نیکوں میں شامل کر دینا۔"

تقدیر

ابن دیلمی رحمتہ اللہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا "میرے دل میں تقدیر کے مسئلہ میں شبہ پیدا ہوا' جس سے مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ میرا دین اور کام (معاملات) تباہ نہ کردے' چنانچہ میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے کہا۔

"ابو منذر! میرے دل میں تقدیر کے بارے میں شبہ پیدا ہو گیا ہے جس سے مجھے اپنے دین اور معاملات کے بارے میں (خرابی کا) خوف ہے۔ مجھے اس کے متعلق کچھ فرمایئے' شاید اس سے اللہ تعالیٰ مجھے فائدہ بخش دے۔

حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ "اگر اللہ تعالیٰ (تمام) آسمانوں والوں اور (تمام) زمین والوں کو عذاب دینا چاہے' تو دے سکتا ہے۔ یہ اس کا ان پر ظلم نہیں ہو گا اور اگر ان پر رحمت کرے تو اس کی رحمت ان کے اعمال سے بہتر ہو گی اور اگر تیرے پاس احد پہاڑ جتنا سونا اور یا احد پہاڑ جتنا مال ہو اور تو اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دے' تو تیرا یہ عمل قبول نہیں ہو گا جب تک کہ تو تقدیر پر ایمان نہ لائے۔ تجھے معلوم ہونا چاہیے جو مصیبت تجھے پہنچی ہے' وہ تجھ سے ٹلنے والی نہ تھی (اسے بہر حال آنا ہی تھا) اور جو مصیبت تجھے نہیں پہنچی وہ تجھے پہنچنے والی نہ تھی اور (یہ جان لے کہ) اگر تیری موت اس عقیدے کے سوا کسی اور عقیدے پر ہوئی تو تو جہنم میں داخل ہو گا اور اگر تو میرے بھائی عبداللہ بن

مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر یہ مسئلہ پوچھ لے تو کوئی حرج نہیں۔"

چنانچہ ابن دیلمی رحمتہ اللہ فرماتے ہیں' میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے یہ مسئلہ پوچھا۔

انہوں نے بھی وہی بات فرمائی جو حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے فرمائی تھی اور فرمایا۔

"اگر تو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس جائے (اور مسئلہ دریافت کرے) تو کوئی حرج نہیں۔"

چنانچہ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے پوچھا' انہوں نے وہی بات فرمائی جو دوسرے دونوں حضرات نے فرمائی تھی۔ اور فرمایا۔

"حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر ان سے پوچھ لو۔"

پھر میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے مسئلہ پوچھا۔ انہوں نے فرمایا۔

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد سنا ہے' آپ نے فرمایا "اگر اللہ تعالیٰ (تمام) آسمانوں والوں اور (سب) زمین والوں کو عذاب دینا چاہے تو دے سکتا ہے' یہ اس کا ان پر ظلم نہیں ہوگا اور اگر ان پر رحمت کرے تو اس کی رحمت ان کے اعمال سے بہتر ہوگی اور اگر تیرے پاس احد جتنا سونا یا احد پہاڑ جتنا سونا ہو اور تو اسے اللہ کی راہ میں خرچ کردے' تو وہ تیرا یہ عمل قبول نہیں کرے گا حتیٰ کہ تو ساری تقدیر پر ایمان لائے اور (یقین کے ساتھ) جان لے کہ جو مصیبت تجھے پہنچی ہے وہ تجھ سے ٹلنے والی نہ تھی اور جو مصیبت تجھے نہیں پہنچی' وہ تجھے پہنچنے والی نہ تھی اور (جان لے کہ) اگر تیری موت اس عقیدے کے سوا کسی اور عقیدے پر ہوئی تو تو جہنم میں داخل ہوگا۔"

فوائد و مسائل :

1۔ اس حدیث سے مسئلہ تقدیر کی وضاحت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے' اس لیے مخلوق کے بارے میں اس کا ہر فیصلہ حق ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

"وہ جو کچھ کرے اس سے اس کے متعلق سوال نہیں کیا جاسکتا اور ان (مخلوقات) سے سوال کیا جائے گا (اور ان کا مواخذہ ہوگا۔ سورہ الانبیا 23) یعنی اللہ تعالیٰ کے کسی کام پر اعتراض کرنا درست نہیں کیونکہ اس کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے' لیکن ضروری نہیں کہ وہ حکمت ہماری سمجھ میں بھی آئے یا ہمیں بتائی بھی جائے۔

2۔ جو مصیبت آئی ہے وہ بہر حال آکر رہے گی' خواہ انسان اس سے ڈرتے ہوئے نیکی کا راستہ چھوڑ کر غلط روی بھی اختیار کرلے۔ اور جو راحت اور نعمت قسمت میں ہے وہ بہر حال ملے گی' اگرچہ اس سے پہلے مشکلات و مصائب ہی کیوں نہ آئیں' اس لیے اللہ پر توکل کرتے ہوئے اس کی رحمت کی امید رکھنی چاہیے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

"اللہ کی رحمت سے ناامید وہی ہوتے ہیں جو کافر لوگ ہیں" (سورۂ یوسف آیت 87)

3۔ صحابہ کرام پختہ اور گہرے علم کے حامل تھے جس کی وجہ سے ان کا ایمان بھی کامل اور قوی تھا۔ تقدیر جیسے بظاہر مشکل مسئلے میں بھی انہیں وہ یقین و عرفان حاصل تھا' جس کی وجہ سے وہ اطمینان کی دولت سے مالا مال تھے اور اس بارے میں وہ شکوک و شبہات کا شکار نہیں تھے۔

4۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک دوسرے کا احترام کرتے اور ایک دوسرے کے علم کا اعتراف کرتے تھے۔ علمائے دین کا بھی ایک دوسرے کے بارے میں یہی رویہ ہونا چاہیے۔

5۔ کسی مسئلے میں اطمینان قلب کے حصول کے لیے ایک سے زیادہ علمائے کرام سے مسئلہ پوچھا جاسکتا ہے۔

6۔ صحابہ کرام کے فتاوی قرآن و حدیث سے ماخوذ

ہوتے تھے بلکہ اکثر اوقات وہ ارشاد نبوی ہی نقل کر دیتے تھے اگرچہ یہ صراحت نہ کریں کہ یہ ارشاد نبوی ہے۔

7۔ محدثین کے ہاں یہ اصول ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایسے اقوال جن کا تعلق اجتہاد سے نہیں ہوتا' مرفوع کے حکم میں ہوتے ہیں' مثلاً "اس مسئلے میں دیگر صحابہ کرام نے تو حدیث کے مرفوع ہونے کی صراحت نہیں کی لیکن حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے وضاحت فرمادی کہ یہ الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ہیں۔

8۔ تقدیر کا یہ مسئلہ ایمان کے بنیادی مسائل میں سے ہے اور تقدیر پر ایمان لائے بغیر کسی انسان کا ایمان قابل اعتبار نہیں ہوتا' لہٰذا تقدیر کا انکار جہنم کی سزا کا باعث بن جاتا ہے۔

تقدیر

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی' آپ اس کے ساتھ زمین میں لکیریں لگانے لگے (جیسے کوئی شخص گہری سوچ میں ہو تو کرتا ہے) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر اٹھایا اور فرمایا۔

"تم میں سے ہر شخص کا ٹھکانا جنت یا جہنم میں لکھ دیا گیا ہے۔"

عرض کیا گیا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پھر ہم (لکھے ہوئے پر) بھروسا نہ کرلیں؟"

فرمایا "نہیں' عمل کرو (لکھے ہوئے پر) بھروسا نہ کرو' ہر کسی کے لیے وہ کام آسان ہو جاتا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا۔"

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیات تلاوت فرمائیں۔

ترجمہ :۔ "جس نے (اللہ کی راہ میں) دیا اور (اپنے رب سے) ڈرا اور اچھی بات کی تصدیق کی تو ہم بھی اسے آسان راستے کی سہولت دیں گے' لیکن جس نے بخل کیا اور بے پروائی کی اور اچھی بات کی تکذیب کی تو ہم بھی اس کو تنگی اور مشکل کے اسباب میسر کردیں گے۔" (سورۂ الیل 5-10)

فوائد و مسائل :

1۔ اس حدیث میں تقدیر الٰہی کا ثبوت ہے۔

2۔ ہر انسان کے انجام کے متعلق فیصلہ ہو چکا ہے اور یوں جنت یا جہنم میں اس کا ٹھکانا مقرر ہے۔

3۔ تقدیر علم الٰہی کا نام ہے' بندے کو مجبور کرنے کا نام نہیں۔

4۔ جنت اور جہنم میں داخلے کا تعلق بندوں کے اعمال سے ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ اس کی قسمت میں کیا ہے' اس لیے نیک اعمال کرنے کی کوشش کرنا اور گناہوں سے بچتے رہنا فرض ہے۔

5۔ تقدیر پر ایمان کا مطلب یہ نہیں کہ انسان محنت اور کوشش ترک کردے بلکہ اسے چاہیے کہ اللہ کے احکام کی تعمیل میں پیش آنے والے خطرات سے خوف زدہ نہ ہو اور مشکلات میں گھبرا کر اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جائے کیونکہ اگر قسمت میں کامیابی لکھی ہے تو وہ ان مشکلات و مصائب کے بعد مل کر رہے گی اور اگر نہیں تو محنت اور نیت کا ثواب تو ضرور ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کسی کی نیکی ضائع نہیں فرماتا۔

6۔ جو جاہل لوگ فسق و فجور میں مشغول رہتے ہیں اور کہتے ہیں جو تقدیر میں ہے وہی ہوگا' یہ ان کی حماقت ہے بلکہ عمل سعادت و شقاوت کی علامت ہیں جس کے عمل اچھے ہیں' امید ہے کہ وہ سعید ہوگا اور جس کے برے ہیں' اندیشہ ہے کہ وہ شقی ہوگا۔ بہر حال ہر ایک کو اچھے اعمال میں رغبت کرنی چاہیے اور گناہ سے بچنے کی فکر کرنی چاہیے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک شخص پر چوری کی حد لگانے لگے تو وہ کہنے لگا۔
"تقدیر میں یوں ہی لکھا تھا' میرا کیا قصور ہے۔"
آپؓ نے فرمایا۔ "تقدیر کے مطابق ہی ہم تمہارا ہاتھ کاٹ رہے ہیں' اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔"

طاقت ور

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"طاقت ور مومن کمزور مومن سے بہتر اور اللہ کو زیادہ پیارا ہے اور ہر ایک میں خیر موجود ہے۔ جو چیز تجھے فائدہ دیتی ہے' اس میں رغبت کر اور اللہ سے مدد مانگ عاجز نہ بن۔ اگر تجھے کوئی مصیبت آجائے تو یوں نہ کہہ۔ "اگر میں اس طرح کرتا' تو یوں نہ ہوتا۔" بلکہ یوں کہہ "اللہ نے یہی مقدر کیا تھا اور اللہ نے جو چاہا کیا۔" کیونکہ (لفظ) "اگر" سے شیطان کا کام شروع ہو جاتا ہے۔" (صحیح مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ جسمانی' ذہنی اور مالی قوت اللہ کی ایک نعمت ہے' اس نعمت کو نیکی کے کاموں میں استعمال کرنا چاہیے۔
2۔ جو شخص کسی قسم کی قوت میں دوسروں سے کم تر ہے وہ بھی خیر سے محروم نہیں۔ ممکن ہے کہ ایک قوت کے لحاظ سے کم زور شخص' دوسری قوت کے لحاظ سے قوی ہو' لہٰذا اللہ تعالیٰ نے کسی کو جو صلاحیت بھی عنایت فرمائی ہو' اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا اور اسے نیکی کے حصول و فروغ اور برائی سے بچنے اور بچانے کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔
3۔ دنیوی فوائد کے حصول کی کوشش کرنا توکل کے منافی نہیں' البتہ اس کے لیے ناجائز ذرائع اختیار کرنا' یا دنیوی فوائد کی حرص کو ذہن پر اس طرح سوار کرلینا کہ زیادہ توجہ ادھر ہی رہے' درست نہیں ہے۔
4۔ شریعت میں یہ چیز مطلوب نہیں کہ کوئی شخص خود محنت کرکے کمانے اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے بجائے دوسروں پر بوجھ بن کر بیٹھ جائے۔ اس رویہ کو توکل قرار دینا غلط ہے' البتہ جو شخص کسی واقعی عذر کی وجہ سے روزی نہیں کما سکتا' وہ معذور ہے اور مسلمان معاشرے کا فرض ہے کہ اس کی ضروریات پوری کرے۔
5۔ کوئی کام کرنے سے پہلے غور و فکر کرنا چاہیے اور معاملے کے مختلف پہلوؤں پر غور اور مشورہ کرلینا چاہیے' لیکن اگر بعد میں کسی وجہ سے نتائج توقع کے خلاف نکلیں تو معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں اور سمجھ لیں کہ اس میں بھی اللہ کی کوئی حکمت ہوگی' اگر مگر کہنے سے تقدیر الٰہی کے انکار کا پہلو نکلتا ہے اور یہ شیطانی فعل ہے کہ آدمی کو خلاف توقع نتیجہ نکلنے پر حسرت دلواتا ہے اور تقدیر کا منکر بناتا ہے۔
6۔ کسی کام کا نتیجہ خلاف توقع نکلنے کے بعد جب اس کی تلافی ممکن نہ ہو' تو منفی سوچوں میں گھر جانا' نہ صرف بے فائدہ بلکہ نقصان دہ ہے۔
بعد میں یہ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں "کاش میں نے فلاں کام یوں کرلیا ہوتا' کاش میں فلاں کام اس طرح نہ کرتا۔"
البتہ اپنے کام کا تنقیدی جائزہ لینا درست ہے تاکہ جو غلطی ہوئی ہے' دوبارہ اس سے بچا جائے۔

ایمان کامل

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"کوئی بندہ مومن نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ وہ چار چیزوں پر ایمان رکھے۔
1۔ اللہ پر جو اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔
2۔ اس بات پر کہ میں (محمد) اللہ کا رسول ہوں۔
3۔ موت کے بعد زندہ ہو کر اٹھنے پر۔
4۔ اور تقدیر پر۔" (ترمذی)
فائدہ : اس حدیث میں ایمان کے بنیادی مسائل کا ذکر ہے' جن میں تقدیر پر ایمان بھی شامل ہے۔

آوازِ دوست

مصنف: مختار مسعود
تبصرہ: آمنہ زریں

وقت تو آگے ہی چلا آتا ہے۔۔۔ کیا زندگی بھی آگے بڑھتی ہے؟
کیا زندگی دن پورے کرنے کا نام ہے۔۔۔ یا آگے بڑھنا اصلاح احوال سے بھی تعلق رکھتا ہے؟
اعتدال زندگی کے ہر رویے میں مطلوب رہتا ہے۔۔۔ اور مطلوب چیز کم ہی حاصل ہوا کرتی ہے۔ اس لاحاصل تگ و دو کا نام اگر زندگی گزارنا ہو۔۔۔ تو پھر وقت تو آگے نکل جاتا ہے۔ حیات ٹھہرے رہنے کا نام ہو جاتا ہے۔
ماضی کو یکسر فراموش کر دینا حقیقت سے مفر کا ذریعہ بن جاتا ہے اور مفر ہمیشہ ذمہ داری اٹھانے کے بوجھ سے انکار کا نتیجہ ہوتا ہے۔۔۔ تاریخ' ماضی ہی کا علمی نام ہے اور تاریخ جاننا' پڑھنا اور سیکھنا رویے میں اعتدال لانے کی کامیاب کوشش کہلائی جا سکتی ہے۔ اگر اصلاح احوال کی خواہش میں خلوص کو دخل ہو۔۔۔
تو چلتے ہیں ایک ایسی کتاب کی طرف۔ جو پڑھنے کے بعد اپنے اور اپنے لکھنے والے کے ہمہ جہت' ہمہ صفت ہونے کی رشک بھری حیرانی سے آشنا کرواتی ہے۔۔۔ یہ کتاب سوانح حیات' یادداشت' سیاحت' کردار نگاری' مخمصی تعزیے' نصیحت' عبرت' تمنا' خواب' جدوجہد' خلوص' راست گوئی کے کھرے پن کے تمام ذائقے رکھتی ہے۔۔۔ یادداشت ایسی کہ لفظی منظر گری میں آپ خود کو منظر کا حصہ پائیں۔۔۔ اور شخصیات کو لفظوں میں یوں پرونے کا ہنر کہ جو رخ جیسا دیکھا۔۔۔ آپ کو بھی نظر آگیا۔ تجزیہ بلا کم و کاست۔ حسرت ایسی کہ دل تھام لیں۔ عبرت ایسی کہ اک ٹھنڈی آہ۔۔۔ اور امید ایسی کہ آس ٹوٹنے نہ پائے۔ تو پھر چلئے! ایک شاہکار کتاب کے حرف حرف موتی کی طرف۔۔۔ جس سے اقتباس چننا دل پر بھاری پتھر رکھنا ہے۔۔۔ کہ ہر حرف پیش کیے جانے کے لائق ہے۔۔۔ مگر ممکن نہیں۔
افسانہ تو خیال کے تانے بانے سے تراشا ہی جاتا ہے۔ مگر حقیقت جیسی سنگ تراشی کو دل آویزی عطا کرنا' ایک ایسے ذہن رسا کی خبر دیتا ہے۔ جس کے نثر میں بھی شاعرانہ رچاؤ محسوس ہوتا ہے۔
"مجھے یاد آیا کہ دل جوئی کے لئے ایک بادشاہ چھپ کر پنی پرانی پوستین سر آنکھوں سے لگاتا تھا۔ ہر شخص کے پاس اس کی پوستین ہوتی ہے۔ مگر اکثر اس سے منکر ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اسے قبول کرنے کے لیے جس جرات کی ضرورت ہوتی ہے' اس کی کمیابی قحط الرجال کی پہلی نشانی ہے۔ خود فراموشی کے فریب سے بچنے کے لیے پوستین ہمیشہ سنبھال کر رکھنی چاہیے اور جب دل تنگ ہو جائے یا سنگ بن جائے تو اس سے کشادگی اور گداختگی مستعار لینی چاہیے۔ میرے پاس سرو چشم پر رکھنے کے لیے چند چیزیں ہیں' جو میں نے ایک بے رنگ آہنی صندوقچی میں رکھی ہوئی ہیں۔ پرائمری اسکول میں یہ میرا بستہ ہوا کرتا تھا۔ اب اس سے بہت سے کام لیتا ہوں۔ یہ کبھی پوستین ہے' کبھی

چراغ اور کبھی جام ہے۔ میں اس کی رعایت سے کبھی سبکتگین بن جاتا ہوں، کبھی الہ دین اور کبھی جمشید۔ یعنی کبھی خودشناس، کبھی دم بخود اور کبھی خود مختار۔ میرے اس بستے میں تحریروں، تصویروں اور تمغوں کے ساتھ ایک چھوٹی سی البم بھی رکھی ہوئی ہے۔"

یہ اس کتاب کی وجہ تسمیہ ہے، جو انہوں نے نہایت فصاحت کے ساتھ بیان کی ہے۔ جو آٹو اور فوٹو گراف سے منسلک شخصیات کے محاسن، شاندار تجزیات اور تجربات پر مشتمل ہے۔

آٹوگراف کی حصولی کے سفر کا آغاز ان کے بچپن سے ہو گیا تھا اور معیار صرف مجموعہ اکٹھا کرنا نہیں طے ہوا تھا۔ بلکہ ایسی شخصیات جنہوں نے خلوص، سادگی سے متصف، متحرک، جدوجہد سے بھرپور زندگی گزاری اور ذاتی مفاد سے بالاتر ہو کر کسی نہ کسی طرح فلاح انسانی کے لئے کام کیا۔

"بہادر لڑکے کی کہانی بچوں کے لیے تھی اور ایک بچے نے اسے پڑھا تھا۔ وہ بچہ یہ سمجھا کہ جرات کے اظہار کے لئے جو مقامات درکار ہیں، وہ صرف دوسرے ملکوں میں ہوا کرتے ہیں۔ جیسے ہالینڈ میں سمندر کو روکنے والے پشتے۔ وقت گزرا تو یہ عقدہ کھلا کہ دنیا کا ہر ملک سطح سمندر سے نیچے آباد ہے۔ آبادی اور سمندر کے درمیان پشتے بنے ہوتے ہیں۔ نئے اور پرانے، پائیدار اور ناپائیدار۔ ان میں جو پشتے دین اور سیاست کے ریختہ بدن کے لہو اور قلم کی سیاہی کے آمیختہ سے بنے ہوں اور جن کی حفاظت سے بصیرت اور فکر فردا کے سپرد ہو، صرف وہی پشتے مضبوط اور مستحکم ہوتے ہیں۔ پشتے خواہ کتنے ہی پائیدار کیوں نہ ہوں، ان کی حفاظت پشت در پشت اور لحہ بہ لمحہ کرنی پڑتی ہے۔ اگر ان میں چھوٹا سا سوراخ ہو جائے تو اسے شگاف بنتے دیر نہیں لگتی۔"

تاریخ، فلسفہ، ادب، سیاست اور باکردار شخصیات کی زندگیوں کا گہرا مطالعہ، مصنف کے قلم کو یہ ہنر عطا کیے ہوئے ہے کہ وہ پیچیدہ نکتوں کے لیے بھی فہم کو آسانی عطا کر سکتا ہے۔

"دراصل جرات ایک کیفیت ہے اور قربانی اس کی کیفیت پر گواہی ہے۔ جرات طرز اختیار کا نام ہے اور قربانی ایک طریق ترک کو کہتے ہیں۔ اس ترک و اختیار میں بسر ہو جائے تو زندگی جہاد اور موت شہادت کا نام پاتی ہے۔"

اب آگے سنیے اور سر دھنیے۔۔۔ "زندگی کو ایک گروہ نے ممکن بنایا، دوسرے نے توانا اور تیسرے نے تابندہ۔ جہاں یہ تینوں گروہ موجود ہوں، وہاں زندگی موت کی دسترس سے محفوظ ہو جاتی ہے اور جس ملک یا عہد کو یہ گروہ میسر نہ آئیں اسے موت سے پہلے بھی کئی بار مرنا پڑتا ہے۔ جس سرحد کو اہل شہادت میسر نہ آئیں، وہ مٹ جاتی ہے۔ جس آبادی میں اہل احسان نہ ہوں، اسے خانہ جنگی اور خانہ بربادی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس تمدن کو اہل جمال کی خدمات حاصل نہ ہوں وہ خوش نما اور دیرپا نہیں ہوتا۔"

بعض اوقات کثرت مطالعہ انسان کے ذہن کو شکوک و شبہات کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ مگر طبیعت کی راستی کے علاوہ دین کا فہم اسے متزلزل ہونے سے محفوظ رکھتا ہے۔ اور قرآن کا مطالعہ (تلاوت کے علاوہ) ذہن و دل کو کشادگی اور فہم کو راستی عطا نہ کرے۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اب آجائیں سیاحت کی طرف۔

"یونان میں دیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ خواہ اسے دیدہ عبرت سے بغور دیکھا جائے یا ڈھلے ہوئے دیدے کی سرسری نظر سے۔۔۔ سامنے منروا کا مندر تھا۔ جن دنوں پیری کیلس نے اس عمارت کو تعمیر کیا، وہ دنیا کی خوبصورت ترین عمارت تھی۔ آج اسے سب سے خوبصورت کھنڈر کا درجہ حاصل ہے۔ (آہ!) میری نگاہ البتہ کاغذ کے چھوٹے سے پرزے پر جمی ہوئی تھی۔ یہ داخلے کا ٹکٹ تھا۔ میں نے اس کی پشت پر

لکھی ہوئی عبارت کو بار بار پڑھا۔ اس پر لکھا تھا کہ پیری کیلس کے دور حکومت میں ملک مالا مال اور لوگ نہال ہوئے مگر وہ اتنا پر نظر تھا کہ اس کی ذاتی ملکیت میں پھوٹی کوڑی کا بھی اضافہ نہ ہوا۔ (اک تیر ایسا مارا۔۔۔) میں نے اس عبارت پر غور کرنے کے بعد سر اٹھا کر ہار تھینن پر نظر ڈالی تو مجھے اس عمارت میں حسن صورت کے ساتھ ساتھ اس کے بنانے والے کے حسن سیرت کی جھلک بھی نظر آئی۔ عمارت کی چھت گر چکی تھی، مگر اس کے ستون دو ہزار برس سے ایستادہ ہیں۔ لغزش سے پیری کیلس خود بھی محفوظ رہا اور اس کے بنائے ہوئے ستون بھی۔"

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 73ء میں آیا تھا۔۔۔ یہ 2013ء تک کی صورت حال تب سے متشکل ہونے لگی تھی؟؟؟؟ حیرت!

"اہل اقتدار کا ذکر ہو تو مجھے بے اختیار "کوبے بیف" یاد آجاتا ہے۔ کوبے جاپان کا مشہور شہر ہے جہاں بڑا گوشت سوغات کے طور پر دساور بھیجا جاتا ہے۔ یہ گوشت اس بیل کا ہوتا ہے، جسے پیدائش سے لے کر ذبح ہونے تک پینے کے لیے پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں دیا جاتا۔ وہ تمام عمر پانی کے بجائے شراب پیتا رہتا ہے۔ پینے والے اس پر رشک کرتے ہیں اور کھانے والے اسے دیکھ کر منہ میں پانی بھر لاتے ہیں۔ یہ بیل کب تک خیر مناتا، بالآخر ذبح کیا جاتا ہے اور اس کے پارچے خوش خور لوگوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ اہل اقتدار کی صورت حال اور قسمت بسا اوقات اس بیل کی طرح ہوتی ہے۔ عقل اور آنکھوں دونوں پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ ان کے چرچے بھی ہوتے ہیں اور کم نظر ان پر رشک بھی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ مقررہ وقت آن لگتا ہے۔ ان کو جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے اور لوگ ہیں کہ بوٹیاں نوچ لیتے ہیں۔ اس انجام کی مثال مسولینی کے انجام میں ملتی ہے۔"

"لوگوں نے مسولینی کو نزدیک سے صرف ان دنوں دیکھا۔ جب اس کی لاش بازار میں لٹکی ہوئی اس کے اس دعوے کو جھٹلا رہی تھی کہ وہ عصر حاضر پر اپنی انا کے ایسے نشان چھوڑ جائے گا۔ جیسے شیر اپنے شکار کے جسم پر اپنے تیز ناخنوں کے نشان چھوڑ جاتا ہے۔"

یہ اقتباس رشک (یونانی حکمران) اور عبرت (اہل اقتدار کے احوال اور انجام) کی کیفیت سے دوچار کرنے والے ہیں۔

"قدرت کا سارا نظام اصولوں کے تابع ہے۔ بڑے آدمیوں کی پیدائش کے بھی تو کچھ اصول ہوں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑے آدمی انعام کے طور پر دیے اور سزا کے طور پر روک لیے جاتے ہیں۔ آخر قدرت ایک سپاس نا آشنا قوم کو بڑے آدمی کیوں عطا کرے۔ اسے اپنے عطیے کی رسوائی اور بے قدری ناگوار گزرتی ہے۔ عطا کا پہلا حق یہ ہے کہ انسان اس کا شکر ادا کرے۔ دل شکر سے لبریز ہو تو روشن ہو جاتا ہے۔ شکوہ کیجئے تو بجھ جاتا ہے۔ ناشکر گزار ہو تو پتھر بن جاتا ہے۔ شکر گزار ہمیشہ روشن ضمیر اور روشن دماغ ہوتا ہے۔ ناشکر گزار بے ضمیر اور بد دماغ ہو جاتا ہے۔"

"انسان ناشکر گزار، زود فراموش، فسادی اور زود رنج ہے۔ اس لیے ہدایت ہوئی کہ خدا کو یاد کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔ خدا نے والدین کا شکر ادا کرنے کی بھی تاکید کی ہے۔ گویا عبادت میں کسی اور کا ذکر تک داخل ہو تو وہ شرک اور شکر میں جتنے حصے دار بھی شامل ہوں، وہ جائز۔"

"اگر دل تشکر کی طرف نہیں آتا۔ دماغ ہنر کی طرف نہیں جاتا اور زبان حق کی طرف مائل نہیں ہوتی تو انسان، انسان نہیں رہتا۔ بلکہ دشت و صحرا میں بدل جاتا ہے۔ جب چاروں طرف بیکراں دشت آدم زاد کی شکل میں پھیلے ہوں تو اس صورت حال کو قحط الرجال کہتے ہیں۔"

اتنے مختصر پیرائے میں زوال کی علامتیں، اسباب

اور نتائج بیان کرنا اور بیان کی سادگی؟ "کون نہ مرجائے اے خدا!"

"شیخ یوسف سبز پلی نے جو ابن عربی کے مرشد تھے ایک سیاہ بلی پالی ہوئی تھی۔ شیخ کی صحبت میں یہ بلی تزکیہ باطن کی منزلیں طے کر گئی۔ وہ بے ہنر سے نفرت کرتی اور بے غرض سے الفت کرتی اور ان دونوں کو شناخت کر لیتی۔ اولیاء ملنے آتے تو ادب سے بیٹھی رہتی۔ کوئی بے ذوق آنکلتا تو یہ اٹھ کر چلی جاتی۔ میں نے بہتیرا چاہا کہ قلب میں کچھ خاصیت و خصلت اس سیاہ بلی کی پیدا ہو جائے۔ اس کا رنگ تو آگیا۔ مگر اس کی مردم شناسی نہ آئی۔ کوشش البتہ جاری ہے اور اس کی نوعیت یہ ہے کہ میں نے جب بھی اپنی آٹوگراف البم کو استعمال کے لیے ساتھ رکھا ہے۔ پہلے دل میں جھانکا۔ اگر بلی اٹھ کر چلی جائے تو میں البم کو جیب سے باہر نہیں نکالتا۔"

اتنے لطیف انداز میں اپنی ذات پر ملامت کا اظہار کسی بھی نکتہ رس ذہن کے لیے باعث لطف ہے۔

سب ہی شخصیات جن کا تذکرہ کتاب میں کیا گیا ہے۔ معتبر نابغہ روزگار اور غیر معمولی نقش پا جیسے وصف رکھتی ہیں۔ اپنے جن خصوصی اوصاف کی بناء پر انہوں نے مصنف کے دل و ذہن کو متاثر کیا۔ قلم نے ان خصوصیت کا احاطہ کر کے اس عقیدت اور معیار کا حق ادا کر دیا کہ جس کا عہد اپنے ساتھ کر رکھا تھا۔ یہاں مصنف کی تجزیاتی صلاحیت نمایاں طور پر آپ کو متاثر کرتی ہے۔

ان شخصیات میں کچھ غیر مسلم شخصیات بھی شامل ہیں اور آپ یہ جان کر حیران ہوتے ہیں کہ ان سب میں اسلام، قرآن فہمی اور خدائے واحد کی طرف رجحان، قدر مشترک تھی۔ ناول نگار فاسٹر، مورخ ٹائن بی اور سروجنی نائیڈو۔۔۔ سب ہی کا ذکر کرنا ناممکن ہے۔ اس لیے

"دل کا حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ مگر سروجنی کی زبان پر کلمہ حق جاری تھا۔ ایک دن مسلمانوں سے خطاب کیا تو کہا۔ "اگرچہ میں تمہارے دوش بدوش کھڑے ہونے کے باوجود تمہاری نظروں میں ایک کافرہ ہوں۔ مگر میں تمہارے سارے خوابوں میں تمہاری شریک ہوں۔ میں تمہارے خوابوں اور بلند خیالوں میں بھی تمہارے دوش بدوش ہوں۔ کیونکہ اسلام کے نظریات بنیادی اور حتمی طور پر اتنے ترقی پسند نظریات ہیں کہ کوئی انسان، جو ترقی سے محبت کرتا ہو ان پر ایمان لانے سے انکار نہیں کر سکتا۔"

"اس نے اپنے سامعین سے کہا کہ تم اس تنگ نظری کا شکار ہو۔ جس کی وجہ سے تمہارے افق کی ایک حد تمہارا صوبہ اور دوسری حد محض تمہاری اپنی ذات ہے۔ یہ محدود افق، یہ مختصر کائنات، یہ مفلس ذہن، یہ عاجز فکر نفرت کے قابل ہے اور تم ہو کہ اسی تنگ نظری سے محبت کرتے ہو۔"

سروجنی نائیڈو۔۔۔ جنہیں "بلبل ہند" کہا گیا۔۔۔ کیسے کیسے جرات مند لوگ تب خطابت کے جوہر سے آراستہ تھے۔۔۔ آئینہ دکھانے والے۔۔۔ سامعین! مگر آپ یوں کریں۔ ان کا یہ مکالمہ آج کے سامعین بن کر خود سے دوہرائیں۔۔۔

"مصنف تحریک پاکستان میں علی گڑھ کے طالب علم کی حیثیت سے شریک تھے۔ اور جدوجہد کے کٹھن سفر، پر شوق خواب لیے، تعمیر و ترقی کی منتظر آنکھیں لیے۔ ملک کی بنتی بگڑتی تقدیر کے شاہد بھی۔

"ایک رات سو کر اٹھے تو دنیا ہی بدلی ہوئی پائی۔۔۔ مجلس قانون ساز کو لاقانون قرار دیا جا چکا تھا اور آئین سے وفاداری کا حلف اٹھانے والے اسے منسوخ کر چکے تھے۔ یہ اکتوبر 1958ء کی بات ہے۔ اس کے بعد ہر بلا خانہ انوری پر نازل ہونے لگی اور برق نے بے چارے مسلمانوں پر گرنا سیکھ لیا۔ ہم نے لاکھ تقریریں کیں، خوش خیال اور دھواں دھار، مگر تاریخ نے ہماری ایک نہ سنی۔ ہم نے بڑے بڑے منصوبے تیار کیے دنیا نے ان کی تعریف بھی کی۔ مگر تاریخ نے ہماری ایک بھی نہ چلنے دی۔ تاریخ نے اپنا رشتہ ہمارے اعمال کے ساتھ استوار کر لیا اور ایک دن ہمیں پا بجولاں ڈھاکا ریس کورس میں لا کھڑا کیا۔ یہ دسمبر 1971ء کی بات ہے۔ اس روز ہم نے مڑ کر اپنی تاریخ پر نظر ڈالی تو ہمیں یاد آیا کہ تاریخ کو کسی تاریخ داں نے جرائم، حماقتوں اور بد قسمتی کی فہرست کہا ہے۔ اگر ہماری تاریخ میں تیئیس مارچ اور چودہ اگست کے دن نہ ہوتے تو ہم تاریخ کی اس تعریف پر ایمان لے آتے۔"

ماں کی ممتا پر بھروسے کی مدد سے، جس طرح بچہ کڑوے گھونٹ بھی بھر لیتا ہے، بالکل اسی دلار سے قلم آپ کو حقیقت کے تلخ ذائقے سے آشنا کرواتا ہے۔

اب ایک ایسی شخصیت کا تذکرہ۔۔۔ جس کے بے مثال فہم و ادراک نے عروج و زوال اور انتشار کے ایسے اصول، علامات، اسباب اور نتائج وضع کر دیے کہ ان کی روشنی میں کوئی بھی قوم اپنا، یا کسی دوسری قوم کا عکس دیکھ سکتی ہے۔ (اب اپنا نہ دیکھنا چاہیں تو۔۔۔!)

ٹائن بی کی اہمیت اس کی شہرت سے زیادہ ہے۔ مگر یہ اہمیت اور شہرت دونوں اس کی کتاب "تاریخ کا ایک مطالعہ" پر مبنی ہیں۔ اس کتاب کا موضوع کسی عہد یا علاقے کی تاریخ نہیں۔ بلکہ تاریخ عالم اور تاریخ انسان کا ایک ایسا جائزہ ہے۔ جس کی رو سے ایک نیا فلسفہ تاریخ قائم ہوتا ہے۔

"تاریخ عالم میں اٹھائیس تہذیبوں کے نشان ملتے ہیں۔ جن میں سے اٹھارہ فنا ہو چکی ہیں۔ نو زوال پذیر ہیں اور تنہا "ایک" ترقی پذیر ہے۔ مگر اس کا مستقبل بھی دوسری تہذیبوں سے مختلف نہ ہوگا۔ بس اتنی سی بات تھی جسے ٹائن بی نے افسانہ بنا کر ہزارہا صفحات، تیرہ ابواب، دس جلدوں اور زندگی کے تینتیس سالوں پر پھیلایا۔"

"نظریہ زوال و انتشار تہذیب ہی ٹائن بی کے علم و فکر کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ اس نظریہ میں وہ زوال کی وجوہات اور انتشار کی کیفیات کا ذکر کرتا ہے۔ زوال و انتشار کی بظاہر صورت یہ ہوتی ہے کہ طباع اقلیت میں طباعی کا فقدان ہوتا ہے اور وہ ایک جابر اقلیت میں بدل جاتی ہے۔ اکثریت ایسی جابر اقلیت کی محکوم تو رہتی ہے۔ مگر وفادار نہیں رہتی اور پیروی کے لیے نئے رہنما اور نئے راستے تلاش کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر انتشار کا شکار ہو جاتی ہے۔"

"سوال کی ساری وجوہات کو اکٹھا کیجیے تو صرف ایک وجہ بنتی ہے۔ یعنی ملک میں اتفاق اور یک جہتی کا فقدان۔"

محض اس داخلی حقیقت کا اظہار ہے کہ معاشرے کی روح زخمی ہو چکی ہے اور زخم اس معاشرے کے ہر فرد کے دل پر لگ چکے ہیں۔

دل صاحب قلم کا ممنون اور احسان مند ہے۔ جس نے ہمیں تاریخ ساز شخصیات سے متعارف کروایا۔ وگرنہ کسے فرصت کہ پیچھے مڑ کر دیکھ سکے۔۔۔ ڈھونڈے۔۔۔ تلاش کرے۔ آٹوگراف کا مرحلہ ملاقات کے بغیر طے نہیں ہو سکتا۔ سو، ٹائن بی سے مصنف کی ملاقات کا تذکرہ بھی شامل ہے۔

ملتان کے ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے انہوں نے ٹائن بی کے اعزاز میں تقریب سے خطاب کیا۔ شرف ملاقات بھی حاصل کیا اور آٹوگراف تو۔۔۔

"تنگ گلیوں، ابلتی نالیوں اور اونچی دیواروں کے اس محلے میں وہ چند دن بڑے مزے سے رہا۔ رات وہ مجھے کھانے پر ملا۔ فروتنی اور انکساری کا وہ عالم تھا کہ مجھے اس کا طرز تپاک دیکھ کر ندامت سے پسینہ آگیا۔ پسینہ خشک ہوتا اور پھر آتا رہا۔ گو بظاہر میں ہنس ہنس کر اس سے گفتگو کر رہا تھا۔"

تحریر میں زمانہ سمٹ سکتا ہے۔۔۔ گزرا ہوا تو ظاہر ہے۔ لیکن اس کی بدولت آنے والا بھی؟ یہ تحریر کا ایک حیران کن پہلو تو ہے۔ مگر جس فہم، ادراک اور اخلاص کی بنا پر تحریر کو یہ وصف ملتا ہے۔ وہ بھی نادر و نایاب ہے۔ تو تجربہ کیجیے ایک ایسی گزرگاہ کا۔۔۔ جہاں پردر تو حقیقت کا ہے۔۔۔ مگر کھلتا حیرت کدے کو ہے!

☆

بندھن

ژالے سرحدی ہمراہ عمر

شاہین رشید

"شادی آن لائن" کی کامیاب کمپیئرنگ سے اپنے فنی کیریر کا آغاز کرنے والی ژالے سرحدی نے جب اداکاری اور ماڈلنگ کی دنیا میں قدم رکھا تو اس میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔ ژالے سرحدی کو فن ورثے میں ملا ہے۔ معروف ہدایت کار ضیاء سرحدی ان کے دادا اور معروف اداکار خیام سرحدی ان کے چچا تھے۔ ژالے کی چھوٹی بہن ژائیلہ سرحدی بھی شوبز سے وابستہ ہیں۔ ژالے سرحدی نے ماڈلنگ اور اداکاری کو اپنایا اور کامیاب ٹھہریں۔

تاہم انہیں بے حد خوب صورت اور سریلی آواز بھی عطا ہوئی ہے۔ مگر انہوں نے گلوکاری کو صرف اپنے شوق کی حد تک محدود رکھا ہے۔ ژالے کے شوہر عامر انیس ایک بزنس مین ہیں اور میمن برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔

"شادی آن لائن" کے ذریعے کئی جوڑوں کو شادی کے بندھن میں باندھنے والی ژالے سرحدی کا اپنا بندھن کیسا ہے۔ یہ جاننے کے لیے اس مرتبہ بندھن میں ہم آپ کی ملاقات ان سے کرا رہے ہیں۔

"ہیلو ژالے! کیسی ہو؟"

"الحمد للہ۔"

"فیملی لائف اور شوبز لائف کیسی گزر رہی ہے؟"

"دونوں بہت اچھی۔۔۔ بہت مصروف، بہت خوش ہوں اپنی لائف میں۔"

"آج کل آپ بہت کام کر رہی ہیں اسکرین پہ۔ فیملی لائف ڈسٹرب نہیں ہوتی کیا؟"

"میری پہلی ترجیح میرا گھر ہے۔ میرا گھر ڈسٹرب ہو مجھے یہ گوارا ہی نہیں ہے۔ جب شادی ہوئی اور اس کے بعد میں امید سے ہوئی تو میں نے شوبز کو چھوڑ دیا۔ عنایا (بیٹی) کے بعد بھی نہیں کیا۔ اب بیٹی اسکول گوئنگ ہو گئی ہے تو مجھے کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے اب ایک سال سے میں بھرپور طریقے سے کام کر رہی ہوں۔"

"آپ کے شوہر کا کتنا تعاون ہے اور کام کے لیے کوئی شیڈول بنایا ہوا ہے آپ نے؟"

"شوہر کے تعاون کے بغیر تو بیوی کچھ کر ہی نہیں سکتی۔ ان کا تعاون ہے تو میں آپ کو فیلڈ میں نظر آ رہی ہوں۔ میں نے اپنے کام کے لیے ایک شیڈول بنایا ہوا ہے کہ مجھے کس وقت گھر پہ ہونا اور کس وقت فیلڈ میں اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اتنی صلاحیت دی ہے کہ میں اپنی ذمہ داریاں بخوبی نبھا سکوں۔"

"ژالے آپ ایک اچھی بیوی ہیں یا عامر انیس اچھے شوہر ہیں؟"

"دیکھیں۔۔۔ میاں، بیوی کا رشتہ انڈر اسٹینڈنگ کا رشتہ ہوتا ہے۔ کوئی سو فیصد درست نہیں ہوتا۔ غلطیاں بیوی سے بھی ہوتی ہیں اور شوہر سے بھی۔ اگر مل بیٹھ کر اپنی غلطی کو تسلیم کر لیں تو کوئی وجہ ہی نہیں کہ گھریلو زندگی اچھی نہ گزرے۔"

"عامر سے دوستی زیادہ ہے یا احترام؟"

"احترام اپنی جگہ اور دوستی اپنی جگہ۔۔۔ عامر میرے بہت اچھے دوست بھی ہیں اور ایک قابل احترام شوہر بھی ہیں۔"

"شوبز کی لڑکیاں عموماً" دیر سے شادی کرتی ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں شوبز میں کام کرنے کی اجازت ہی نہ ملے۔ آپ نے بھی ایسا کچھ سوچا تھا؟"

"نہیں۔۔۔ ایسا کچھ نہیں سوچا تھا اور محض شوبز میں رہنے کی خاطر شادی نہ کرنا یا دیر سے کرنا سوائے حماقت کے کچھ نہیں ہے۔ شادی ضرور کرنی چاہیے۔ اپنی فیملی ضرور بنانی چاہیے۔ کیونکہ یہی اصل زندگی ہے۔"

"عامر صاحب کو آپ کا کام کیسا لگتا ہے؟ شوق سے دیکھتے ہیں آپ کے ڈرامے؟"

"سچ بتاؤں، عامر کو ٹی وی دیکھنے کا زیادہ شوق نہیں ہے اور شادی سے پہلے تو انہوں نے میرے ڈرامے بالکل بھی نہیں دیکھے تھے۔ مگر اب ایسا نہیں ہے۔ اب وہ میرے ڈرامے نہ صرف شوق سے دیکھتے ہیں۔ بلکہ تنقید اور تعریف بھی کرتے ہیں۔ بعض اوقات تو بہت زیادہ حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔"

"شروع شروع میں جب انہوں نے آپ کے ڈرامے نہیں دیکھے تھے تو اس وقت کہا تھا کہ تم شوبز کو چھوڑ دو اور ڈراموں میں کام نہ کرو؟"

"نہیں۔۔۔ عامر نے کبھی مجھ پہ پابندی نہیں لگائی اور نہ ہی اس بات کا اظہار کیا کہ میں شوبز کو چھوڑ دوں۔ میں نے بتایا نا کہ وہ اب نہ صرف میرے ڈرامے شوق سے دیکھتے ہیں، بلکہ میری حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔"

"عامر کو شادی کے بعد کیسا پایا؟ غصے کے تیز ہیں؟ اچھی بری عادت کیا ہے؟"

"عامر کو شادی کے بعد کیسا پایا والی بات پر میں یہ جواب دوں گی کہ شادی سے پہلے ہماری اتنی طویل ملاقاتیں یا باتیں نہیں ہوتی تھیں کہ ہمیں ایک دوسرے کے مزاج کا پتا چلتا۔ کیونکہ عامر اپنے بزنس کے سلسلے میں بہت مصروف رہتے تھے اور میں اپنے

کام کی وجہ سے۔۔۔ تو شادی کے بعد ہی ان کے مزاج اور ان کی اچھی اور بری عادت کا پتا چلا۔۔۔ آپ نے غصے کی بات کی تو سچ بتاؤں کہ غصے کی تو میں تیز ہوں۔ انہیں تو کبھی کبھار ہی غصہ آتا ہے اور اتر بھی جلدی جاتا ہے۔ جبکہ میرا غصہ دیر تک رہتا ہے اور اچھی عادتیں تو ان میں بہت ہیں۔ ان کے اندر رشتوں کا احترام بہت زیادہ ہے۔ ہر رشتہ ان کے لیے اہم ہے۔ اس لیے سب رشتوں کو نبھا کر رکھتے ہیں اور سب کو ان کے رتبے کے حساب سے لے کر چلتے ہیں۔ اپنے گھر والوں سے تو محبت کرتے ہی ہیں میرے گھر والوں سے بھی یعنی اپنے سسرال والوں سے بھی بہت پیار کرتے ہیں بہت احترام کرتے ہیں۔"

"میرے خیال سے خامی تو پھر کوئی ہوگی نہیں؟"

"نہیں، نہیں۔۔۔ ایسی بات نہیں ہے۔ خامی ہے۔ مگر خوبیاں اس پر حاوی ہیں۔ خامی صرف یہ ہے کہ میرے ساتھ گھر کے کاموں میں ہاتھ نہیں بٹاتے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ کبھی کبھار تو میرا ہاتھ بٹا دیا کریں۔"

"اچھا۔۔۔ ویسے عامر صاحب تو ملک سے باہر اکیلے کئی سال رہے تو انہیں تو کام کی عادت ہونی چاہیے؟"

"مسئلہ یہ ہے کہ باہر کی دنیا سے ہو کر تو آئے ہیں۔ مگر پاکستان آکر اور اپنے گھر آکر سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ باہر تو مجبوری سے کام کرتے ہیں۔ اپنے گھر میں تو کوئی مجبوری نہیں ہوتی۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ سب کام مجھ پر یا نوکروں پر چھوڑ دیتے ہوں۔ اپنے بہت سے کام خود بھی کر لیتے ہیں۔" (ہنستے ہوئے)

"جوائنٹ فیملی میں رہتی ہیں؟"

"نہیں، نہیں۔۔۔ ایک سال جوائنٹ فیملی میں رہی اور پھر علیحدہ ہو گئی۔ مجھے وہاں رہنے میں بھی کوئی پرابلم نہیں تھا کیونکہ مجھے سسرال میں بھی ہر کام کرنے کی آزادی تھی۔"

"تو پھر علیحدہ کیوں ہوئیں؟"

"بہت زیادہ عرصہ جوائنٹ فیملی میں رہنے سے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ جلد ہی علیحدہ ہو جانا چاہیے۔ اس طرح مسائل بھی جنم نہیں لیتے اور محبتیں بھی برقرار رہتی ہیں۔"

"غصہ آپ کا تیز، جوائنٹ فیملی بھی نہیں ہے تو پھر جب لڑائی جھگڑا ہوتا ہے تو صلح کون کراتا ہے؟"

"یہ اچھا سوال کیا۔۔۔ ویسے جب میاں بیوی علیحدہ گھر میں ہوتے ہیں تو لڑائی جھگڑے بھی نہیں ہوتے۔ دونوں۔۔۔ ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھتے ہیں اور ہم دونوں کے درمیان بہت معمولی باتوں پر تھوڑی سی لڑائی ہو جاتی ہے اور اس میں بھی قصور میرا ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ مجھے ہی غصہ زیادہ آتا ہے۔ تو جب بھی ایسا ہوا ہے، عامر ہی صلح کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ ہماری لڑائی گھنٹہ دو گھنٹہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔"

"عامر آپ کی شہرت سے چڑتے تو نہیں۔ کہ مجھے کوئی نہیں پہچانتا اور تمہیں سب جانتے ہیں؟ اور شادی کے بعد کوئی شکایت جو ابھی تک برقرار ہے؟"

"شادی کے بعد کی ایک شکایت تو ابھی تک برقرار ہے کہ ولیمہ کے دو دن کے بعد ہی یہ آفس چلے گئے تھے اور رات کو تقریباً" آٹھ نو بجے گھر آئے تھے اور جہاں تک شہرت کی بات ہے تو یہ بالکل بھی نہیں چڑتے۔ بلکہ میری شہرت سے خوش ہوتے ہیں اور فخر کرتے ہیں کہ ان کی بیگم ایک مشہور آرٹسٹ ہے۔"

"ویسے آپ کے خیال میں بیوی کو کمانا چاہیے؟"

"بالکل کمانا چاہیے۔۔۔ بلکہ ضرور کمانا چاہیے۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ آپ کو کسی چیز کی کوئی کمی ہوتی ہے، بلکہ اس لیے ضروری ہے کہ آپ کے والدین نے آپ کو اعلا تعلیم دلوائی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ آپ اپنی لائف میں اپنے لیے بھی کچھ کر سکیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ آپ کا فیوچر سیکیور ہوتا ہے اور پھر آنے والے وقت کا کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کیا کروٹ لے۔ اس لیے تعلیم حاصل کرنا بھی بہت ضروری ہے اور کمانا بھی بہت ضروری ہے۔ اب مجھے کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ مگر میں گھر بیٹھ کر اپنا ٹیلنٹ کیوں ضائع کروں۔"

"گڈ۔۔۔ یہ بتائیں کہ عامر صاحب سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی؟"

"کافی پیچھے جانا پڑے گا۔۔۔ خیر! یہ 2004ء کی بات ہے۔ میں اپنی ایک دوست کی شادی میں گئی ہوئی تھی۔ وہاں ان سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ میری دوست نے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ عامر ہیں اور امریکا سے آئے ہیں۔ سرسری بات چیت ہوئی اور پھر اس طرح دوستوں کی محفل میں بھی ان سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ مگر ایک دن عامر نے مجھ سے میرا فون نمبر مانگا۔ بلکہ نہیں۔۔۔ یہ کہا کہ میں آپ کو کال کروں گا۔ ان کے پاس پہلے سے میرا نمبر موجود تھا۔ غالباً" انہوں نے میری کسی دوست سے لے لیا تھا۔ بس تو پھر فون پر بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا اور بات چیت پسندیدگی کے رنگ میں ڈھل گئی۔۔۔ اور بس۔"

"پھر بات مزید آگے کیسے بڑھی؟ بڑوں تک بات کیسے پہنچی؟"

"پھر بات ایسے آگے بڑھی کہ 2005ء میں عامر نے مجھے پروپوز کر دیا۔ اسی دوران مجھے ملک سے باہر جانا تھا تو عامر نے کہا کہ جب تم پاکستان واپس آؤ گی تو میں اپنے والدین کو تمہارے گھر بھیجوں گا اور جب واپس آئی تو عامر نے بتایا کہ کچھ مسائل نے جنم لے لیا ہے۔ اس لیے تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔ خیر! پھر 2006ء میں جون کے مہینے میں ہماری منگنی ہو گئی اور 20 جولائی 2007ء کو شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔"

"اس دن کا بے چینی سے انتظار تھا یا نارمل لائف گزری؟"

"نہیں! بے چینی سے بالکل بھی انتظار نہیں کیا۔ کیونکہ میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ میں سوچتی کہ ہائے اللہ! میری شادی ہونے والی ہے۔ میری زندگی کیسی گزرے گی۔ سسرال والے کیسے ہوں گے۔ میں نے بالکل نارمل زندگی گزاری اور اپنے کاموں میں مصروف رہی۔ کیونکہ میں نے بہت پریکٹیکل لائف گزاری ہے اور گزار رہی ہوں۔ اس لیے ہر بات کو پریکٹیکلی انداز سے سوچتی ہوں اور آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ شادی سے ایک دن پہلے تک میں شوٹ میں مصروف رہی۔"

"جب آپ اپنے کام میں مصروف عامر اپنے کام میں مصروف تو شادی بھی بہت سادگی اور نارمل انداز میں ہوئی ہوگی؟ مطلب دھوم دھام سے تو نہیں ہوئی ہوگی؟"

"گھر والوں کو ہی دھوم دھام کا انتظام کرنا تھا۔ اس لیے دھوم دھام سے تو ہوئی۔ بہت ہلا گلا نہیں تھا تو بہت سادگی بھی نہیں تھی۔"

"پیا کے دیس جانے اور میکہ چھوڑتے وقت کیا تاثرات کیا احساسات تھے؟"

"بس وہی جو ہر لڑکی کے ہوتے ہیں۔ سسرال کے بارے میں سوچنا۔ میکے میں اپنے گزرے وقت کو یاد رکھنا۔ دونوں کام مشکل ہوتے ہیں۔ مگر پھر سب کچھ سیٹ بھی ہو جاتا ہے۔"

"منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور ہنی مون کہاں منایا تھا؟"

"سچ بتاؤں۔۔۔ منہ دکھائی میں شوہر بیوی کو کچھ دیتا ہے۔ مگر اس بارے میں عامر کو کچھ بھی نہیں پتا تھا اور نہ ہی شاید ان کو کسی نے گائیڈ کیا تھا۔ اس لیے یہ رسم رہ ہی گئی۔ البتہ ہنی مون منانے ہم تھائی لینڈ گئے تھے اور ہمارا ہنی مون پیریڈ بہت ہی اچھا رہا تھا۔ بہت انجوائے کیا تھا۔"

"کیا ہنی مون منانا ضروری ہوتا ہے؟"

"بالکل ہوتا ہے۔۔۔ اگر آپ جوائنٹ فیملی میں جا رہے ہوتے ہیں یا رہ رہے ہوتے ہیں تو پھر ہنی مون منانا بہت ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ میاں بیوی کو ایک خاص وقت مل جاتا ہے اکیلے رہنے کا۔ ایک دوسرے کو سمجھنے کا۔ ایک دوسرے کے ساتھ انڈر اسٹینڈ ہونے کا۔"

"ڈراموں میں تو کافی دلہن بنیں۔ اصل میں دلہن

بن کے کیسا لگا تھا؟ اپنا آپ اچھا لگا تھا؟"

"ہاں۔۔۔ مجھے اپنا آپ بہت اچھا لگا تھا۔ اس دن میں اسمارٹ اور فریش نظر آؤں۔ اس کے لیے میں نے تیاری بھی خوب کی تھی اس دن میرا میک اپ بھی بہت اچھا ہوا تھا تو کافی اچھی لگ رہی تھی اور اصل دلہن اور ڈرامے کی دلہن میں بہت فرق ہوتا ہے۔"

"عامر صاحب کے کیا تاثرات تھے؟ تعریف کی تھی سادگی پسند ہیں یا فیشن پسند؟"

"انہوں نے بھی تعریف کی تھی۔ مگر یہ بہت سادگی پسند ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ شروع شروع میں جب میں شادی کے بھاری جوڑے پہنتی تھی تو انہیں بہت گھبراہٹ ہوتی تھی اور اب بھی ان کا یہی حال ہے۔"

"ایک دوسرے کو کس نام سے بلاتے ہیں؟"

"ہمارے آپس میں کافی پیار کے نام ہیں۔ البتہ جب ہم دونوں غصے میں ہوتے ہیں تو پھر ایک دوسرے کو نام لے کر بلاتے ہیں اور جب کوئی بھی نام لے کر بلائے تو پتا چل جاتا ہے کہ کچھ گڑبڑ ہے۔"

"کامیاب شادی کے لیے لڑکی کا خوب صورت ہونا ضروری ہے یا پیسہ ہونا ضروری ہے؟"

"اچھی اور قبول صورت ہونا تو بہت ضروری ہے۔ یہ لڑکے کے لیے بھی اور لڑکی کے لیے بھی۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ پیار محبت اور سیرت کا ہونا ضروری ہے۔ عقل مند ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر آپ عقل مند نہیں ہیں تو اچھی بھلی صورت بھی بری لگ رہی ہوگی اور جہاں تک پیسے کی بات ہے تو پیسہ تو ہر حال میں ضروری ہے۔ خواہ آپ شادی شدہ ہوں یا نہ ہوں۔ اچھی زندگی گزارنے کے لیے پیسہ بہت بہت ضروری ہے۔"

"ژالے! اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی کو ہمیشہ اسی طرح خوش باش رکھے اور آپ دونوں کی محبت کو برقرار رکھے۔ لیکن اگر خدانخواستہ عامر نے دوسری شادی کی اجازت مانگی تو کیا دے دیں گی؟"

"اجازت؟ بالکل بھی نہیں دوں گی۔ بھئی! اگر دوسری شادی کرنی تھی تو پھر مجھ سے کیوں کی شادی۔۔۔؟ اور پھر بھی نہ مانے تو میں انہیں خدا حافظ کہہ کر خود ہی چلی جاؤں گی۔"

"مشرقی بیوی کی طرح عامر کے کتنے کام آپ کر کے دیتی ہیں؟"

"زیادہ تر کام کر کے دیتی ہوں۔ کیونکہ مجھے اچھا لگتا ہے ان کے کام کرنا۔ میں انہیں ناشتا بھی بنا کر دیتی ہوں۔ کھانا بھی اکثر پکاتی ہوں۔ کیونکہ مجھے کوکنگ کرنا اچھا لگتا ہے اور۔۔۔ اور بھی بہت کچھ جو مجھ سے ہو سکتا ہے۔ لیکن عامر میں بھی یہ خوبی ہے کہ وہ اپنے زیادہ تر کام خود ہی کرتے ہیں۔"

"کھانے پینے کے معاملے میں بے صبرا کون ہے، آپ یا عامر؟"

"عامر۔۔۔ بہت بے صبرے ہیں۔ کھانا وقت پر نہ ملے تو بہت پریشان ہو جاتے ہیں۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ ایسی نوبت ذرا کم ہی آتی ہے۔ ماشاء اللہ عامر کھانے پینے کے بہت شوقین ہیں اور میں بھی بہت شوقین ہوں۔ لیکن چونکہ میں زیادہ تر ڈائٹ پہ رہتی ہوں۔ اس لیے اپنے من پسند کھانے نہیں کھا سکتی۔ کبھی کبھار کھا بھی لیتی ہوں۔ مگر زیادہ نہیں۔"

"اور کوئی خاص بات جس کو سوچ کر بے ساختہ ہنسی آجاتی ہو؟"

"جب یہ کمرے میں آئے تو لائٹ چلی گئی اور یہ "آئی ایم سوری جان! جنریٹر آن کر کے ابھی آیا۔" کہہ کر چلے گئے اور میری بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔"

شادی مبارک ہو

غازیہ ہمراہ اسکواڈرن لیڈر فیصل

رضیہ مہدی

میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا کہ آخر یہ لڑکیاں اتنی جلدی بڑی کیسے ہو جاتی ہیں۔ ابھی کل ہی کی تو بات لگتی ہے جب میں غازیہ کی انگلی پکڑے کراچی پبلک اسکول میں اس کے ایڈمیشن کے لیے کھڑی تھی
چلیں یہ بات آپ کو کچھ پرانی لگے تو وہ دن تو واقعی یوں لگتا ہے جیسے ابھی ابھی گزرا ہو' جب میں تیز بارش میں اپنے ڈرائیور ناصر بلوچ کے ساتھ لیاقت نیشنل اسپتال سے ملحقہ کالج میں کبھی ادھر جارہی تھی کبھی ادھر جارہی تھی کہ مجھے ایم بی بی ایس کے لیے اس کا فارم جمع کروانا تھا' تب کہیں دور میرے ذہن میں یہ خیال ابھی آیا تھا کہ پانچ سال میں ایم بی بی ایس ہوگا پھر ایک سال کی ہاؤس جاب ہوگی پھر...... اور پھر کے آگے میں کچھ اور سوچنے پر تب کہاں تیار تھی۔
مگر ہوا کیا' ابھی سال ہی گزرا ہوگا کہ ادھر ادھر سے کچھ احساس سا ہونے لگا کہ میری گڑیا' میری رانی اب بڑی ہوگئی ہے کہ لوگ پوچھنے لگے اشارتاً' کنایتاً' کہ کہیں بات وات چلی اور پھر میں نے لوگوں کی پذیرائی شروع کردی ارے یہ لڑکیوں کی ماؤں کو ایک ساتھ کیسے کیسے احساس پریشان کرتے ہیں۔ ہیں نا۔ کبھی سوچتی ہیں؟

پتا نہیں یہ مراحل کب اور کیسے طے ہوں گے (دنیا میں رہتے ہیں اور لڑکیوں کے معاملات میں لوگوں کی پریشانی چھپی تھوڑی ہے)
کیا قدر دان لوگ مل جائیں گے (آخر بیٹی کو ماں سے زیادہ کون جانتا ہے)
کیسا ہوگا وہ' جس سے میری بیٹی کا نصیب جڑا ہے۔ (بہت سے جوڑ/ بے جوڑ نظر کے سامنے آنے لگتے ہیں)

تیاریاں کیسے ہوں گی کہ سب کچھ اچھا اچھا ہو جائے۔
اور پھر آخر میں یہ دھڑکا' کیا میری لاڈو اس گھر سے چلی جائے گی؟ چلی جائے گی تو میں کیسے رہوں گی؟
مگر جیسے وقت کا کام ہے گزرنا ویسے ہی قدم قدم پر مشکل فیصلے ہمارے منتظر رہتے ہیں' دراصل اس مکرو فریب کی دنیا میں کیسے اور کس پر اعتبار کریں اور اعتبار نہ کریں تو کیا کریں۔ ابھی ہم لوگ اسی گومگو میں تھے کہ اس شہزادے کی امی نے بڑے وقار سے ہمارے در پر دستک دی کہ جس سے ہماری بیٹی مقدر کا ستارہ ملنا تھا۔

عجیب بات ہے کہ جب نصیب زور مارتا ہے تو ہر طرف سے گرین سگنل ملنے لگتا ہے۔ شاید 2012ء میری لاڈلی کے نئے گھر میں پہلے قدم کے لیے راہیں ہموار کررہا تھا۔
"لڑکا اسکوڈرن لیڈر (جی ڈی پائلٹ) ہے اور تمہیں کیا چاہیے۔" یہ میری کزن تنویر کا کہنا تھا۔
"خاندانی لوگ ہیں۔ شرافت ہی معیار ہمارے یہاں ہمیشہ مانی گئی۔" یہ صبیحہ تھیں ہماری عزیز ہیں۔
"سب ٹھیک ہے' بجو بسم اللہ کرو۔" صوفیہ کا خیال تھا۔

اور سب سے بڑھ کر جنہیں سب فیصلے کا اختیار حاصل تھا یعنی غازیہ کے بابا' انہیں فیصل بہت پسند آئے۔
"اسمارٹ ہیں فیصل بھائی۔" پارس اور مدثر تھے میرے دونوں نور نظر۔
پھر بات یہاں آکر رک سی گئی کہ ہم ابھی نکاح نہیں کرسکتے۔ ابھی تو دو سال پڑھائی کے باقی ہیں پھر ہاؤس جاب کا مرحلہ بھی ہے۔
ہاں مگر یہ مہدی صاحب یعنی غازیہ کے بابا کا فیصلہ تھا اور قدرت کا فیصلہ وہ کیا تھا؟
وہ یہ تھا کہ یہ بندھن بندھ کر رہے گا۔
سو ہوا یوں کہ کچھ عرصے خاموشی کے بعد ابھی فائنل ایئر شروع ہی ہوا تھا کہ فیصل کی امی ایک مرتبہ پھر بڑے مان چاؤ سے آگئیں اور ان کی متانت اور پروقار انداز تخاطب نے نہیں نہیں کو' ہاں ہاں' میں بدل دیا ایسے کہ حج پر جاتے ہوئے وہ ہمارے اعتبار کی خوشبو ساتھ لے گئیں۔
طے یہی پایا کہ نکاح پہلے ہوگا کہ فورسز کی جاب میں نکاح کے بعد ہی اکاموڈیشن وغیرہ کے معاملات سلجھتے

ہیں تو میرے رب نے وہ لمحہ وہ خوب صورت منظر مجھے دکھایا کہ جب آنکھیں نم تھیں، دل خوش تھا اور لب مسلسل دعاگو کہ۔

میرے مولا میں نے جس کی امانت تھی اس کے سپرد کی اور تو ان کو اپنی رحمتوں اور اکرام کے حصار میں رکھ ہمیشہ۔

سب کچھ بہت اچھی طرح ہوا۔

نکاح تو غازیہ بی بی کا چہیتی چھوٹی اعلا اور خیرا، چھوٹے ماما کے بغیر ہو گیا کہ ان کا فورا" آنا ممکن نہیں تھا مگر رخصتی کے لیے سب کا مشترکہ فیصلہ یہی تھا کہ تاریخیں ایسی طے کی جائیں کہ سب یعنی مینا اور متین سعودیہ سے سارہ اور ضیا انگلینڈ سے اور ذہین اور فریال کینیڈا سے آسکیں۔ ادھر دولہا کے بڑے بھائی کے اپنے آنے جانے کے شیڈول ہیں۔ وہ ایک مہینہ کراچی اور ایک مہینہ امارات میں گزارتے ہیں ایسے میں تاریخوں کا حصول مسئلہ بن گیا۔ بڑی مشکل سے یہ مرحلہ طے ہوا۔

اب تیاریوں کے مراحل تھے۔ ایک ہی بیٹی اور وہ بھی ایسی کہ آج تک جو لا کر دیا پہن لیا مجھے خود فیشن اور کلرز کا خیال رکھنا ہوتا تھا۔ وہ تیاریوں سے بھی بالکل دور۔ ساس نے بھی محبت سے کہا مگر گھبرا گئی۔

"مما! آپ کہہ دیں، وہ اپنی پسند سے لے کر آئیں۔ میں آپ کے ساتھ بھی کب جاتی ہوں۔"

اس کی دوستوں کا خیال تھا کہ برائیڈل سوٹ تو دلہن پسند سے لیتی ہے۔ میں کیا کہتی۔ گھر کی مہمان داری البتہ دلہن صاحبہ نے سنبھالی کر مما ان کی اپنے دفتر کے ساتھ ساتھ کراچی کے سارے بازار اور ان کے رستوں کی دریافت میں مہارت حاصل کر رہی تھیں۔

اللہ عرفان (ڈرائیور) کو سلامت رکھے اور صوفیہ (چھوٹی بہن) کو کہ وہ معاون تھے۔ سب سے زیادہ ٹیلرز اور میچنگز نے تنگ کیا۔ بیٹے کی بری بازار میں کھڑی یہ اگلے وقتوں کے لوگوں کا کہنا تھا۔ بیٹیوں کا معاملہ تب بھی اور تھا اب بھی اور ہے اور پھر جب تیاری کی ذمہ داری ہو مجھ ایسے انسان پر جو تھوڑے کم اور ذرا سا ادھر ادھر پر راضی نہ ہو پا رہا ہو تو مشکل بڑھ رہی تھی۔ کیا کراکری کیا شوز۔ کیا دولہا کی تیاریاں اور کیا خود دلہن کے لیے ایک ایک چیز کا انتخاب۔

سب کچھ ہونا تھا ہو رہا تھا بس رات و دن کا فرق مٹ گیا تھا۔ میری چاروں بہنیں صبیحہ، صوفیہ، فوزیہ اور مینا میری چھوٹی بھاوج صبا کے ساتھ مسلسل مصروف تھیں۔ نیلی سعودیہ سے اور فریال کینیڈا سے آ گئیں تو وہ دونوں مامیاں بھی مصروف ہو گئیں۔ غازیہ کی پھوپھیاں درخشاں اور شمیم باجی بھی شادی کے دنوں میں ساتھ دے رہی تھیں۔

صبا مسلسل غازیہ کو ڈانتی رہیں کہ "عجیب لڑکی ہو تم، اب زندگی بدل رہی ہے۔ کچھ تو خود پر توجہ دو۔ ایسے رہ رہی ہو جیسے شادی کسی اور کی ہو۔"

مہینے ہفتوں میں اور ہفتے دنوں میں بدل گئے اور دیکھتے دیکھتے شادی کے دن قریب آ گئے۔ میری بوکھلاہٹ بہت بڑھ گئی۔ پہلے ہی یہ حال ہے کہ اچھی طرح حفاظت سے جو چیز رکھ دی اس کے بعد چراغ رخ زیبا کے گھر ڈھونڈتے رہے کہ جس سے اسے ڈھونڈا جائے مگر ان دنوں تو یہ حال ہو گیا کہ آدھا وقت چیزیں رکھنے میں اور آدھا انہیں ڈھونڈنے میں صرف ہونے لگا۔

شہر کی اس دگرگوں حالت میں کوئی تقریب کا خیال وارد ہو تو جانو جان سولی پر ہی لٹکی رہتی ہے کہ یہاں کچھ پتا نہیں کب کیا ہو جائے۔

میلاد شریف سے تقریبات کا آغاز ہوا پھر سب کچھ ہوا۔ مایوں، مہندی، ڈھولکی، بارات ولیمہ اور چوتھی کی دعوت مایوں تقریباً" نو دن پہلے ہوا سب سمجھتے تھے بوریت ہو جائے گی وہاں وقت کو پر لگ گئے۔ اب بچے کہتے ہیں شادی اتنی جلدی ختم کیوں ہو گئی ابھی اور ہلا گلا رہتا تو اچھا تھا۔

ہمارے یہاں ایک مزے کی رسم ہے کہ جب لڑکے اور لڑکی کا مایوں ہوتا ہے تو اس کے بعد سارے قریبی عزیز ایک ایک وقت کا پر تکلف اور مزے دار سا کھانا بھیجتے ہیں سو تقریباً" نو دن تک ڈنر کبھی خالہ کبھی

ماموں کبھی پھوپھی کی طرف سے ہوتا رہا اور سب کے مزے آتے رہے گھر کیوں کہ کہ قریب قریب ہیں اس لیے کسی کے لیے بھی پریشان کن نہیں رہا۔

خیر خیریت سے بارات کا دن آ گیا کہ جو CAA جاگنگ لان کے بینکوئیٹ میں رکھی گئی تھی۔ ماشاءاللہ نو سو کے قریب مہمان تھے، تقریباً" سارے ہی مدعو مہمان تشریف لائے۔

امتل نے آ کر مجھے بہت زیادہ شاد کیا وہ ہمیشہ کی طرح بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

غازیہ صیب سے تیار ہوئی اور واقعی اس کی ساس کی پسند کا ڈیپ ریڈ شرارہ بہت خوب صورت تھا۔ دولہا بھی کم نہیں تھا سب ہی نے جوڑی کی تعریف کی۔ ماشاءاللہ انتظامات بھی بہت اچھے ہوئے۔ سب ہی لوگ کہہ رہے تھے کہ کھانا بھی اچھا تھا اور شکر ہے شادی اس ہنگامہ پرور شہر پر آشوب میں بہترین انداز میں ہو گئی۔

دوسرے دن ولیمہ تھا۔ غازیہ نے بوتل گرین ڈھاکہ پائجامہ لمبی شرٹ کے ساتھ پہنا تھا جس کے سلور کام کی سب ہی تعریف کر رہے تھے ہمارے یہاں دلہن کے دونوں دن کے سوٹ دولہا والے اور دولہا کے دلہن والے بنواتے / لاتے ہیں سو دونوں اچھے لگ رہے تھے اس کے معنی انتخاب دونوں کا لاجواب ٹھہرا۔

سارے دنوں کے مینیو میں نے اپنے بھائی اور میاں کے ساتھ مل کر طے کیے۔ اچھے بنے اچھے سے پیش ہوئے کمال ٹھہرا کیٹرنگ سروسز اور بنکوئیٹ کے انتظامات کاروں کا۔ مگر سب مرغن کھانوں سے برات کا اظہار بھی کر رہے تھے اور ابھی چوتھی کی دعوت باقی تھی، سو سب نے طے کیا کہ یہ دعوت گھر والیوں کے سلیقے اور ہنر کی داد حاصل کرنے کے لیے مخصوص کی جائے، صبیحہ (میری چھوٹی بہن نے چکن 65 بنائی۔ قورمہ فوزیہ نے، صوفیہ نے کٹلس، صبا نے نرگسی کوفتے اور میں نے شاہی ٹکڑے جبکہ حلیم اور پلاؤ باورچی سے بنوایا گیا۔ سلاد بچیوں کی ذمہ داری ٹھہری۔ سب کو ہر چیز بہت پسند آئی۔

غازیہ نے اس دن پہلی مرتبہ ساری باندھی ریڈ ساری جو بہت جھلملا رہی تھی۔ جیولری کے ساتھ غازیہ بہت بدلی بدلی سی لگی۔ اس کی ایک وجہ شاید وہ محبت کا اعتماد بھی تھا جو فیصل نے ایک حصار کی صورت اس کی شخصیت کا حصہ بنا دیا تھا اور جس سے اس کی دلفریبی میں نظر لگ جانے کی حد تک اضافہ ہو چلا تھا جب ہی تو سب چاہنے والے دعائیں کر رہے تھے کہ پروردگار اس کی زندگی کو ہمیشہ یونہی خوب صورت اور خوشگوار رکھنا اور غازیہ کا خوشی سے جگمگاتا چہرہ یقین دلا رہا تھا کہ...... میں تو بھول چکی بابل کا دیس پیا کا گھر پیارا لگے.....

میرے رب نے مجھے غازیہ سے نوازا۔ میں کبھی بھی اس کی اس عنایت و کرم کا شکریہ ادا نہیں کر سکتی۔ صرف شکل و صورت ہی کی موہنی نہیں ہے، میری بیٹی مزاج بھی نرم اور محبتی پر خلوص انداز بھی رکھتی ہے اور یہ میرا ہی خیال نہیں ہے سب ہی جاننے سننے والے متفق ہیں کہ وہ آج کی لڑکیوں سے منفرد ہے۔ کسی بات کی ضد نہیں کسی بات پر اڑتا نہیں بات کو سمجھنے کی اچھی صلاحیت خدا نے دی ہے تو میں کیوں نہ تمنائی ہوتی کہ اس کا ساتھ بھی کسی ایسے سے ہو جو اندر سے انسانیت کی معراج پر ہو اور اب میں ایک مرتبہ پھر سربسجود ہوں فیصل شکل و صورت، عادات، مزاج سب میں بہترین ہیں۔

دعاگو ہوں کہ یہ جوڑی ہمیشہ قائم رہے اور خوشیوں کے پھولوں سے ان کا دامن بھرا رہے۔ آپ سب سے بھی دعاؤں کی درخواست ہے۔

☼

سرورق کی شخصیت	
ماڈل	شنار باضی
فوٹوگرافر	موسیٰ رضا
میک اپ	روز بیوٹی پارلر

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں۔ آپ کی سلامتی۔ عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو، ہم کو اور ہمارے پیارے وطن کو دشمنوں سے محفوظ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔

پہلا خط شیخوپورہ سے امت السلام کا ہے، لکھتی ہیں۔

شعاع میں نے کب پڑھنا شروع کیا؟ جب سے ہوش سنبھالا ہے، شعاع کو اپنے گھر کی زینت بنے دیکھا ہے۔ اب جس کہانی نے میری ازلی سستی کو شکست دے کر آخر قلم میرے ہاتھوں تک پہنچایا ہے وہ نمرہ احمد کی "جنت کے پتے" کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ میں آٹھویں جماعت سے نقاب کرتی آرہی ہوں اور اب ایف ایس سی کے پیپرز دیے ہیں، کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ میں آخر نقاب اور برقع لیتی کیوں ہوں، لیکن نمرہ آپی کا شکریہ کہ انہوں نے میری سوچ کو ایک سیدھا رخ دیا۔

آپ کے الفاظ دور کہیں کسی شخص کی زندگی بدل رہے ہوں اور فرشتے آپ کا نامہ اعمال نیکیوں سے بھر رہے ہوں اس سے بڑی خوش نصیبی کیا ہو سکتی ہے۔

رخسانہ نگار، عنیزہ سید، بشریٰ سعید نہایت اعلیٰ لکھتی ہیں۔ پلیز شائستہ جو اسکیچ بناتی ہیں ان کا انٹرویو بھی لیں۔ عمیرہ احمد سے میں سخت ناراض ہوا۔ اب ایسی بھی کیا مصروفیت تھی کہ آپ ہمیں بھول جائیں؟

ج۔ امت السلام! ایسی تحریریں جو زندگی کو خیر اور بھلائی کا راستہ دکھائیں جو زندگی میں حسن اور خوب صورتی پیدا کریں اور ان کی تحریریں اور الفاظ میں وہ اثر ہو جو پڑھنے والوں کو متاثر کرے۔ یہ اللہ کا کرم ہے جو یہ ہنر عطا کرتا ہے۔ نمرہ احمد کو اللہ تعالیٰ نے یہ ہنر عطا کیا ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

صبا طارق تربیلا غازی سے لکھتی ہیں۔

میں نے نمرہ احمد کے اور ناول بھی پڑھے ہیں مگر "جنت کے پتے" سے زیادہ اچھا، زبردست ناول کوئی بھی نہیں۔ مجھے اس کی تعریف کے لیے الفاظ ہی نہیں مل رہے۔

"دیوار شب" جویا کی صحت یابی کی بڑی خوشی ہوئی۔ عنیزہ سید کا "تان بائی کی بیٹی" اف...! بہت دکھ ہوا زینا وقار کے ساتھ ناانصافی کا۔ ہما تو بس، بے حد غصہ آیا اس پر۔

فواد خان کا انٹرویو شائع کیجیے گا اور پلیز ذرا جلدی۔ گول گپے بنانے کی ترکیب بھی بتائیں۔

ج۔ پیاری صبا! آپ نے "جنت کے پتے" کے متعلق جو سوال پوچھے ہیں ان کا جواب نمرہ احمد دیں گی۔ ہم جلد ہی "روبرو" کے سلسلے میں نمرہ احمد کو دعوت دیں گے۔

فواد خان کا انٹرویو شائع ہو چکا ہے اور گول گپے بنانے کی ترکیب بھی دی جا چکی ہے، آپ کی فرمائش پر دوبارہ دے دیں گے۔

امبر گل، جھڈو سندھ سے لکھتی ہیں۔

اس دفعہ کا شعاع بہت ہی اچھا اور زبردست لگا۔ دل سے پسند آیا۔ بات کروں گی عنیزہ سید کی، یار کیا ناول لکھا ہے آپ نے۔ جب داؤد نے زینا کے دکھوں کا ازالہ کرتے ہوئے اس سے شادی کرنے کی بات کی تھی تو بے ساختہ جیسے یکدم ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگ گئیں اور بہت پیارے سفید روئی کے گالوں جیسے سفید بادل نیلے امبر پر یوں چھا گئے۔ جب اینڈ تک پہنچی تو پھر چبھتی، کڑکتی دھوپ نکل آئی۔ یہ ناول پڑھتے پڑھتے میں بہت سی کیفیات سے گزری۔ میری طرف سے عنیزہ جی کو بہت بہت مبارک باد اتنا سپرڈپر قسم کا ناول لکھنے پر.....

سلسلے وار ناول دیوار شب میں، معاذ کا جویا کے لیے استحقاق جتانا بہت اچھا لگا۔ "ایک تھی مثال" میں عاصمہ بے چاری پر ٹوٹنے والی مصیبتیں پڑھ پڑھ کر دلی دکھ ہوتا ہے۔

"دیمک زدہ محبت" بہت زبردست لکھ رہی ہیں صائمہ اکرم یہ ناول خصوصاً" اس میں مائی جیلہ کی تجربہ کار اور نصیحت مندانہ باتیں۔

اب بات ہو جائے سائرہ رضا کے "فرمانبردار" کی۔ یار سائرہ آپ تو پلیز اپنی نظر اتارتی رہا کرو کہیں ہم جیسوں کی نظر ہی نہ لگ جائے۔ ماں سے بیٹے کی ایسی لازوال محبت... سبحان اللہ

اب بات ہے "جنت کے پتے" کی نمرہ احمد ہمیشہ ہی کمال کرتی ہیں بھئی۔ نمرہ کے لیے دعائیں کہ انہوں نے ہمارے لیے اتنی شاندار تحریر لکھی "شادی مبارک" میں آسیہ جی کی باتیں اور شادی کا احوال پڑھ کر اچھا لگا۔

ج۔ پیاری امبر! تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ صفحات کی کمی کی وجہ سے پورا شائع نہیں کر سکے، لیکن ہم نے آپ کا خط پوری توجہ سے پڑھا ہے۔

سائرہ رضا کی کہانی میں آپ کہانی کا صحیح میسج نہ سمجھ سکیں۔ سائرہ نے اس کہانی میں توازن کا پیغام دیا ہے۔ توازن ہر رشتے میں ضروری ہے خواہ وہ کوئی بھی رشتہ ہو۔ یہ بیٹے کی ماں سے لازوال محبت کی کہانی نہیں تھی۔ محبت خود کی جاتی ہے۔ دوسروں سے جبراً" نہیں کروائی جاتی محبت میں قربانی خود دی جاتی ہے کسی سے قربانی لی نہیں جاتی "ایک بیٹا اپنی ماں سے محبت میں بیوی کے حقوق پامال کر رہا ہے۔ بیوی پر جبر کر رہا ہے کہ وہ اس کی ماں کے ساتھ رہے۔ اگر اسے اپنی ماں سے محبت ہوتی تو وہ اپنی جاب کی قربانی دے کر ماں کے پاس رہتا۔ ماں کی خدمت کرتا اور ماں کو بیٹے کا خیال ہوتا تو وہ اپنے بیٹے کے قریب رہنے کے لیے تھوڑی تکلیف بھی برداشت کر لیتی۔ دونوں ماں بیٹے نے اپنی محبت میں ایک بیوی کو اور بچوں کے حقوق نظر انداز کیا۔

زائرہ پروین نے تحصیل سلانوالی ضلع سرگودھا سے لکھا ہے۔

مئی کا شعاع تین تاریخ کو ملا ٹائٹل بہت شاندار تھا۔ میں تو یہ سوچ کر ہی اداس ہوں کہ اب حیا اور جہان ہم سے نہیں ملیں گے۔ جہان سکندر بھی بہت ہی زبردست ہے پر بھئی افق ارسلان افق ہی ہے ویسے دونوں میں کچھ کچھ مماثلت تھی۔ میں نے نمرہ کے تمام ناول پڑھے ہیں صرف مصحف نہیں پڑھا۔ آپ پلیز بتا دیں کہ مصحف کب؟ کس سال؟ کس میگزین میں چھپا تھا۔ اس دفعہ عنیزہ سید کا ناول زبردست تھا۔ سائرہ رضا اچھا اضافہ ہیں اور رخسانہ نگار بھی بہت اچھا لکھتی ہیں۔

ج۔ پیاری زائرہ! مصحف شعاع میں نہیں خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہوا تھا۔ اپریل 2011ء سے اگست 2011ء تک قسط وار شائع ہوتا رہا ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ امید ہے، آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

عظمیٰ نے طورو سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں۔

سب سے پہلے ٹائٹل جو بہت ہی معصوم صورت سے سجا تھا۔ میری کزنز شکیلہ، حاجرہ، سائرہ، عالیہ، سلوٹی بھی بہت شوق سے ڈائجسٹ پڑھتی ہیں۔ آپ نے جویریہ تبسم کو لکھا تھا کہ آپ کی کہانی قابل اشاعت نہیں فی الحال مطالعہ پر توجہ دیں۔ مطالعہ سے مراد آپ کا کس قسم کا مطالعہ ہے۔

ج، مطالعہ سے مراد یہ ہے کہ آپ خواتین ڈائجسٹ اور شعاع میں شائع ہونے والی کہانیاں پڑھیں اس کے علاوہ

خواتین اور شعاع کے جو ناول کتابی شکل میں آچکے ہیں۔ ان کا مطالعہ کریں اس سے آپ کو پتا چلے گا کہ کس طرح کی کہانیاں ہم شائع کرتے ہیں۔

ام صغریٰ نے کراچی گرین ٹاؤن سے لکھا ہے۔

کافی عرصے سے افسانوں میں کچھ کمی سی رہتی تھی پر اس دفعہ کے شعاع میں افسانے تمام ہی بہت اچھے تھے۔ عالیہ بخاری کی کہانی ہمیشہ یاد رہے گی۔ شعاع کے سارے سلسلے شروع سے آخر تک ہمیشہ کی طرح بہت ہی خوب صورت تھے۔

ج۔ ام صغریٰ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

رضوانہ کرن کمالیہ سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے۔

ہم چار بہنیں ہیں میں اور میری تمام کزنز بھی بہت شوق سے ڈائجسٹ پڑھتی ہیں۔ اس ماہ کے شمارے میں بھی دیمک زدہ محبت کی تیسری قسط شوق سے پڑھی۔ نمرہ احمد کا "جنت کے پتے" اور رخسانہ نگار کا "ایک تھی مثال" بھی اچھی رہیں۔ اس ماہ "زمین کے آنسو" نے کچھ خاص مزہ نہیں دیا۔ ان کے علاوہ باقی تمام ناولٹ اور افسانے اچھے تھے۔ کہانیوں میں مزاح بہت کم ہو گیا ہے۔ نہ رہے شبلی اور جوادی اور نہ رہا ازمیر بٹ۔ ان کرداروں کو تخلیق کرنے والی مصنفین سے میری التجا ہے کہ وہ انہیں باقاعدہ شعاع میں شامل کریں۔ اب سے بہت پہلے میں نے ایک کہانی پڑھی تھی۔ افسوس مصنفہ کا بھی پتہ نہیں ہے۔ لیکن کردار میرے ذہن پر نقش ہو گئے ہیں' اس میں عمر اور تاباں ایک دوسرے کے فرسٹ کزنز تھے۔ عمر ہر وہ کام کرتا ہے جس سے تاباں کو چڑ ہوتی ہے' لیکن دل سے وہ اسے پسند کرتا ہے جس کا اظہار وہ اینڈ میں جا کر کرتا ہے۔ پلیز ایک اور کہانی گرفتار مسافر جس میں ایک لڑکی لڑکا بن جاتی ہے اگر آپ کو پتا ہو تو بتادیں کہ وہ کون سے سال کے کس ماہ کے شمارے میں تھی۔ برائے مہربانی اداکار ببرک شاہ کا انٹرویو بمعہ تصویر تفصیلی ضرور شائع کیجیے گا۔

ج۔ رضوانہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ "زمین کے آنسو" نگہت سیما کا ناول شعاع میں نہیں خواتین میں شائع ہو رہا ہے۔ آپ نے جن کہانیوں کے متعلق پوچھا ہے۔ وہ ہمیں یاد نہیں ممکن ہے ہماری قارئین میں سے کسی کو یاد ہو تو وہ ہمیں خط لکھ دیں۔ ہم شائع کر دیں گے۔ ببرک شاہ کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔

طاہرہ بتول نے ملتان سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں۔

لفظوں سے آشنائی ہوئی دوسری کلاس میں جو جیب خرچ ملتا اس سے کہانی خرید لیتی۔ عمرو عیار' ٹارزن اور بادشاہوں کی۔ پھر بھائی رسالے پڑھتا تھا۔ اس کے چرا کے پڑھنے شروع کر دیے' لیکن بھائی نشانی لگا کر بند کرتا تھا اس کو پتا چل جاتا تھا پھر بھائی سے بہت مار کھائی۔ والدین کی ناچاقی کی وجہ سے شادی جلد ہو گئی' صرف چودہ برس کی عمر میں۔ اب سسرال میں خالہ کے گھر شوہر اور دیور لڑنے لگے کہ رسالے نہ پڑھو۔ بہت رسالے گم کیے اور پھاڑے حتیٰ کہ میرے شوہر تو مار بھی دیتے تھے اور جس کا رسالہ ہوتا تھا یا تو اس سے شرمندگی سے معذرت کرنی پڑتی تھی یا پھر پیسے دینے پڑتے تھے۔ چھوٹی عمر میں شادی ہو کر اور ماں بن کر گھرداری اور بچے پالنے کا ہنر میں نے رسالوں سے سیکھا ہے۔ میرے ماموں کے گھر ٹی وی کیبل ہے' لیکن وہ اس کو گناہ نہیں سمجھتے' ہمیں طعنہ دیتے ہیں کہ یہ رسالے پڑھتی ہیں ہمارے گھر میں نہ ٹی وی ہے نہ ٹیپ اور نہ ریڈیو نہ ہی اخبار آتا ہے بس یہ رسالے ہیں خواتین اور شعاع۔ زندگی کی واحد خوشی۔ اب میری سسٹر کی قسمت اچھی ہے کہ اس کا شوہر رسالے لا دیتا ہے اور ہم چھپا کر پڑھ لیتے ہیں کیونکہ پہلے میں سسٹر کے گھر پڑھتی تھی تو میرے شوہر نے سسٹر کے گھر جانے پر پابندی لگادی۔ آپ یقین کریں میں نے میرے چارہ گر کی قسطیں موبائل کی اسکرین کی روشنی میں پڑھی ہیں۔ اب گرمیوں میں کیا ہوگا۔

مہینے میں ایک بار میرا شوہر مرکز جاتا ہے شب جمعہ کو تو اس رات میں دونوں رسالے پڑھتی ہوں۔ میرا شوہر کہتا ہے ان کو پڑھنے سے گناہ ہوتا ہے میرا جنون ہیں شعاع اور خواتین اور میرے شوہر کی ضد۔ سارے گھر کے کام کرتی ہوں ساری ذمہ داریاں پوری کرتی ہوں۔ پانچ بچوں کو سنبھالتی ہوں۔ سارے بچے اسکول جاتے ہیں سب کچھ کرنے کے باوجود میرا جنون مجھ سے چھیننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آپ سب مجھے کوئی حل بتائیں' میں تو تھک گئی ہوں۔ اٹھارہ سال کے اس سفر میں.... رسالے تو مجھ سے نہیں چھوڑے جاتے۔ اب آپ بتائیں کہاں جاؤں میں؟

ج۔ پیاری طاہرہ! آپ کا خط پڑھ کر بہت دکھ اور تکلیف ہوئی ہے۔ اٹھارہ سال آپ اس شخص کے ساتھ گزار چکی ہیں جسے آج بھی آپ کا کوئی شوق گوارا ہے نہ کسی خوشی کا خیال ہے۔ ایسے بے حس شخص کے لیے کیا کہیں۔ امید کی صرف ایک کرن ہے۔ آپ کے بچے۔ ان کی تربیت اس طرح کریں کہ وہ اپنے دوسروں کے جذبات' احساسات کا احترام کرنا سیکھیں۔ انہیں اپنے جیسا انسان سمجھیں۔ شوہر میں تو اب کیا تبدیلی آسکتی ہے' لیکن اگر بچے آپ سے محبت کریں گے۔ آپ کا خیال کریں گے تو یقینی طور پر آپ کے شوہر کو کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوگی۔ قارئین میں سے کسی کے ذہن میں کوئی حل ہو تو بتائیں۔

ہمارے ہاں خواتین کے حقوق کے بارے میں نعرے لگائے جاتے ہیں' اسمبلی میں بل پاس ہوتے ہیں' این جی اوز کروڑوں روپے کی بیرونی امداد حاصل کرتی ہیں' لیکن حقیقت یہ ہے تبدیلی کہیں نہیں ہے۔ تبدیلی صرف تعلیم سے آسکتی ہے جب تک صحیح تعلیم اور شعور نہیں آئے گا ظلم و زیادتی کا یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔

حفصہ اقبال نے اوکاڑہ سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں۔

آخر کار نمرہ احمد نے خط لکھوا دیا۔ سب سے پہلے تو آپ کا اور نمرہ کا بے حد شکریہ کہ انہوں نے اتنا شاندار ناول ہمیں دیا۔ الحمد للہ میں خود بھی پردہ کرتی ہوں اور میرا دل چاہتا ہے کہ ہر مسلمان آبگینہ حیا کی چادر میں ہی لپٹا ہو۔ پہلی قسط سے لے کر آخر تک نمرہ کی ناول پر مکمل گرفت رہی۔ سورہ احزاب کی انتہائی خوب صورت تفسیر اور خدیجہ گل' غرض جنجر بریڈ ہاؤس کے ایک بار ٹوٹنے سے دوبارہ ٹوٹنے تک کا ہر ہر مرحلہ بھرپور اور ہر ہر جملہ خاص تھا۔

مما جان سے لے کر چھوٹے بھائی تک سب ہی شعاع باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔ سب کو ناول بہت پسند آیا۔ رب سوہنا آپ کو اور نمرہ کو اس بہترین کاوش پر اجر خیر عطا فرمائے۔ پلیز وعدہ کریں کہ آپ نمرہ احمد تک یہ تعریف و تحسین ضرور پہنچائیں گی۔

ج۔ پیاری حفصہ! ہم آپ کی تعریف و تحسین نمرہ احمد تک پہنچا رہے ہیں۔ لیکن صرف ایک تحریر پر تبصرہ....؟ آئندہ شعاع کی دیگر تحریروں کے بارے میں بھی لکھیے گا۔

جھنگ صدر سے ماہا احمد نے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں۔

مئی 2012ء کا شمارہ اپنی مثال آپ تھا۔ شعاع کی کہانیاں سب ہی سبق آموز ہوتی ہیں اور بہت اچھی بھی۔ پر "جنت کے پتے" واہ نمرہ آپی آپ نے تو کمال کا ناول لکھا ہے۔ نئی لک' نیا موڑ اور اور سب کچھ اور کالے موتی کی کتنی اچھی وضاحت کی۔ جیو نمرہ آپی اور مکمل ناول میں "نان بائی کی بیٹی" عنیزہ سید آپ کا ناول سپر ہٹ تھا روزینا بیکری 1971 کی باقرخانیاں۔ زینا کے نرم موٹے ہاتھ کی خوشبو میرے دماغ میں بس گئی۔ اتنا ظلم ایک عورت ایک عورت کی دشمن اور اک بات کہنا چاہوں گی میں نے اپنی زندگی میں تین لڑکیاں دیکھیں انہوں نے ایسے ہی کیا جیسے روزینا بیکری کی زینا کے ساتھ ہما نے کیا اور ان تینوں کے نام بھی ہما تھے' اب میں اپنی زندگی میں کبھی شاید کسی پر اعتبار نہ کر سکوں۔ سلسلہ وار ناول میں "ایک تھی مثال" مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا بس عاصمہ والا کردار کچھ کچھ اچھا لگتا ہے۔ آپی پلیز شعاع میں اک نئی کہانی لازمی شائع کرنا۔

ج۔ ماہا! یہ محض اتفاق ہے کہ آپ کو زندگی میں تین لڑکیوں نے دھوکا دیا اور ان کے نام ہما تھے۔ نام سے کچھ نہیں ہوتا۔ ایک جیسے نام والے بے شمار لوگ ہوتے ہیں اور وہ سب ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔

نمرہ احمد اور عنیزہ سید تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

سرگودھا سے سارہ نثیل لکھتی ہیں۔

شعاع سے رشتہ بہت پرانا ہے' جب سے ہوش سنبھالا ہے شعاع پڑھتے پایا۔ پہلے امی جی اور میری بڑی بہن حافظہ عمارہ پڑھتی تھیں دو سال پہلے شادی ہوئی۔ میرے ہزبینڈ (نثیل سرور) بھی شعاع کے دیوانے ہیں۔ خط لکھنے کی وجہ نمرہ احمد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اتنی صلاحیت دی کہ وہ دوسروں کی اصلاح کر سکیں۔ کہانی کا اینڈ بہت اچھا تھا۔

عالیہ بخاری کا "دیوار شب" بہت اچھا ہے۔
افسانے تینوں اچھے تھے۔
صائمہ اکرم کے ناولٹ میں شائلہ نے رامس کو دیکھا ہے شاید جسے وہ سکندر شاہ سمجھتی ہے۔ ماریہ زاہد سے ملاقات، پیارے نبی کی باتیں، باتوں سے خوشبو آئے، تاریخ کے جھروکوں سے، بہت اچھے تھے۔

ج۔ پیاری سارہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

حرمت روا اکرم نے ڈلوال سے لکھا ہے۔

نمرہ احمد کا بہت بہت بہت زیادہ شکریہ! جنھوں نے ہمیں ہمارے مسلمان ہونے پر فخر دلایا جنھوں نے زندگی کے ان موضوعات پر لکھا جن پر ہم کبھی سوچتے ہی نہیں۔
کس طرح شکریہ ادا کروں میں اس چھوٹی سی لڑکی کا! جس نے انتہائی کم عمری میں وہ کچھ پالیا، اسے وہ کچھ عطا کردیا گیا جس کو پانے کے لیے لوگ صدیوں ریاضت کرتے ہیں۔
عنیزہ سید کا ناول "نان بائی کی بیٹی" پڑھ کر میں کافی دیر تک کچھ بول ہی نہ سکی۔ ناول پڑھ کر گمان تو یہ ہی گزرا کہ کوئی انگلش ناول پڑھ رہے ہیں۔ مگر پھر پتا چلا کہ نہ جی یہ تو ہمارے پیارے پاکستان کی ہی اسٹوری ہے۔ سائرہ رضا کے ناول "فرمانبردار" میں شہزاد کی اپنی والدہ سے محبت واقعی اس قابل تھی کہ اسے کہانی کی صورت میں تراشا جائے۔ مگر محبت چاہے جس رنگ میں ہو جنونی نہیں ہونی چاہیے۔ بہت بہت اچھا ناول تھا۔ اگر کسی کو یاد ہو تو ہماری اک رائٹر تھیں جناب نبیہہ نقوی جی!۔ سائرہ جی کے انداز تحریر میں ان ہی کے جیسا اک سادہ انداز اور آسان لفظوں میں اپنی بات پہنچانے کا ڈھنگ جھلکتا ہے" آپ کو نہیں لگتا ایسا؟
نبیلہ عزیز، نایاب جیلانی، ام مریم، مریم عزیز اور فائزہ افتخار کو بھی ڈھونڈ ہی لائیں پلیز...!!!

ج۔ پیاری حرمت! نمرہ احمد واقعی بہت اچھا لکھتی ہیں اور انہوں نے اب تک جن موضوعات پر لکھا ہے" ان پر اس سے پہلے نہیں لکھا گیا اور بلاشبہ ان کا لکھنے کا انداز بھی بہت خوب صورت اور سحر انگیز ہے" سائرہ رضا کی نبیہہ نقوی سے کوئی مماثلت یا مشابہت ہمیں تو ہرگز ایسا نہیں لگتا۔ سائرہ رضا کی تحریریں نبیہہ نقوی کی تحریر سے یکسر مختلف ہیں۔ نہ صرف زبان و بیان، بلکہ ان کے موضوعات بھی بہت منفرد ہیں وہ حقیقت سے قریب موضوعات کا انتخاب کرتی ہیں اور بہت گہرائی میں جا کر لکھتی ہیں۔

سلمٰی فیصل نے فتح جنگ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں۔

مئی کا فریش سا ٹائٹل بہت اچھا لگا اس دفعہ خط لکھنے کی وجہ صرف اور صرف "نمرہ احمد" ہیں۔ نمرہ جی آپ نے ترکی کی اتنی اچھی سیر کروائی کہ ہم اگر خود بھی جاتے تو اتنی جگہیں کبھی نہ دیکھ پاتے۔ حیا اور جہان دونوں کا کردار بہت اسٹرونگ تھا، میں فوزیہ سلطانہ کی رائے سے اتفاق کرتی ہوں کہ جہان سکندر کے کردار میں نمرہ خود ہی ہیں کیونکہ ساری معلومات اور پلاننگ تو نمرہ آپ ہی کی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کن الفاظ میں تعریف کروں۔
عالیہ بخاری کی "دیوار شب" ایک اچھی تحریر ہے۔ جس نے دھیرے دھیرے چار سال گزار دیے اور پتا بھی نہیں چلا۔ عنیزہ سید کا مکمل ناول "نان بائی کی بیٹی" بھی بہترین تھا بس اینڈ میں کچھ تشنگی سی رہی۔
افسانوں میں "پیر دستگیر" اچھا لگا ہمارے عقائد اتنے کمزور ہیں کہ اللہ کی ذات پر بھروسا کرنے کے بجائے کوئی اور ذریعہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔

ج۔ پیاری سلمٰی! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ نمرہ احمد اور عالیہ بخاری تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔
امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

سعیدہ، سعدیہ، رابعہ بصری، فریدہ اور عدینہ ریلوے پھاٹک لالیاں سے تشریف لائی ہیں، لکھا ہے۔

"جنت کے پتے" ناول نے ہماری لمبی خاموشی کو توڑ دیا اور ہمیں اس ناول کی اور نمرہ احمد کی تعریف کرنے پر مجبور کردیا۔ اس کے علاوہ "دیوار شب" بھی بہت اچھی طرح اختتام کی جانب رواں دواں ہے۔ "ایک تھی مثال" اور "دیمک زدہ محبت" بھی اچھا جارہا ہے۔ اس کالم میں بھی ہمارے شہر لالیاں کا ذکر بھی نہیں ہوا۔ آپ ہمارے شہر کو کم نہ سمجھیں یہ ضلع چنیوٹ کی تحصیل ہے۔

ج۔ سعیدہ، سعدیہ، فریدہ، رابعہ اور عدینہ آپ سب

دوستوں کو شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ ہم آپ کے شہر ہی کو نہیں پاکستان کے کسی بھی شہر کو کم نہیں سمجھتے۔ پاکستان کا ہر شہر، ہر گاؤں کوئی نہ کوئی خصوصیت رکھتا ہے اور اپنی جگہ بہت اہم ہے جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے لالیاں سے پہلے بھی کچھ قارئین شرکت کرچکی ہیں۔ شاید آپ کی ماؤں اور دوستوں کی نظر سے نہیں گزرا۔ اب آپ انہیں اپنا خط دکھا دیجئے گا اور آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجئے گا۔

بھکر سے رخشانہ عزیز نے پوچھا ہے۔

آپ کے ڈائجسٹ کے تمام سلسلے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ تمام رائٹرز بھی کمال کا لکھتی ہیں۔ آج جس چیز نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا ہے وہ یہ ہے کہ مجھے لکھنے کا بہت شوق ہے اور میں نے ایک ناول لکھا بھی ہے۔ پلیز مجھے بتائیے کہ ناول لکھنے کے رولز کیا ہیں؟ کہانی کا عنوان اور اپنا نام کون سی سطر یہ کہاں لکھا جاتا ہے؟ اور ہم جو بھی افسانہ، ناولٹ یا ناول لکھتے ہیں تو کیا اس کا بھی نام لکھنا پڑتا ہے کہ یہ افسانہ ہے یا ناول اور کہاں پر لکھا جاتا ہے؟

ج۔ رخسانہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ لکھنے کا طریقہ اسی سلسلے میں ہم کئی بار بتا چکے ہیں۔ اب ایک بار اور بتائے دیتے ہیں۔
(1) صفحے کے ایک جانب سطر چھوڑ کر لکھیں۔
(2) اپنا نام، پتا اور فون نمبر پہلے صفحے پر لکھیں چاہیں تو آخری صفحہ پر بھی لکھ سکتی ہیں۔
(3) ناول، افسانہ یا ناولٹ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ فیصلہ ہم خود کرتے ہیں۔
اپنی تحریر بذریعہ ارجنٹ میل سروس بھجوائیں۔
ایڈریس یہ ہے۔
شعاع۔ 37 اردو بازار کراچی۔

افشاں حاجی جعفر لیاری کراچی سے لکھتی ہیں۔

"جنت کے پتے" کے لیے نمرہ احمد کو بہت بہت مبارک باد۔ افسانے بھی سارے اچھے تھے۔ سائرہ رضا، راحت جبیں، عمیرہ احمد، کنز نبوی، عالیہ بخاری سب رائٹر اچھا لکھتی ہیں۔ باجی دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میرے ابو کی مغفرت کرے، ابو کبھی بھی مجھے شعاع، کرن، خواتین پڑھنے سے منع نہیں کرتے تھے بلکہ وہ خود مجھے لا کر دیتے تھے۔

ج۔ افشاں! اللہ تعالیٰ سے آپ کے ابو کی مغفرت اور دائمی زندگی میں آرام و سکون کے لیے دعاگو ہیں۔ بیٹیوں کی محبت سے اچھی پرورش اور ان کی خوشی کا خیال رکھنے کا اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑا اجر اور مقام ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نواب شاہ سے شعونہ شیخ نے لکھا ہے۔

ٹائٹل موسم کے لحاظ سے پرفیکٹ لگا۔ میرے خط لکھنے کی وجہ سلسلہ "شعاع کے ساتھ" میں کرن شبیر کا تعارف ہے۔ میرا تعارف بھی مارچ 2010ء میں شائع ہوچکا ہے اور کرن جی نے آخر کے تین سوال میری نقل کرکے لکھ دیے ہیں۔ آپ سے درخواست کرنی تھی کہ اگر کسی اداکار کے انٹرویو کے بجائے آپ اگر اردو ادب کے کسی شاعر یا ادیب کا تعارف شائع کردیں تو یقیناً "سب کو بہت پسند آئے گا۔ اردو میں ایم اے کرنے کے بعد احساس ہوا کہ ہم تو اپنے ادب کو جانتے ہی نہ تھے اور آخر میں ایک بات پوچھنی ہے کہ "شگفتہ بھٹی کا ناول "مڑ کے آئے مول

نہ جائیں" کتابی شکل میں شائع ہوا ہے؟

ج۔ پیاری شعونہ! شگفتہ بھٹی کا ناول کتابی شکل میں شائع ہوچکا ہے آپ اس کا ناول کو منگوانے کے لیے 500 روپے کا منی آرڈر کردیں۔ ایڈریس یہ ہے۔ مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی۔ کرن شبیر نے آپ کے سوال نقل کرکے بھجوادیے یہ جان کر بہت افسوس ہوا۔ یہ سلسلہ ہم نے قارئین کے تعارف اور ان کی صلاحیتوں کو سامنے لانے کے لیے شروع کیا ہے' اس طرح نقل کرنے سے شرمندگی کے سوا کچھ حاصل نہیں۔

نیہا سیف اسلام آباد سے شریک محفل ہیں' لکھتی ہیں۔

میں شعاع تب سے پڑھ رہی ہوں جب سے "جنت کے پتے" شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ بیچ میں مجھے ٹائیفائڈ بھی ہوا اور دسویں کے بورڈ کے امتحان بھی ہوئے' مگر کچھ بھی مجھے شعاع سے دور نہ رکھ سکا' میں اسی مستقل مزاجی سے اسے لیتی اور پڑھتی رہی۔

"تان بائی کی بیٹی" میں مجھے "ڈینش گائے" پر بہت ترس آیا۔ اس کہانی کا نام "بے چاری" ہونا چاہیے تھا۔ "دیمک زدہ محبت" میں پلیز موحد کو ٹھیک کردیں۔ اس کی لاچارگی پر تو صائمہ اکرم صاحبہ کو خود ترس آنا چاہیے۔

"سبق" کافی سبق آموز کہانی تھی۔ "اندھی سوچ" آج کل کے معاشرے کی صحیح عکاسی کرتی تھی۔

ج۔ پیاری نیہا! اللہ تعالیٰ آپ کو امتحان میں کامیابی عطا فرمائے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

گجرات سے ثوبین یعقوب لکھتی ہیں۔

سرورق پر فرینہ کا ڈریس اور ڈریس کلر اچھا لگا اگر لپ اسٹک لائٹ پنک کلر کی ہوتی تو سب فریش لگتا۔ نمرو آپی! آپ کیا چیز ہیں' ہمیں تو آپ سے پیار ہوگیا ہے۔ یہ آپ روبرو میں آئیں۔ پلیز نمرہ اس ناول کو کبھی ڈرامے کی شکل میں ٹی وی پر نہ آنے دینا۔ اس کے بعد "دیمک زدہ محبت" دیوار چین کی طرح لمبا ہوگا۔ "ایک تھی مثال" کے صفحات بڑھائیں۔ پلک جھپکتے ہی ختم ہوگیا۔ بنت حوا کا ٹاپک پرانا تھا۔ فرمانبردار اس ماہ کی نمبرون تحریر۔ سائرہ رضا جی آپ کے ہاتھ کہاں ہیں؟ تان بائی کی بیٹی بھی اچھی لگی۔ "پیر دستگیر" میں آج کے دور میں ہونے والے فعل کی منظر کشی کی گئی ہے۔ کچے عقیدے والی بالکل نامرہ کی طرح ہوتی ہیں۔ "سبق" کا اینڈ بھی بہت اچھا ہوا۔

ج۔ پیاری ثوبین! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ نمرہ احمد کو مختلف ٹی وی چینلز اور پروڈکشن ہاؤسز کی جانب سے مسلسل آفرز آرہی ہیں' لیکن انہوں نے ابھی تک کسی بھی ناول کی ڈرامائی تشکیل کے لیے رضامندی ظاہر نہیں کی ہے۔ دیگر متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

شائمہ' سمیعہ اور شازیہ نے گاؤں عازی پور ضلع رحیم یار خان سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں۔

دس سال پرانے اس تعلق کو سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کیا نام دوں' بس عجیب سی وابستگی ہے شعاع سے' جو شاید کبھی ختم نہ ہوپائے۔ فرحت اشتیاق' نمرہ احمد اور رخسانہ نگار کی دلوں کو چھو لینے والی تحریریں ہمیں ان سے ملنے کو بے چین کردیتی ہیں۔ خط لکھنے کی اہم وجہ یہ ہے کہ آپ سے درخواست کرسکیں! ہوسکے تو پرانے تمام لکھنے والوں سے ہماری طرف سے پرزور درخواست کریں' ہمیں پہلے کی طرح معیاری اور خوب صورت تحریریں پڑھنے کو ملیں۔

ج۔ شائمہ' سمیعہ اور شازیہ! شعاع سے وابستگی کے لیے دلی شکریہ۔ یہ آپ قارئین کی محبت ہے کہ شعاع اتنی تیزی سے ترقی کی منازل طے کررہا ہے۔ شعاع میں جہاں نئی مصنفین کی تحریریں جگہ پاتی ہیں' وہاں پرانی مصنفین کی تحریریں بھی شامل ہوتی ہیں۔ ہم آپ کا پیغام ان سطور کے ذریعے تمام مصنفین تک پہنچارہے ہیں۔

پاکیزہ' دعا' کنزہ' مصباح' سمیعہ' نورین' فضا۔ تحصیل صادق آباد' ضلع رحیم یار خان سے تشریف لائی ہیں لکھا ہے۔

ہمیشہ کی طرح شمارہ زبردست اچھا تھا۔ افسانے اچھے تھے۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں یہ سلسلہ مجھے بہت پسند ہے۔ شاعری بھی اچھی تھی' ٹائٹل بھی زبردست تھا۔ "تان بائی کی بیٹی" بہت منفرد تحریر لگی' لیکن اس کا اختتام اچھا نہیں ہوا۔ "جنت کے پتے" اتنا اچھا لگا کہ پڑھ کے بھی ایسا لگا کہ ابھی ہم نے پڑھا ہی نہیں۔ نمرہ احمد اتنی ساری نالج اور اتنی چھوٹی عمر میں حیرت کی بات ہے۔ F.M-105 صادق آباد کے آر جے دعا' فضا' خرم طفیل ان میں سے کسی ایک کا انٹرویو لیں۔ خوب صورت بننے میں حدو منہ بالوں کے بارے میں لکھیے گا۔

ج۔ آپ سب کی شرکت کے لیے شکریہ۔ ہمیں افسوس ہے کہ تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر آپ کا پچھلا خط شامل نہ ہوسکا۔ آپ کی فرمائشیں ضرور پوری کریں گے' ان شاء اللہ۔ آر جے کے انٹرویو کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچائی جارہی ہے۔

لاہور سے زوباریہ خالد لکھتی ہیں

نمرہ احمد نے بہت اچھا اختتام کیا۔ جہاں اس بات کی خوشی ہے کہ یہ ناول ختم ہوگیا۔ وہاں دکھ بھی کہ اگلے شعاع میں "جنت کے پتے" نہیں ہوگا۔ پلیز نمرہ احمد کو روبرو میں لے کر آئیں۔ اس کے علاوہ اس بار رسالے کی جان تھا "تان بائی کی بیٹی" زینب وقار کے آخری خطوط میں اس کے دکھ کو بڑے اچھے طریقے سے بیان کیا گیا۔ "دیمک زدہ محبت" کی ہر قسط میں نئے کردار آرہے ہیں۔ لگتا ہے کہ یہ ناولٹ کافی لمبا چلے گا۔ افسانے بس ٹھیک تھے۔ کوئی مزاحیہ تحریر بھی نہیں تھی اس بار؟ شعاع کے ساتھ ساتھ کے صفحات بڑھایئے۔

ج۔ پیاری زوباریہ! ہماری تقریباً تمام قارئین نے اس بات پر دکھ کا اظہار کیا ہے کہ نمرہ احمد کا ناول ختم ہوگیا۔

آپ کو ایک خوش خبری سنادیں۔ نمرہ احمد جلد ہی اگلا ناول لکھیں گی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ شعاع کے ساتھ ساتھ کے صفحات بڑھانے کی فرمائش نوٹ کرلی ہے۔

نور الصباح کراچی سے شریک محفل ہیں

اس ماہ کا شعاع بھی ہر ماہ کی طرح خوب تھا۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ السلام کی پیاری باتوں سے بڑھ کر بہترین تو کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ عنیزہ سید کو کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ اس میں کہانی کے ساتھ ساتھ حالات و واقعات بھی بہترین لگے۔ عالیہ بخاری کا "دیوار شب" ایک بہت طویل ناول ہے۔ جو ہلکے ہلکے اپنا گہرا اثر چھوڑ جاتا ہے۔ اس کا اختتام بھی یادگار انداز میں کریں۔ سلوی علی بٹ نے سبق پرانے موضوع پہ لکھا۔ سعدیہ رئیس نے "پیر دستگیر" میں صحیح لکھا کہ لوگوں نے ایک اللہ کو چھوڑ کر اپنے کئی خدا بنالیے ہیں۔ بنت حوا کا اندھی سوچ کہانی سے زیادہ کسی اخبار کا ایڈیٹوریل لگا۔ "دیمک زدہ محبت" صائمہ اکرام کی اچھی کاوش ہے۔ سائرہ رضا نے "فرماں بردار" میں حساس موضوع پہ خوب لکھا ہے۔ اکثر بیٹے ماں بہنوں اور بیوی کے رشتے میں توازن نہیں رکھ پاتے۔ رخسانہ یوں تو اچھا لکھتی ہیں۔ مگر ان کا "ایک تھی مثال" کافی ٹریجک ہے اور آگے بھی اس کا موڈ بدلتا نہیں دکھ رہا۔ اس ماہ کی مسکراہٹیں آدھی نئی تو آدھی پرانی کے ساتھ مزا دے گئیں۔ باتوں سے خوشبو آئے۔ ہر ماہ کی طرح زبردست۔ آئینہ خانہ بھی دلچسپی لیے ہوتا ہے۔ تاریخ کے جھروکے پڑھ کے احساس ہوتا ہے کہ گزرتا وقت تاریخ کے سینے پہ کیا کچھ چھوڑ جاتا ہے۔ موسم کے پکوان اور خوب صورت بنیے کو پڑھ کے ہم ہمیشہ اپنے آپ کو حسین و سگھڑ محسوس کرتے ہیں۔

ج۔ نور الصباح! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

☼

عالیہ بخاری

دیوارِ شب

خیام کا تعلق اس دنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خالہ اور دل دار نانی نے اس کی پرورش بے حد ناز و نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیدہ خاطر ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو بتائے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے جس سے اس کی شناسائی ہے، جو ریڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اٹھا لاتا ہے، جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار، لاری اڈے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا رویہ حیران کن ہے۔ شہر آکر اسے کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بابو شوکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ گیتی آرا کی چوڑیاں دیکھ کر خیام کو شدید جھٹکا لگتا ہے اور پہلی مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھروسا ٹوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔

ربیعہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے کے ایمان دار ہیڈ کلرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل ابا کا پرتو رفاحی کاموں میں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں اور دادی ہر دم معاذ اور ربیعہ کے لیے دعا گو ہیں۔

—۶۲—

باسٹھویں قسط

گھر کی داخلی سیڑھیوں پر وہ کب سے منتظر تھے۔

خیام کی گاڑی کو اندر آتا دیکھ کر وہ بڑی بے تابی سے آگے بڑھے اور پھر گاڑی سے باہر رکھتے اس کے پہلے قدم پر انہوں نے دل کی گہرائی سے بسم اللہ پڑھی تھی۔

"السلام علیکم!"

خیام کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کر کے انہوں نے اسے گلے لگایا۔

ویسی ہی گرم جوشی اور اپنائیت' جب وہ ان سے پہلی بار متعارف ہوا تھا۔

مگر شاید اس سے بھی کچھ زیادہ۔

ان کی آنکھوں سے گرتے آنسوؤں کو دیکھ کر اس نے اپنا تجزیہ درست کیا۔

"شاید ہمیں کچھ دیر ہو گئی۔" ابا مسکراتے ہوئے معذرت چاہ رہے تھے۔

"ارے نہیں' بالکل بھی نہیں۔ آیئے تشریف لایئے!"

کمال صاحب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ محاورتاً "نہیں حقیقتاً" ان کے قدموں میں پلکیں بچھاتے۔

"میری بڑی خوش نصیبی ہے اسلام صاحب کہ آپ میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ میرا رواں رواں آپ کا احسان مند...." الفاظ ان کے حلق میں اٹکنے لگے تھے۔

ابا نے نرمی سے ان کا کندھا تھپتھپا کر انہیں پر سکون کرنا چاہا۔

وہ لوگ گھر کے رہائشی حصے میں داخل ہو چکے تھے۔ ایک ایک انچ سے یوسف کمال کے اس "غریب خانے" کی شان و شوکت پوری طرح ظاہر تھی۔ پر ابا اور خیام دونوں ہی یکساں بے نیازی کے ساتھ گزرے تھے۔

"میں بس ایک منٹ میں حاضر ہوا!" کمال صاحب ان لوگوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر باہر نکلے تھے۔ بے تحاشا دھڑکتے ہوئے دل اور آنکھوں میں آتے آنسوؤں کو کنٹرول کرنا مشکل تر ہو رہا تھا کن کن زخموں پر سے کھرنڈ اترا تھا۔

جس گھڑی کا ساری عمر انتظار کیا تھا' اس کا سامنا کرنا ان کے لیے آسان ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ اپنے حوصلے اور ضبط کو زندگی میں دوسری بار انہوں نے کھوتا ہوا محسوس کیا تھا۔

اور یہ دونوں مواقع درد کے ایک ہی سلسلے' ایک ہی نام سے جڑے تھے۔

"فیروزہ!"

دل پر آج بھی اس کا اختیار تھا۔ جس کی عدالت میں کھڑے برسوں برس گزرے تھے۔

نہ ہی عدالت برخاست ہوتی تھی اور نہ ہی سزا معاف ہوتی تھی۔

اندر خیام نے ایک مسکراتی ہوئی نگاہ اس وسیع و عریض ڈرائنگ روم پر ڈالی۔

"ابا! لگتا ہے ان کمال صاحب نے پیسہ تو بہت بنا کر رکھا ہے۔ کہیں کوئی دو نمبر والے سلسلے تو نہیں ہیں ان کے؟"

"اوں ہوں۔" انہوں نے بے اختیار پہلو بدلا۔ "بے کار میں کسی سے بدگمانی رکھنا بھی گناہ ہے۔ بہت اچھے انسان ہیں کمال صاحب' کتنے فلاحی اداروں کی سرپرستی کرتے ہیں شہر میں۔" خیام نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا تھا۔

پچھلے سارے دنوں میں' دانستہ نادانستہ ابا نے جتنی تعریفیں کمال صاحب کی تھیں۔ ان میں یہ بات بھی کئی بار دہرائی جا چکی تھی۔

"شاید وہ انہیں بلانے گئے ہیں؟"

"کس کو؟" اسلام صاحب نے ذرا چونک کر خیام کو دیکھا۔

"ہمارے والد محترم کو۔ ان سے ہی تو ملنے آئے ہیں ہم!" خیام پر سکون تھا۔ مگر انہوں نے ایک بار پھر یاد دہانی ضروری سمجھی۔

"خیام بیٹا' کچھ ایسا مت کرنا' کچھ ایسا نہ کہنا' جس سے انہیں تکلیف ہو.... بہت دکھ سہہ لیا ہے اس شخص نے' اب بس!"

"میں نے انہیں معاف کر دیا ہے ابا!" اس کی مسکراہٹ دھیمی ہوئی تھی۔ "لیکن میں سچ کہہ رہا ہوں کہ ان کے حوالے سے مجھے کوئی فیلنگز نہیں رہیں اب' نہ محبت کی' نہ نفرت کی۔ وہ جیسے بھی ہیں' بس ٹھیک ہیں۔ اس کے آگے میں کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتا اور۔" اس نے یوسف کمال کو آتے دیکھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑی تھی۔

وہ تنہا واپس آئے تھے۔ خیام کو تھوڑی سی حیرت ہوئی تھی' ان کی آنکھوں پر رگڑ کر خشک کیے جانے کے آثار باقی تھے۔ خیام کو وہ کچھ بیمار سے لگے۔

"بہرحال مجھے کیا....؟" بے نیازی سے سر کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے اس نے ان کی اور ابا کی باتوں پر دھیان لگانا چاہا۔

"ناشتا لگ رہا ہے اسلام صاحب! اچھا ہو گا کہ پہلے ناشتا کر لیا جائے۔"

"ارے نہیں' آپ بالکل کسی تکلیف میں نہ پڑیں۔ ہم دونوں گھر سے ناشتا کر کے چلے ہیں... اب تو گنجائش بھی نہیں ہے۔" ابا نے انہیں فوراً" ہی منع کیا تھا۔

وہ جواباً" اصرار کرنے لگے "میری خوشی کی خاطر تھوڑا سا ہی سہی۔ منع مت کریں اسلام صاحب...."

ان کا سر' ابا کے سامنے جھکا جا رہا تھا ان کے چہرے' ان کے لہجے میں بڑی ٹوٹی سی کیفیت تھی۔ جو ان کے اس لش پش' عالی شان پس منظر سے کے ساتھ بڑا عجیب سا تضاد پیش کر رہی تھی۔

اتنی دیر میں پہلی بار خیام نے محسوس کیا کہ وہ اس سے نگاہ چرائے ہوئے ہیں اور ایک بار بھی انہوں نے اسے براہ راست مخاطب نہیں کیا ہے۔

"شاید اس لیے کہ...."

اس بار اسے جواب ڈھونڈنے کی بھی مہلت نہیں ملی۔

"میں اب وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا کمال صاحب.... قدرت نے جو ایک بھاری ذمہ داری میرے ناتواں کندھوں پر ڈالی تھی۔ اسے پورا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔" ابا کی آواز میں گہرا سکون تھا۔

چند لمحوں کی بھید بھری خاموشی ماحول پر طاری ہوئی تھی۔

خیام نے خالی خالی نگاہوں سے ابا اور کمال صاحب کی طرف دیکھا۔

ابا اسے اٹھنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ سو وہ کسی روبوٹ کی مانند اٹھ کھڑا ہوا۔ ذہن یکدم ہی کچھ سوچنے سمجھنے سے قاصر ہوا تھا۔ ابا اس کے ساتھ ہی اٹھے تھے اور خیام نے اپنے ہاتھ پر ان کا دباؤ محسوس کیا تھا۔

کمال صاحب بالکل قریب کھڑے تھے اور ان کا نچلا ہونٹ دانتوں تلے سختی سے دبا تھا۔

"آپ کی امانت' آپ کا بیٹا.... خیام!" ابا نے اس کا ہاتھ کمال صاحب کی طرف بڑھایا۔

خیام نے بے یقینی سے کمال صاحب کے کھلے ہوئے بازوؤں کی طرف دیکھا۔

مگر دوسرے ہی پل وہ خود بڑھ کر اسے گلے لگا چکے تھے۔ اس کے گرد ان کے بازوؤں کا گھیرا سخت تھا اور ان کا سارا ضبط' آنسوؤں میں بہا جا رہا تھا۔

خیام نے خود کو ناقابل بیان سی کیفیت میں پایا تھا۔

ایک مکمل اجنبی' زندگی کی پہچان ثابت ہوا تھا۔

وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں ان کے کندھے سے لگا کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ ہوش سنبھالنے سے لے کر آج تک کا پورا سفر ایک چھوٹے سے پل میں اس کے دل پر سے ہو کر گزرا۔

جلتے انگاروں پر ننگے پیر کیے جانے والا سفر!

جس میں صرف اس کا وجود ہی نہیں' دل اور جاں بھی خاکستر ہوئی تھی۔

"وہ انہیں دھکا دے کر بھاگتا ہوا اس گھر سے نکل جائے اور پھر کبھی مڑ کر اس طرف نہ دیکھے!" اس کے دل نے شدت سے آرزو کی تھی.....

مگر تب ہی اس نے ان کی آنسوؤں سے بھیگی' گھٹی گھٹی سی آواز سنی۔

"مجھے معاف کر دو میرے بچے! جانتا ہوں کہ ناقابل معافی ہوں' مگر پھر بھی..... وہ بمشکل ہی بول پا رہے تھے۔

"تمہارے ہر دکھ' ہر تکلیف کا ذمہ دار یہ تمہارا بدنصیب باپ ہے۔ بیٹا! جو تم سے آنکھ ملانے کے بھی قابل نہیں رہا..... کوئی حق نہیں تم پر میرا..... پھر بھی اگر معاف کر سکو..... میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔"

ان کے کانپتے ہوئے ہاتھ اس کے سامنے جڑنے لگے تھے۔ تب ہی خیام نے بے ساختہ ان کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھا۔

اسے پتا بھی نہیں چلا تھا کہ کب اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہوا تھا۔

"نہیں بابا..... پلیز ایسے نہیں۔" اس بار وہ پورے دل سے ان کے گلے لگا تھا۔

ساری کڑواہٹ' سارا غصہ' سارا گلہ..... کہیں دور گم ہوا تھا۔

اپنی پہچان کا بھرپور احساس اور پاؤں تلے ٹھہرتی زمین۔

ایک ٹھنڈا' میٹھا' گھنا سایہ.....

ابا نے سکون بھرا گہرا سانس لیا اور پوری عاجزی کے ساتھ رب کا شکر ادا کیا۔

خود ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

☼ ☼ ☼

جویا کو آئی سی یو سے روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ لیکن محض چند لوگوں کو مختصر ملاقات کی اجازت ملی تھی۔

یہ احتیاط' ڈاکٹرز کے ساتھ ساتھ معاذ کی بھی تجویز کردہ تھی۔ اپنی اور ابا کی جان پہچان اور تعلقات کو اس نے یہاں تھوڑا سا استعمال کر ہی لیا تھا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ آپا گل اور فریدالدین کی جھلک بھی جویا کو دکھائی دے۔

لیکن بات صرف ان دو تک ہی محدود کب تھی۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے شاکرہ امی اور اظہار صاحب اسے دیکھنے آئے تھے۔

زویا اسے ان کی آمد کے بارے میں بتا چکی تھی۔

اس سارے عرصے میں جب بھی وہ لوگ آئے' ایک آدھ بار کے علاوہ اس نے ہمیشہ پوری کوشش رکھی کہ اس سے ان کا سامنا نہ ہو۔ خاص طور پر اظہار صاحب سے۔

سو اس وقت بھی وہ ان سے خاصا دور ایک بینچ پر تنہا بیٹھا تھا۔

مشکل ترین گھڑیاں کٹ ہی گئی تھیں۔

"اب کم از کم وہ اس سب سے برے امکان کے خوف سے تو نکل ہی آیا ہے!"

معاذ نے بینچ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے خود کو باور کرایا لیکن آگے کا منظرنامہ ابھی تک دھندلایا ہوا تھا۔

یہاں سے نکلنے کے بعد جویا کو ان ہی سب میں واپس جانا تھا اور اسے اس بدترین حالت میں پہنچا دینے کے بعد بھی کیا تبدیلی آنے والی تھی بھلا!

اس طرف بھی اور اس طرف بھی۔

اس نے اضطراب سے پہلو بدلا۔

دور سامنے گیٹ سے گاڑیاں اور لوگ متواتر اندر آ رہے تھے۔ اتنے دنوں میں' کتنی ہی بار اس کی امید بھری نگاہ لوگوں کے ہجوم پر جمتی تھی۔

مگر ہر بار ایک سی مایوسی۔

امی نے ایک بار بھی جویا کو دیکھنے آنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ وہ اس سے اتنی متنفر تھیں کہ موت اور زندگی کی اس کشمکش کے بیچ بھی اسے معاف نہ کر سکیں۔

ابا' دادی' ربیعہ' خیام کوئی بھی تو انہیں یہاں آنے پر مجبور نہیں کر سکا۔

شاکرہ اور اظہار کی بیٹی کے لیے ان کے پاس نہ کوئی رعایت ہے اور نہ ہوگی' چاہے وہ زندہ سلامت رہے اور چاہے....." معاذ نے بے اختیار ہی سر جھٹک کر کسی برے خیال کو ٹالا۔

نفرت' انا' خود غرضی' بے حسی۔

دونوں اطراف یہ سب ہی کچھ' آج بھی پہلے سے کہیں زیادہ کہیں طاقت ور!

"کاش! وہ جویا کو لے کر چپکے سے کہیں دور نکل جائے..... جہاں کوئی بھی اس تک نہ پہنچ سکے۔"

اپنی فطرت کے بالکل برخلاف' ان دنوں کتنی ہی بار اسے یہ خیال آیا تھا۔

"ہا آ!" ایک تھکی تھکی سی سانس لیتے ہوئے اس نے مڑ کر ہاسپٹل کے اس بلاک کی طرف دیکھا' جہاں جویا تھی۔ اتنی دور سے بھی اس نے اظہار چچا کو اندر سے واپس آتے دیکھا۔

شاید انہیں اندر نہیں جانے دیا گیا یا گیا.....؟

معاذ کو الجھن سی محسوس ہوئی تھی۔

آپا گل اور فریدالدین کی بات قطعی دوسری تھی۔ لیکن اظہار چچا کے سامنے وہ اس طرح نہیں کھڑا ہو سکتا تھا۔

اس وقت بھی جب وہ پورے خاندان میں اس کی اور اس کے پورے گھر کی حقارت آمیز ہنسی اڑاتے تھے۔

او جب انہوں نے ربیعہ کو رد کر کے زوبیہ کا انتخاب کیا اور نہ جب ہی جب اس کی اور جویا کی زندگیوں میں دم گھونٹتے اندھیرے کے علاوہ کچھ بھی باقی نہ رہا۔

اور آج' آج بھی نہیں۔

"اب پتا نہیں کیا ہوا تھا؟"

اس نے مضطرب نگاہوں سے ایک بار پھر اس طرف دیکھا۔ جہاں زویا اور اظہار چچا اب بھی کھڑے تھے۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا ابو!" زویا نے ان کے پسینے میں بھیگے ہوئے چہرے کو فکرمندی سے دیکھا تھا۔

"ہاں..... ٹھیک ہوں۔ شاید گرمی زیادہ ہے۔"

پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے خود کنٹرول کرنا چاہا مگر ان کے چہرے کا پھیکا پڑتا رنگ بہت نمایاں ہو رہا تھا۔

زویا کو ان کی بات پر تھوڑی سی حیرت ہوئی تھی۔ اس سینٹرلی ایئر کنڈیشنڈ ہاسپٹل میں انہیں گرمی کی شکایت کیوں ہوئی تھی..... اور جب کہ باہر بھی موسم ٹھیک ہی تھا۔

"بس کچھ دیر کھلی ہوا میں بیٹھوں گا۔ تم اندر چلی جاؤ اپنی ماں کے پاس!" سیڑھیوں سے اتر کر وہ ایک قریبی بینچ پر آکر بیٹھے' جہاں بڑا ٹھنڈا سا سایہ تھا۔

"جاؤ!" انہوں نے پھر زویا سے کہا۔

اس بار وہ خاموشی سے واپس مڑ گئی۔

انہیں اب بھی خود کو سنبھالنے میں دقت کا سامنا تھا۔ بڑی مشکل سے جو آنسو زویا کی وجہ سے ضبط کیے تھے۔ بہہ نکلنے کو بے تاب تھے۔

آج آپا گل کے بے حد اصرار پر وہ جویا کو دیکھنے آئے تھے' ورنہ در حقیقت وہ اس سے سامنا کرنے کی ہمت خود میں نہیں پارہے تھے۔

مگر آپا گل کے بقول ان کی اور فریدالدین کی معاذ کے ہاتھوں بے عزتی کا ازالہ اسی صورت ہو سکتا تھا جب جویا کے پاس "گھر کے افراد" کے علاوہ کسی کو بھی پھٹکنے نہ دیا جائے۔

"دو چار دن میں ٹھیک ہو کر گھر آجائے گی جویا۔ رہی کمزوری تو وہ جاتے جاتے ہی جائے گی۔ کچھ وقت لگتا ہے۔ لوگ بیمار پڑ ہی جاتے ہیں مگر یہاں تو ایک ڈراما بن کر رہ گئی ہے جویا کی بیماری... اور یہ سب ہماری کمزوری ہے جو وہ معاذ وہاں ٹھیکیدار بنا بیٹھا ہے جویا کا... اور کسی کی نہ سہی' فریدالدین کی ہی شرم کریں آپ لوگ۔"

ان کا سب سے بڑا ٹارگٹ۔ اب شاکرہ امی اور اظہار صاحب تھے۔ ایک وہ جو معاذ اور اسلام صاحب کو ہاسپٹل کا راستہ دکھانے کی ذمہ دار اور دوسرے...

وہ ان ہی ان گنت طعنوں سے بچنے کے لیے آج یہاں آئے تھے اور جویا سے سامنا کرنے کے مشکل ترین مرحلے سے بھی گزر ہی جاتے اگر' وہ انہیں دیکھتے ہی اتنی زیادہ خوف زدہ نہ ہو جاتی۔

محض چند منٹ پہلے وہ اپنی زندگی کے ایک اور بدترین تجربہ سے گزرے۔

جویا کی ویران آنکھوں میں ابھرتا ہوا سہم' اور وہ کھنچاؤ۔ اس کی دونوں مٹھیاں سختی سے بند ہوئی تھیں۔

حالانکہ وہ تو اسے دیکھ کر مسکرائے بھی تھے۔

لیکن ان ویران خوف زدہ نگاہوں کے سامنے بس چند سیکنڈ ہی ٹک پائے۔

اپنے بھیگے ہوئے دامن کے ساتھ وہ کتنی ہی دیر وہاں بیٹھے رہے نفرتوں کے اس کھیل میں وہ اپنی بیٹی کو کھو چکے تھے۔

جویا کو کھو چکے تھے۔

وہ سر جھکائے اسی ایک نشست میں بیٹھے تھے۔ پتا نہیں کب شاکرہ امی ان کے قریب آئی تھیں۔

"چلیں!"

"ہوں!" انہوں نے چونک کر سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

شاکرہ امی کے چہرے پر سکوت کا سا تاثر تھا اور آنکھیں خشک۔

شاید وہ حالات پر صبر کرتی جا رہی تھیں۔ یا پھر عادی ہوتی جا رہی تھیں۔

"کیسی ہے اب وہ؟" ان کے ساتھ چلتے ہوئے انہوں نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔

"ٹھیک ہے!"

"تمہیں وہ ٹھیک لگتی ہے شاکرہ!" ان کے لہجے میں گلہ سا تھا۔

"اب تک زندہ ہے تو ٹھیک ہی ہوئی نا!" وہ سامنے دیکھتے ہوئے چل رہی تھیں اور لہجے میں بڑی عجیب سی بے نیازی تھی۔

اظہار صاحب کو ان پر غصہ آنے لگا۔

"یہ کس طرح کی بات کر رہی ہو تم۔ ان شاء اللہ وہ بہت جلد ٹھیک ہو کر گھر آجائے گی۔ تم ماں ہو' دعا کرو' نہ کہ ایسی مایوسی کی باتیں۔"

وہ چلتے چلتے رکی تھیں۔

"کیا دعا کروں اظہار صاحب! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا' وہ ٹھیک ہو کر گھر آبھی گئی' تب بھی کون سا زندگی کی طرف پلٹ جائے گی' اس کی بدنصیبی اس کا ساتھ چھوڑنے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔"

ان کی نگاہوں میں حد سے زیادہ چبھن تھی۔

اظہار صاحب نے بے اختیار نگاہ چرائی۔

"اگر آپ کو اس پر رحم آہی گیا ہے' تو ابھی اسی وقت معاذ کو آواز دے لیں۔ وہ یہیں کہیں ہوگا۔" انہوں نے شاکرہ امی کی سرگوشی سی سنی۔

وہ ایسی ہی ایک کوشش کر رہی تھیں جیسے انہوں نے شائستہ بیگم کے آگے کی تھی۔

اظہار صاحب نے حلق میں اٹکتے آنسوؤں کو بمشکل اندر اتارا۔

"چلو دیر ہو رہی ہے۔" وہ بغیر ان کی طرف دیکھے آگے بڑھتے چلے گئے۔

دور بیٹھے معاذ نے اس وقت تک انہیں جاتا دیکھا' جب تک وہ اسے نظر آتے رہے۔

موبائل پر بہت سی مس کال تھیں۔

یہ امی اور ربیعہ تھیں۔

فون سائلنٹ پر تھا' سو ان کی بے چینی بھی سمجھ میں آتی تھی۔ معاذ نے ایک مختصر سا میسج ربیعہ کے نام کیا اور پھر تیز قدم اٹھاتا ہوا جویا کی طرف چلا آیا۔

زویا باہر نکل کر آرہی تھی۔

"وہ کل اسے روم میں شفٹ کر دیں گے اور پھر شاید دو تین دن بعد گھر لے جانے کی اجازت بھی دے دیں۔" زویا خوش تھی۔ "یہ سب آپ کی وجہ سے ممکن ہوا ہے معاذ بھائی! آپ تھے جو اسے..."

"سب اللہ کی مہربانی ہے زویا! دعا کرو کہ آگے بھی اس کی مہربانی شامل حال رہے۔"

وہ محض اس کا دل رکھنے کے لیے مسکرا دیا تھا' زویا نے اپنی خوشی میں ایسا کچھ نہیں نوٹ کیا۔

جویا آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ اس کی آہٹ پر وہ متوجہ ہوئی۔

"تم پھر آگئے معاذ؟ دن میں کتنی بار آتے ہو آخر!"

معاذ نے اس کے چہرے پر پھیلتی روشنی کو محبت سے دیکھا۔

"جب تک تم یہاں ہو میں اسی طرح ہر وقت آسکتا ہوں۔"

"اور جب میں یہاں سے چلی جاؤں گی..."

"تب بھی تم نے کیا سمجھا ہے مجھے۔" اس کے قریب جھک کر معاذ بہت دھیمی آواز میں بات کر رہا تھا۔

وہ افسردگی سے مسکرائی۔

"سچ بتاؤ۔ کیا واقعی وہ لوگ تمہیں یہاں آنے سے نہیں روکتے... مجھے یقین نہیں آتا معاذ... ابھی میں نے ابو کو دیکھا تھا۔ وہ یہاں آئے تھے۔"

ان کا ذکر اس وقت بھی دکھ اور خوف سے عبارت تھا۔

معاذ نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

"تم مت آؤ یہاں۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ لوگ تمہاری بے عزتی کریں۔ کوئی بھی تمہیں کچھ کہے۔۔۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوگا پلیز! یہاں تمہارا کوئی بھی نہیں ہے۔۔۔ نفرت کرتے ہیں وہ تم سے۔" وہ بہت عاجزی سے درخواست کررہی تھی۔ اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرتی جارہی تھیں۔

جیسے جیسے اس کی طبیعت سنبھل رہی تھی۔ وہ بہتر طور پر سوچنے سمجھنے کے قابل ہوتی جارہی تھی۔

حقیقت آج بھی اتنی ہی زہر بھری تھی۔ یا شاید اور بھی زیادہ اور اسے بدلنا کسی کے بھی بس میں نہیں تھا۔

معاذ نے ان چند لمحات میں خود کو بے بس محسوس کیا۔

"مجھے پتا ہے کہ تم میرے لیے سب کچھ کر جاؤ گے۔۔۔ لیکن آج بھی میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گی۔"

وہ بولتے بولتے تھکنے لگی۔

"خاموش رہو بس۔ پھر سے طبیعت خراب کرنی ہے کیا!" معاذ نے بہت بے چین ہو کر اس کا ہاتھ تھاما۔

"جب میں کہہ رہا ہوں تم سے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا تو پلیز اپنے ذہن پر مت زور ڈالو۔ کسی کے بارے میں مت سوچو۔ یا پھر صرف میرے بارے میں سوچو کیونکہ اچھے خیالات رکھنا بھی نیکی ہے۔"

اپنی جذباتیت پر قابو پاتے ہوئے وہ ایک بار پھر ہلکے پھلکے موڈ میں آنے لگا۔ لیکن وہ مسکرائی تک نہیں۔

"ہم کیسے اپنے بڑوں کے خلاف جاسکتے ہیں معاذ ہماری بدنصیبی کہ وہ ہم سے خوش نہیں ہیں۔ لیکن۔۔۔"

خود پر جمی معاذ کی والہانہ نگاہ نے اسے بات پوری کرنے نہیں دی۔

"ایسے مت دیکھو!"

وہ ایک بار پھر مسکرا رہا تھا۔

"چلو اچھا ہوا، مجھے کم از کم یہ تو پتا چل گیا کہ تمہیں کس طرح خاموش کرایا جاسکتا ہے۔۔۔ مستقبل میں کام آئے گی یہ بات!"

جویا نے بہت حسرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"یا اللہ! اس شخص کی خوش گمانی کی کوئی حد بھی ہے بھلا۔"

ایک تھکی تھکی سانس جویا کے لبوں سے آزاد ہوئی۔

"تم جاؤ معاذ۔۔۔ مجھے نیند آرہی ہے۔"

"ٹھیک ہے! میں جارہا ہوں، لیکن یہیں آس پاس ہوں، خواب میں دکھائی دوں تو غصے میں مت آجانا۔" وہ مسکرا کر کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"اللہ حافظ!"

باہر نکلنے سے پہلے ایک بار پھر معاذ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

معاذ نے مسکرا کر اللہ حافظ کا اشارہ کیا اور باہر نکل آیا۔

ایسی ہر ملاقات کے اختتام پر خود کو سنبھالے رکھنا بہت دقت طلب ثابت ہوتا تھا۔

چند منٹ وہ بالکل خاموش سر جھکائے ریکوری روم کی دیوار کے ساتھ لگا کھڑا رہا۔

"معاذ بھائی۔۔۔!"

اس نے آواز پر آنکھ کے کونے پر ٹکے آنسو کو انگلی کی پور سے گراتے ہوئے سر اٹھایا۔

سامنے خیام کھڑا تھا۔

☆ ☆ ☆
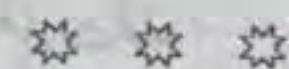
خیام کا گھر سے جانا بیک وقت خوشی اور دکھ کا سبب بنا ہوا تھا۔ پچھلے دو دن سے گھر میں یہ ہی ایک موضوع دہرایا جارہا تھا۔

"مجھے تو خیر پہلے ہی یقین تھا کہ ہو نہ ہو یہ بچہ ضرور کسی بہت اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی صورت، رکھ رکھاؤ، لحاظ شرم سب ہی کچھ تو گواہی دیتے تھے۔"

دادی کو اپنے اندازے کی درستگی کی بے حد خوشی تھی تو شائستہ کچھ اور ہی سوچ کر شرمندہ تھیں۔

"کتنے بڑے باپ کا بیٹا تھا اور ہمارے ہاں کس سادگی سے رہ رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے بھی ہروقت دوڑا پھرتا تھا۔ اب سوچ رہی ہوں تو بڑی شرم آرہی ہے۔"

ربیعہ چائے لے کر دادی کے کمرے میں آرہی تھی، جب اس نے امی کو کہتے ہوئے سنا۔

ابا ان کی بات پر پتا نہیں کیوں بڑے طنزیہ انداز میں مسکرائے تھے۔

ربیعہ خاموشی سے چائے پیش کرنے لگی۔ اس نے اب تک اس سارے قصے پر کوئی رائے نہیں دی تھی۔

دل ایک عجیب ناقابل بیان سی کیفیت میں گھرا تھا۔

خیام کی آنکھوں میں جمی اداسی اور رہ رہ کر اپنی طرف اٹھتی نگاہ کا ادراک ہوا بھی تو کب۔۔۔

وہ اس کے بارے میں بالکل بھی نہیں سوچنا چاہتی تھی۔

دادی کے کمرے کے کونے میں بچھے ہوئے تخت پر اس کی شادی کے سلسلے میں ہونے والی شاپنگ کا ڈھیر روز بروز اونچا ہوتا جارہا تھا۔

وہ جتنی بار بھی کمرے میں داخل ہوتی۔ کمرے کا یہ کونہ ایک خاموش یاددہانی ثابت ہوتا تھا۔

"تم جویا کو پھر دیکھنے نہیں گئیں بیٹا!"

ابا کی آواز پر وہ چونک کر اپنے خیالوں سے باہر آئی۔

امی کی موجودگی کی ذرا بھی پروا کیے بغیر وہ ربیعہ سے پوچھ رہے تھے۔

"آپ جاتے تو ہیں۔ اماں اور ربیعہ بھی جاکر پوچھ آئی ہیں اور وہ جو ساری دنیا سے تعلق توڑ کر وہیں بیٹھا ہوا ہے کافی نہیں ہے کیا؟" اپنے کپ میں زور زور سے چمچہ چلاتی ہوئی شائستہ بیگم کے لہجے میں بڑی ہی کاٹ دار کیفیت تھی۔

"میں تم سے نہیں، ربیعہ سے بات کررہا ہوں۔" ابا پرسکون تھے اور ان کی جواب طلب نگاہ ربیعہ پر جمی تھی۔

ان کے اور شائستہ بیگم کے دوران چھائی سرد مہری اب دادی اور ربیعہ دونوں پر عیاں تھی۔

دادی نے ایک گہری سانس لی۔

"کوئی لے جانے والا نہیں تھا ابا۔ جاتی کس کے ساتھ۔ پہلے تو وہ لے جاتے تھے۔" کچھ پزل سا ہو کر اس نے بات ادھوری چھوڑی۔

"یہ تو ہے۔ گھر میں خیام کے جانے سے بڑی کمی ہو گئی ہے۔ صبح سے کتنے ہی کام یاد آئے۔ وہ ہوتا تو جھٹ پٹ کردیتا۔" دادی پوری طرح متفق ہوئی تھیں۔

"خیام ملازم نہیں تھا اماں! مہمان تھا۔ مہربانی تھی اس کی، جو وہ ہمیں اپنا سمجھتا ہے۔ ہمارے کام اس کی ذمہ داری نہیں تھے۔ جس کی ذمہ داری ہیں، وہ تو ہمیں اہمیت دینے کو بھی تیار نہیں ہے۔ کتنا بڑا کام سر پر کھڑا ہے ربیعہ کی شادی کا۔ مگر وہ تو اس اکلوتی بہن تک کا نہیں ہے، جو اس کی محبت میں مری جاتی ہے۔" شائستہ آج کل اسی طرح کسی بات کو بھی لے کر پھٹ پڑتی تھیں اور سب ہی کان دبائے سن لیتے تھے۔

ابا کا ضبط اس معاملے میں اب آخری حد پر تھا۔

"سب کچھ دیکھ رہی ہو۔ پھر بھی یہ ماننے کو تیار نہیں کہ جویا اس کی زندگی میں کیا معنی رکھتی ہے۔ تمہاری بے

حسی پر افسوس ہوتا ہے شائستہ! شرم آتی ہے مجھے۔" ان کی آواز اس وقت بھی دھیمی تھی۔ لیکن لہجے میں گہری سرد مہری تھی۔

دادی نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا تھا۔ خلاف عادت آج صبح ہی سے وہ کچھ اکھڑے اکھڑے تھے۔

اور آج بھی دادی سے زیادہ ان کے مزاج کے رنگ کو کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔

"تمہیں جویا پر تو کیا اپنے بیٹے کی اذیت پر بھی رحم نہیں آتا۔"

شائستہ بیگم کے چہرے پر بڑی تلخ سی مسکراہٹ پھیلی تھی۔

"ٹھیک کہا آپ نے۔۔۔ نہیں آتا کسی پر مجھے رحم۔۔۔ اب نفرت ہے مجھے اس خاندان سے۔۔۔ جنہوں نے ساری زندگی میرے گھر کی ہنسی اڑائی۔ ذلیل کیا۔ ہماری سفید پوشی کو تار تار کر کے رکھا، سارے خاندان کے سامنے۔"

ربیعہ نے رخ پھیرے ہوئے اپنی گیلی ہوتی آنکھوں کو سختی سے رگڑا۔

"بے چاری امی۔۔۔"

ایک عمر تک کی جانے والی ان کی جان توڑ محنت۔

دن رات چلنے والی مشین کی مخصوص سی گھرر گھرر۔

ان کی بے غرضی، خلوص۔۔۔

آج سب جس مقام پر تھے۔ وہ سب سے زیادہ ان ہی کی قربانیوں کا صلہ تھا۔ مگر آج سب کو ان ہی سے شکایت تھی۔

ابا کو بھی۔۔۔

اور یقیناً" معاذ کو بھی۔

اس کا دل چاہا کہ وہ بھاگ کر ان سے لپٹ جائے اور بتائے کہ اسے ان سے کتنی زیادہ محبت ہے اور یہ کہ وہ ان کی کتنی زیادہ شکر گزار ہے۔

"تلخ باتوں کو دہرا دہرا کر تازہ کیے رکھنا، کون سی عقل مندی ہے بیٹا! معاف کر دو ان سب کو۔۔۔ در گزر کرو۔"

دادی نرمی سے کہہ رہی تھیں۔

شائستہ امی کا سر ہلکے سے نفی میں ہلا۔

"میں نہیں کر سکتی اماں۔۔۔ اور سچ پوچھیں تو میری سمجھ میں آیا ہی اب ہے کہ معاف کرنے کا اجر اللہ نے اتنا زیادہ کیوں رکھا ہے۔ یہ بہت مشکل امر ہے اماں۔۔۔ بہت ہی مشکل۔۔۔ مجھ جیسے گناہ گاروں کے ظرف سے تو بہت ہی زیادہ۔۔۔" ان کی آواز دھیمی پڑ رہی تھی۔

دروازے پر ہوتی آہٹ پر ان سب نے ایک ساتھ ہی مڑ کر دیکھا تھا۔

دروازے پر معاذ کھڑا تھا اور اس سے ایک قدم پیچھے خیام۔

کسی کو بھی یہ سمجھنے میں وقت نہیں ہوئی تھی کہ اسے وہ ہی لایا تھا۔

شائستہ امی کی نگاہ معاذ پر جمی تھی۔

اس کی خستہ حالی، ان کی توقع سے بھی کہیں زیادہ تھی۔

"السلام علیکم امی!" وہ ان کے قریب آ کر رکا۔

"وعلیکم السلام!" ایک کمزور لمحے سے وہ بچ نکلی تھیں۔ "آ گئی یاد تمہیں گھر کی۔۔۔ یا پھر خیام کے زبردستی کرنے پر آئے ہو؟"

اس کے پاس اس طنز بھرے تجزیے کا کوئی جواب نہیں تھا۔ سو بے چارگی سے انہیں دیکھے گیا۔

خیام ذرا فاصلے پر دادی کے پاس جا بیٹھا تھا۔ اور وہ اسے گلے سے لگائے، بے بہا دعائیں دینے میں مصروف تھیں۔

ربیعہ کی نگاہ بے ساختہ ہی اس کی طرف اٹھی تھی۔ دادی کے کندھے سے لگا، وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"دھت!"

ہر بار یہ شرمندگی اسی کے حصے میں آ رہی تھی۔

تیزی سے چائے کے کپ اٹھا کر ٹرے میں رکھتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔

اسلام صاحب اس کے ساتھ ہی باہر آئے تھے۔

"میں اپنے کمرے میں ہوں بیٹا! معاذ تمہاری اماں کی عدالت سے بری ہو جائے تو اسے اور خیام کو میرے پاس بھیج دینا۔" انہوں نے مڑ کر اس سے کہا اور تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

ربیعہ نے ان کے چہرے پر پھیلی مایوسی کو واضح طور پر محسوس کیا تھا۔ وہ الجھے ہوئے تھے۔ دکھی تھے۔

انہیں شائستہ بیگم کا رویہ مکمل مایوس کیے دے رہا تھا۔

ایک کمال درجے کی ذہنی ہم آہنگی اور محبت بھرا رشتہ، جو مشکل ترین معاشی حالات کو بخوبی جھیل چکا تھا۔ اس فراغت بھرے دور میں اپنی خوب صورتی تقریباً" کھو چکا تھا۔

ربیعہ بھاری دل کے ساتھ صحن میں چلی آئی۔ فی الوقت کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اور اندر جا کر خیام کی نگاہوں سے مقابلہ کرنے سے کہیں آسان تھا کہ یہیں کسی گوشہ عافیت میں بیٹھ جائے۔

سو وہ چمپا کے جھنڈ کے قریب بنی منڈیر پر بیٹھی رہی۔ یہاں بڑا ٹھنڈا سا سایہ رہتا تھا اور ہوا کے جھونکے ہمہ وقت دل فریب سی خوشبو سے بوجھل رہتے تھے۔

ربیعہ نے ایک گہری سانس لی۔

کیسا کنفیوژن تھا، جو زندگیوں سے ہٹنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ وہ سب جو ٹھیک کیا جا سکتا تھا، اتنا ہی ناممکن ناقابل رسائی تھا۔

اپنی اپنی جگہ سب درست، لیکن مجموعی طور پر۔۔۔

"امی ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ انسان کے لیے خود اپنے ظرف سے مقابلہ کرنا سب سے زیادہ مشکل ہے۔ سارا کھیل اپنے آپ سے جنگ کا ہی ہے۔ غصہ، حسد، نفرت، خوف، کینہ سارے منفی رویوں میں کس بلا کی طاقت ہے۔ شاید جب ہی تو نہ ہم معاف کرنا سیکھ پاتے ہیں اور نہ پیار کرنا۔" وہ سر جھکائے خاموشی سے سوچے گئی۔

اندر پتا نہیں امی اور معاذ کا معرکہ کس موڑ پر تھا۔۔۔ یا تھا بھی یا نہیں۔۔۔

اندر خیام نہ ہوتا تو وہ ضرور چلی جاتی۔

چند لمحے خاموشی سے آگے بڑھے۔

چڑیوں کا ایک چھوٹا سا غول شور مچاتا ہوا درخت پر اترا تو وہ چونک سی گئی۔

اسے احساس ہوا تھا کہ وہ صرف خیام کے بارے میں ہی سوچ رہی ہے اور کتنی عجیب سی بات تھی کہ ایک بار بھی اس شخص کا خیال تک نہیں آیا تھا، جس کی تصویر اس کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل میں شائستہ امی نے رکھی تھی اور جس کے ساتھ آگے کی ساری زندگی ایک پرائے دیس میں کٹنی تھی۔

وہ خود سے نگاہ بچا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

خود سے چھڑی ایک اور جنگ۔

ابا کے کمرے کی کھڑکی کے نیچے سے گزرتی ہوئی وہ اگلے احاطے کی طرف آئی تو ایک لمحے کے لیے رک سی گئی۔

نئے ماڈل کی چمکتی ہوئی گاڑی بڑی خوش گوار سی حیرت میں مبتلا کر رہی تھی۔
ایک فطری سی بے ساختگی کے ساتھ وہ چند لمحوں کے لیے سب کچھ بھول کر اسے دیکھنے میں مصروف ہوئی۔
دادی کے کمرے سے باہر آتے ہوئے خیام نے ربیعہ کے چہرے پر چھایا ہوا بچوں کا سا اشتیاق دیکھا اور پھر وہ ہلکے سے مسکرایا تھا۔
"کیسی لگی؟"
"ہوں!" وہ چونک کر پلٹی۔
خیام قریب ہی کھڑا تھا۔
"میں گاڑی کی بات کر رہا ہوں۔"
"بہت اچھی ہے... لگتا ہے' اب آپ واقعی بہت بڑے آدمی بن گئے ہیں۔ کیا واقعی بہت امیر ہیں آپ کے ابا..." ذرا رکتے رکتے ربیعہ نے بات پوری کی۔
خیام کے چہرے پر آئی مسکراہٹ مدھم پڑی۔
"صرف بہت سارے پیسے ہونے سے کوئی امیر نہیں ہو جاتا ربیعہ... اور وہ بھی صرف پیسے والے ہی ہیں۔"
وہ کچھ سمجھی اور کچھ نہیں بھی۔
"پیسہ امارت کی دلیل نہیں ہے۔ تو پھر..."
"اور بہت کچھ... جو پیسہ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت قیمتی' بہت خالص ہوتا ہے۔" کوشش کے باوجود بھی وہ ربیعہ پر سے نگاہ نہیں ہٹا پا رہا تھا۔
"جیسے؟" اس نے کترا کر رخ بدلا۔
"جیسے یہ گھر' جہاں ابا اور معاذ بھائی رہتے ہیں اور جیسے وہ شخص جو آپ کی زندگی میں آ رہا ہے۔ بہت امیر ہو گا۔" اس کی آواز دھیمی تھی۔ لیکن ایک ایک لفظ بالکل صاف تھا۔
ربیعہ کی ہمت نے یکسر جواب دیا۔ وہ یوں ہی رخ موڑے کیاری میں لگے پھولوں کو تکنے گئی۔ جہاں نیلے پروں والی ایک تتلی مستقل اڑ رہی تھی۔
چند لمحوں بعد اس نے خیام کے واپس مڑتے قدموں کی چاپ سنی اور پھر مکمل خاموشی۔
ربیعہ کا چہرہ آہستہ آہستہ آنسوؤں سے بھیگتا جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

گرمی غضب کی تھی۔
آپا گل نے دوپٹے کے پلو سے اپنا چہرہ خشک کیا اور اکتائی ہوئی نگاہ سڑک پر چلتے ٹریفک پر ڈالی۔
فریدالدین کی گاڑی میں اے سی چلنے کا سوال ہی نہیں تھا۔
"ہاں! تو میں کہہ رہا تھا..."
برابر میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے فریدالدین کی ہر بات انہیں ازبر ہو چکی تھی' مگر وہ پھر بھی سننے پر مجبور تھیں۔
"اب میں ایک دن بھی دیر نہیں کروں گا۔ نکاح ہو جائے گا تو مجھے بھی اطمینان ہو جائے گا۔ آپ لوگوں کو میرا خیال کرنا چاہیے۔ اتنا پیسہ خرچ کر چکا ہوں اب تک۔ گھر کے کرائے کا نقصان الگ۔"
"غیروں جیسی باتیں نہ کریں بھائی فرید!" اپنوں سے بھی کوئی حساب کرتا ہے کیا۔ یہ تو جویا کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ ورنہ شادی تو کب کی ہو گئی ہوتی۔ ہمارے ہاں تو خود سب کو بے حد افسوس ہے۔ کیسی خوشی خوشی

سب کام ہو رہا تھا۔ نظر لگ گئی کسی کی۔ میں تو روزانہ صدقہ دے رہی ہوں آپ کا بھی اور جویا کا بھی۔"
ان کا شہد سے لت پت لہجہ بھی فریدالدین کے ماتھے کے بل کم نہیں کر رہا تھا۔
"گرمی کیسی پڑ رہی ہے' دل گھبرایا جا رہا ہے۔" انہوں نے دانستہ بات بدلنا چاہی۔
فریدالدین نے کوئی تبصرہ کیے بغیر گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔
اب پہلے سے دن نہیں تھے' جب وہ "اشارتاً" کی جانے والی اس بات کے جواب میں کسی آئس کریم پارلر پر گاڑی روک دیتا۔
آپا گل کے چہرے پر کھسیاہٹ بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔
"بھائی فرید! میں نے کہا نا' فکر نہ کریں۔"
"فکر تو آپ کریں آپا گل! اگر یہ کام نہ ہوا تو سارا خرچا بھرنا ہو گا اور گھر بھی خالی... میری بہنیں تو ویسے ہی اس رشتے کے خلاف ہیں۔ وہ تو مجھے ہی شوق ہے کہ بیوی اور سسرال پڑھا لکھا ہو... سو لڑکیاں بہت۔"
ایک دھچکے کے ساتھ گاڑی کو روکتے ہوئے اس نے انہیں اترنے کا اشارہ کیا۔
آپا گل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
آج وہ بدلا بدلا سا تھا۔
"پتا نہیں اس کی کمینی بہنوں نے کس طرح کان بھرے ہیں۔" انہیں سوچ کر ہی کوفت ہوئی تھی۔ "اس شخص کا کچھ بھروسا نہیں۔ گھڑی میں تولہ۔ گھڑی میں ماشہ۔"
"اور وہ سونے کے کڑے' جو آپ نے میرے ساتھ چل کر..." آپا گل نے تیزی سے بات کاٹی۔
"جویا آ رہی ہے دو ایک دن میں گھر... نکاح اسی دن کر لیتے ہیں سادگی سے... اس میں مسئلہ کیا ہے۔"
فریدالدین نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا۔
"ٹھیک کہہ رہی ہوں نا' اسی دن نکاح اور دو چار دن میں رخصتی... کون سی دیر لگتی ہے۔"
وہ خود کو سنبھال چکی تھیں۔
فریدالدین نے ہلکے سے سر ہلایا۔
"اپنی بات پر قائم رہنا آپا!" گاڑی آگے بڑھانے سے پہلے اس نے محض اتنا ہی کہا تھا۔
آپا گل سن ہوتے دل و دماغ کے ساتھ اوپر آئی تھیں۔
گھر پر وہی دم گھونٹتی سی کیفیت۔
سلمان اپنے کمرے میں بے فکری سے ہاتھ پاؤں پھیلائے سو رہا تھا اور شاکرہ امی اور اظہار صاحب چپ چاپ لاؤنج میں بیٹھے تھے۔
آپا گل کو دیکھ کر دونوں ہی کے چہروں پر بے حد سہم طاری ہوا تھا۔
وہ چلتے ہوئے ان کے قریب آ کر رکیں۔
"جمعہ کو فریدالدین اور جویا کا نکاح ہو گا۔ بس گھر گھر کے لوگ ہوں گے۔ رخصتی چند دن بعد ہو گی۔"
اظہار صاحب اور شاکرہ امی دونوں ہی نے چونک کر کچھ کہنا چاہا تھا۔ لیکن آپا گل کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔
"اگر ہم نے اب بھی نہیں کی تو آپ لوگ سوچ لیں کہ کہاں رہنا ہے۔ ان دو لڑکیوں اور اس نکھٹو' نکمے کے ساتھ۔ اپنا پیسہ وصول کرنے کے لیے فریدالدین کہیں تک بھی جا سکتا ہے۔ پولیس تک لا سکتا ہے۔"
"پولیس... قانون..."

یہ سب بڑی ڈراؤنی باتیں تھیں۔
"تمہیں منظور ہے۔" انہوں نے اتنی تیزی سے کہا۔ جیسے پولیس واقعی گھر کے نیچے کھڑی ہے۔
آپا گل کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ پھیلی۔
"میں نے بھی اس سے یہ ہی کہا ہے۔"
شاکرہ امی نے زرد پڑتے چہرے کے ساتھ ان دونوں کی طرف باری باری دیکھا۔
اظہار صاحب رخ موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگے تھے۔
"شریف لوگوں میں بار بار رشتے نہیں ٹوٹتے امی! اور یہ جویا... اس نے تو ویسے بھی ہمیں رسوا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رکھی۔ سارا ڈراما ہے بیماری کا۔ وہاں وہ عاشق جو بٹھار کھا ہے... حد ہے آپ لوگ..."
لرزتی کانپتی شاکرہ امی نے پوری قوت سے ان کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔
آپا گل بالکل ساکت کھڑی تھیں۔
چند لمحے بڑی گمبھیر سی خاموشی ماحول پر طاری ہوئی تھی۔
شاید ایک اور بڑا ہنگامہ۔
اظہار صاحب نے بے بسی سے ان دونوں کو دیکھا اور اٹھنے لگے۔
آپا گل خلاف توقع پرسکون تھیں۔
"آپ جتنا چاہیں غصہ کرلیں۔ لیکن جو ہونا ہے' وہ ہو کر رہے گا۔ ورنہ اس گھر کی بربادی میں جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی ہے وہ بھی بس ختم ہی سمجھیے پتا نہیں کیوں' مجھے بار بار یہ بات یاد دلانی پڑتی ہے۔"
"تم... تم فکر مت کرو گل... جو تم چاہ رہی ہو... ویسا ہی ہوگا۔ میں نے کہا ہے نا۔"
اظہار صاحب کی آواز لڑکھڑا رہی تھی اور خود کو سہارا دینے کے لیے انہوں نے کرسی کی پشت کو پکڑا ہوا تھا۔ وہ فطرتاً" ایک کمزور انسان تھے اور جیل میں گزرے ڈھائی تین سال' انہیں جسمانی اور اعصابی' دونوں طرح سے مکمل طور پر توڑ پھوڑ چکے تھے۔
"میں باپ ہوں جویا کا... میرا فیصلہ آخری ہے۔"
آپا گل کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ آکر جمی تھی۔ ہاتھوں سے پھسلتا ہوا منافع پھر سے مٹھی میں کس کر بند ہوا تھا۔
"خوش فہمی ہے آپ لوگوں کی اظہار صاحب! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ جویا کی شادی اب صرف معاذ سے ہوگی اور یہ اب طے ہے۔" شاکرہ امی کی آواز میں عجیب سی دھمک تھی اور وہ اس طرح سر اٹھائے کھڑی تھیں' جیسے گھر میں ان ہی کے نام کا حکم' سکہ چل رہا ہو۔
ایک لمحے کے لیے آپا گل کے چہرے کا رنگ اڑا تھا۔
"ہوش میں تو ہیں آپ... کہیں اس کمینے معاذ کے ساتھ مل ملا کر کچھ کر تو نہیں دیا آپ نے... ہاں..."
فوری طور پر انہیں بدترین خیال جویا اور معاذ کے نکاح کا ہی آیا تھا۔
"چپ کیوں ہیں۔ ضرور اس معاذ کے بچے نے کوئی پکا کام کرلیا ہے۔ دیکھا... دیکھا ابو!" وہ بدحواس ہونے لگیں۔ "اس جیسے آوارہ شخص سے اور کیا توقع کی جاسکتی تھی۔ اسی کا ڈر تھا مجھے... برباد کردیا نا آخر اس نے..."
اظہار صاحب پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھے جارہے تھے۔
شاکرہ امی نے ایک گہری سانس لی۔
"منہ سنبھال کر بات کرو گل! معاذ تم لوگوں جیسا سازشی' مکار' بے شرم نہیں ہے۔ اسے چھپ کر کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو ہوگا سب کے سامنے ہوگا۔"
آپا گل کی جان میں جان آئی۔
"کمال ہے۔ یوں ہی سارا دن بیٹھ کر ہوائی قصے بناتی رہی ہیں... لے کر جان نکال کر رکھ دی۔ ان کا بھی اب کچھ کرنا ہوگا... ورنہ مکمل پاگل پن دور نہیں ہے اب۔"
حقارت آمیز انداز میں بڑبڑاتے ہوئے وہ گرنے کے انداز پر صوفے پر بیٹھی تھیں۔
شاکرہ امی کی نگاہ آپا گل پر جمی تھی اور ان نظروں میں ناقابل برداشت کاٹ تھی۔
"ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟ نہیں ہے جویا کی قسمت میں معاف... اگر ہوتا تو کب کا مل گیا ہوتا... آپ خود کو ہلکان مت کریں۔ فریدالدین نے آپ کی کوئی الٹی سیدھی بات سن لی تو یہ آخری آسرا بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔ سمجھیں آپ!"
ذرا اونچی آواز میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے انہوں نے شاکرہ امی کو اس طرح سمجھانا چاہا جیسے کسی فاتر العقل شخص کو کچھ بتانے کی کوشش کی جاتی ہے۔
"بھئی ابو... میری مانیں تو انہیں ذرا دور ہی رکھیں۔ جویا کی شادی بڑا سنجیدہ معاملہ ہے اور یہ ضرور کوئی بے وقوفی کریں گی اس دن۔"
اکتائے ہوئے انداز میں وہ اظہار صاحب کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔ شاکرہ امی عجیب سے انداز میں مسکرائیں۔
"مجھ سے مت ڈرو گل... اب تو وہ کرے گا' جس کے پاس میں نے جویا کی درخواست جمع کرائی ہے اور جس کا حکم نافذ ہو کر رہتا ہے۔ ڈرو اس سے اگر تمہیں توفیق ہو۔" ان کی آواز میں سرسراہٹ سی تھی۔ وہ کچھ بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔
"دیکھا! گویا اب اللہ تعالیٰ سے بھی براہ راست گفتگو ہونے لگی ہے ان کی۔ اس طرح ڈرا رہی تھیں جیسے اللہ نہ کرے کوئی ناجائز کام ہونے جارہا ہے۔ ارے گھر بسانا تو نیکی ہے' بہت بڑی... جویا ایک شریف' خوش حال آدمی کی بیوی بننے جارہی ہے اور اس بے چارے فریدالدین کا بھی..."
ماحول پر چھایا پرہول سناٹا آپا گل کے پڑھے گئے خوش آئند پیراگراف سے بھی کم نہیں ہورہا تھا۔
اظہار صاحب چپ چاپ فرش کو تکے جارہے تھے۔

☆ ☆ ☆

صبح پرسکون اور خوش گوار تھی۔
یوسف کمال نے بڑی محبت سے اپنے خوبرو بیٹے کو ڈائننگ روم میں آتے دیکھا۔ بے حد قیمتی سامان سے سجے اس گھر میں جہاں جہاں بھی وہ قدم رکھتا تھا' روشنی بڑھتی چلی جاتی تھی۔
"السلام علیکم!" سب کے ساتھ بیٹھنے سے پہلے اس نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
"وعلیکم السلام جیتے رہو بیٹا!"
وہ اس کے معاملے میں اتنے حساس ہورہے تھے کہ بار بار گلے میں آنسو پھنسنے لگتے تھے۔
"بیٹھو خیام! ہم تمہارا ہی انتظار کررہے تھے۔" زوبیہ کے انداز میں بڑی اپنائیت تھی۔ اپنے سے کہیں چھوٹے اس بھائی کی محرومیوں بھری زندگی پر اسے دل سے دکھ تھا اور وہ آج بھی ماں اور باپ دونوں کو قصوروار سمجھتی تھی۔ خیام کے آگے پلیٹ رکھتے ہوئے وہ محبت سے مسکرائی۔

"سنا ہے لاہور جارہے ہو ایک دو دن میں؟"
"جی! کل کا پروگرام ہے۔"
"زیادہ دن بالکل مت رکنا۔ میں بہت مس کروں گی تمہیں۔"
سامنے بیٹھیں مسز کمال نے اضطراب سے پہلو بدلا۔ انہیں زوبیہ کا اتنا لگاؤ بالکل بھی نہیں بھا رہا تھا۔ "سوکن کا بیٹا!"
جتنی بار اس پر نگاہ پڑتی' ان کے دل کو زور کا دھچکا لگتا تھا۔
اس کی دلکشی ہوئی رنگت' سحر انگیز براؤن آنکھیں گواہی دیتی تھیں کہ وہ یوسف کمال اور فیروزہ کا بیٹا ہے۔ ان کی محبتوں کا امین' ان کی زندگی کا سب سے معتبر سچ۔
وہ فیروزہ' جس کا اپنے طور پر انہوں نے ہر حوالہ ختم کردیا تھا۔ آج پورے حق کے ساتھ پھر سے یوسف کمال کی زندگی میں واپس آگئی تھی۔
یا شاید وہ کہیں گئی ہی نہیں تھی۔ صرف وہ ہی بے خبر تھیں۔
"میں کوشش کروں گا ایک دو دن میں آجاؤں۔ اصل میں مجھے اپنی نانی سے ملنا ہے۔ بہت عرصہ ہوگیا ہے ان کے پاس گئے ہوئے۔ مجھے انہوں نے ہی پالا ہے۔"
زوبیہ کے کسی سوال کے جواب میں وہ بہت پُرسکون انداز میں کہہ رہا تھا۔ آج اس کے لیے اپنا کوئی حوالہ باعث شرم نہیں رہا تھا۔
"شاید آپ نے بھی ان کا نام سنا ہو۔ اپنے وقت کی بہترین ستار نواز تھیں۔"
ابا نے اسے اس حقیقت سے بخوبی روشناس کروا دیا تھا کہ کتنے سارے کمپلیکسز' محض ہمارے اپنے دل و دماغ کا خلل ہوتے ہیں یا پھر معاشرے کی بیمار ذہنیت۔
"نانی ستارہ ہمارے کلاسیکل ورثے کا بہت بڑا نام ہیں۔ ان جیسے ماہر فن نایاب ہوتے جارہے ہیں۔ خیام! تمہیں پتا ہے اس بار ان کو تمغہ حسن کارکردگی دیا جارہا ہے گورنمنٹ کی طرف سے۔"
"بہت خوشی کی خبر ہے بابا! مجھے واقعی نہیں پتا تھا۔" اسے دلی خوشی ہوئی تھی اور فخر بھی۔
"بہت مبارک ہو خیام! جاؤ تو انہیں میری طرف سے بھی مبارک باد دینا۔" زوبیہ نے پورے خلوص سے کہا۔
سو اب یہ سب کچھ دیکھنا اور سننا ان کی مجبوری رہے گی۔ کوئی غصہ' کوئی جبر' عمر کے اس حصے میں یوسف کمال پر اثر انداز نہیں ہوسکتا۔
مسز کمال نے بڑے اضطراب سے ان تینوں کی طرف دیکھا' جو بڑی تیزی سے ایک دوسرے کے قریب ترین محسوس ہونے لگے تھے۔
ہاتھ میں تھاما گلاس انہوں نے بے اختیار ہی ذرا زور سے میز پر رکھا تھا۔
"آپ کیسی ہیں آنٹی؟"
خیام نے شاید ان کا اپ سیٹ ہونا محسوس کیا تھا۔
"میں ٹھیک ہوں!" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرائیں۔ "جوس نکالوں تمہارے لیے۔۔۔"
کہنے کے ساتھ ہی انہوں نے اس کے لیے گلاس میں جوس نکالنا شروع کردیا۔ اس عمر میں ایک بے نتیجہ محاذ آرائی اب ان کے بس کی بھی بات نہیں رہی تھی۔ ناشتے کے بعد وہ یوسف کمال کے ساتھ ہی چلتا ہوا پورچ میں آیا تھا۔
"کل میں بھی تمہارے ساتھ لاہور چل رہا ہوں۔"

"جی!" وہ کچھ چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔
"بہت بوجھ ہے میرے دل پر تمہاری ماں کی طرف سے۔ اپنے آپ کو بہت بڑا مجرم سمجھتا ہوں۔ تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا تو شاید ان لوگوں کے سامنے میری تھوڑی سی عزت بحال ہوسکے گی۔"
خیام نے ہلکے سے سر ہلایا۔ ان چند دنوں میں وہ ان کی زبانی جو کچھ بھی سن پایا تھا' اس کے بعد کہیں نہ کہیں وہ بھی بے حد قابل رحم لگے تھے۔
"اور وہاں سے آنے کے بعد تم باقاعدہ میرا آفس سنبھالو گے۔ بہت کام کرلیا میں نے۔ اب تمہاری ذمہ داری ہے۔"
"ابھی چند دن نہیں بابا! وہاں آج کل ابا اور معاذ بھائی کو میری ضرورت ہے۔"
"او ہاں! شادی ہے نا' اسلام بھائی کی بچی کی۔ کتنے دن ہیں باقی؟"
"بس دو ہفتے!" اس کی آواز دھیمی ہوئی۔
"بہت بھرپور شرکت کرنی ہے ان شاء اللہ۔ بہت سارے تحائف بچی کے لیے۔ کوئی بے حد قیمتی جیولری۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔"
"ابا شاید پسند نہ کریں بابا۔۔۔" خیام نے نرمی سے ان کی بات کاٹی۔
"ارے! میری بات تو انہیں ماننی ہی ہوگی۔ کچھ بھی منوا سکتا ہوں میں ان سے۔" کمال صاحب بڑے یقین سے مسکرائے۔
"کچھ بھی؟" خیام نے بے ساختہ کہا۔
"ہاں! بہت حق ہے میرا ان پر۔ میری بات نہیں ٹالنے والے۔"
تب ہی خیام کے پھیکے پڑتے رنگ نے ان کی توجہ اپنی طرف کھینچی۔
"کیا ہوا بیٹا۔۔۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" وہ بری طرح پریشان ہوئے۔
"بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ پریشان مت ہوں۔" وہ زبردستی مسکرایا۔ "شاید رات ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی۔"
"کوئی بات ہے تو مجھ سے مت چھپاؤ۔ کسی چیز کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہوں نا!"

زندگی میں اس یقین دہانی کی اہمیت اس پر پہلی بار ظاہر ہوئی۔ "میں ہوں نا!"
اس نے دل ہی دل میں دہرایا۔
کاش! یہ الفاظ اس نے کچھ عرصہ پہلے سن لیے ہوتے تو یقیناً۔۔۔
"خیام!" وہ اسے بہت فکر مندی سے دیکھ رہے تھے۔
"کچھ نہیں بابا۔۔۔ آپ جائیں آپ کو دیر ہو رہی ہے۔ مجھے بھی معاذ بھائی کے پاس جانا ہے۔"
"اچھا! لیکن اگر کوئی مسئلہ ہو تو مجھے ضرور بتا دینا۔"
خیام نے مسکرا کر سر ہلایا اور دوسری گاڑی کی طرف بڑھا۔
تب ہی کمال صاحب کا موبائل بجنے لگا۔
"سالار کا ہے!" انہوں نے ریسیو کرنے سے پہلے خیام کو بتایا تو وہ ہلکے سے مسکرا دیا۔
"میرا اسلام کہیے گا ان دونوں کو۔"
کمال صاحب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کو جانے کا اشارہ کیا۔۔۔
سالار خیام کے ملنے کی پرجوش مبارک باد دے رہا تھا اور اس کے خلوص کے وہ دل سے معترف تھے۔
"اللہ کا جتنا بھی شکر کیا جائے کم ہے انکل۔۔۔ میں اور گیتی دونوں اتنے خوش ہیں کہ الفاظ میں بتانا ناممکن ہے۔"
"میں جانتا ہوں بیٹا! اور اب تو گیتی کے حوالے سے تم میرے داماد بھی بن چکے ہو۔۔۔ یاد رہے۔" بات کرتے ہوئے بھی ان کی نگاہ خیام پر تھی جو گاڑی گیٹ سے نکال رہا تھا۔
جواباً وہ بڑی خوش دلی سے ہنسا تھا۔
وہ اور گیتی بھی لاہور جانے کا پروگرام بنائے بیٹھے تھے۔ اور ان ساری خوش کن باتوں کے درمیان ایک چھوٹی سی خبر یہ تھی کہ زرتاج بیگم کی واپسی اور صحت یابی فی الحال دونوں ہی مشکوک تھیں۔ ان کا ذہنی توازن بڑی حد تک بگڑ چکا تھا اور وہ وہیں مقامی اسپتال میں نامعلوم مدت تک کے لیے داخل تھیں۔
کمال صاحب ان کے وکیل سے مستقل رابطے میں تھے۔
"اللہ اس کی مشکل کو آسان کرے سالار۔۔۔ میں اس بارے میں اس سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں کہوں گا۔"
"اور میں بھی نہیں انکل!" جواباً سالار نے آہستہ سے کہا۔
چند لمحوں کی بے ساختہ سی خاموشی ان دونوں کے بیچ آ کر رکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آج اس نے تھوڑی سی واک بھی کی۔ وہ بہتر ہو رہی ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔"
معاذ خیام کے ساتھ چلتے ہوئے دھیمی آواز میں اسے جویا کی طبیعت کے بارے میں بتا رہا تھا۔
"ایک دو دن میں وہ اپنے گھر چلی جائے گی۔ اللہ کرے کہ وہ سب اس کا بہت خیال رکھیں۔"
"ان کا خیال صرف آپ رکھ سکتے ہیں معاذ بھائی! اور کوئی بھی نہیں۔ بہت وقت ضائع کر چکے ہیں آپ دونوں۔ اب بس کر دیں۔ پلیز رحم کریں ان پر۔۔۔ انہیں اب حالات کے رحم و کرم پر مت چھوڑیں۔" خیام کے لہجے میں درخواست کی سی کیفیت تھی۔
معاذ چلتے چلتے رکا تھا۔

وہ دونوں اس وقت ایک الگ تھلگ سے حصے سے چلتے ہوئے آ رہے تھے۔
"کتنی مشکل سے وہ سنبھلی ہیں معاذ بھائی! اللہ نہ کرے جو۔۔۔" خیام نے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔ معاذ نے ایک تھکی تھکی سی سانس لی تھی۔
"امی آج بھی راضی نہیں ہیں خیام! تم نے دیکھا ہے نا ان کا رویہ جس میں کوئی لچک کوئی نرمی نہیں ہے جویا کے لیے۔ نفرت ہے انہیں اس سے۔"
"کبھی نہ کبھی وہ بھی ضرور شرمندہ ہوں گی معاذ بھائی! افسوس ہوگا انہیں اپنے رویہ پر۔ آپ دیکھ لیجیے گا۔"
"میں نے کبھی بھی انہیں شرمندہ نہیں دیکھنا چاہا ہے خیام! لیکن کاش وہ انسانیت کے ناطے ہی سہی جویا سے تھوڑی سی ہمدردی کر لیتیں۔ مجھے بڑی امید تھی کہ اس بے حد کڑے وقت میں وہ اس پر رحم کریں گی۔ معاف کر دیں گی اسے۔ لیکن اب مجھے کوئی امید نہیں ان سے۔ اور وہ بھی سمجھ رہی ہے کہ ایسا کچھ نہیں بدلا ہے ہماری زندگیوں میں۔" وہ بے حد مایوس تھا۔
"ابا ضرور کوئی حل نکال لیں گے۔ سب کچھ برا نہیں رہے گا معاذ بھائی! اللہ اپنے کسی بندے کو اکیلا نہیں چھوڑتا۔ اسے سب کی فکر ہے۔ مجھے دیکھیے نا۔۔۔ مایوسی کی انتہا کو چھو کر واپس پلٹا ہوں۔"
معاذ کی نگاہ خیام کے چہرے پر جمی تھی۔ اس کا کہا کوئی لفظ غلط نہیں تھا اور کتنی عجیب سی بات تھی کہ کل تک وہ اس کا ہاتھ تھامنے کا فرض انجام دے رہا تھا اور آج خیام اس کی بہت بڑی تسلی ثابت ہو رہا تھا۔
معاذ کے چہرے پر افسردہ سی مسکراہٹ ابھری۔
"چلو! تمہیں جویا سے ملواؤں۔ بہت خوش ہوگی وہ تم سے مل کر۔" اس نے دانستہ بات بدلی۔
"نہیں ابھی نہیں۔" خیام نے ہلکے سے نفی میں سر ہلایا "اب میں ان سے جب ہی ملوں گا۔ جب میرا ان سے کوئی مضبوط رشتہ ہوگا آپ کے حوالے سے۔ اور وہ وقت اب قریب تر ہے۔"
وہ بے حد پریقین تھا۔
"ابا نے مجھے بتایا ہے کہ اللہ بندے کے گمان کے ساتھ ہے۔ بندہ اپنے رب سے جیسا گمان رکھے گا وہ اس کے حق میں ویسا ہی کرتا ہے۔ اس کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔"
معاذ نے رشک بھری نگاہوں سے خیام کو دیکھا۔
یقیناً "ابا سے فیض حاصل کرتے ہوئے۔ وہ اس سے دو قدم آگے نکل چکا تھا۔
"میں لاہور سے ایک دو دن میں آ جاؤں گا۔ اور یہ میں ابا کے اصرار پر جا رہا ہوں۔ ورنہ یقیناً" بعد میں جاتا بہت کام پڑے ہیں باقی۔"
معاذ ہلکے سے مسکرایا۔
"یہ سب کام تمہارے انتظار میں جوں کے توں رکھے رہیں گے، بے فکر رہو۔ لیکن نانی سے ضرور مل آؤ خیام! اب ایک دن کی بھی دیر مت کرو۔ بہت تکلیف میں ہوں گی وہ تمہاری طرف سے اور کتنے عرصے سے۔۔۔"
خیام نے رات کے اس پہر کو یاد کیا، جب وہ نانی کا زیور لے کر گھر کی سیڑھیاں اترا تھا۔
سالار کا گلی کے کونے پر ملنا اور اس کے بعد ایک درد بھرے سفر کا سلسلہ۔۔۔
صد شکر کہ اب وہ بہت بہتر انسان کے طور پلٹ کر جائے گا۔
ایک چھوٹے سے لمحے میں اس نے بہت کچھ سوچا۔
"تم آؤ گے تو ربیعہ کی شادی میں اور بھی کم وقت رہ جائے گا۔ مجھے تو سوچ کر ہی عجیب سی تکلیف ہوتی ہے کہ وہ

یہاں نہیں ہوگی۔ بہت دور چلی جائے گی۔" معاذ کہہ رہا تھا۔
خیام نے گم صم سے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

☼ ☼ ☼

دن ابھی پوری طرح نہیں چڑھا تھا لیکن دھوپ کی تپش تیزی سے کمرے میں پھیلی جارہی تھی۔
شاما نے کھڑکیاں بند کرکے مخمل کے گہرے نیلے بھاری پردے گرائے تو کمرے میں نیلاہٹ مائل ٹھنڈا سا اندھیرا پھیلنے لگا۔
مسہری کے سرہانے، پیتل کے بڑے سارے منقش سفید پیالے میں بھرے پانی پر بیلے کے سفید پھولوں کا ڈھیر تیر رہا تھا۔
شاما نے ایک مطمئن سی نگاہ پورے ماحول پر ڈالی پھر دبے قدموں واپس باہر نکل گئی۔ نانی ستارہ دوسری طرف کروٹ لیے لیٹی تھیں۔
علی الصبح کی عبادت، ریاض اور ناشتے کے بعد۔ یہ ان کے مختصر دورانیہ کے آرام کا وقت تھا۔
نیچے بازار میں ابھی مکمل سکوت طاری تھا۔
تب ہی باہر کی سمت کھلتے لکڑی کے بھاری دروازے کو دھکیل کر وہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر چلا آیا۔

سامنے آرائشی برآمدہ خالی پڑا تھا اور جالی کے کاسنی پردوں کو شاما آج بھی سلیقے سے باندھنا نہیں بھولی تھی۔
داہنے ہاتھ پر پہلا پڑتا استاد فراغت بیگ کے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔
وہ جانتا تھا کہ یہ وقت ان کے آرام کا ہے۔
بے آواز قدموں سے چلتا ہوا وہ نانی ستارہ کے کمرے پر رکا تھا۔
دروازہ جیسے اس کے ایک اشارے کا منتظر تھا۔ وہ اگلے ہی لمحے اس بے حد مانوس منظر میں کھڑا تھا۔
کمرے کی فضا بیلے کے پھولوں کی خوشبو سے آج بھی معطر تھی اور نیلا ٹھنڈا اندھیرا اتنا ہی پرسکون۔
آج سے زیادہ شاید پہلے کبھی اسے یہ سب اتنا خوب صورت نہیں لگا تھا۔ وہ ایک بے حد حساس سے تاثر کے زیر اثر کھڑا تھا۔ تب ہی نانی ستارہ نے کروٹ لی۔ وہ انہیں دیکھ کر بری طرح چونکا تھا۔
وہ بے حد کمزور ہوچکی تھیں۔ اس بڑی سی مسہری کے کونے میں سمٹ کر لیٹی ہوئی، وہ کوئی بالکل مختلف شخصیت محسوس ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھوں کے گرد گہرے حلقے پڑچکے تھے۔
اتنا بدلاؤ۔
اسے یاد آیا۔ نانی کہتی تھیں کہ خوشی اور غم دونوں ہی انسان کو بدل دیتے ہیں۔ وہ کچھ سے کچھ بن جاتا ہے۔
نانی بھی بدل گئی تھیں۔ دکھوں اور محرومیوں کی لمبی فہرست کو بھگتاتے... بھگتاتے آخرکار......
وہ تڑپ کران کے قریب آکر کھڑا ہوا۔
"نانی!" اس کی آواز میں بے قراری تھی اور انہوں نے پہلی ہی بار میں آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا تھا۔
(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

شیریں ملک

چاندنی رات کا فسوں اس چھوٹے سے آنگن میں یوں پھیلا تھا کہ سدرہ اس کے سحر میں گم آنکھیں جھپکائے بغیر اپنے اس خواب کی تعبیر کو بڑے پیار سے تکے جارہی تھی۔ اپنے اس خواب کو پانے کے لیے اس نے کتنے اور خوابوں سے نظریں چرائی تھیں۔ کتنی خواہشوں سے منہ موڑا تھا۔ کتنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کو نظرانداز کیے صرف اس ایک ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اس نے کتنی محنت کی تھی اور یہ محنت صرف دو تین سالوں میں نہیں کی تھی۔ بلکہ اس کی زندگی کے خوب صورت آٹھ سال لگے تھے۔ ان آٹھ سالوں میں کون سا ایسا دن تھا، جب اس نے اس پیارے خواب کو تصور ہی تصور میں پورا ہوتے نہ دیکھا ہو۔

اور آج اتنے سالوں بعد وہ یہ سب کچھ حقیقت میں دیکھ رہی تھی۔ بڑی عقیدت سے، بڑے پیار سے ٹانگوں کے گرد بازو لپیٹے گھٹنوں پہ ٹھوڑی رکھے، وہ ٹکٹکی باندھے دیکھے جارہی تھی۔ اس وقت کوئی اس اٹھائیس سالہ سدرہ کو اس حالت میں دیکھتا تو حیران ضرور ہوتا۔ لیکن سدرہ کا تو خوشی کے مارے بس نہیں چل رہا تھا کہ پوری دنیا کو بتائے۔ دیکھو! آج میں نے جو چاہا، وہ پالیا۔ اگر کوئی اس سے پوچھتا کہ تمہاری چاہت کیا ہے تو وہ ایک پل کی بھی دیر کیے بغیر اس کو اپنا یہ چھوٹا سا خوب صورت گھر دکھاتی۔ بھلے وہ پانچ مرلے پہ بنا دو کمروں اور برآمدے پہ مشتمل ہی کیوں نہ تھا۔ لیکن اس چھوٹے سے صحن میں بیٹھے ہوئے ملکیت کا جو احساس سدرہ کے من میں ہلکورے لے رہا تھا، اس خوشی کا اندازہ کوئی نہیں کرسکتا تھا۔
اب وہ صحن میں ایک طرف بنی چھوٹی سی کیاری کو دیکھ رہی تھی۔ جس میں اس کی امی نے گھر کی بنیادیں پڑتے ہی چھوٹے چھوٹے پودے لگادیے تھے جو گھر مکمل ہونے تک کافی بڑے ہوگئے تھے۔ گلاب اور موتیا کے پودوں پہ لگے پھولوں کی خوشبو اور الائچی کے پودے کی خوشبو مل کر اس گھر کی فضا کو جیسے معطر کررہی تھی دنیا کا کوئی پرفیوم اس خوشبو کا مقابلہ نہیں

کر سکتا تھا۔ سدرہ آنکھیں موندے اس معطر فضا میں سانس لیتے ہوئے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼
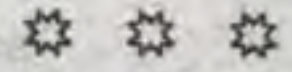
سدرہ کی زندگی کا سب سے بڑا دکھ کرائے کے مکان میں رہائش پذیر ہونا تھا۔ اپنے ذاتی گھر کی خواہش وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شدت پکڑتی گئی۔ یہ وہ بنیادی ضرورت ہے۔ جس کی چاہ ہر چرند پرند اور ہر جانور کو بھی ہوتی ہے تو انسان پھر اشرف المخلوقات ہے۔ بہتر سے بہتر چیز پانے کی خواہش اس کی سرشت میں ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہر خواہش ہی تعبیر پا سکے یا اگر پوری ہو بھی جائے تو نجانے کتنی دیر لگ جائے۔ یہی معاملہ سدرہ کے ساتھ بھی تھا۔

اشفاق احمد کے تین بچے تھے۔ بڑے دو بیٹے حماد اور جواد تھے اور تیسرے نمبر پہ سدرہ تھی۔ اشفاق احمد ایک سرکاری ٹیچر تھے۔ مہنگائی کے اس دور میں انہوں نے اور ان کی بیوی سلمٰی نے بمشکل سفید پوشی کا بھرم رکھا ہوا تھا۔ ان کی زندگی کا سب سے اولین مقصد بچوں کی اچھی تعلیم و تربیت تھا اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے بہت سی بنیادی ضرورتوں سے نظریں چرانا پڑتی تھیں۔ اسی لیے وہ اپنا گھر بنانے کے لیے کچھ بھی پس انداز نہ کر سکے۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی آمدنی کا مخصوص حصہ گھر کے کرائے کی نذر ہو جاتا۔

اشفاق صاحب بڑھتی عمر کے باوجود بہت محنت کرتے تھے۔ اسکول سے چھٹی ہونے کے بعد وہ رات گئے تک بچوں کو ٹیوشن پڑھاتے۔ لیکن مسائل تھے کہ بڑھتے ہی جاتے تھے۔ پھر بھی سلمٰی نے محلے میں چھوٹی موٹی کمیٹیاں ڈال کر اتنی رقم ضرور اکٹھی کر لی کہ آبادی سے دور کسی اسکیم کے تحت پانچ مرلے کا پلاٹ خرید لیا کہ اسی طرح ایک دن اپنا مکان بھی بنا لیں گے لیکن یہ خیال صرف خیال ہی رہا اور وقت دن مہینوں اور سالوں میں بدلتا رہا۔ لیکن یہ گزرتا وقت گھر کی سب سے چھوٹی اور حساس سدرہ کو بہت متاثر کر تا گیا۔

آئے دن کے مکان بدلنے سے وہ تنگ آچکی تھی۔ یہ تو حقیقت تھی کہ مکانوں کے مالک اپنی مرضی کے کرایہ دار رکھتے ہیں۔ جب تک یہ ان کی ڈیمانڈز پوری کرتے انہیں کوئی شکایت نہ ہوتی۔ لیکن جب کرایہ بجٹ سے زیادہ بڑھنے لگتا اور یہ لوگ پس و پیش سے کام لیتے تو انہیں مکان چھوڑنے کا نوٹس مل جاتا اور یوں یہ نسبتاً" کم کرائے والے مکان میں شفٹ ہو جاتے۔ ابھی ایک گھر سے مانوس بھی نہ ہوتے اور وہاں سے نکلنے کا نوٹس مل جاتا۔

سدرہ کو یوں لگتا' ان کی زندگی یونہی آئے دن سامان کی شفٹنگ میں گزر جانی ہے۔ وہ جب بھی مکان بدلتے' سب سے زیادہ سدرہ کو محسوس ہوتا۔ اسے اس لمحے اپنی کم مائیگی کا بہت زیادہ احساس ہوتا تھا یہ احساس وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جڑ پکڑتا گیا۔ لڑکیوں کی جو عمر روپہلے خواب بننے کی ہوتی ہے' سدرہ اس عمر میں صرف ایک ہی خواب سجائے بیٹھی تھی اور وہ خواب تھا کہ چاہے چھوٹا سا ہی سہی' لیکن ان کا اپنا ایک گھر ہو۔ جہاں وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہے تو مہینے کے شروع ہوتے ہی انہیں کرائے کی فکر نہ ہو۔ جہاں مہنگائی بڑھنے کے باوجود کوئی ان کو نکلنے کے لیے نہ کہے۔ جہاں سے انہیں کہیں شفٹ نہ ہونا پڑے۔ جہاں اس کا اپنا ایک کمرا ہو۔ جس میں اس کے بچپن کے کھلونے' اس کی کتابیں' اس کے فرسٹ آنے پر ملنے والے سارے پرائز سجے ہوں۔ جو زیادہ تر شفٹنگ کے دوران ٹوٹ پھوٹ جاتے تھے اور وہ اپنی چیزوں کو سنبھالتے سنبھالتے تھک جاتی تھی۔

وہ چاہتی تھی اس کی تمام یادیں اس کے کمرے میں مقید ہوں۔ جہاں ملکیت کا احساس ہو۔ جہاں اگر بداحتیاطی سے ٹوٹ پھوٹ ہو جائے تو کسی کا ڈر نہ ہو۔ جہاں کی ہر چیز وہ اپنی مرضی سے تصرف میں لائے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے تئیں کوشش کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اب اس کے والدین بوڑھے ہونے لگے تھے تھکنے لگے تھے۔ لیکن وہ خوش تھے کہ ان کے تینوں ہی بچے محنتی' لائق اور فرماں بردار تھے۔

حماد اور جواد بھی گھر کے حالات کو دیکھتے ہوئے اپنی تعلیم کے لیے پارٹ ٹائم جاب کرنے لگے تھے۔ سدرہ بھی بی سی ایس کرنے کے بعد ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھانے لگی۔ شام کی کلاسز میں اپنی تعلیم جاری رکھی اور رات گئے تک اپنے بابا کے ساتھ ان کے ٹیوشن سینٹر میں آئے بچوں کو پڑھاتی جو انہوں نے پنشن ہونے کے بعد بھی جاری رکھا تھا۔ یوں زندگی کی گاڑی چلتی رہی۔ وقت گزرتا گیا۔ حماد اور جواد کی تعلیم مکمل ہو گئی۔ خوش قسمتی سے دونوں کو ہی آرمی میں اچھی پوسٹ پر جاب مل گئی۔ دونوں کی نسبت بچپن سے ہی اپنے تایا کی بیٹیوں مصباح اور مریم سے طے تھیں۔ سلمٰی کو بھی اپنے بیٹوں کے سر پر سہرا سجانے کا شوق چرایا اور تایا کو بھی بیٹیوں کی شادی کی جلدی تھی۔ یوں یہ کام بھی سادگی اور خوش اسلوبی سے طے ہو گیا۔ اور پھر جیسے ہی انتظام ہوا' دونوں بھائیوں نے ہی جہاں جہاں ان کی پوسٹنگ تھی' وہیں پر اپنی بیوی کو بلا لیا۔ لیکن گھر سے رابطہ ہنوز تھا۔ دن میں کئی کئی بار فون کرتے۔ کبھی کبھار ملنے آجاتے اور دونوں تنخواہ ملتے ہی ایک مخصوص رقم اپنے ماں باپ اور بہن کو ضرور بھیجتے۔

اشفاق اور سلمٰی دونوں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتے کہ عزت سے وقت گزر گیا اور سفید پوشی کا بھرم بھی قائم رہا۔ اب دونوں کو صرف سدرہ کی شادی کی فکر تھی۔ وہ کسی اچھے رشتے کے انتظار میں تھے تاکہ اس کے فرض سے بھی سبکدوش ہو سکیں۔ لیکن شاید ابھی اس کام میں دیر تھی۔

دونوں میاں بیوی بہت قناعت پسند اور صبر کرنے والے تھے۔ وہ جانتے تھے' جب اس کی شادی کا وقت آئے گا تو خود بخود اللہ تعالیٰ کی ذات کوئی وسیلہ بنا دے گی۔ لیکن سدرہ کی اپنی ہی دنیا تھی اور وہ گھر کے لیے کوشش کیے جا رہی تھی۔ کچھ عرصہ قبل اسے ایک بہت اچھی کمپنی میں کمپیوٹر سیکشن میں اچھی تنخواہ پر جاب مل گئی تھی۔ اب اسے لگتا تھا' وہ اپنی منزل کے بہت قریب ہے اور ایک دن ایسا آیا' جب اس نے اپنے امی اور بابا سے ایک گھر کی فرمائش کی تھی اور ساتھ ہی اپنے اکاؤنٹ میں جمع رقم کے بارے میں بتایا تھا۔ تاکہ پلاٹ پر گھر بنانے کے لیے کام شروع کیا جا سکے۔ پھر بعد میں جو کمی بیشی ہو گی' وہ بھائیوں سے مدد لے لیں گے۔ سلمٰی اس کی خواہش کو بڑی اچھی طرح جانتی تھی۔ اور یہ بھی جانتی تھی کہ سدرہ اپنی تنخواہ بینک میں کیوں جمع کراتی ہے۔ صرف از حد ضرورت کے وقت ہی وہ رقم گھر میں دیتی تھی۔ ورنہ نہیں۔

سلمٰی بھی یہ سوچ کر چپ تھی کہ جلد ہی سدرہ کی شادی ہو جائے گی اور یہی رقم اس کے جہیز میں کام آئے گی اور یوں سدرہ اپنے سارے خواب سسرال میں جا کر پورے کرے گی۔ لیکن ابھی انہیں کوئی رشتہ پسند نہیں آیا تھا۔ پھر بھی دونوں میاں بیوی نے بیٹی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ جلد ہی اس کی شادی ہو جائے گی اور وہ اپنے گھر گرہستی میں گم ہو جائے گی۔ رہے یہ دونوں بیوی تو ان کی زیادہ زندگی تو گزر ہی گئی۔ جو تھوڑی سی رہ گئی ہے' وہ بھی گزر جائے گی۔ وہ اپنی رقم بچا کے رکھے آگے چل کر اس کے کام آئے گی لیکن سدرہ نے ان کی ایک نہیں سنی اور یہ کہہ کر ان کو چپ کرا دیا کہ اگر وہ ساری زندگی ان کی خوشیوں اور آرام کے لیے محنت کر سکتے ہیں تو کیا وہ ان کو یہ خوشی نہیں دے سکتی' وہ ان کے لیے اتنا سا بھی نہیں کر سکتی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ اس کی اپنی بھی تو خوشی اور زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے اور یوں پلاٹ پہ گھر کی بنیادیں پڑنا شروع ہو گئیں۔ جواد اور حماد نے بھی مقدور بھر اپنا حصہ ڈالا۔

اور سدرہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی' جب چند ہی مہینوں میں اس کے خواب کو تعبیر مل گئی اور بہت جلد وہ وہاں شفٹ ہو گئے۔

☼ ☼ ☼
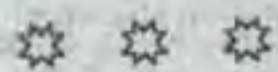
سدرہ اب بہت خوش رہنے لگی تھی۔ بہت دل سے اس نے اپنے گھر اور خاص کر کے اپنے کمرے کو

سجایا تھا۔ ہر چیز میں ایک نیا پن تھا۔ اس کو یوں خوش دیکھ کر اشفاق اور سلمیٰ بھی نہال ہو جاتے۔ انہوں نے گھر میں خیر و برکت کے لیے قرآن خوانی بھی کرائی۔ بہت جلد ان کی اچھی عادات کی وجہ سے آس پڑوس سے ان کے اچھے تعلقات استوار ہو گئے۔

اور پھر نئے گھر میں آنا' جیسے ان کے لیے مبارک ثابت ہوا۔

سدرہ کے تایا جی کی وساطت سے سدرہ کا ایک بہت اچھا رشتہ آیا۔ کسی بھی قسم کی چھان بین کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ تایا جی ان کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ اسی لیے بہت جلد گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اس چھوٹے سے گھر میں رونقیں لگ گئیں۔ دونوں بھائی اور بھابیاں بھی شادی میں شریک ہونے کے لیے بہت پہلے سے آگئے۔ سب نے اپنے دل کے ارمان پورے کیے اور یوں سدرہ آنکھوں میں نئے خواب سجائے ارسلان کے سنگ اپنے اس چھوٹے سے گھر سے رخصت ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"سدرہ! میں تو آج سے آفس جوائن کر رہا ہوں۔ تمہاری چھٹی کب ختم ہو رہی ہے؟"

آج ان کی شادی کو دو ہفتے ہو چکے تھے۔ سدرہ نے اس عرصے میں ارسلان کو جتنا جانا تھا تو وہ اسے ہر لحاظ سے اچھا ہی لگا تھا۔ بہت خیال رکھنے والا اور بہت ہی فرماں بردار بیٹا تھا۔ ماں کی ہر بات کو حکم کا درجہ دینے والا۔ اس کے والد حیات نہیں تھے۔ بہت اچھا بھائی تھا۔ اس سے چھوٹی تین بہنیں تھیں جو ابھی اسکول کالج میں پڑھ رہی تھیں۔ ان سب رشتوں کو نبھانے کے ساتھ ساتھ وہ بہت ہی پیار کرنے والا اور خیال رکھنے والا شریک سفر بھی تھا۔ سدرہ بہت جلد اس پرخلوص سی فیملی میں گھل مل گئی۔ لیکن آج ارسلان کے اس سوال نے اسے حیران کر دیا۔

وہ تو سوچ رہی تھی کہ وہ ملازمت سے استعفا دے دے گی۔ کیونکہ حقیقتاً" وہ ایک گھریلو سی لڑکی تھی۔ گھر گرہستی کو سنبھالنے والی' ملازمت تو وہ صرف مجبوری کے تحت کر رہی تھی اور اب وہ تھکنے لگی تھی۔ یہ تو انسان کی فطرت ہے کہ جب انسان اپنی منزل پا لیتا ہے تو سستانے کو جی چاہتا ہے۔ اسی لیے اب بھی صرف گھر سنبھالنا چاہتی تھی۔ آرام کرنا چاہتی تھی۔ اسے نہیں لگتا تھا کہ اب اسے ملازمت کی ضرورت بھی ہے۔ کیونکہ ارسلان کی فیملی ان لوگوں سے کافی خوش حال تھی۔ ارسلان کی بہت اچھی ملازمت تھی بلکہ اسے تو لگتا تھا کہ ارسلان خود اسے ملازمت سے منع کر دے گا۔ لیکن اس کا سوال سدرہ کی توقع کے خلاف تھا۔

"ارسلان! میرا نہیں خیال کہ مجھے آفس جوائن کرنا چاہیے۔ میں ریزائن دینے کا سوچ رہی ہوں۔" اس نے بڑے سادہ سے لہجے میں اپنا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

"ارے! یہ بے وقوفی کبھی نہ کرنا۔"

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بالوں میں برش کرتے ارسلان کا ہاتھ ایک دم رکا تھا۔ اس کے لہجے میں ناگواری تھی۔ اس نے برش وہیں پہ پھینکا اور اس کے پاس آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"میرا مطلب ہے' آج کل کے اس دور میں اچھی جاب ملتی کہاں ہے۔ تمہیں جلد ہی آفس جوائن کر لینا چاہیے۔" اس کا ہاتھ پکڑے وہ نسبتاً" نرم لہجے میں گویا ہوا۔

"لیکن ارسلان! میرا جاب کرنے کو بالکل دل نہیں کرتا۔" وہ ایسے بولی جیسے شوہر سے کوئی فرمائش کر رہی ہو۔

"سدرہ! میں اس گھر کا واحد مرد ہوں۔ مجھ پہ بہت سی ذمہ داریاں ہیں۔ اگر تم میری مدد کرو گی تو مجھے آسانی ہو جائے گی۔ میری ہیلپ ہو جائے گی۔ اب تم بھی اس گھر کی فرد ہو۔ میرے دکھ سکھ کی ساتھی ہو۔ ہم دونوں کام کریں گے تو ہمارا معیار زندگی اچھا ہو جائے گا۔ اس گھر کے اخراجات' بہنوں کی تعلیم' ان کی شادیاں اور سب سے بڑھ کر اپنے آنے والے بچوں کے لیے ان کو اچھا معیار زندگی دینے کے لیے ہمیں مل کے کوشش

کرنی ہے اور جب تم اپنے گھر والوں کے لیے جاب کر سکتی ہو تو کیا تمہارا مجھ سے ایسا رشتہ نہیں کہ تم میرے ساتھ کھڑی ہو؟ کیا تم مجھے ذمہ داریوں کے بوجھ تلے اکیلا چھوڑ دو گی؟"

اب وہ ایموشنلی بلیک میلنگ پہ اتر آیا تھا۔ کیونکہ اب وہ اسے یہ تو بتا نہیں سکتا تھا کہ اس نے تو سدرہ سے شادی ہی اس لیے کی ہے کہ وہ ملازمت کرتی ہے۔ اس نے شروع سے ہی اپنی امی سے کہہ رکھا تھا کہ وہ شادی ہی ایسی لڑکی سے کرے گا جو پڑھی لکھی ہو اور نہ صرف ملازمت کرتی ہو۔ بلکہ کافی اچھی ملازمت کرتی ہو۔ آج کل کے اس مشینی دور میں اگر اس طرح جوڑ توڑ والی منصوبہ بندی نہ کی جائے تو زندگی گزر تو جاتی ہے۔ لیکن سہل ہرگز نہیں ہوتی۔ اس نے اپنی آسانی کے لیے ہی تو سدرہ جیسی عام شکل و صورت کی اور اٹھائیس سالہ لڑکی سے شادی کی تھی۔ ورنہ اس کی اپنی فیملی میں کتنی کم عمر اور خوب صورت لڑکیاں تھیں جو اس کی وجاہت پر مرتی تھیں۔

اس سے پہلے کہ اس کی باتوں پہ حیران ہوتی سدرہ اسے کوئی جواب دیتی، ارسلان کا موبائل بج اٹھا تھا۔ فون سنتا ہوا ارسلان سدرہ کو کافی ڈسٹرب لگا تھا۔

"ماموں! آپ بے فکر ہو جائیں۔ آپ کے آنے سے پہلے میں ان شاء اللہ کچھ نہ کچھ انتظام کر لوں گا۔"

"جی جی! بالکل۔" اس کے ساتھ ہی اس نے اللہ حافظ کہہ کر فون رکھ دیا تھا۔

"کیا بات ہے ارسلان! خیریت تو ہے نا؟ آپ پریشان لگ رہے ہیں۔" وہ اس کے ماتھے کی شکنوں کو دیکھتے ہوئے پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"ہاں یار! خیریت ہی ہے۔ لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں کوئی اچھا سا کرائے کا مکان دیکھنا پڑے گا۔" پیشانی کو مسلتے ہوئے اس نے جو بات کی تھی وہ کچھ دیر کے لیے تو سدرہ کی سمجھ میں ہی نہ آئی۔

"کرائے کا مکان۔۔۔؟"

"کیا مطلب؟ کیا یہ آپ کا گھر نہیں؟" وہ نا کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔

"ارے! نہیں۔۔۔ یہ گھر ہمارا کہاں ہے۔ میرے ماموں کا ہے۔ ان ہی کا فون تھا۔ وہ پہلے یہیں ر تھے۔ لیکن پھر جاب کے سلسلے میں کراچی جانا پڑا تو بھی وہیں شفٹ ہو گئی۔ ہم یہاں آ گئے۔ یوں عرصے کے لیے ہماری کرائے کے مکانوں سے چھوٹ گئی۔ لیکن اب میرے ماموں ریٹائر ہو رہے اور انہیں واپس یہیں حیدرآباد آنا ہے تو مجھے پہلے انفارم کر رہے تھے کہ ہم ان کے آنے تک کوئی دیکھ کر وہاں شفٹ ہو سکیں۔ پتا ہے سدرہ! مجھے کرائے کے مکانوں میں رہنا بالکل پسند نہیں۔ میرا خواب کہ میرا ایک ذاتی گھر ہو۔ لیکن مجھ پہ بہت ذمہ دار ہیں۔ اس خواب کی تعبیر بہت جلد تو ممکن نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم میرا ساتھ دو گی تو بہت جلد ہمارے سارے خواب پورے ہو جائیں گے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے سدرہ کا ہاتھ تھاما اور ا لگا جیسے ایک بھاری بوجھ اس کے سینے پہ آ گرا ہو۔ جیسے وہ جہاں سے چلی تھی، دوبارہ وہیں پہ پہنچ گئی ہو۔ جیسے کوئی مسافر منزل تک پہنچنے کی کوشش میں لمبی مسافت طے کر کے بھی اپنی منزل تک نہ پہنچ سکے اور دوبارہ سفر شروع کرنا پڑے۔

ارسلان کچھ اور بھی کہہ رہا تھا۔ شاید اسے کنوینس کرنے کی کوشش میں کچھ اور ذمہ داریوں کی فہرست گنوا رہا تھا۔ لیکن وہ حیرت اور صدمے کی زیادتی سے کچھ بھی نہیں بول پا رہی تھی۔ اس کا جسم بے جان ہونے لگا۔ آنکھوں کے آگے دھند چھانے لگی۔ ایسے میں منزل کہاں دکھائی دیتی ہے اور دھند تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

صدف آصف

"بیٹا جانی... ماں کہنا بہت آسان ہے۔ مگر ماں کہلوانا بہت مشکل۔ ہر لڑکی کو ماں بننے کے بعد اپنی ماں کی تکلیفوں کا احساس ہوتا ہے۔" نجف شادی سے قبل امی جان کی جو باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتی تھی، اب پہلے وانیہ پھر ربیع کی پیدائش کے بعد انہیں بار بار یاد کرتی۔ ہر انسان اپنے تجربے سے سیکھتا ہے۔ اس کے بعد ہی اسے دوسروں کی باتوں کے معنی و مطلب اچھی طرح سے سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ اس نے بھی ایسے ہی سیکھا۔

اماں کو گزرے کئی سال بیت چکے تھے، مگر جب ان کا ذکر خیر آتا تو نجف کی آنکھیں ان کی محبت اور قربانیوں کو یاد کر کے خود بخود بھیگ جاتیں۔ آج وہ بھی تو ماں بن کر اسی مقام پر آکھڑی ہوئی تھی۔ جہاں کل اس کی امی جان تھیں۔ اکثر خوابوں میں بھی وہ اسے سفید لباس میں ہنستی مسکراتی دکھائی دیتیں تو اس کا دل سکون کی دولت سے مالا مال ہو جاتا۔

"اماں کے چہرے پر کتنا نور ہے۔" وہ جب بھی پریشان ہوتی، اماں اسے سہارا دینے خوابوں میں چلی آتیں۔ نجف سوتے میں ہی خوش ہو رہی تھی کہ اچانک چونک کر نیند سے جاگی۔

"باجی... اے باجی صفائی شروع کروں۔" شازیہ کی پتلی آواز نے ہمیشہ کی طرح ٹھیک ساڑھے نو بجے نجف کے کانوں میں رس گھولنا شروع کر دیا۔ اتنا اچھا خواب ٹوٹنے پر وہ بھنا اٹھی۔

"اللہ کی بندی! کبھی تو لیٹ ہو جایا کرو۔ بڑی مشکل سے منے کی آنکھ نو بجے لگی تو میں بھی سو پائی اور تم ٹھک کر کے پہنچ گئیں۔ ساری رات یہ جگاتا ہے۔ اس وجہ سے میری نیند بھی پوری نہیں ہو پاتی۔ اسی لیے میں نے تمہاری اماں سے شروع دن ہی کہہ دیا تھا کہ تمہیں کام پر گیارہ بجے کے بعد بھیجے۔ مگر وہ سنتی ہی نہیں۔ روزانہ جلدی بھیج دیتی ہے۔" نجف نے آٹھ سالہ شازیہ کو عادت کے برخلاف بری طرح سے جھاڑا۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ اسے اپنے لہجے کی تلخی کا احساس ہوا تو لمحہ بھر کو خاموش ہو گئی۔

"وہ باجی... صبح ہم سب ساتھ ہی گھر سے نکل جاتے ہیں نا! گھر دور ہے... اس لیے میرا وہاں سے اکیلے آنا مشکل ہے۔ میری امی مجھے اپنے ساتھ ہی لے آتی ہے۔" اس نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بتایا تو نجف نے سر ہلا دیا۔ پھر وہ ایک ماہ کے ربیع کو تھپکنے لگی، جو اس بحث مباحثہ کی وجہ سے کسمسا اٹھا تھا۔

"اچھا! جاؤ پہلے کمروں کی ڈسٹنگ کرو۔ پھر ربیع کے دھلے کپڑے رسی سے اتار کر تہہ لگا کے اس کے کاٹ میں رکھ دینا۔ میں بعد میں بچوں کی الماری میں رکھ دوں گی۔" نجف نے نیند سے بند ہوتی آنکھوں کو جھپکا اور اسے ہدایت دے کر کروٹ بدل لی۔

☼ ☼ ☼
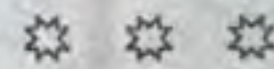
ربیع کی پیدائش کے بعد نجف نے گھر کی صفائی کرنے والی ماسی نعیمہ سے اوپر کے کاموں کے لیے ایک لڑکی کا انتظام کرنے کے لیے کہا۔ بیٹا آپریشن سے ہوا تھا۔ اسی لیے وہ ابھی تک مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہو سکی تھی۔ ڈاکٹر کی جانب سے جھکنے اور بھاری چیزیں اٹھانے کی سختی سے منادی تھی۔ بڑی بیٹی وانیہ ابھی چھ سال کی تھی۔ وہ پہلی جماعت میں پڑھتی تھی۔ شوہر سعید علی فارماسیوٹیکل کمپنی میں جاب کرتے تھے۔ نوکری کی نوعیت ایسی تھی کہ وہ رات دس بجے سے قبل گھر میں داخل نہیں ہو پاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ تھا۔ پورے دن اکیلے رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ ان سب مسائل کا حل اسے یہ ہی نظر آیا کہ کچھ عرصے کے لیے ایک کام والی پورے دن کے لیے رکھ لے۔ اس طرح اس کو دو سراہٹ بھی ہو جاتی اور وانیہ کو بھی کوئی سنبھال لیتا۔ لیکن نعیمہ جب اپنی سب سے چھوٹی بیٹی شازیہ کو اس کے یہاں کام پر رکھوانے کے لیے لے کر آئی تو نجف نے اس کی کم عمری کی وجہ سے "فوراً" ہی انکار کر دیا۔ دبلی پتلی سی ڈری سہمی آنکھوں والی بچی کو دیکھ کر نجف کے نرم دل کو کچھ ہوا۔ وہ وانیہ سے چند سال ہی تو بڑی ہوگی۔ ابھی تو اس کے

کھیلنے کی عمر ہے نا کہ کام دھندے پر لگنے کی۔

"ارے... نعیمہ! یہ تو بہت چھوٹی ہے۔ ابھی تو اس کے اسکول جانے کی عمر ہے۔ اسے کیوں ایسے گورکھ دھندوں میں پھنسا رہی ہو؟ کام کرنے کو ساری عمر پڑی ہے۔" نجف نے اسے انکار کرتے ہوئے سمجھایا۔

"باجی... اس مہنگائی میں پیٹ کی روٹی کا انتظام ہوجائے تو یہ ہی بہت ہے۔ اتنی فیسیں، پھر مہنگی کتابیں... کہاں سے پڑھائیں؟" وہ لجاجت سے نجف کا ہاتھ تھام کر بولی۔

"پھر بھی... میرے میاں کو پتا چلا کہ میں اتنی چھوٹی سی بچی سے کام لے رہی ہوں تو وہ خفا ہوں گے۔ وہ ویسے بھی چائلڈ لیبر کے خلاف ہیں۔ اس لیے تم میرے گھر کے لیے کسی بڑی لڑکی کا انتظام کردو۔" نجف نے معذرت کی تو وہ مایوس نظر آنے لگی۔

"باجی! کیا کروں۔ لڑکی ذات ہے۔ میں اور اس کی بہنیں صبح سویرے کام پر نکل جاتی ہیں اور شام ڈھلے گھر واپسی ہوتی ہے۔ پیچھے رہ جاتا ہے اس کا نشئی باپ اور اس کے جواری دوست... ڈرتی ہوں کہ کسی دن میری بچی کو ہی جوئے میں نہ ہار بیٹھے۔ آپ کا گھر دیکھا بھالا ہے۔ شازیہ شام تک یہاں رہے گی تو مجھے سکون رہے گا۔ پھر کچھ پیسے بھی مل جائیں گے۔"

نعیمہ کی بات نے نجف کو سوچ میں مبتلا کردیا۔ وہ فیصلہ نہیں کرپارہی تھی۔ شازیہ اور اس کی ماں کی پرامید نگاہیں نجف پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے سعید کو اس معاملے میں منانے کا فیصلہ کیا۔

"اچھا! ٹھیک ہے... مگر یہ صرف اوپر کے چھوٹے موٹے کام ہی کرے گی یا وانیہ سے کھیلے گی۔ گھر کی باقی صفائی تم آکر کروگی۔" نجف کو ایک ماں کی مشکلات اور شازیہ کی معصومیت پر رحم آگیا تو اس نے ہامی بھرلی۔ یہ بات سن کر دونوں ماں بیٹی مسرور نظر آنے لگیں۔

نجف منے کے رونے کی آواز کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کا پیمپر لیک ہوگیا تھا۔ وہ اس کو بدلنے میں لگ گئی۔ نعیمہ اسے دعائیں دیتے ہوئے چلی گئی۔

نجف تھوڑی دیر بعد کسی کام سے ٹی وی لاؤنج کی طرف آئی تو دیکھا شازیہ ایک کونے میں سکڑی سمٹی گرمی میں بیٹھی ہے۔

"ارے... اوپر کرسی پر بیٹھو۔ یہ دیکھو! پنکھے کا بٹن... جب یہاں بیٹھنا ہو تو اسے آن کرلیا کرو۔" نجف نے پنکھا چلاتے ہوئے اسے آہستہ آہستہ گھر کی چیزوں سے روشناس کرانا شروع کردیا۔

"تم اپنی اماں کے ساتھ گئی کیوں نہیں؟ کل سے کام پر آجاتیں۔" نجف نے ڈبل روٹی اور انڈے فریج سے نکالتے ہوئے پوچھا۔ وہ لاؤنج سے متصل کچن میں ناشتا بنانے کھڑی ہوگئی۔

"نہیں جی... وہ اماں کہہ رہی تھیں کہ آپ کا منا بہت چھوٹا ہے تو میں آج سے ہی کام پر لگ جاؤں۔" اس نے جھجکتے ہوئے بتایا۔

"چلو... پہلے ناشتا کرلو۔ پھر کام شروع کرنا... ٹھیک ہے۔" نجف نے اس کے سامنے بھی چائے کا کپ، انڈا اور توس رکھے۔

"نہیں باجی صبح اچار، رات کی روٹی سے کھا کر نکلی تھی۔" اس نے شرما کر کہا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی نظریں انڈے کا طواف کررہی تھیں۔

نجف کو احساس تھا کہ ملک میں ایسے کتنے گھرانے ہیں، جہاں روٹی کھانے کا مطلب صرف ایک سوکھی روٹی ہی ہوتی ہے۔ جسے چائے، پیاز یا اچار سے کھا کر اللہ کا شکر ادا کیا جاتا ہے اور ایسے لوگ بھی ہیں جن کی میزیں ایک وقت میں بے شمار پکوانوں سے بھری ہوتی ہیں۔ مگر وہ پھر بھی کمی کا رونا روتے رہتے ہیں۔ کھانوں میں ذائقہ ہی نہیں، کی شکایت کی جاتی ہے۔ اصل میں صبر و شکر کی کمی ہوگئی ہے۔ کثرت استعمال نے چیزوں کی اہمیت کم کردی ہے۔ نجف کو یاد تھا کہ اس کی والدہ جب کسی کی دعوت میں چکن بناتی تھی تو جیسے ان سب بھائی بہنوں کی عید ہوجاتی۔ اب تو تقریباً ہر روز ہی گھر میں مرغی پک رہی ہوتی ہے۔ مگر وہ ذائقہ ندارد تھا، جو نجف کو اپنے بچپن میں کھا کر آتا تھا۔ جب سادگی کی جگہ نمود و نمائش لے لے، تو معاشرے میں ایسے ہی مسائل جنم لیتے ہیں۔

"کوئی بات نہیں۔ اب گیارہ بج رہے ہیں۔ تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔ کھالو۔" نجف نے اپنے خیالات سے چھٹکارا پایا اور اس کی حوصلہ افزائی کی۔ وہ رغبت سے کھانے بیٹھ گئی۔ ربیع کی مالش کرتے ہوئے بھی نجف کی آنکھیں شازیہ پر ہی لگی ہوئی تھیں۔ اس نے بڑے سلیقے سے اپنے اور نجف کے ناشتے کے برتن سنک میں رکھ کر دھوئے اور اس کے بعد لاؤنج میں پھیلے کشن اور اخبارات کو ان کی جگہوں پر رکھنے لگی۔

"ہوں۔ بچی سمجھ دار ہے۔ نعیمہ خوب سمجھا کر لائی ہے... گزارہ ہوجائے گا۔" نجف نے طمانیت سوچا اور ربیع کو نہلانے کے لیے واش روم کی طرف چل دی۔ اس سے پہلے تو اسے یہ ہی ڈر تھا کہ شازیہ کے ساتھ بہت مغز ماری کرنی پڑے گی۔

☼ ☼ ☼

"شازیہ۔ شازیہ۔" خاموشی کے طویل وقفے نے نجف کو چونکایا۔ چوری چکاری کے واقعات اتنے عام ہوگئے ہیں کہ کسی پر اعتماد کرتے ہوئے دل ڈرتا ہے۔ نجف نے ذہن سے اندیشوں کو جھٹکا اور دوبارہ شازیہ کو پکارا۔ مگر جواب ندارد۔

"دوسرے کمرے کی تو الماریاں بھی بغیر تالے کے کھلی پڑی رہتی ہیں۔" نجف نے سوچا۔ پھر وہ دھیرے سے ربیع کے پہلو سے اٹھی کہ کہیں اس کی آنکھ نہ کھل جائے اور باہر نکل آئی۔ اس نے شفاف شیشے کی کھڑکی کے پار دیکھا۔ شازیہ، وانیہ کی رائٹنگ ٹیبل پر کسی کام میں مصروف نظر آئی۔

"یہ کیا کررہی ہے؟" نجف نے بغور دیکھا تو اسے احساس ہوا۔ وہ وانیہ کی ڈرائنگ کی کتاب پر پاس پڑی رنگوں کی ڈبیا سے رنگ بھرنے میں مصروف تھی۔ یقیناً" وانیہ نے رات کو کھیلتے کھیلتے اپنی چیزیں وہیں چھوڑدی تھیں، اب اسکول گئی ہوئی تھی۔ نجف نے شازیہ کا چہرہ دیکھا جو اس وقت دھنک کے ساتوں رنگوں سے مزین تھا۔

"یہ بھی تو بچی ہے۔ اس کو بھی کتاب میں بنی ہوئی اشکال میں رنگ بھرنے میں مزا آتا ہوگا۔ جیسے میری وانی کو آتا ہے۔" نجف نے دل میں سوچا اور چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کا گداز دل بچی کی پل بھر کی خوشی چھیننے پر کسی طرح راضی نہ ہوا۔ اس لیے وہ خاموشی سے پلٹ گئی۔

"اس دفعہ بازار جاؤں گی تو شازیہ کے لیے ایک رنگوں کی کتاب اور کچھ رنگین پنسلیں خرید لاؤں گی۔" نجف نے سوچا اور مسکرادی۔

اس نے رات کو اپنے میاں جی سے بھی اس بات کا ذکر کیا تو انہوں نے تاکید کی کہ وہ اس بچی کے لیے کلرنگ بک کے علاوہ دوسری کتابیں بھی لائے اور فارغ وقت میں اسے تھوڑا لکھنا پڑھنا بھی سکھادے۔ نجف نے اثبات میں سرہلادیا۔

☼ ☼ ☼

"مما! میری کلر پنسلیں نہیں مل رہیں، آج مجھے کلرنگ بک میں کام کرنا ہے... آپ پلیز! اچل کے دیکھیں نا۔" وانیہ نے نجف کا ہاتھ تھام کر گھسیٹا۔ آج ہفتہ تھا۔ اس کی چھٹی تھی۔ اس لیے وہ اس دن اپنی پسند کے کھیل کھیلتی تھی۔ اب چونکہ اس پر رنگ بھرنے کا سودا سمایا تھا۔ اس لیے جب تک اسے رنگوں والی ڈبیا نہیں ملتی، نہ وہ خود سکون سے بیٹھتی اور نہ ہی ماں کو بیٹھنے دیتی۔

نجف نے ہر جگہ رنگوں والی ڈبیا ڈھونڈ ڈالی۔ مگر نہ ملنا تھی، نہ ملی۔ وانیہ کی وارڈ روب، اسٹور، پرانے بیگ، دوسرے کمرے غرض ہر جگہ اچھی اچھی طرح سے دیکھ لیا۔ مگر وہ نہیں ملی۔ اب وانیہ نے باقاعدہ طور پر رونا شروع کردیا۔ نجف الگ پریشان کہ کہاں گئی۔

"شازیہ! تم نے وانیہ کی کلر پنسلیں تو نہیں دیکھیں؟" شازیہ چھت پر بندھی رسی پر ربیع کے کپڑے پھیلانے گئی ہوئی تھی۔ وہ واپس آئی تو نجف نے اس سے پوچھا۔

"نہیں تو... باجی جی... میں نے نہیں دیکھا۔" وہ

قدرے پریشان نظر آنے لگی۔ مگر اس نے انکار میں سر ہلایا۔

"چلو۔۔۔ خیر۔۔۔ دیکھنا۔۔۔ کہیں نظر آئے تو بتانا۔" نجف نے بات ختم کی اور وانیہ کو پرانے رنگ دے کر بہلانے کی کوشش کی۔ مگر اس نے ان کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

"مجھے وہ والے ہی رنگ چاہئیں، جو تایا ابو لائے تھے۔" اس نے ضد کی۔ وہ کلرنگ ڈبیا بہت خوب صورت تھی۔ اس میں پنسل کلر، واٹر کلر اور کریان بھی تھے جو نجف کے جیٹھ آسٹریلیا سے پچھلے سال وانیہ کے لیے لائے تھے۔ نجف حیران و پریشان تھی کہ اس سے قبل تو کوئی چیز گھر سے ایسے غائب نہیں ہوئی تھی۔ اتنے میں ربیع کے زور سے رونے کی آواز آنے لگی تو وہ بے قرار ہو کر اس کے کمرے کی طرف بھاگی۔

☼ ☼ ☼

"دیکھو بیگم ۔۔۔ بعض اوقات ہم گناہ کرنا نہیں چاہتے۔ مگر ہمارے آس پاس والے ہمیں اس پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ شازیہ کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ رہا ہو۔" سعید نے نجف سے سارا واقعہ سننے کے بعد بڑی نرمی سے کہا۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں کہ اگر شازیہ نے وہ باکس چھپایا ہے تو اس کی ذمہ دار میں ہوں؟" نجف تلخی سے بولی۔

"ہاں مگر میں یہاں صرف تمہاری بات نہیں کر رہا بلکہ اپنی معاشرتی ناہمواریوں کے حوالے سے بول رہا ہوں۔ جو ایک انسان کو مجرم بننے پر مجبور کر دیتی ہیں۔" سعید نے بیوی کا ہاتھ پکڑ لیا اور پوری سنجیدگی سے گویا ہوئے۔

"دیکھو! شازیہ کا معاملہ تو چھوٹا سا تھا۔ تم رنگوں کے بارے میں اس کی خواہش سے بھی آشنا ہو چکی تھیں دل میں نیک نیتی سے اس کے لیے کلرنگ بک لانے کا ارادہ بھی باندھا، مگر پورا نہ کر سکیں۔" انہوں نے نجف کو سمجھایا۔

"بس۔۔۔ وہ ربیع کی وجہ سے میں بازار نہ جا سکی۔" نجف نے ہاتھ مسلتے ہوئے صفائی پیش کی۔

"کیا۔۔۔ اس کی جگہ وانیہ ہوتی، تب بھی اس کی خواہش پوری کرنے میں تم اتنی دیر لگاتیں؟ کسی نہ کسی طرح یہ کام کر ہی لیتیں نا؟" سعید نے مسکرا کر وانیہ کو گود میں بٹھایا۔ وہ ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"وہ تو ہے۔۔۔ مگر آپ پلیز! میری بچی کا مقابلہ۔۔۔ شازیہ سے تو نہ کریں۔" نجف میاں جی کی باتوں پر چڑ گئی۔

"بس۔۔۔ یہیں سے تو پتا چلتا ہے کہ ہم اسلامی تعلیمات پر کتنے عمل پیرا ہیں۔ ہمارا دین ہمیں صرف قرآن شریف کی تلاوت کا اذن نہیں دیتا۔ بلکہ اس کے اندر ہمارے لیے جو ضابطہ حیات تخلیق کیا گیا ہے اس کو سمجھنے اور اس کے حساب سے زندگی گزارنے کا حکم دیتا ہے۔ ہم لوگ تقریریں تو زور شور سے کرتے ہیں۔ مگر جہاں عمل کا معاملہ آتا ہے تو ہم زیر و زبر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ معاشرے سے مساوات کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اسی لیے جرائم کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہم جیسا اپنے لیے اچھا سوچتے ہیں، دوسروں کے لیے ویسا کیوں نہیں سوچتے؟ چلو دوسروں کے لیے ویسا نہ کر سکیں، مگر اپنی استطاعت کے حساب سے تو کر سکتے ہیں نا۔۔۔" انہوں نے محبت کو سمجھایا۔ نجف خاموشی سے انہیں سنتی رہی۔

"معاشرے میں فرسودہ روایات کی داغ بیل ڈال دی گئی ہے۔ کئی گھروں میں لڑکیاں جہیز نہ ہونے کی وجہ سے بیٹھی ہیں تو کوئی اپنے بچوں کی شادیوں پر پیسہ پانی کی طرح بہاتا ہے۔ صرف شادی بیاہ کی سجاوٹ کے پیکجز پر لاکھوں روپے پھونک دیے جاتے ہیں جس میں ایک غریب لڑکی سادگی سے اپنے گھر کی ہو سکتی ہے۔ غیر اسلامی تہوار بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے ہیں۔ تقریبات میں دل بھر کے پکوانوں کا ضیاع کیا جاتا ہے۔ کہیں ایک وقت پیٹ بھر کر روٹی کھانے کے بھی لالے پڑے ہوئے ہیں۔ ایسے میں جب کوئی سر پھرا چوری چکاری یا بٹوا چھیننے پر اترا آتا ہے تو اسے سب مل کر برا بھلا کہتے ہیں۔" سعید کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اس معاشرے کا ایک حساس کردار تھے۔ اپنے آس پاس رہنے والے لوگوں کے دکھوں سے آشنا تھے۔ اسی لیے حالات کا حقیقت پسندی سے تجزیہ پیش کر رہے تھے۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔۔۔ اس طرح جو غریب ہو۔۔۔ کیا وہ چوری چکاری پر اتر آئے؟" نجف نے میاں سے اختلاف رائے کیا۔

"میں مجرموں کی حمایت نہیں کر رہا۔ بلکہ میرا موقف یہ ہے کہ جرم کرنے کی وجوہات کا سدباب کرو۔ مجرم بننا ختم ہو جائیں گے۔ ہر ایک عادی یا پیدائشی مجرم نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض اوقات حالات اور اس کے ارد گرد رہنے والوں کی بے حسی اسے اس راہ پر گامزن کر دیتی ہے۔" سعید کا حلق خشک ہونے لگا۔ نجف نے اٹھ کر اسے جلدی سے پانی پلایا۔

"یہ لو۔۔۔ یہ کل۔۔۔ شازیہ کو دے دینا۔" تھوڑی دیر بعد سعید نے اپنا بریف کیس کھولا اور ایک شاپر نجف کو تھمایا۔ اس نے کھول کر دیکھا تو اس میں کلرنگ بک، رائٹنگ سیریز، پنسل ربڑ اور کلر کی ڈبی تھی۔

"وانیہ کے رنگوں کا کیا ہو گا؟ اگر وہ شازیہ لے گئی ہو تو۔۔۔؟" نجف کو تشویش ہوئی کیونکہ وانیہ اپنے رنگوں کے لیے بہت بے چین تھی۔

"کیا پتا یہ صرف تمہارا شک ہو۔ کلرنگ ڈبیا یہیں کہیں پڑی مل جائے۔ جب تک آنکھوں سے نہ دیکھا جائے کسی پر الزام لگانا بہتان کے زمرے میں آتا ہے جس کی بہت سخت سزا ہے۔" سعید نے نجف کو فوراً تنبیہہ کی۔

"اور ہو سکتا ہے کہ یہ اس کا پہلا جرم ہو۔ تمہارا ایک اچھا عمل جرم کی دنیا میں پڑنے والے اس کے پہلے قدم کو روک دے۔" سعید نے کمرے سے نکلتے ہوئے نجف کے سر پر چپت مار کر اسے سمجھایا۔

☼ ☼ ☼

"باجی۔۔۔ اے باجی۔" شازیہ کی مہین آواز نے نجف کو چونکا دیا۔

"کیا بات ہے شازیہ۔۔۔ کوئی کام تھا؟" نجف نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ کمرے کے دروازے پر کھڑی اسے پکار رہی تھی۔

"جی۔۔۔ وہ میں اسٹور کی صفائی کر رہی تھی تو یہ وانیہ بی بی کے رنگوں کا ڈبا پڑا ملا۔" شازیہ نے کلر باکس آگے بڑھایا۔ یہ شازیہ کو کتابیں دینے کے تیسرے دن کا واقعہ تھا۔

"کمال ہے۔۔۔ میں نے وہاں اتنی دفعہ دیکھا تھا۔ خیر! یہیں رکھ دو اور جلدی کام ختم کر کے اے بی سی ڈی والا ایک صفحہ لکھ کر دکھاؤ۔" نجف نے مسکرا کر کہا تو شازیہ کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ شاید وہ بھی پڑھنا چاہتی تھی۔

نجف اپنے میاں جی کے تجربے کو دل سے مان گئی، انہوں سختی سے منع کیا تھا کہ شازیہ سے وانیہ کے رنگوں کے بارے میں کوئی بات نہ کرنا۔ تم اسے کلرز دو گی تو اسے خود ہی احساس ہو جائے گا۔"

شاید یہ ہی ہوا تھا جب شازیہ کو اس کے رنگ مل گئے تو اسے اپنے گناہ کا احساس ہوا ہو اور اس نے وانیہ کے رنگ واپس کر دیے۔ نجف کو امید تھی کہ یہ چھوٹا سا سبق سیکھنے کے بعد شازیہ کے قدم اب غلط راہوں پر کبھی نہیں اٹھیں گے۔

☼

فرزانہ حسین چوہدری

پہلا لقمہ منہ میں رکھتے ہی جنید کے چہرے کا زاویہ بگڑ گیا تھا۔ بمشکل حلق سے نوالہ اتار کر اس نے پلیٹ پرے کھسکائی اور پانی کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگالیا۔

"کیا ہوا... آپ کھا کیوں نہیں رہے؟" حرا نے ڈیڑھ سالہ حبیب کو کھانا کھلاتے ہوئے جنید کی جانب دیکھا۔ جو کھانے سے ہاتھ کھینچ چکا تھا۔

"ماما! کھانا بالکل بھی مزے کا نہیں ہے۔" دس سالہ ٹیپو نے بھی باپ کی تقلید کرتے ہوئے بگڑے موڈ سے کہا۔ سوہا البتہ کھانے کو ذرا ذرا ٹونگ رہی تھی جیسے زبردستی کھا رہی ہو۔

"تمہارا اگر کھانا بنانے کا موڈ نہیں ہوتا تو صاف کہہ دیا کرو میں آفس سے ہی کچھ لے لیا کروں گا مگر خدا کے لیے یوں جان مت چھڑا لیا کرو۔"

طنزیہ لہجے میں کہتے ہوئے صحن میں لگے واش بیسن کی طرف بڑھ گیا۔ ہاتھ دھو کر قریب لگے تولیہ اسٹینڈ کی جانب نگاہ کی تو تولیہ ندارد... جھنجلا کر جیب سے رومال نکال کر ہاتھ پونچھے۔

"ہوا کیا ہے... کچھ پتا بھی تو چلے۔ آپ کی تو ویسے ہی عادت ہو گئی ہے آج کل ذرا ذرا سی بات پر بگڑنے کی۔" حرا نے چڑ کر حبیب کو گود سے اتار کر صوفے پر بٹھایا۔

"میری عادت ہو گئی ہے؟" جنید کا پارہ ہائی ہوا۔ "یہ جو تم نے شاہی قیمہ بنایا ہے نا... ذرا چکھ کر دیکھو اسے اور پھر خود ہی کھا بھی لو... میں واپس جا رہا ہوں۔"

"اچھا رکیں تو میں، آملیٹ بنا..."

"دیر ہو رہی ہے مجھے... ایک تو گرمی میں سلگتے ہوئے آفس سے گھر آؤ۔ ٹریفک سے الگ نمٹو اور گھر آؤ تو..." وہ بڑبڑاتا بائیک کی چابیاں اٹھاتا بیرونی گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔

بائیک باہر نکال کر آٹومیٹک ڈور لاک کو زوردار آواز سے کھینچ کر بند کیا کہ پورا گھر گونج اٹھا تھا۔

"توبہ ہے... نخرے ہیں کہ ختم ہی نہیں ہوتے۔ ہر چیز میں نقص نکالنے کی عادت ہو گئی ہے... تھوڑی سی کمی بیشی کھانے میں ہو جائے تو گھر سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ یہی عادت اولاد میں بھی ہے' ایک تو وقت پر سب تیار کر کے آگے رکھو اوپر سے... اور تم کیا منہ تکتے بیٹھے ہو۔ کھانا شروع کرو۔" حرا نے سارا نزلہ ٹیپو پر گرانا چاہا تھا' مگر وہ بھی جنید کی اولاد تھا۔

"میں نہیں کھا رہا... سالن میں سے اسمیل آرہی ہے۔"

اور نوالہ منہ میں رکھتے ہی خود حرا کا جی چاہا تھا لقمہ اگلنے کو... سالن میں نمک کافی تیز تھا' ٹھیک سے نہ بھننے کے باعث قیمے میں بساند باقی رہ گئی تھی اور شوربہ الگ کچا تھا۔ دیر ہو رہی تھی سو اس نے آج سالن پر خاطر خواہ توجہ دینے کی کوشش ہی نہ کی تھی۔

حرا نے سر پکڑ لیا تھا۔ جنید کا موڈ ٹھیک کرنے کے خیال سے چاول بھگو کر قیمے کے سالن کو قیمہ بریانی کی شکل میں ڈھال لیا تھا کہ بہرحال اسے جنید کی پروا تو تھی۔ ساتھ میں رائتہ' سلاد اور آلو کے کباب چونکہ مہینے کا آخر تھا' اس لیے میٹھا بنانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

لوڈشیڈنگ کے باعث آئس کریم رکھنا بھی اس نے چھوڑ دیا تھا۔

آٹھ بجے تک جنید آفس سے آیا تو اس نے سوہا کو ساتھ لگا کر ٹیبل پر کھانا لگا دیا تھا۔

"واؤ ماما! بریانی بنی ہے۔" ٹیپو کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہی چہکا۔ "دوپہر میں تو بالکل مزا نہیں آیا تھا۔"

"ٹیپو! کھانا کھاؤ خاموشی سے۔" حرا نے اسے گھور کر کہا اور جنید کی جانب دیکھا' اسے رغبت سے کھاتے دیکھ کر دل ہی دل میں شکر ادا کیا' دوپہر کے مقابلے میں یوں بھی اس کا موڈ کافی بہتر تھا اور یہی اس کی اچھی عادت تھی کہ غصے کو سر پر سوار نہیں کرتا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر اس نے برتن سمیٹے پھر ابھی وہ حبیب کو تھپک تھپک کر سلا رہی تھی کہ اس کا سیل بجنے لگا تھا۔ اٹھا کر دیکھا تو کشف کا فون تھا۔

"ہیلو۔" اس نے ایک ہاتھ سے نیند میں کسمساتے حبیب کو تھپکتے ہوئے دوسرے سے سیل کان کو لگایا تھا اور ٹی وی میں منہمک جنید کو اس کا دھیان رکھنے کا اشارہ کرتی خود لاؤنج میں چلی آئی تھی۔
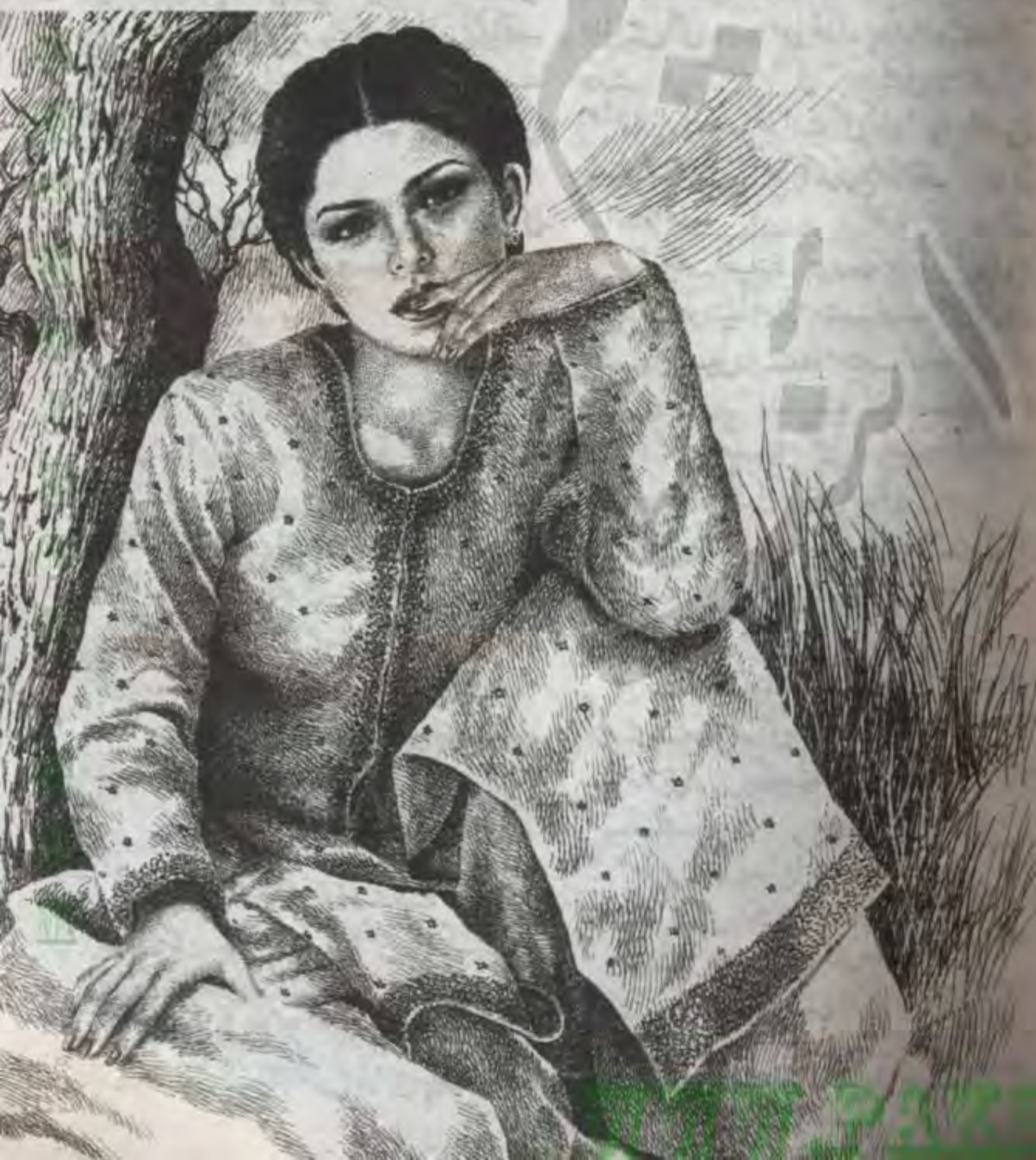
"سمجھ میں نہیں آتا' آخر ان عورتوں کے پاس اتنی باتیں اکٹھی کہاں سے ہو جاتی ہیں حالانکہ ہم مرد سارا دن باہر ہوتے ہیں مگر ہمارے پاس کوئی چٹ پٹے قصے نہیں ہوتے ایک دوسرے کو سنانے کو۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے چینل تبدیل کیا۔

گھنٹہ بھر کے پیکج سے جی بھر کر فائدہ اٹھانے کے بعد حرا فارغ ہوئی تو اس کا کان خوب گرم ہو چکا تھا۔

"اوہ جنید کی کافی تو رہ گئی۔" وہ جلدی سے کچن کی جانب بڑھی۔ پہلے ایک نظر بچوں کے کمرے کی جانب ڈالی تو دونوں دھینگا مشتی میں مصروف تھے۔ زبردستی دونوں کو لٹا کر یونی فارم تیار کیے پھر کچن کا رخ کیا تھا۔ کچن میں پورا سنک رات کے کھانے کے برتنوں سے اٹا پڑا تھا۔ اس نے نظر چرائی۔ اب صبح ہی دیکھیں گے۔"

فٹافٹ کافی تیار کر کے کمرے میں آئی تو جنید ابھی جاگ ہی رہا تھا۔ شکر کرتے ہوئے اسے کافی کا مگ تھمایا۔

"آ گیا خیال۔" جنید نے طنز سے اس کی جانب دیکھا۔

حرا نے ان سنی کر کے بال کھول کر ہاتھوں سے سلجھائے اور کیچر میں لپیٹ لیے گہرا سانس سینے سے خارج کرتی وہ بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔

"اف! بہت تھکن ہو گئی ہے۔"

"نماز نہیں پڑھنی آج تم نے...؟" خالی کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے جنید نے ایک نظر اس پر ڈالی۔

"ہمت نہیں ہو رہی۔" وہ آنکھیں بند کیے کچھ غنودگی سے بولی تھی۔

☼ ☼ ☼

ٹی وی کا سوئچ لگا کر اسے ریموٹ سے آن کیا' پھر بڑے اطمینان کے ساتھ چائے کا فل سائز مگ لے کر وہ صوفے پر براجمان ہو گئی۔

نو بجے کی نیوز ہیڈ لائنز ختم ہو گئی تھیں' اب اس کا پسندیدہ ترین مارننگ شو شروع ہوا ہی چاہتا تھا۔ گرما گرم چائے کا گھونٹ لے کر اس نے ٹی وی کی آواز مزید بڑھا دی۔

"جی تو ناظرین... آج ہم آپ کو جو اسٹوری... اچھا پہلے میں آپ سے کچھ سوال کروں گی۔ پلیز اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر ایک... صرف ایک بار ناظرین! خود سے پوچھیے کہ کیا واقعی ہم انسان کہلائے جانے کے لائق بھی ہیں۔ ہم بھول ہی گئے ہیں کہ ہم مسلمان بھی ہیں۔"

پروگرام کی میزبان نے رنگ بھرنے کے لیے اپنے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور لہجے کے ساتھ ساتھ الفاظ کی ادائی میں بھی وہ درد سمویا تھا کہ پروگرام دیکھنے والا تو دور... جس "مظلوم" کی "درد بھری داستان" کا "اشتہار" لگنے جا رہا تھا' اسے بھی شاید اپنے ساتھ بیتنے جانے والے اس "ظلم" کا اس پروگرام میں آ کر ہی صحیح اندازہ ہوا تھا۔

"جی بیٹا... اب بتاؤ' تمہارے ساتھ اصل میں کیا ہوا تھا؟ دیکھو بچے! گھبراؤ مت... ارے بھئی کوئی پانی لاؤ... لو بیٹا... پانی پیو... روؤ مت... ارے میری جان خود پر قابو رکھو...." رقت سے کہتے ہوئے میزبان کی خود کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں اور اب وہ ایک طرف بیٹھی خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ناظرین! دیکھا آپ نے یہ بچی... اس پر ہم مزید بات کرتے ہیں لیکن... پہلے لیتے ہیں ایک بریک... بس ہم ابھی واپس آئے۔"

ہوسٹ نے اپنے نادیدہ آنسو پونچھ کر کیمرے کی آنکھ میں دیکھا۔ کچھ بھی تھا' آخر بریک میں چلنے والے یہ اشتہار ہی تو اس کے لیے بڑے سے چیک کا سامان کرتے تھے۔

"سوں... سوں۔" حرا نے دوپٹے سے گیلی آنکھیں صاف کیں۔ اسی وقت دروازے پر بیل ہوئی تھی۔

"افوہ! کیا مصیبت ہے۔ اس وقت کون آ گیا؟" وہ کوفت سے چپل پاؤں میں اڑستی گیٹ کی جانب بڑھی۔

"ارے تم...!" ہما کو دیکھ کر وہ خوشگوار حیرت سے مسکرائی۔

"تمہیں تو فرصت ہے نہیں' سوچا خود ہی چل کر جناب کا دیدار کر لیا جائے۔" ہما مسکراتے ہوئے اس کی ہمراہی میں آگے بڑھی۔

وہ حرا کی چچا زاد اور بچپن کی سہیلی تھی' چونکہ ہما کا سسرال حرا کے گھر سے چند گلیاں چھوڑ کر تھا۔ اس لیے اکثر دونوں ہی کا آنا جانا رہتا تھا۔

"کیا کروں یار... گھر کے بکھیڑے جان چھوڑیں تب ہی کہیں نکلوں... اچھا تم بیٹھو... میں چائے لے کر آتی ہوں۔"

اس نے گھر کے بکھراوے پر ایک شرمندہ سی نظر ڈال کر ہما کو لاؤنج میں بٹھایا اور جلدی سے کچن کا رخ کیا تھا جو گھر کے مقابلے میں کہیں زیادہ پھیلا ہوا تھا۔

"تم نے خوامخواہ تکلف کیا۔ ورنہ میں تو ناشتا کر کے ہی آئی تھی۔" ہما نے حرا کو لوازمات کی ٹرے لیے اندر داخل ہوتے دیکھا تو کچھ شرمندگی سے کہا۔

"کتنے دن بعد تو تم آئی ہو... اور میں نے کچھ خاص نہیں کیا' یہ تو بس... لو نا..." حرا نے پلیٹ اس کی جانب بڑھائی تھی

"اچھا تو تم بھی یہ مارننگ شو..." ہما نے چائے کی چسکی لے کر سامنے اسکرین کی جانب دیکھا۔

"ہاں بس... پہلے میں بھی کہاں دیکھتی تھی' پھر مجھے کشف نے اس کا بارے میں بتایا تو سوچا کہ چلو دیکھوں گی کسی روز... اور کیا بتاؤں تمہیں' جب میں نے پہلی بار دیکھا تو بس مت پوچھو کہ... اتنا زبردست پروگرام ہوتا ہے اس کا۔" حرا نے میزبان کا نام لیا۔

"اور پتا ہے... اب تو مجھے اس پروگرام کا اتنا چسکا لگ گیا ہے کہ جب تک نہ دیکھوں چین ہی نہیں آتا۔"

"ہاں' وہ تو میں دیکھ ہی رہی ہوں۔" ہما سوچ کر ہی رہ گئی تھی۔ سارے گھر کا کام چھوڑ' وہ ٹی وی کے آگے براجمان تھی۔

"تم نہیں دیکھتیں؟" حرا کچھ حیران ہوئی تھی۔

"نہیں..."

"کیوں...؟"

"بس یونہی... ایک تو ٹائم ہی نہیں ہوتا۔ گھر کا کام ہی اتنا ہوتا ہے اور تمہیں تو پتا ہے کہ صبح کے کام اگر وقت پر نہ نمٹیں تو سارا دن کوئی بھی کام مکمل نہیں ہو پاتا۔" حرا نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔

"اور پھر امی کو بھی صبح صبح کام کاج چھوڑ کر ٹی وی کے آگے بیٹھنا پسند نہیں ہے... اچھا چھوڑو یہ سب... میں تو تمہیں آج دوپہر قرآن خوانی کے لیے کہنے آئی تھی... دوپہر تین بجے کے بعد ہے... تم ضرور آنا۔" وہ کپ رکھ کر کھڑی ہوئی۔

"وعدہ تو نہیں کرتی البتہ... کوشش کروں گی' تمہیں تو پتا ہے' گھر کے بکھیڑوں سے ٹائم نکال کر کہیں نکلنا میرے لیے کتنا مشکل ہے۔"

"گھر کے بکھیڑے ایک طرف رکھ کر پسندیدہ پروگرام دیکھا جا سکتا ہے مگر..." ہما گہری سانس کھینچ کر رہ گئی۔

"افوہ... سارا پروگرام نکل گیا..." ہما کے جاتے ہی وہ پھر ٹی وی کی جانب متوجہ ہوئی جو اب ختم ہونے کو تھا۔

جلدی جلدی کرتے بھی اسے ہما کے گھر پہنچتے ساڑھے چار ہو ہی گئے تھے۔

"اتنی کوشش کی گھر سے جلدی نکلنے کی مگر... تمہیں تو پتا ہے کہ جنید دوپہر کا کھانا گھر آ کر کھاتے ہیں پھر بچوں کو..." حرا نے کچھ شرمندگی سے تاویل گھڑی تھی۔

"چلو کوئی بات نہیں... تم آ گئیں' یہ ہی بہت ہے۔" ہما اسے لیے ہال کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ سیپارے پڑھے جا چکے تھے سو اس نے یٰسین شریف اٹھائی۔ دعائے ختم قرآن کے بعد دسترخوان لگنا شروع ہوا تو محفل میں موجود اکثر ہی خواتین کے بڑے جذب سے پھیلا کر سروں پر لیے گئے دوپٹے گردنوں میں اتر آئے تھے۔

حرا نے آگے بڑھ کر ہما کی ساس کو سلام کیا تھا اور ان کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی' مگر کچھ ہی دیر میں بے زار ہو گئی تھی' بڑی بی پند و نصائح کا پیکر تھیں۔ پتا نہیں

ہما انہیں کیسے جھیلتی ہے۔ وہ چند منٹ میں ہی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
"لاؤ' میں کچھ ہیلپ کرواؤں تمہاری؟" ہما کے پاس کچن میں آئی تو وہ ٹرے میں چائے کے کپ رکھتی مسکرا کر کھڑی ہو گئی۔
"نہیں' سب ہو گیا ہے' تم آؤ نا۔ اندر سب کے درمیان بیٹھتے ہیں۔"
دونوں ہال کمرے میں آئیں تو' عورتوں کے درمیان بہت سے موضوع زیر بحث تھے۔ دونوں ایک طرف بیٹھ گئیں۔ حرا نے پلیٹ میں کچھ چاٹ نکال لی۔ ہما کی ساس' عصر پڑھنے کے لیے اٹھ کر جا چکی تھیں۔
"سچی۔ ایسے ایسے تلخ حقائق سامنے لاتی ہے کہ عقل حیران اور آنکھیں دنگ رہ جاتی ہیں۔ بہت ہمت والی ہے بھئی۔ سب کے منہ پر ان کو کھری کھری سناتی ہے۔" بہت سی عورتوں کے منہ پر اس مارننگ شو مشہور چرب زبان میزبان کی چرچے تھے۔
"ارے بھئی۔ یہ اسٹار پلس کا بخار کب اترا اور کب ان مارننگ شوز کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا' کچھ پتا ہی نہ چلا۔" پڑوس میں رہنے والے تجمل صاحب کی بیگم نے مصنوعی حیرانی سے کہا۔ ان کے انداز میں استہزاء تھا
بہت سی عورتوں نے منہ چلانے کے دوران ہی منہ بگاڑے تھے۔ پہلے یہی تھیں جو نصیحتیں جاری کرتی تھیں کہ بھئی اپنے ملک کے چینل دیکھنے چاہئیں اور اب۔
"مگر خالہ! اس میں کچھ ایسا غلط تو نہیں ہے۔ یہ لوگ معاشرے میں ہونے والے ظلم و زیادتیاں سب کے سامنے پیش کرتے ہیں' دکھیارے لوگوں کی دل جوئی کرتے ہیں' ان کو انصاف دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔" فراز صاحب کی بہو نے دفاع کیا۔
"ارے بی بی اب میرا منہ تم نہ ہی کھلواؤ تو بہتر ہے' مگر پھر بھی تم مجھے ذرا یہ بتاؤ کہ۔ کسی مظلوم کی داستان' یوں سجا سنوار کر نشر کرنا کہ جس کو نہیں بھی پتا وہ بھی "باخبر" ہو جائے' دوسرے الفاظ میں برہنہ کرنا۔ کیا یہ صحیح ہے؟ اور دل جوئی۔ ہونہہ!" وہ طنز سے ہنسیں۔
"بی بی! جب لاکھوں کا چیک تمہاری جیب میں ہو گا اور میرے جیسی ہزاروں دیوانیاں اپنا کام کاج چھوڑ' اپنا قیمتی وقت برباد کر کے تمہیں دیکھنے اور سننے کو بیٹھیں گی تو کیا تم تھوڑی سی دل جوئی بھی نہ کرو گی؟ میری باتوں کا برا مت ماننا مگر بیٹا۔ تم خود سوچو کہ کیا یہ واقعی ہمارے معاشرے کی یا ہماری اصلاح ہو رہی ہے۔ کبھی کسی دکھوں کی ماری کا تماشا بن رہا ہوتا ہے تو اگلے ہی روز اسٹیج بریانیوں اور مہندی کے اسٹیج سجے ہوتے ہیں اور پھر تو جو "کچھ" ہوتا ہے۔ کیا وہ کسی تیلی تماشے سے کم ہوتا ہے؟ اور کیا کہہ رہی تھیں تم کہ انصاف دلانے کی کوشش۔ ارے جانے دو بیٹا! اگر یوں دو گھنٹے چیخ چلا کر ان دیکھے لوگوں پر کیچڑ اچھال کر انصاف ملتا تو پھر سارے ملک کی عدالتیں بند نہ ہو جاتیں' اور بھلا کتنوں کو انصاف مل چکا اب تک؟"
"مگر خالہ! یہ تو پتا چلتا ہے نا کہ ہمارے ملک میں عورتوں کے ساتھ کتنا ظلم ہو رہا ہے۔ ان پروگراموں کے ذریعے ہمیں ہمارے حقوق سے آگہی اور شعور۔"
"ہائیں۔ تو کیا اب تک یہ مسلم معاشرہ عورتوں کے حقوق سے نابلد چلا آ رہا تھا؟ جو کچھ یہ ہمیں باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں نا۔ چودہ سو سال پہلے ہی بتایا جا چکا ہے۔ ہم عمل سے بے بہرہ ہیں' یہ اور بات ہے' پر بیٹا یہ بتاؤ۔ کتنے لوگ ہیں جو ان معاشرتی برائیوں سے دور ہو چکے ہیں؟ ہمارے مذہب نے تو نیکیوں کا دکھاوا کرنے سے منع فرمایا ہے اور ہم ہیں کہ بدی کا پرچار بھی بڑے فخر سے بلکہ باقاعدہ مینجمنٹ کے تحت کر رہے ہیں۔"
"اچھا' اب میں چلوں۔ بچے بھی گھر پر اکیلے ہیں۔ حبیب کو سلا کر آئی تھی' اٹھ نہ گیا ہو' پتا نہیں سوہا اور ٹیپو اسے سنبھال پائیں گے یا نہیں۔" حرا نے عبایا پہن کر اسکارف اٹھایا تھا۔

"یہ لو۔" ہما نے ایک بڑا شاپر اسے پکڑایا تھا۔
"یہ کیا ہے۔؟"
"کچھ نہیں بس۔ بچوں کے لیے۔"
"اس کی کیا ضرورت تھی۔" حرا نے قدرے خفگی سے اسے دیکھا۔
"ضرورت نہیں تھی بچے' مگر کبھی کبھی ہم یونہی بہت سے کام بلا ضرورت بھی تو کر لیا کرتے ہیں نا۔" ہما کی ساس نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ "لے جاؤ۔ بچے خوش ہو جائیں گے۔"
"جی۔" اس نے تابعداری سے شاپر تھام لیا۔
"اچھا۔ ہما تمہاری نظر میں کوئی اچھا ٹیوٹر ہو تو بتانا مجھے۔"
"کیوں۔" ہما حیران ہوئی۔ "تم تو بچوں کو خود ہی پڑھاتی ہو نا۔"
"ہاں یار۔ مگر اب ٹائم نہیں نکال پاتی' اتنے تو بکھیڑے ہوتے ہیں ان گھروں کے۔ دونوں بچوں کا مڈٹرم کا رزلٹ بالکل بھی اچھا نہیں آیا۔ جنید بھی غصہ کر رہے تھے۔"
"اچھا ٹھیک ہے۔ میں کوشش کروں گی۔" ہما نے اسے تسلی دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ماما! کیبل نہیں آ رہی۔" ٹیپو نے چوتھی بار آ کر بے زاری سے کہا تو وہ جھنجلا اٹھی تھی۔
"نہیں آ رہی تو میں کیا کروں۔ جاؤ جا کر کتابیں کھولو۔ کبھی ٹی وی سے ہٹ کر دھیان پڑھائی کی طرف بھی دے لیا کرو۔ جب دیکھو ٹی وی کے آگے بیٹھے ہوتے ہو اور اب آ کر مجھے پریشان مت کرنا' کپڑے پریس کرنے دو مجھے۔ لائٹ چلی گئی تو اور مصیبت۔" اس نے شرٹ استری کر کے ہینگر میں لٹکائی۔ تب ہی گیٹ پر بائیک کا ہارن بجا تھا اور وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی تھی' جنید آ گیا تھا اور ابھی اس نے روٹی نہیں پکائی تھی۔
کھانے سے فارغ ہو کر جنید نے خبروں کے لیے ٹی

وی کھولا تو کیبل تب بھی نہیں آرہی تھی۔

"پاپا! شام سے ہی نہیں آرہی۔" ٹیپو نے اسے مطلع کیا۔

جنید نے کیبل آپریٹر کو فون گھمایا' پتا چلا کہ اس کے آفس میں شارٹ سرکٹ کے باعث بجلی منقطع ہے' لہٰذا جب تک وائرنگ کا کام مکمل نہیں ہوجاتا اس وقت تک کیبل بند رہے گا۔

"چلو جی۔۔۔ چھٹی ہوئی!" سب ڈھیلے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

صبح جنید اور بچوں کے جانے کے بعد اس نے کچن سمیٹا پھر کچھ خیال آنے پر مشین لگائی تھی۔ ہفتہ بھر کے کپڑوں کا انبار جمع تھا' سو کپڑوں کے ساتھ ساتھ دیگر کام بھی نپٹائے جارہے تھے۔

بے خیالی میں اس کی نگاہ تنقیدی انداز میں گھر کے چاروں طرف گھومی تھی' کتنا ٹائم ہوگیا اس نے گھر کی تفصیلی صفائی نہیں کی تھی' چھتوں کے کونوں پر جگہ جگہ جالے لٹکے نظر آرہے تھے۔ کھڑکیوں پر ٹنگے پردے بھی میلے ہورہے تھے۔ جابہ جا چیزوں پر اٹی گرد۔۔۔

"یہ میں نے اپنے گھر کا کیا حال کرلیا ہے؟ ایسی تو نہیں تھی میں۔۔۔" اس نے اپنا احتساب کیا تو اس پر اپنی ہی کوتاہیاں اور لاپروائیاں آشکار ہوئیں۔ شرمندگی کا ایک گہرا احساس تھا جس نے اسے گھیرا تھا' پھر جیسے کچھ بیدار ہوا تھا اس میں۔۔۔

دیکھتے ہی دیکھتے صحن میں میلے کپڑوں کا ایک پہاڑ اکٹھا ہوچکا تھا۔ پردے' چادریں' بیڈ شیٹس' غلاف' کشن کور غرض جو میلا کپڑا اس کے ہاتھ لگا اس نے اٹھالیا۔۔۔ مشین اسٹارٹ کرکے اس نے سب سے پہلے جالے اتارنے والا لمبا بانس گھر کے ایک کونے سے برآمد کیا تھا اور سر' منہ لپیٹ کر شروع ہوگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کوئی آرہا ہے کیا؟" جنید دوپہر کے کھانے کے لیے گھر آیا تو پورا گھر بلٹ تھا۔

"کیوں۔۔۔ کوئی آئے گا تب ہی گھر کی صفائی ہوگی؟"

حرا نے روٹی اور دال کا ڈونگا اس کے آگے رکھا تھا۔

"کیا بات ہے بھئی!" جنید اپنا سا منہ لے کر رہ گیا تھا۔

"خالی دال۔۔۔؟" کوئی اور اہتمام نہ دیکھ کر وہ بدمزہ ہوا تھا۔

"دیکھ بھی رہے ہیں کہ میں نے سارا گھر پھیلایا ہوا ہے۔۔۔ شکر کریں بروقت کھانا تیار مل گیا ہے۔۔۔ آج فی الحال خالی دال پر ہی گزارہ کرلیں۔"

کھانے سے فارغ ہوکر وہ پھر شروع ہوگئی تھی' ٹیپو اور سوہا نے مل کر اس کے ساتھ ساری سیٹنگ چینج کروائی۔ نئے پردے اور چادریں' کشن الماری سے نکال کر اس نے چڑھائے۔ تین چار گھنٹوں کی محنت سے تینوں کمرے اور برآمدہ جیسے جگر' جگر کرنے لگا تھا۔ تھکن کے باوجود ایک تازہ دم احساس تھا جو اسے محسوس ہورہا تھا۔

"چلو بھئی بچو! اب تم لوگ نہا دھو کر کپڑے چینج کرلو اور تھوڑی دیر آرام کرلو۔۔۔ شام کو پھر ہوم ورک بھی کمپلیٹ کرنا ہوتا ہے تم لوگوں کو۔۔۔ میں ذرا اب کچن کی خبر بھی لے لوں۔۔۔ حبیب ابھی سو رہا ہے۔ اٹھ گیا تو کام نہیں کرنے دے گا۔"

وہ اب کمر کس کر کچن کا رخ کرچکی تھی' سب سے پہلے اس نے فریج کی خبر لی تھی۔ اسے اندر باہر سے صاف ستھرا کرکے ہر چیز سلیقے سے سیٹ کرکے وہ کیبنٹس کی طرف متوجہ ہوئی۔ کتنے شوق سے اس نے پچھلے سال یہ کچن اور باتھ رومز بنوائے تھے' نئی ٹائلیں' کیبنٹس' شیلف' دراز۔۔۔ حالانکہ جنید نے کہا بھی تھا کہ اپنی اس نکلنے والی کمیٹی سے کوئی سونے کی چیز اپنے لیے بنوالے مگر اس نے منع کردیا تھا۔ دو گھنٹے کی انتھک محنت کے بعد کچن جیسے اپنی نئی والی حالت میں لوٹ آیا تھا۔ شیشے کے کیبنٹس میں لگے صاف ستھرے برتن خوب چمک رہے تھے۔

ایک گہرا سانس سینے سے خارج کرکے اس نے ایک تقابلی جائزہ کچن کا لیا۔ میرا پیارا کچن۔۔۔ خوب صورت لگ رہا ہے۔۔۔ وہ خود ہی مسکرا اٹھی تھی۔

شام ہونے کو تھی اور اس کا پورا جسم تھکن سے چور تھا مگر ایک آخری اور سب سے ضروری کام ابھی باقی تھا۔ اس کے صحن میں لگے پودے' جو خود پر توجہ نہ دیے جانے کے باعث شاید بڑی حسرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"ہائے میرے پیارے پودے۔۔۔!"

☼ ☼ ☼

"واہ بھئی۔۔۔ آج تو گھر بڑا جگمگ کررہا ہے۔"

جنید رات کو گھر آیا تو گھر کا بدلا نقشہ اسے حیران کر گیا تھا' گھر کا کونا کونا حرا کی آج کی گئی محنت کا منہ بولتا ثبوت پیش کررہا تھا۔ صحن میں لگے پودے دھلے دھلائے اپنی جگہ بدلنے کے باعث کچھ زیادہ ہی ہرے بھرے لگ رہے تھے' اندرونی کمروں میں بھی بدلی گئی سیٹنگ سے دل کش لگ رہی تھی۔

"پاپا! آج تو ماما نے پورے گھر کو بدل کر رکھ دیا ہے نا۔۔۔؟" سوہا نے مسکرا کر کہا تو وہ بھی ہنس پڑا۔

ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگاتی حرا بھی مسکرا کر رہ گئی تھی۔ "گھر تو وہی ہے۔۔۔ اگر کچھ بدلا ہے تو وہ میری سوچ ہے۔"

"ماما! میں آپ کی ہیلپ کرواؤں۔"

"ہاں بیٹا! یہ جگ اور گلاس لے جاکر ٹیبل پر رکھو۔" اس نے نرمی سے سوہا کو جگ اور گلاس تھمائے۔

☼ ☼ ☼

"شکر ہے کہ کیبل آگئی۔۔۔" دو دن بعد کیبل آئی تو بچوں نے جیسے سکھ کا سانس لیا۔ بچے اسکول سے آئے تو کھانا کھاتے ہی ٹی وی کی جانب لپکے تھے۔

"سوہا' ٹیپو۔۔۔ خبردار! جو ابھی ٹی وی آن کیا تو۔۔۔ چلو چپ چاپ چل کر لیٹ جاؤ۔۔۔ شام کو مدرسے سے پڑھ کر اور اپنا اسکول کا ہوم ورک نمٹا کر پھر دیکھ لینا ٹی وی۔" اس نے فوراً انہیں ٹوکا۔

"مگر ماما۔۔۔ اچھا بس تھوڑی دیر۔۔۔ اتنے دن سے میں نے اپنے فیورٹ کارٹون نہیں دیکھے۔"

"کہہ دیا نا کہ نہیں۔۔۔ آگے فائنل ایگزامز سر پر ہیں' چلو چپ چاپ اپنے کمروں میں۔۔۔ اور اب آواز نہ سنوں دونوں کی۔"

حرا نے دوپہر کے کھانے کے برتن سمیٹے پھر کچن صاف ستھرا کرکے اس نے وضو کرکے ظہر ادا کی تھی۔ نماز سے فارغ ہوکر بچوں کے کمرے میں جھانکا۔ انہیں سوتا پاکر اطمینان سے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ بیڈ پر لیٹتے ہی لگی تھی کہ اس کی نگاہ دائیں جانب لگے بک شیلف پر گئی تھی۔ کتنے دن ہوئے اس نے کچھ بھی نہیں پڑھا۔۔۔ حالانکہ پہلے اسے کچھ پڑھے بنا نیند نہیں آتی تھی اور دوپہر میں تو لازمی وہ سب کاموں سے فارغ ہوکر کچھ نہ کچھ پڑھا کرتی تھی۔ یہ بک شیلف بھی اس نے خاص طور سے بنوائی تھی۔

گرمیوں کی لمبی دوپہروں میں' خاموشی سے اپنے پسندیدہ رائٹر کو پڑھنا کتنا دلچسپ ہے نا!

☼ ☼ ☼

شام کو صحن میں بیٹھی وہ بچوں کو پڑھا رہی تھی ساتھ ساتھ سبزی بھی کاٹی جارہی تھی۔ قریب ہی واکر میں حبیب یہاں سے وہاں گھومتا پھر رہا تھا۔ جب ہما کی آمد ہوئی تھی۔

"دو تین دن سے تمہارے پاس آنے کا سوچ رہی

تھی مگر' دو دن سے اسٹرائیک کی وجہ سے بچے اور نوید گھر پر ہی تھے تو نکلنا ہی نہیں ہوا' پھر شہر کے حالات خراب ہونے کی وجہ سے یہ دو گلیوں تک آنا بھی مشکل لگ رہا تھا' دیکھا تم نے۔۔۔ کیسی سفاکیت اور بربریت مچائی ہے ان ظالموں نے۔۔۔؟"

ہما نے دو دن پہلے شہر میں ہونے والے بم بلاسٹ کا ذکر کیا تھا جس کی وجہ سے تقریباً" سارا شہر مکمل بند تھا دو روز سے۔۔۔

"ہاں۔۔۔" حرا نے بھی ایک دکھ بھری سانس سینے سے خارج کی تھی۔ "پتا نہیں کون ظالم ہیں یہ اور کیا چاہتے ہیں آخر۔۔۔ اتنی جانوں کو موت کی نیند سلا کر کیا انہیں نیند آجاتی ہوگی؟"

"اللہ پاک ہمارے شہر پر رحم و کرم فرمائے' کیسا پرسکون شہر تھا کبھی ہمارا کراچی اور اب؟ اوپر سے یہ میڈیا۔۔۔ ان کو تو اللہ ہی ہدایت دے' اپنی کوریج کے لیے بار بار وہاں پہنچ کر ان بے چاروں کا تماشا' سر بازار لگا کر بیٹھ جاتے ہیں اگر کرنا ہی ہے تو ان بچ جانے والوں کے تباہ ہونے والے گھروں کے لیے کچھ کریں ان کی رہائش اور خوراک سب سے بڑا مسئلہ ہے مگر یہ لوگ تو وہاں مجمع اکٹھا کرتے ہیں' ان کے زخموں کے بخیے ادھیڑتے ہیں اور گھنٹہ بھر کا پروگرام مکمل کرکے سب کچھ سمیٹ کر چلتے بنتے ہیں اور ہم۔۔۔؟ ہم یہ کرتے ہیں کہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر کافی' چائے پیتے ہوئے یہ سب دیکھتے ہیں' افسوس کے کلمات کا ایک دوسرے سے تبادلہ کرتے ہیں اور پھر یہ کہہ کر کہ ہم سے تو یہ سب دیکھا نہیں جاتا' ریموٹ اٹھا کر کوئی دوسرا چینل تبدیل کرلیتے ہیں۔ یونہی گزر جاتا ہے ہمارا یوم سوگ۔ کاش! کوئی ریموٹ ان حالات کو تبدیل کرنے کے لیے ایجاد ہوتا' دیکھا ہی ہوگا تم نے کل کافی سارے مارننگ شو کے اینکر پرسن بھی تو وہاں جاکر اپنا شو کررہے ہیں۔"

ہما نے پالک کے پتے چنتے ہوئے اسے دیکھا۔

"نہیں۔۔۔" حرا نے چھری اٹھا کر اطمینان سے چنی ہوئی پالک کے پتے کترتے ہوئے کہا۔

"میں نے مارننگ شوز دیکھنا بند کردیے ہیں' کیا فائدہ؟ یہ سب انیس بیس کے فرق سے ایک ہی راگ تو الاپ رہے ہیں۔ لیکن میں اب اس بے وقوفی سے نکل آئی ہوں۔ سمجھ گئی ہوں کہ پہلی ترجیح ہمارا گھر ہوتا ہے۔ مگر ہم اپنے گریبانوں میں جھانکنا چھوڑ چکے ہیں' ہمیں صرف چٹخارا چاہیے' خواہ کسی بھی شکل میں ملے' تفریح کی ماری ہم قوم۔۔۔"

ہما نے خوش گواریت سے اسے دیکھا تھا۔ حرا ہلکے سے مسکرائی تھی۔

"مجھے پہلے اپنے حصے کی ذمہ داری ادا کرنی ہے۔ مجھے یہ دیکھنا ہے کہ مجھے اپنے بچے کی تربیت کس نہج پر کرنی ہے تاکہ کل جب وہ ایک مرد کا کردار نبھائے تو اس میں وہ معاشرتی خامیاں پروان نہ چڑھیں جو بگاڑ کا سبب بنتی ہیں' مجھے اپنی بیٹی کے لیے رول ماڈل بننا ہے کیونکہ بیٹیاں اکثر و بیشتر ماں کا ہی پرتو ہوتی ہیں۔ بڑی تبدیلیوں کی مجھے کوئی خواہش نہیں ہے' میں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں لاکر ہی بڑے بڑے نقصانات سے بچ سکتی ہوں۔"

حرا نرم خوئی سے بولتی چلی گئی تھی۔

"تم بیٹھو۔۔۔ میں چائے لاتی ہوں۔" وہ کھڑی ہوئی۔

"نہیں۔ تم بیٹھو۔" ہما نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے دوبارہ بٹھایا۔

"چائے کی اس وقت طلب نہیں ہے۔۔۔ میں تو بس اس لیے آئی تھی کہ تم نے ٹیوٹر کا کہا تھا مگر اب مجھے نہیں لگتا ہے اس کی ضرورت ہے۔۔۔ صحیح کہہ رہی ہوں نا؟"

"ہوں۔۔۔؟" حرا نے آسودگی سے سر اثبات میں ہلایا۔ "مجھے اپنے بچوں کو یہ وقت دینا ہے تاکہ کل یہی وقت یہ مجھے لوٹائیں' کیوں کہ ہم امیدوں کے مسافر ہیں اور خوش گمانی کی راہ پر چل کر ایک نہ ایک دن تو یقین کی منزل پا ہی لیں گے۔ ان شاء اللہ۔

☼

نعیمہ ناز سلطان

ہم کیوں ہارے

مکمل ناول

سلونی شام کا رنگ گہرا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ افق پر شفق کی لالی سورج ڈوبنے کا پتا دے رہی تھی، قریبی مسجد سے اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی اور اماں نے باورچی خانے سے نکل کر چارپائی پر سوتے ہوئے اسلم کو ایک دھموکا لگایا۔

"کم بخت، آوازیں دے دے کر میرا حلق سوکھ گیا، دوپہر سے پڑا سو رہا ہے، مغرب ہو گئی، نواب زادے کو اٹھنے کا ہوش ہی نہیں، جانے کوئی بھنگ پی کر لیٹا تھا، مردار، نکما، بدحرام۔" اماں کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

"او بے غیرتو! اب تو ٹی وی بند کر دو، اذان ہو رہی ہے مغرب کی، دونوں وقت مل رہے ہیں، بہتے دریا بھی رک جاتے ہیں اس وقت، تم لوگوں نے ابھی تک نحوست پھیلائی ہوئی ہے، بند کرو اس ناس پیٹے کو۔ کم بخت ٹی وی نہ ہوا مصیبت ہو گیا، ہر وقت کا جنجال۔"

ان کے غصے کا نشانہ اب کمرے میں بیٹھی وہ چنڈال چوکڑی تھی جنہیں ان کی اولاد ہونے کا شرف حاصل تھا، سب کوئی وی کے سامنے باجماعت بیٹھے دو، تین گھنٹے تو ہو ہی چکے تھے۔

"کیا ہے اماں! کیوں چیخ رہی ہو؟" اسلم' ان کا لاڈلا اور سب سے بڑا سپوت' جو اماں کے دھموکے اور چیخ پکار کے بعد اب اپنی مندی مندی آنکھیں کھول رہا تھا۔

"کیا ٹائم ہو رہا ہے؟ کون سی اذان ہے؟" اس نے اپنی آنکھیں سکیڑ کر صحن کی جانب دیکھا جہاں گہری شام اپنے پر پھیلا چکی تھی۔

"ابے یار! یہ تو مغرب ہو گئی' میں نے کہا بھی تھا' مجھے پانچ بجے اٹھا دینا۔" وہ چھلانگ مار کر چارپائی سے اترا اور واش بیسن پہ کھڑا ہو کر منہ پہ چھپاکے مارنے لگا۔

"کس سے کہا تھا؟" اماں نے کڑے تیوروں سے اسے دیکھا۔

"انی سے کہا تھا' انی' او انی! بہری بھلکڑ' میں نے تجھ سے کہا تھا نا کہ مجھے پانچ بجے اٹھا دینا' ایک ضروری کام سے جانا ہے۔" اسلم نے تولیے سے منہ رگڑا' ساتھ ساتھ انی کی گوشمالی بھی جاری تھی جو اس کی آواز سن کر باہر آ گئی تھی۔

"میں بھول گئی تھی بھائی!" وہ آہستہ سے بولی۔

"بھول کی بچی' وہ منحوس ٹی وی ڈراما دماغ سے نکلے تو کوئی اور بات گھسے۔" اسلم بڑبڑاتے ہوئے اپنا غصہ اور جھنجلاہٹ انیلا پر اور اس کے پسندیدہ چوبیس گھنٹے چلنے والے ڈراموں پر نکالتے ہوئے اپنی تیاری بھی کرتا جا رہا تھا' پینٹ شرٹ صبح ہی استری کر لی تھی جلدی جلدی پہنی' جوتے پہن کر ان پر تیزی سے جھاڑن مارا' والٹ جیب میں ٹھونسا اور موبائل احتیاط سے رکھا۔

"کہاں جا رہا ہے' بتا کر تو جا۔" اماں کچن کی کھڑکی سے اس کی تیاریاں دیکھ رہی تھیں' وہیں سے پھر چیخیں۔

"آ کر بتا دوں گا اماں!" وہ تیزی سے باہر لپکا

"بھائی! کنگھا تو کر لو' بال دیکھو کیسے ہو رہے ہیں۔" انی نے اسے بروقت پکارا تھا۔

"شٹ یار!" اسے یاد آیا کہ وہ کنگھا کرنا بھول گیا تھا۔

"کنگھا لا جلدی سے۔" وہ واش بیسن پر لگے آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا جہاں سے حسب توقع کنگھا غائب تھا۔

"کہاں ڈھونڈوں' پتا نہیں کہاں پھینک دیا۔" سب کی بری عادت تھی چیز استعمال کر کے اسے ٹھکانے پہ رکھنے کے بجائے ادھر ادھر ڈال دیتے' بعد میں ڈھونڈتے پھرو۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے ڈھونڈ رہی تھی' اس ہفتے یہ تیسرا کنگھا تھا جو گم ہوا تھا۔

"کیا ہو گیا؟" اماں نے کام کرتے کرتے پھر کچن کی کھڑکی سے جھانکا۔

انی بوکھلائی بوکھلائی ادھر ادھر مختلف چیزیں ٹٹول رہی تھی۔

"اماں کنگھا۔"

"پھر کھو دیا' اب میرے باپ کی بھی توبہ جو میں تم لوگوں کو کنگھا لا کر دوں' پورا پیکٹ لائی تھی جمعہ بازار سے' ایک مہینہ بھی نہیں ہوا ابھی' نواب کی اولاد ہیں روزانہ نئی چیز استعمال کرتے ہیں اور پھینک دیتے ہیں۔" چولہے کی گرمی کے آگے اماں کا پارہ خود بخود ہائی ہو جاتا تھا اور سے اولادوں کے کرتوت' کبھی کبھی تو وہ خود جیسے جلتے توے پہ بیٹھ جاتیں۔

"یہ لو بھائی!" انیلا ہانپتی کانپتی آ گئی۔

"کہاں سے لائی؟ اوپر سے؟" اسلم نے خود ہی سوال خود ہی جواب کرتے ہوئے جلدی جلدی ہاتھ مارے۔

"ہاں ان ہی سے لائی ہوں۔ کہہ رہی تھیں' فوراً" واپس لے آنا۔" انیلا نے بھابھی کی تاکید دہرائی۔

"چل پھر فوراً" واپس دے آ' کھو گیا تو سنا دیں گی دو چار باتیں۔" اسلم نے جلدی سے کنگھا اسے واپس دیا اور باہر کی جانب لپکا۔

"انی! جلدی آ' مقدس گھر چھوڑ کر جا رہی ہے۔" ڈرامے میں ایک ٹرننگ پوائنٹ آنے پر منی نے آواز لگائی۔

"نہیں....!" انی جو کنگھا واپس دینے سیڑھیوں پہ جا رہی تھی فوراً" پلٹ آئی۔

"بھابی دے آؤں گی تھوڑی دیر میں۔" ٹی وی اسکرین پر نظریں جماتے ہوئے اس نے کنگھا صوفے پہ رکھ دیا۔

اسلم اپنی بائیک پر جیسے اڑا جا رہا تھا' فیصل کے گھر پہنچا تو حسب توقع سب لوگ تیار بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"کہاں رہ گیا تھا بھائی دو گھنٹے سے تیرا انتظار کر رہے ہیں' فون ٹرائی کر کر کے تھک گیا' وہ بھی بند۔" اس کی شکل پہ نظر پڑتے ہی فیصل کا شکوہ ناز شروع ہو گیا۔

"ابے یار! کیا بتاؤں' میری کہانی بعد میں سننا۔ پہلے جلدی سے ذرا اپنا موبائل پکڑا۔"

"تیرے موبائل کو کیا ہوا؟" فیصل نے اپنا سیل فون اس کی جانب بڑھایا۔

"بیٹری چارج نہیں تھی۔" اسلم نے تیزی سے نمبر پش کرتے ہوئے اسے جواب دیا اور دوسری جانب سے ہیلو کا انتظار کرنے لگا' دوسری بیل پر فون ریسیو ہو گیا۔

"ہیلو السلام علیکم انکل! میں ان لوگوں کو لے کر آ رہا ہوں آپ کی طرف' بس سمجھیں ہم نکل گئے' مشکل سے بیس پچیس منٹ لگیں گے۔"

"دیر بھی دیر تو ہو گئی ہے' آ کر وجہ بتاؤں گا' خدا حافظ!" اسلم نے فیصل کو فون واپس کیا۔

"چل شہزادے' چلنے کی تیاری کر۔" اسلم اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"تین گھنٹے سے تیار بیٹھا سوکھ رہا ہوں تیرے انتظار میں' اب تو ساری تیاری بھی بگڑ گئی۔" فیصل کا موڈ ابھی ٹھیک نہیں ہوا تھا۔

"چل نا یار' بعد میں ناراض ہو جانا' شادی کے بعد۔" اسلم نے آنکھ دبائی۔

"تو فرنہ ہو تو۔" فیصل ہنستا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

ٹھیک بیس منٹ بعد وہ مطلوبہ علاقے میں پہنچ چکے تھے' متوسط طبقے کی آبادی والا علاقہ تھا' مین روڈ سے تھوڑے اندر آئے تو ایک مناسب جگہ دیکھ کر اسلم نے گاڑی پارک کروائی جو فیصل ڈرائیو کر رہا تھا۔

"بس یہیں سامنے گلی میں گھر ہے ان کا۔" اسلم نے گاڑی سے اترتے ہوئے انکل اور آنٹی کو بتایا۔

"دائیں ہاتھ پہ چھٹا مکان۔" اسلم کو اچھی طرح یاد تھا' وہ پرسوں پہلی بار یہاں آیا تھا۔

میزبانوں نے بہت پرتپاک استقبال کیا مہمانوں کا' بعد میں چائے بڑی پر تکلف تھی' سموسے' گلاب جامن' چکن پیٹس' دہی پھلکیاں اور گھر کا بیک کیا ہوا کیک۔ دونوں فیملیز کے درمیان شروع میں ہلکی پھلکی رسمی گفتگو ہوئی۔

"ہم دہلی کے ہیں' یوسف زئی!"

"ہم الہ آباد کے ہیں' صدیقی ہیں۔" باتوں باتوں میں تعارف ہوا۔

"بس بھائی صاحب! یہ تو سب ہماری شناخت اور پہچان کے لیے ہیں' کوئی سید' کوئی مغل' کوئی پٹھان' کوئی راجپوت' اصل تو انسان کی سیرت ہے اس کا کردار' اس کا اخلاق ہے۔" فیصل کے والد نے لڑکی

کے والد کو مخاطب کیا۔

"جی جی، بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے، نیکی اور شرافت اصل ہے، باقی سب فروعات۔" ضامن صاحب نے ان کی بات سے اتفاق کیا۔

باتوں باتوں میں لوازمات بھی آگئے اور بعد میں چائے، روایتی طریقے سے لڑکی یعنی ثمن چائے کی ٹرے نہیں لائی تھی، سب کچھ اس کی بہنوں اور بھابھی نے سرو کیا تھا۔

فیصل کی والدہ نے آنے کے کچھ دیر بعد ہی ان سے کہا تھا۔

"تکلف برطرف. بہن جی! آپ اپنی بچی کو چائے کی ٹرے پکڑائے بغیر ایسے ہی بلوالیں، آپ کے ساتھ ساتھ بچی سے بھی گپ شپ ہو جائے گی۔" ہلکے پھلکے لہجے میں کہی گئی ان کی بات "بہن جی" کو ایسی بھائی کہ انہوں نے فوراً" بچی یعنی ثمن کو بلوالیا۔

مناسب قدوقامت، دبلی پتلی، خوب صورت آنکھوں والی ثمن، ابتدا میں تھوڑی گھبرائی سی لگ رہی تھی مگر بیگم جلیل کی دوستانہ مسکراہٹ اور بے تکلف گفتگو نے اسے اعتماد بخشا، باتوں کے دوران گاہے گاہے مسکراتی ہوئی بیگم جلیل کو وہ اچھی لگی پھر اس کی گفتگو، پسند، ناپسند بھی ان کے مزاج کے مطابق تھی، ان کے چہرے پہ پسندیدگی کے آثار نمایاں تھے، گھر والے بھی اپنے طور طریقوں اور گفتگو سے شریف لگے تھے، کسی بھی قسم کے تصنع اور بناوٹ سے دور، پھر اسلم نے بھی ان لوگوں کی بہت تعریف کی تھی، انہوں نے فوراً" ہی سب کے سامنے اپنی پسندیدگی ظاہر بھی کردی۔

"بھئی۔ مجھے تو آپ کی بچی بہت اچھی لگی، ماشاء اللہ، اللہ نظر بد سے بچائے۔"

ان کی بات سن کر ثمن کی دادی سمیت سب ہی کے چہرے کھل اٹھے۔

اسلم کا موبائل بجا تھا، فیصل کی کال تھی۔

"بس دس سے پندرہ منٹ لگیں گے، چائے پی رہے ہیں سب۔" اسلم، مختصر بات کرکے فون بند کردیا۔

"فیصل گاڑی میں بیٹھا انتظار کررہا ہے ہمارا۔" اسلم نے جان بوجھ کر بلند آواز میں جلیل صاحب کو مخاطب کیا۔

"ہاں، بس چلتے ہیں ابھی۔"

"آپ کا بیٹا۔ آپ کے ساتھ آیا ہے؟" ضامن صاحب کا چونکنا بجا تھا۔

"ہاں، دراصل ڈرائیو وہی کرتا ہے، میری جب سے نظر کمزور ہوئی ہے مجھے ڈرائیونگ سیٹ سے بے دخل کردیا گیا ہے، اب جہاں جانا ہوتا ہے، فیصل ہی لے جاتا ہے۔" جلیل صاحب نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی۔

"ارے صاحب! تو آپ نے بتایا بھی نہیں، بچہ وہاں بیٹھا سوکھ رہا ہے، آپ بتاتے تو سہی۔" ضامن صاحب اچھل پڑے۔

"ہم نے سوچا، پہلی بار کا معاملہ ہے، آپ یوں ہمارے بیٹے کی یہاں آمد پسند کریں نہ کریں۔" اب کے بیگم جلیل نے صفائی پیش کی۔

"وہ تو نصیب کی بات ہے. بہن! جہاں جوڑ لکھتا ہے شادی وہیں ہوگی۔ جیسے آپ مہمان، ویسے آپ کا بیٹا مہمان، کم از کم ایک کپ چائے پینا تو بچے کا حق بنتا ہے نا۔"

اب کے ثمن کی دادی نے بڑے سبھاؤ سے مداخلت کی، انہیں دونوں میاں بیوی اچھے لگے تھے، پوتی کا رشتہ یہاں ہو جاتا تو انہیں خوشی ہوتی۔ "ڈاکٹر کے" کی غائبانہ تعریفیں اسلم خوب خوب کرکے گیا تھا۔

ثمن کے بھائی اور اسلم دونوں جاکر فیصل کو اپنے ساتھ لے آئے۔ ثمن کو اٹھنے کا اشارہ کردیا گیا تھا، فیصل ڈرائنگ روم میں آیا تو بیک وقت سب کی نظریں خود پر جمی دیکھ کر چند لمحے کو نروس ہوا پھر نارمل ہوکر بیٹھ گیا۔ لمبا قد، سانولی رنگت اور چمکتی ذہین آنکھوں والا خوش مزاج فیصل، سب کو اچھا لگا۔ بات بن ہی گئی تھی، چلتے وقت مسٹر فیصل کے ابو نے ثمن کی فیملی کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی تھی۔

راستے بھر فیصل نے بڑی مشکل سے اپنے تاثرات کو قابو میں رکھ کر چہرے پہ نارمل ایکسپریشن رکھا، گھر پہنچ کر امی ابو اندر گئے، فیصل، اسلم کے گلے لگ گیا۔

"یار! تیرا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

"بھولنا بھی مت، ورنہ بہت پٹائی لگاؤں گا تیری۔" اسلم اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوا۔ اتنے میں جلیل صاحب ڈرائنگ روم میں آگئے، پیچھے پیچھے بیگم صاحبہ بھی۔

"بہت بہت شکریہ بیٹے، تم نے اتنی بھاگ دوڑ اور تردد کیا ہمارے لیے، ماشاء اللہ لڑکی بہت اچھی ہے، لوگ بھی بھلے ہیں، ہماری تو ساری فکر ختم کردی تم نے۔"

"بیٹا بھی کہتے ہیں پھر شکریہ بھی، اب شرمندہ مت کریں۔" اسلم مسکرایا۔

"اچھا۔ اب ہماری بھی ایک بات سنو، منع مت کرنا۔" جلیل صاحب اٹھ کر اس کے قریب آئے اور ایک لفافہ اس کی شرٹ کی جیب میں رکھا۔

"یہ... کیا...؟" اسلم بوکھلا گیا۔

"کچھ نہیں، بس ہماری خوشی ہے، ہماری طرف سے ایک جوڑا خرید لینا اپنے لیے۔" اب کی بار بیگم صاحبہ بولیں۔

"مگر آنٹی...!"

"بس، میں نے کہا تھا نا کہ منع نہیں کرنا، چپ چاپ رکھ لو، بیٹا سمجھ کر دیا ہے۔" جلیل صاحب کے لہجے میں ایک خاص استحقاق اور مان تھا، اسلم چپ ہوگیا۔

"اب تم بیٹھو، کھانا کھا کر جانا۔"

"اتنا کچھ تو کھا کر آیا ہوں وہاں سے، اب کھانے کی گنجائش تو بالکل بھی نہیں۔ اب آپ لوگ مجھے اجازت دیں، پھر چکر لگاؤں گا۔ ان شاء اللہ!" اسلم اٹھ کھڑا ہوا۔

سب کو خدا حافظ کہہ کر اس نے اپنی موٹر سائیکل باہر نکالی اور کک لگا کر اسٹارٹ کی۔

"شکر ہے محنت وصول ہوگئی، ڈراما کامیاب ہوگیا۔" گھر واپس آتے ہوئے وہ بے اختیار مسکرا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

تیرا میرا کوئی نہ کوئی ناتا ہے
ورنہ کون کسی کے پیچھے آتا ہے

دوپہر کے بعد محمود خالو کا "فلمیزیا" شروع ہو چکا تھا اور وہ اتنی بلند آواز میں ٹی وی چلاتے تھے کہ دونوں گھرانوں سمیت آدھا محلہ تو اس سے ضرور ہی مستفید ہوتا۔ دو ہی تو شوق تھے ان کے، بیوی سے اچھے اچھے کھانے پکوا کر کھانا اور فارغ وقت میں فلمیزیا دیکھنا، رکشہ چلاتے تھے۔ علی الصبح نکل جاتے، دوپہر کو کھانے کے لیے گھر آتے پھر دوبارہ شام میں ہی جاتے، آج بھی صبح ہی فرمائش بلکہ تاکید کرکے گئے تھے بیوی کو کہ دوپہر میں کوفتے بنالے اور یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ گھر میں جو بھی اچھی ڈش بنے جو ہفتے میں پانچ دن تو لازمی بنتی تھی، وہ برابر میں خالہ کے گھر نہ آئے اور یہاں آنے کے لیے کون سا تردد کرنا پڑتا تھا، ابا جس کمرے میں ٹی وی دیکھتے تھے اس کی ایک کھڑکی خالہ کے صحن میں کھلتی تھی، فقط دو پٹ کی کھڑکی جس میں نہ کوئی گرل تھی نہ سلاخیں نہ کچھ اور بلی کے بچے۔ کے ساتھ ساتھ انسان کا بچہ بھی اس میں سے بآسانی گزر سکتا تھا، شبو کا آنا جانا زیادہ تر اسی رستے سے ہوتا تھا۔

"آج کیا لائی ہے شبو؟" اسلم نے اس کے ہاتھ میں ڈونگا دیکھ کر ڈھکن اٹھایا۔

"کوفتے ہیں۔" وہ شرمانے لگی۔ اسلم اتنے قریب کھڑا تھا، اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔

"یہ تو ہر وقت شرمائی کیوں رہتی ہے، اپنے گھر چلنے والی فلموں کی ہیروئنوں کی طرح؟" اسلم نے اس کے ہاتھ سے ڈونگہ لے لیا۔

"آپ ایسے مذاق نہ کیا کریں جی!" وہ اور لجا گئی، بچپن سے ہی اپنے نام کے ساتھ اسلم کا نام سنتی آرہی

تھی' سوئٹ سکسٹین ختم ہو کر اب سترہواں برس لگا تھا' اسلم سے شرمانا اس نے اپنا فرض سمجھا ہوا تھا اور اس کا مذاق اڑانا اسلم نے اپنی ذمہ داری سمجھا تھا۔

"کھانا تو نہیں کھایا نا ابھی؟" شبو نے اپنی الجھی لٹ یوں ٹھیک کی کہ وہ پھر اس کے ماتھے پہ آن گری۔

"بالکل نہیں' ہم تو ان کوفتوں کا انتظار کر رہے تھے' اب لگائیں گے دستر خوان!" اسلم نے فوراً" نفی میں سر ہلایا۔

"چل منی! دستر خوان لگا' آ گئے کوفتے۔"

"میں لگا دیتی ہوں۔" شبو فوراً" لپک کر کچن میں گئی اور دستر خوان لگانے لگی۔

"تم نے کیا پکایا ہے؟" وہ انیلا عرف انی سے پوچھ رہی تھی۔

"یہ پوچھا کرو کہ کون سی سبزی یا کون سی دال پکائی ہے۔" انی کا لہجہ جلا بھنا تھا۔ "گوشت کی شکل تو مہینوں میں ہی دیکھنے کو ملتی ہے' وہ بھی پانی ملا گوشت' ایک بوٹی ملتی ہے وہ بھی کھاؤ تو ایسی جیسے ربڑ کی ہو' لعنت ہے یار' ایسی زندگی پر۔" انی جانے کس بات پر خار کھائے بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا' نوکری لگی نہیں اسلم۔ بھائی کی؟" بھائی کا لفظ وہ خاصی دیر میں بڑی جلدی اور بے دلی سے ادا کرتی تھی۔

"پتا نہیں' جاتے تو روز ہیں' کل بھی گئے تھے' رات کو تو کچھ نہیں بتایا' سو کر بھی دیر سے اٹھے۔ اماں پوچھ بھی رہی تھیں بس یہ کہہ دیا کہ بتا دوں گا۔"

دستر خوان لگ گیا تو اماں نے سب سے پہلے ایک پلیٹ میں دو کوفتے' دو آلو اور ٹھیک ٹھاک شوربا نکال کر اسلم کے آگے رکھا۔ باقی کے دو کوفتے' چاروں بچوں کو آدھے آدھے بانٹ دیے' ایک ایک آلو کے ساتھ۔

"کیا بات ہے شبو! خالہ' خالو میں بول چال نہیں ہے کیا؟" اسلم نے نوالہ توڑتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"کیوں؟ کیا مطلب؟"

"لڑائی جھگڑے کی آواز نہیں آئی دو' تین روز سے۔"

"چل' چپ ہو کر کھا' ہر وقت مذاق نہ کیا کر بچی سے۔" اماں نے اسے ڈانٹا' مگر فضول ہی ڈانٹا۔ "بچی" تو اسلم کے مذاق پر کھی کھی کھی کر رہی تھی۔

"ہمارے خالہ' خالو بھی خوب ہیں' ایک دن لڑائی' دوسرے دن صلح' تیسرے دن امن' چوتھے دن پھر جھگڑا' ٹام اینڈ جیری' ہاہاہا۔" اسلم نے بقیہ پلٹن کے ساتھ قہقہہ لگایا۔

"تو باز نہیں آئے گا' ہر وقت کا مخول اچھا نہیں ہوتا' تیرے خالو تک آواز پہنچی تو کیا سوچیں گے۔" اماں نے پھر ڈپٹا' نگران کی سنتا کون تھا۔

"چھوڑو خالہ! مذاق تو اپنوں سے ہی کیا جاتا ہے' غیروں سے کون مذاق کرتا ہے۔" شبو نے ڈائیلاگ جھاڑا۔

"شبو آپی! بھائی نے مذاق اڑایا ہے' کیا نہیں ہے۔" گو نے اسے اطلاع فراہم کی۔

"تو۔۔۔؟ مذاق تو مذاق ہوتا ہے۔ کرو یا اڑاؤ۔" شبو کی معصومیت قابل دید تھی۔

"بے شک' پھول' پھول ہوتا ہے' چاہے گلاب کا ہو یا گوبھی کا۔" منی کی بھی رگ ظرافت پھڑکی' اپنے بھائی کے ہم نام ایک سیاست دان کے مشہور زمانہ ڈائیلاگ کو اس اسٹائل میں دہرایا تو ایک بار پھر سب کی کھی کھی کھی شروع ہو گئی۔

"بھائی' بھائی ہوتا ہے' چاہے ہمارا ہو یا شبو آپی کا۔" گو بھی پھر شروع ہو گیا۔

"ہمارا تمہارا' ایک بھائی' اسلم بھائی' اسلم بھائی!" ہاشم عرف ہاشو بھی شروع ہو گیا۔ ظاہر ہے وہ لوگ شبو کو ہی چھیڑ رہے تھے جسے یہ چھیڑ چھاڑ اچھی لگتی تھی۔

"چپ ہو کر کھانا کھا کم بخت۔ اس کا باپ ادھر کمرے میں ہی بیٹھا ہے سنے گا تو دو چار سنا دے گا۔ تم لوگوں کو پتا تو ہے اس کی عادت کا۔" اماں نے ایک دھمو کا اس کی کمر پر مارتے ہوئے اسے خالو سے ڈرایا حالانکہ وہ بے چارے تو با آواز بلند اپنے مشغلے میں مصروف تھے۔

کیسا جادو گر دلبر مستانہ ہے
کبھی لگے غیر کبھی جانا پہچانا ہے

"خالہ! امی کہہ رہی تھیں' فارغ ہو جاؤ تو آ جانا۔" شبو نے اپنی امی کا پیغام خالہ کو پہنچایا۔

"تمہاری امی کے فقط ایک عدد میاں ہیں اور ایک عدد بیٹی' وہ ان سے فارغ نہیں ہوتیں اور ہماری اماں کے ماشاء اللہ پانچ بچے' ایک بہو اور دو پوتے ہیں' کہہ دینا اپنی امی سے' آج کی عورت گھرداری کے جھمیلوں میں پھنسی ہے۔ کہاں سے وقت نکالے پڑوس میں جھانکنے کا۔"

اماں کے سارے بچے فقرے بازی میں مہارت رکھتے تھے ساتھ ساتھ ڈائیلاگ مارنے میں بھی۔

"بڑی ہی کم بخت اولاد ہے۔" اماں نے منی کو گھورا پھر شبو سے مخاطب ہوئیں۔

"ماں سے کہنا' رات میں آؤں گی سب کام دھندوں سے فارغ ہو کر۔"

"ارے لڑکے' تو نے مجھے بتایا نہیں' تیرے کام کا کیا ہوا' جب پوچھو ٹال دیتا ہے کہ بتا دوں گا' بتا دوں گا۔" اماں نے پانی پیتے ہوئے بیٹے کے آگے روئے سخن کیا۔

"کھانے سے فارغ ہو جاؤ' پھر بتاتا ہوں۔"

"اب چائے کون بنائے گا؟" کھانے کے بعد اسلم نے ہانک لگائی۔

"میں بنا دیتی ہوں۔" منی اٹھی۔

"بیٹھ جا' اللہ کے واسطے' جوشاندہ نہیں چاہیے' چائے چاہیے۔" انی نے وہ برا سا منہ بنایا جو اکثر منی کے ہاتھ کی بنی چائے پی کر بنتا تھا۔

"میں بنا لیتی ہوں۔" شبو فوراً" اٹھی۔

"بناؤ بناؤ' کل کو تمہیں ہی سنبھالنا ہے یہ کچن۔" انی نے بعد کا فقرہ ذرا دبی زبان سے کہا' مگر پھر بھی سب نے سن ہی لیا' اماں ہنس پڑیں' بھانجی کو بہو بنانے کا ارمان انہیں بچپن (بھانجی کے) سے تھا' اسلم نے اسے گھور کے دیکھا' باقی سب کھی کھی کر کے ہنس پڑے' شبو کچھ لجاتی' کچھ مسکراتی کچن کی طرف بھاگ گئی۔

سب ادھر ادھر ہو گئے' لوڈشیڈنگ کا ٹائم ہو گیا تھا ورنہ سب اس وقت باجماعت ٹی وی کے آگے بیٹھے ہوتے۔

اماں تسلی سے اسلم کے پاس بیٹھ گئیں۔

"کیا ہوا بیٹا نوکری کا؟ ایسے کیسے کام چلے گا' کہیں کچھ بات بنی یا نہیں؟" اماں نے ایک ہی سانس میں ساری بات کہہ ڈالی۔

"یہ رکھ لو اماں! فی الحال اس سے کچھ کام چلاؤ پھر دیکھتے ہیں' اللہ مالک ہے۔" اسلم نے والٹ میں سے پانچ ہزار نکال کر انہیں دیے۔

"جب تو کوئی کام دھندا نہیں کر رہا تو یہ رقمیں کہاں سے آ رہی ہیں' ہفتہ دس دن پہلے بھی تو نے پانچ ہزار دیے تھے۔" اماں نے مشکوک نظروں سے بیٹے کو گھورا۔

"سچ سچ بتا کیا چکر ہے؟"

"کوئی چکر وکر نہیں ہے اماں! ایک دوست کا رشتہ کروایا تھا۔ انہوں نے پیسے دے دیے کہ ہماری طرف سے جوڑا بنا لینا اور دوسری طرف لڑکی والوں سے بھی میری جان پہچان تھی' انہوں نے بھی پانچ ہزار پکڑا دیے۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔" اماں نے اطمینان بھری سانس لی۔

"اللہ کا شکر ہے' وہ کوئی نہ کوئی سبب بنا دیتا ہے روزی کا۔"

"اماں' کوئی لڑکا ہے نظر میں؟" اسلم نے اچانک سوال کیا۔

"ہیں۔۔۔ کیسا لڑکا؟" وہ گڑبڑا گئیں۔

"ایک لڑکی کا رشتہ کروانا ہے' اس کے لیے چاہیے۔"

"اوئی' کیا تو رشتہ کروانے والا بن گیا' عورتوں کے کام ہیں یہ تو۔" اماں نے ناک پہ انگلی رکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔

"جیسے عورتیں' مردوں کے شانہ بشانہ ہر کام کر رہی ہیں چاہے ان کے کرنے کا ہو' نہ ہو اسی طرح ہم مرد

بھی ان کے شانہ بشانہ کام کر رہے ہیں ہم ان سے پیچھے ہیں کیا۔"

"کیا کہہ سکتی ہوں' یہ دنیا اور اس کے طریقے' میں نری جاہل گنوار' گھر میں رہنے والی۔ باہر کی دنیا میں جانے کیا کیا ہو رہا ہے۔"

"کوئی رشتہ بتاؤ اماں! ادھر ادھر کی باتیں چھوڑو۔"

"نیلے گیٹ والی شمسہ ہے نا' اپنے بیٹے کے لیے لڑکی دیکھ رہی ہے۔ کہہ رہی تھی۔ کوئی اچھی لڑکی نظر میں ہو تو بتانا۔" اماں نے ذہن پر زور دیا اور اسلم کو بتایا۔

"عباد کی شادی کریں گی؟" اسلم محلے میں سب ہی کو جانتا تھا۔

"ہاں' عباد کے لیے ہی کہہ رہی تھی۔"

"اچھا ٹھیک ہے' میں بات کرتا ہوں ان سے۔"

"جو بھی کرو' سوچ سمجھ کر کرنا بیٹے۔" اماں نے تاکید کی۔

"فکر نہ کرو اماں! ارے یہ چائے بن رہی ہے یا پائے۔" اسلم نے انہیں تسلی دیتے ہوئے آواز لگائی جو کچن تک بخوبی پہنچ گئی۔

"بس ابھی لائی۔" شبو کی باریک سی آواز میں جواب آیا اور دو منٹ بعد وہ خود چائے سمیت حاضر ہو گئی۔

"بات سن شبو رانی!"

"جی۔!" وہ مڑی

"چائے میں چینی ہی ڈالی ہے نا' نمک تو نہیں ڈال دیا۔"

"نہیں جی' میں ایسی حرکت کیوں کروں گی۔" وہ یکدم گھبرائی۔

"اس لیے کہ خالہ نے شادی سے پہلے خالو کو اسی طرح چائے بنا کر دی اور اس میں چینی کی جگہ نمک ڈال دیا' بس خالو اسی ادا پر ہی فوراً "فدا ہو گئے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے' میری امی تو ابا کو شادی سے پہلے جانتی تک نہیں تھیں' شادی کے بعد پہلی بار دیکھا تھا۔ کیوں خالہ؟" شبو نے ان سے تصدیق چاہی جو بیٹے کے مذاق پر ہنس رہی تھیں۔

"تو جا۔ یہ ایسے ہی الٹی سیدھی ہانکتا رہتا ہے۔" اماں نے شبو کو وہاں سے بھگایا۔

"چائے پی ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

"ہاں! پیتا ہوں ابھی۔" وہ اس رشتے کے متعلق سوچنے لگا جو اسے ابھی کروانا تھا سوچتے سوچتے اس کے خیالات کی رو فیصل اور ثمن کی جانب مڑ گئی اس رشتے کو کروانے میں اس نے ایسے خفیہ پاپڑ بیلے تھے جو کسی کو نظر نہیں آئے۔

"شکر ہے' کسی کو کوئی شک نہیں ہوا' آرام سے سارا کام ہو گیا۔" وہ مسکراتے ہوئے اٹھ بیٹھا' چائے کا کپ منہ سے لگایا۔ چائے کڑوی زہر ہو رہی تھی۔

"اوع ع۔۔۔" کپ واپس ٹرے میں پٹخ کر وہ دہاڑا۔

"شبو کی بچی ی ی۔۔۔" وہ بچی باہر صحن میں باقیوں کے ساتھ قہقہے لگا رہی تھی۔ دوسری طرف خالو نے اپنے ٹی وی کا والیوم کچھ اور اونچا کر دیا تھا۔

کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتے ہیں کتنے پیارے' کچھ لوگ۔۔۔

☼ ☼ ☼

آستینوں کے کف کہنیوں تک الٹے ہوئے' بال پریشان' کنگھے سے محروم' چہرہ اداس' ہفتہ بھر کی شیو سے بے نیاز' بڑی محویت سے وہ فیصل کی داستان سن رہا تھا جب وہ الٹا اس پر برس پڑا۔

"بات سن اب' جان یہ میری بنی ہوئی ہے اور حلیہ تو نے بنایا ہوا ہے' ناکام عاشق کا' یہ کیا شکل بنائی ہوئی ہے۔" فیصل کی نفاست پسند طبیعت پر اس کا بگڑا ہوا سراپا گراں گزر رہا تھا۔

"دھندا بالکل چوپٹ پڑا ہوا ہے یار! ہر کوئی ادھار مال مانگتا ہے' تھوڑا بہت ادھار کاروبار میں چلتا ہے مگر یہاں تو ساری رقم پھنسی ہوئی ہے' مال ختم ہو گیا۔ مزید لانے کے لیے رقم نہیں' جن دکانداروں کو مال بیچا ہے وہ کچھ ادائیگیاں کر دیں تو میرا کام چل جائے مگر کہیں سے کوئی آسرا ہی نہیں۔" اسلم اپنی داستان غم سنانے لگا' فیصل اپنی رام کہانی ایک طرف رکھ کر اس کی الجھن کو سلجھانے میں لگ گیا۔

"تو بتا رہا تھا کہ حاجی صاحب پہ ایک بڑی رقم ہے وہ دے دیں گے پچھلے ہفتے۔" فیصل نے کچھ یاد کیا۔

"کیا کہوں یار! انہوں نے وعدہ کیا تھا ادائیگی کا' اس سے پہلے ہی ان کا جوان بیٹا اور بھتیجا مارے گئے' نامعلوم افراد کی فائرنگ سے۔۔۔" اسلم نے ہونٹ بھینچ لیے۔ "دونوں دکان پر بیٹھے تھے' لوگ آئے اور گولیاں برسا کر چلے گئے' اب تو یہ خبر بھی روز کا معمول بن گئی ہے۔ بریکنگ نیوز نہیں رہی۔" اسلم آزردہ ہو گیا۔

"کیا کہیں یار! کراچی میں تو جیسے کوئی خون آشام بلا گھس آئی ہے' کتنا لہو پی چکی ہے مگر۔۔۔" فیصل نے تاسف سے سر ہلایا۔

کچھ دیر تک دونوں چپ رہے پھر اسلم دوبارہ بتانے لگا۔

"تعزیت کے لیے ان کے گھر گیا تھا' میری ہمت نہیں ہوئی دوبارہ ان کے پاس جانے کی اور اب تو ویسے بھی دکان بھی بند ہے۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔"

"دس ہزار ہیں میرے پاس' تیرا کام چل جائے اس سے تو لے لے۔" فیصل نے اسے پیش کش کی۔

"نہیں بھئی! پہلے کے پندرہ ہزار ابھی نہیں اترے۔ اور قرضہ خود پر چڑھا لوں۔" اسلم نے اس کی پیش کش سے صاف انکار کر دیا۔

"پھر کیا کرے گا؟"

"کوئی نوکری دیکھتا ہوں یار!"

"لے' میرا مسئلہ تو بیچ میں ہی رہ گیا۔" فیصل کو اچانک یاد آیا۔

"ہاں' بتا کیا کہہ رہا تھا تو ثمن کو پسند کرتا ہے' وہ بھی بقول تیرے تجھے پسند کرتی ہے مگر تو رشتہ نہیں بھجوا سکتا' کیوں؟"

"پہلی رکاوٹ میرے گھر کی طرف سے ہے۔ بڑے بھیا اور چھوٹے بھیا دونوں نے "لو میرج" کی ہے اور دونوں بھابھیاں اپنے اپنے شوہروں کو لے کر ایسی فرار ہوئیں کہ مہینوں میں ہی شکل دیکھنے کو ملتی ہے۔ امی' ابو دونوں نے کان پکڑ لیے کہ اب میری شادی سراسر اپنی مرضی اور پسند سے کریں گے' اگر انہیں بھنک بھی پڑ گئی نا تو سارا معاملہ خراب ہو جائے گا یار' میں کسی ضد بحث میں نہیں الجھنا چاہتا' بس کچھ ایسا ہو جائے کہ خیر و خوبی کے ساتھ سارے معاملات سیٹ ہو جائیں پھر ثمن کی طرف سے بھی کچھ اسی قسم کا مسئلہ ہے۔"

"وہاں کیا پرابلم ہے؟"

"وہ! جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتی ہے' دادی' پھوپھی' چچی' تائی' سب ہی ہیں۔ پھر گھرانہ ہے روایتی اور قدامت پسند' اس کا یونیورسٹی میں پڑھنا' ایک بہت بڑا معاملہ تھا سب کے لیے' پھر کالج میں پڑھانا' یہ بھی قابل اعتراض تھا سب کے لیے کہ نوکری تو نوکری ہے چاہے پڑھانا ہو یا کچھ اور۔۔۔ لڑکی ذات اور جاب' تنقید اور اعتراضات کا سلسلہ ایسے ماحول میں اگر کسی کو ذرا سا شک بھی ہوا کہ اس کی پسند سے رشتہ ہونے جا رہا ہے تو سب لوگ اسے اور اس کے والدین کو سینگوں پر دھر لیں گے جنہوں نے سب کی مخالفت اور اعتراضات کے باوجود اپنی بیٹی کی پڑھنے اور پڑھانے کی خواہش جو پوری کی۔ وہ بھی یہی چاہتی ہے کہ یہ "ارینج میرج" ہو۔" فیصل نے تفصیل سے بتایا۔

"ماشاء اللہ! ہزار رکاوٹیں' پابندیاں' پھر بھی محبت ضرور کریں گے۔"

"میں نے باتیں بنانے کو نہیں کہا' ہیلپ کرنے کو کہا ہے۔"

"اچھا جی! کریں گے ہیلپ۔۔۔ کرتے ہیں کچھ۔۔۔ ثمن کی فیملی کا سارا بایوڈیٹا بتا۔"

اگلے روز سے ہی اسلم کی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔

ثمن کے والد کا میڈیکل اسٹور تھا' اسلم نے رات میں روزانہ وہیں سے گزرنا شروع کر دیا' ہر دوسرے تیسرے دن وہ کبھی دودھ' کبھی بسکٹ' کبھی پونسٹان یا ڈسپرین کا پتا خرید لیتا۔ دو' تین ہفتے میں اتنی سلام دعا ہو گئی کہ ایک دوسرے سے خیر خیریت دریافت کر لیتے' کبھی اسلم خود ہی بات سے بات نکال کر حالات حاضرہ

ر بھی کوئی بات کر لیتا۔ وہ خوش اخلاق اور سادہ مزاج شخص تھے۔ اسلم کی آہستہ آہستہ بڑھتی بے تکلفی اور گرمجوشی کے جواب میں انہوں نے کبھی رکھائی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ مہینے دو مہینے کے بعد جب اسلم کو محسوس ہوا کہ لوہا ٹھیک ٹھاک گرم ہو چکا ہے تو اس نے چوٹ مارنے کا فیصلہ کیا۔

حسب معمول وہ ان کے اسٹور سے مطلوبہ سامان لے رہا تھا جب اس کے موبائل پہ بیل ہوئی۔

"السلام علیکم انکل۔۔۔! جی جی اللہ کا شکر ہے۔ سب خیریت ہے۔۔۔ میں آپ کے ہی کام میں لگا ہوا ہوں جیسے ہی کوئی اچھی لڑکی اور شریف فیملی میری سمجھ میں آئی "آپ کو فوراً" بتاؤں گا' جی' میں پوری کوشش کروں گا کہ جلد سے جلد کام ہو جائے ٹھیک ہے۔ اللہ حافظ۔" اسلم نے موبائل آف کر کے ان کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔

"میرے دوست کے والدین اپنے بیٹے کے لیے لڑکی تلاش کر رہے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کروا رہے ہیں۔۔۔ مجھے ذمہ داری سونپی ہوئی ہے ایک دو لڑکیاں دکھائیں مگر ان کی سمجھ میں نہیں آئیں۔ دراصل انہیں تعلیم یافتہ لڑکی چاہیے' بھلے لوگ غریب ہوں' مگر ہوں شریف۔۔۔ لڑکا ماشاء اللہ ہیرا ہے ہیرا۔ میرا تو دوست ہے' اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"بڑے صاحب' آپ کی نظر میں کوئی ہو تو بتایئے گا۔" اسلم نے اچانک انہیں مخاطب کیا۔

"ہاں' ہاں کیوں نہیں!" وہ مسکرائے۔

"یہ فیصل کی تصویر اور اس کا بائیو ڈیٹا ہے۔" اسلم نے جھٹ سے ایک لفافہ انہیں دیا۔ "کئی کاپیاں کروا کر رکھی ہوئی ہیں' اپنے جاننے والوں کو دیتا ہوں نصیب کی بات ہے جہاں مقدر ملے گا' وہیں بات بن جائے گی۔"

"ہاں بیٹا! سب نصیب کی بات ہے۔" انہوں نے کاؤنٹر پر سے لفافہ اٹھا لیا۔

اگلے روز اسلم جان بوجھ کر اسٹور پر نہیں گیا۔ اس سے اگلا دن بھی اس نے یونہی نکالا تیسرے دن وہ جا پہنچا۔

"کہاں تھے بھئی؟" انہوں نے بشاشت سے سوال کیا۔

"بس۔۔۔ آپ کو بتایا تھا نا فیصل کے بارے میں اس کے لیے لڑکی دیکھنے گئے تھے۔" اسلم نے بڑی گہری اور لمبی سانس لے کر بتایا۔

"اچھا' پھر بات بنی؟" انہوں نے سوچ سمجھ کر لفظوں کا انتخاب کیا۔

"نہیں! انکل' آنٹی چاہتے ہیں لڑکی ماسٹرز ہو' فیصل نے بھی ماسٹرز کیا ہوا ہے۔"

"ایک لڑکی ہے تو سہی' ماسٹرز ہے' باقی یہ ہے کہ ملاقات کر کے دیکھ لیں۔" انہوں نے جھجکتے ہوئے اسلم سے کہا۔

"اچھا؟ کون ہیں؟ آپ کے جاننے والے ہیں؟" اسلم نے بظاہر متانت سے پوچھا ویسے اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

"میری بیٹی ہے اگر آپ۔۔۔"

☼ ☼ ☼

"موسم حسین ہے لیکن تم سا حسین نہیں ہے
ہر اک ادا تمہاری۔۔۔"

ٹی وی بلند آواز سے آن ہونے کا مطلب کہ خالو گھر آ چکے تھے۔

شبو تھوڑی دیر بعد اپنے محل سرا سے نکل کر آئی۔ گہرے نیلے رنگ کی پرنٹڈ لمبی قمیص جو جدید انداز میں سلی ہوئی تھی' سفید چوڑی دار پائجامہ' سوٹ کا ہم رنگ بڑا سا دوپٹا سر پر اس طرح اوڑھا ہوا تھا کہ بالوں کی دو چار لٹیں' دوپٹے سے باہر جھانکتی رہیں' کل کے کرائے ہوئے ہربل فیشل سے چہرہ دمک رہا تھا اس کا ناک نقشہ تو اپنے باپ کی طرح پھیلا پھیلا تھا مگر رنگت میں وہ خالہ پر تھی' خوب صاف رنگ' جس پر وہ مزید محنت کرکے یوں ہر وقت لشکارے ہی مارتی رہتی تھی۔

"السلام علیکم!" آتے ہی اس نے جملہ حاضرین کو سلام کیا' جو اپنے اپنے مشاغل میں مصروف تھے۔ اماں سر میں مہندی تھوپے سوکھنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ اسلم شیو بنا رہا تھا اور انیلا اس کی پینٹ شرٹ استری کر رہی تھی' اکو اور ہاشم' منی کے ساتھ کیرم کھیل رہے تھے۔ کیبل بند تھا ورنہ تینوں ٹی وی کے سامنے ہی پائے جاتے۔

"کیا لائی ہو؟" سلام کا جواب دے کر سب سے پہلے ضروری سوال پوچھا گیا۔

"ہرے ماش کی دال کی کھچڑی اور املی کی چٹنی۔"

"یہاں کون بیمار ہے؟" ان لوگوں کے نزدیک کھچڑی صرف اور صرف بیماری میں کھانا روا تھی۔

"تھوڑا گوشت ہی ڈلوا لیتیں اس میں۔" اسلم کی طرف سے مشورہ یا فرمائش آئی۔

"خالہ کے لیے لائی ہوں' انہیں پسند ہے۔" شبو سے اپنی کھچڑی' چٹنی اور رائتے کی ناقدری برداشت نہیں ہوئی۔

"اب لائی ہو تو کھا ہی لیں گے۔" اکو نے جیسے احسان جتایا۔

"شکریہ! احسان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" شبو نے ٹرے خالہ کے قریب رکھی۔

"یہ لیں خالہ! گرم گرم ہے' کھائیں۔"

"اس شاہی ڈش کے انتظار میں تو اماں نے دو دن سے کھانا نہیں کھایا۔" اسلم اسے چھیڑنے سے باز نہ آیا۔

"خالہ۔۔۔" وہ ٹھنکی۔

"چپ کر جا لڑکے! ہر وقت کا بولنا اچھا نہیں لگتا۔" اماں نے ٹرے اپنی طرف کھسکاتے ہوئے بیٹے کو جھڑکا۔

"خالو نے تو بڑے مزے لے لے کر کھائی ہو گی۔" اسلم نے پھر فقرہ اچھالا۔

"کل کا آلو' مٹر' قیمہ رکھا تھا ان کے لیے' وہی دیا ہے۔ انہیں بھی ہر سالن اور چاول میں بوٹیاں چاہئیں۔"

"بات سن شبو! اپنی میرون والی فراک دکھانا ذرا شام میں۔" انی نے اسے مخاطب کیا۔ "کل میری سہیلی کی سالگرہ ہے۔ پہن کر جاؤں گی۔"

"اچھا! لے لینا۔" شبو نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔

"کہاں جانے کی تیاری ہے۔" اسلم کو رگڑ رگڑ کر شیو بناتے دیکھ کر شبو نے اشارے سے پوچھا۔

"رشتہ دیکھنے جا رہے ہیں۔" انی نے جھٹ سے اسے جواب دیا۔

"رشتہ؟ کس کا؟"

"اپنا۔" انی نے سنجیدہ منہ بنایا۔

"اپنا رشتہ؟ خود دیکھنے جا رہے ہیں؟" پہلے تو حیرت کے مارے شبو کا منہ پورا کا پورا کھل گیا۔ پھر یکایک اسے کچھ اور اک ہوا۔

"سچ مچ' اپنا ہی رشتہ دیکھنے جا رہے ہیں۔" شبو کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ حلق میں کچھ اٹکنے لگا۔ اس نے فریاد طلب نظروں سے خالہ کی طرف دیکھا۔

"تو اور کیا' ماڈرن زمانہ ہے۔ ماڈرن لوگ' اپنا رشتہ خود ہی دیکھتے ہیں۔ آج کل تو لڑکیاں بھی اپنا رشتہ خود دیکھتی ہیں۔ بعض تو روزانہ دیکھتی ہیں۔" اماں کے کچھ کہنے سے قبل انیلا کی زبان دوبارہ چل پڑی۔

"زیادہ بک بک نہ کیا کر چل! بھائی کے جوتوں پہ ذرا برش مار دے۔" اماں نے اسے ڈانٹتے ہوئے حکم جاری کیا۔

"رشتے کروانے لگا ہے اسلم۔۔۔ وہ ہوتا ہے نا میرج بورو (بیورو) والا کام۔۔۔ وہ کر رہا ہے۔ اسی کے لیے کہیں جانا ہے۔" اماں نے شبو کا فق چہرہ دیکھ کر اسے تسلی دی۔

"اچھا۔" اس نے اطمینان کی سانس لی۔

وہ میرے سامنے تصویر بنے بیٹھے ہیں
میرے ہر خواب کی تعبیر بنے بیٹھے ہیں

خالو نے ٹی وی کا والیوم کچھ اور تیز کر دیا تھا۔

"تیرا ابا و بہت ہی تیز آواز میں ٹی وی سنتا ہے۔ خود تو سنو ہی سنو' پاس پڑوس والے مفت میں سنیں۔" اماں یہ اعتراض اکثر کرتی رہتی تھیں۔

"پرانی عادت ہے خالہ! کیا کریں۔" اس نے ہمیشہ کی طرح لاپروائی سے جواب دیا اور انیلا کے پاس جا

بیٹھی۔ دونوں کے پاس ایک دوسرے سے کرنے کے لیے بہت ساری باتیں تھیں۔

اسلم گھر سے نکل گیا تھا۔ قریبی پیٹرول پمپ سے بائیک میں پیٹرول ڈلوا کر وہ اپنی منزل کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ گاڑی سے زیادہ اس کے خیالات کی رو تیز تھی۔

یہ چوتھا رشتہ تھا جو وہ کروانے جا رہا تھا۔ اس سے پہلے تین رشتے وہ کامیابی سے کروا چکا تھا۔ اگرچہ اس کامیابی کے لیے اسے بہت پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ لڑکے والوں کی باتیں اور ڈیمانڈز نرالی تھیں۔ مگر لڑکی والے بھی کچھ کم نہ تھے۔ ایک تو سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ "تقریباً" ہر والدین یہ چاہتے تھے کہ پہلے بیٹیوں کا رشتہ یا شادی کہیں ہو جائے پھر بیٹے کے بارے میں سوچیں گے۔

"ہر کوئی یہی سوچ لے تو لڑکیوں کے لیے لڑکے کہاں سے آئیں گے۔" اسلم بساط بھر لوگوں کو کنوینس کرنے کی کوشش کرتا۔

"اللہ کا نام لے کر بیٹے کے لیے کوئی رشتہ فائنل کریں۔ آپ کسی کی مشکل آسان کریں گے۔ اللہ آپ کی مشکل آسان کرے گا۔" اسلم نے شمسہ خالہ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھیں۔

"بیٹا! ہم تو کسی کے ساتھ نیکی کر لیں اور جو کسی اور کو یہ نیکی نہ سوجھی تو میری لڑکیاں تو بیٹھی رہ جائیں گی اور لڑکے پار لگ جائیں گے۔" انہوں نے نکتہ اٹھایا۔

"اوفوہ...؟" وہ اپنا سر پیٹتے پیٹتے رہ گیا۔ "اللہ پر بھروسا بھی کوئی چیز ہے؟"

"اچھا بیٹا! تم کہتے ہو تو کچھ سوچتی ہوں۔" انہوں نے جیسے کڑوا گھونٹ پینے پر رضامندی ظاہر کی۔

اب بھی نہ سوچیں گی؟ دونوں بیٹے بالترتیب پینتیس اور تینتیس سال کے ہو رہے تھے۔ پھر تین لڑکیاں تھیں۔ سالوں سے وہ اس کوشش میں تھیں کہ پہلے لڑکیوں کی نیا پار لگا دیں، مگر فی الحال تو سب کی کشتیاں ساحل سے دور تھیں۔

اسلم کی بھاگ دوڑ اور کوششوں سے دونوں لڑکوں اور ایک لڑکی کا رشتہ طے ہو گیا تھا۔ اب ایک لڑکی کا رشتہ اور ہونے جا رہا تھا۔ اسلم کا طریقہ کار تھا کہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ وہ پہلے دونوں کی فیملیز کے بارے میں اچھی طرح چھان بین اور معلومات کرنے کے بعد جب خود مطمئن ہو جاتا تب بات آگے بڑھاتا۔ بہرحال اب وہ ساری معلومات کر کے شمسہ خالہ کے پاس جا رہا تھا۔

"اوئی! لڑکا ٹھیلا لگاتا ہے۔" وہ اچھل پڑیں۔ "میری لڑکی چودہ کلاس پڑھی ہوئی ہے۔ پھر لوگ کیا کہیں گے۔ خاندان ہے۔ محلہ ہے۔ برادری ہے۔ سب باتیں بنائیں گے۔ اے بیٹا! کوئی نوکری پیشہ کا رشتہ لاؤ۔" وہ یوں فرمائش کر رہی تھیں۔ جیسے اسلم آرڈر پہ رشتے تیار کرتا ہو۔

"ارے خالہ! لڑکا ریڑھی ضرور لگاتا ہے۔ مگر جاہل جٹ نہیں ہے۔ انٹر پاس ہے اور نوکری سے زیادہ اس کام میں کماتا ہے۔ محنتی ہے۔ اسی کمائی سے اس نے گھر بنایا ہے۔ بہن کی شادی کی ہے۔ اب اپنی کرے گا۔ ویسے اگلے چند سالوں کے لیے اس کا پلان ہے کہ کوئی بڑی کمیٹی ڈال کر اپنی دکان خریدے گا۔" اسلم نے انہیں تفصیل بتائی۔

"پھر بھی بیٹا۔ وہ تو بعد کی بات ہے۔ ابھی تو سب پوچھیں گے نا کہ لڑکا کیا کرتا ہے۔ ہم کیا کہیں گے؟" ان کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"بات سنیں خالہ! غور سے سنیے گا" نوکری پیشہ وہ رشتے میں لایا تھا نا۔ دونوں نے آپ کی بیٹی کو ناپسند کر دیا تھا۔ ان لوگوں نے نہ آپ کی بیٹی کا چھوٹا قد دیکھا، نہ کم رنگت، پھر ان کی کوئی ڈیمانڈ بھی نہیں۔ لڑکا برسر روزگار ہے۔ شریف ہے۔ گھر اپنا ہے۔ فیملی چھوٹی ہے اور کیا چاہیے آپ کو، رہی بات لوگوں کی تو کسی کے کچھ کہنے کی پروا مت کریں۔ آپ کی بیٹی خدانخواستہ اگلے چند سال اور گھر بیٹھی رہی تو کوئی خاندان، محلے اور برادری والا نہیں پوچھے گا کہ جی لاؤ! ہم تمہاری پریشانی میں تمہاری مدد کریں۔" اسلم نے انہیں سمجھاتے ہوئے تقریر جھاڑ دی۔

"ٹھیک ہے بیٹا! سب گھر والوں سے مشورہ کر کے جواب دے دیں گے۔" خالہ نے ایک گہری سانس لی۔

ایک ہفتے بعد انہوں نے مثبت جواب دے دیا۔

☼ ☼ ☼

یاور بھائی کے مشورے اور معاونت سے ایک مناسب جگہ کرائے پہ لے کر اس نے باقاعدہ اپنا آفس کھول لیا تھا۔ ابھی تک تو راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ سوائے ان اوقات کے جب خالو ٹی وی کے سامنے ڈٹے ہوتے۔

دل کو جلانا ہم نے چھوڑ دیا چھوڑ دیا۔

پھرتے تھے مارے مارے...

"اف!" اسلم نے تکیے میں منہ گھسایا۔ ابھی ابھی نیند کی وادی میں پہنچا تھا کہ ٹی وی کی تیز آواز نے ہاتھ پکڑ کر واپس بیداری کی دنیا میں لا پٹخا۔

"ارے اسلم بیٹا! بات سن، سو رہا ہے کیا؟" اماں نے باآواز بلند اسے پکارا۔

"کوشش کر رہا تھا۔ اب کہاں ملے گا سونا۔ سلطان راہی جو آگئے ہیں گھر پر۔" وہ بھنا کر اٹھ بیٹھا۔

"ان کو چھوڑ، بات سن میری۔" اماں ہاتھ ہلا کر اس سے مخاطب ہوئیں۔

"ہاں!" اسلم نے منہ پہ ہاتھ رکھ کر جمائی روکی۔

"مجھے اسپتال لے چل آ۔"

"خیریت۔" ان کی فرمائش پر اسلم بری طرح چونکا۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"

"ہاں ہاں! میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ اللہ کا شکر ہے بھلی چنگی ہوں، کسی کو دیکھنے جانا ہے۔"

"کسے؟" انگڑائی لیتے ہوئے سوال ہوا۔

"روبینہ یاد ہے ہماری صالحہ چچی کی بھتیجی، تم لوگ چھوٹے چھوٹے سے تھے جب تو وہ اکثر ان کے ساتھ آیا کرتی تھی ہمارے گھر۔ چچی نے اسے گود لیا ہوا تھا نا۔"

"پتا نہیں اماں! آگے بولو۔" اسلم نے ذہن پہ زور دینے کی زحمت بالکل نہیں کی۔ بچپن میں تو ڈھیروں ڈھیر رشتے داروں کا آنا جانا تھا گھر میں، اس بھیڑ بھڑکے میں اماں کی صالحہ چچی کی بھتیجی کو شناخت کرنا، مشکل کام تھا۔

"بے چاری کو اٹیک ہو گیا۔" اماں کے چہرے پہ افسردگی چھا گئی۔

"صالحہ چچی کو؟"

"نہیں، ان کی بھتیجی کو، روبینہ کو، جسے انہوں نے گود لیا تھا۔ اللہ بخشے ہماری چچی کے میکے والے بھی ہمارے رشتے دار ہی تھے تو ان کی بھتیجی بھی..."

"کون سے اسپتال جانا ہے اماں؟"

"کارڈیو جانا ہے۔"

جتنی دیر میں وہ نہا دھو کر شیو بنا کر تیار ہوا۔ اماں نے لپک جھپک ہنڈیا چڑھا دی۔ روٹیاں انیلا کے ذمے لگائیں اور خود استری شدہ چکن کا سوٹ پہن کر تیار ہو گئیں۔ بھائی اور اماں کے کپڑے منی نے استری کر دیے تھے۔

"چلو اماں!" اسلم نے بائیک کی چابی ہاتھ میں پکڑی۔

"ہاں ہاں چل! تو بائیک نکال، میں چپل پہن کر آتی ہوں۔ منی! میری جوتی تو نکال دے سفید والی۔"

"اچھا اماں!" منی نے الماری کے اس خانے کو کھولا، جہاں جوتیاں رکھی تھیں۔ ساری جوتیاں دیکھ لیں۔ سفید جوتیاں نہیں ملنی تھیں، نہ ملیں۔

"انیلا باجی پہن کر گئی تھیں۔ پرسوں قرآن خوانی میں، ان سے پوچھو، کہاں رکھی تھیں۔" اماں کے ڈانٹنے پر منی کا منہ بن گیا۔

"نہیں تو رکھی تھی۔" اماں کی پھٹکار پر انیلا بادل نخواستہ ٹی وی کے سامنے سے ہٹی، الماری میں دیکھا، ادھر ادھر ٹٹولا۔

"نیچے تو نہیں گھس گئی۔ اتاری تو یہیں تھی۔" انیلا نے الماری کے نیچے جھانکا۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا۔ ایمرجنسی لائٹ لے کر آئی۔ اس کی روشنی میں دوبارہ جھانکا تو بالکل اندر کی طرف سفید جوتیاں چمکتی نظر آئیں۔

اسلم اندر آگیا بھنایا ہوا۔

"اتنی دیر سے موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے کھڑا ہوں کیا ہو گیا؟"

"ارے میری جوتیاں۔"

"الماری کے نیچے پڑی ہیں' نکالیں کیسے؟" منی نے اطلاع دیتے ہوئے پوچھا۔

"اف! ایک تو تم لوگ۔" اسلم نے تیزی سے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ چارپائی پر سے اماں کا دستی پنکھا اٹھایا اور انیلا کو دیا۔

"جلدی کر۔"

اس نے جلدی سے جوتیاں نکال کر اماں اماں کے آگے رکھیں۔

☼ ☼ ☼

اسپتال میں مریضہ کے روم تک پہنچنے میں انہیں تھوڑی سی دشواری تو ہوئی۔ مگر دو چار افراد سے پوچھ پوچھ کر وہ پہنچ ہی گئے۔

مریضہ' بیڈ پر بیٹھی تھیں اور ایک نوجوان لڑکی کو چمکار رہی تھیں۔ جس کا چہرہ اور آنکھیں بتا رہی تھیں کہ خاصے آنسو بہائے گئے ہیں۔

اماں کو دیکھ کر مریضہ صاحبہ نے خاصی خوشی اور گرم جوشی کا اظہار کیا۔ اسلم تو معلوم کر کے خاموش بیٹھا بس جائزہ لے رہا تھا۔ پہلے کمرے کا' پھر کمرے میں موجود نفوس کا۔ ویسے یہ مریضہ لگ تو نہیں رہیں۔ ان کا چمکتا دمکتا صاف ستھرا سراپا آواز کی کھنک اور چہرے بشرے کی تازگی و شادابی' کہیں سے بھی انہیں مریضہ ظاہر نہیں کر رہی تھی۔ البتہ وہ دبلی پتلی' روئی روئی سی لڑکی جسے وہ چمکار رہی تھیں۔ ضرور مریض لگ رہی تھی۔

"ارے کچھ نہیں ہوا مجھے اماں۔" وہ اماں سے مخاطب تھیں۔ "معمولی سا انجائنا کا اٹیک تھا۔ ای سی جی سمیت سارے ٹیسٹ کلیر ہیں۔ کل چھٹی ہو جائے گی۔ یہ پاگل یوں ہی گھبرا گئی۔ دیکھو ذرا' کیسے رو رو کر آنکھیں سجا لیں۔" وہ ہنس ہنس کر بول رہی تھیں اور اماں اور اسلم کی غیر ارادی نظریں خود پر محسوس کر کے اس "پاگل" کے چہرے پہ خفت چھا گئی۔

"یہ اسلم ہے نا؟ ہائے کتنا بڑا ہو گیا۔" اسلم کو دیکھ کر بولتے ہوئے ان کا انداز ایسا تھا کہ اسلم کو ہنسی آگئی۔ اس کے ذہن کے دریچوں میں ایک دھندلی سی شبیہ واضح ہونے لگی تھی۔ جب نو عمر اور الہڑ سی روبینہ باجی اکثر صالحہ چچی کے ساتھ ان کے گھر آتی تھیں تو وہ چھریرا بدن اور نو عمری کا بانکپن ویسا نہیں رہا' مگر ان کی جان دار اور زوردار ہنسی وہی تھی۔

"آپ کی ہنسی ویسی ہی ہے' جیسی میں نے اپنے بچپن میں سنی تھی۔" اسلم مسکراتے ہوئے ان سے مخاطب ہوا۔

"ہے نا! ہاں! سب مجھ سے یہی کہتے ہیں' روبینہ! تمہاری ہنسی وہی ہے جو پندرہ سال پہلے تھی۔" انہوں نے پھر اسی تاریخی ہنسی کے ساتھ اس کی تائید کی۔

"یہ بچی کون ہے؟" اماں نے ناک کی پھننگ پر چشمہ جما کر اسے غور سے دیکھا۔

"ثمینہ آپا کی بیٹی ہے۔ رامین' چھوٹی تھی تو کئی بار آپ کے گھر آئی تھی۔"

"ارے! یہ ثمینہ کی بچی ہے۔ ماشاء اللہ بڑی ہو گئی۔"

"وقت گزرتا ہے تو یہی ہوتا ہے۔ بچے بڑے ہو گئے جو بڑے تھے وہ بوڑھے ہو گئے۔ جو بوڑھے تھے وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔" روبینہ کی آنکھوں میں یک لخت اداسی اتر آئی۔

"ثمینہ بے چاری تو بس یوں ہی چٹ پٹ ہو گئی۔ ذرا سی دیر میں' کیسی جوان' خوب صورت تھی۔ ابھی تک آنکھوں میں پھرتی ہے۔" اماں نے بیتے دنوں اور گزرے لوگوں کو یاد کیا۔ ماحول تھوڑا سا سوگوار سا ہو گیا۔ کچھ لمحے خاموشی کے یوں ہی سرک گئے۔

"اسلم کیا کرتا ہے؟ کوئی نوکری وغیرہ۔" روبینہ نے سنبھلتے ہوئے موضوع بدلا۔

"رشتے کراتا ہے۔" اماں نے کھٹاک سے جواب دیا۔

"ہیں۔۔۔ اچھا!" روبینہ کے چہرے پہ حیرت کے

انکار' پھر ایک دم وہ ہنس پڑیں۔ اسلم بھی جھینپ کر مسکرا دیا۔ یوں ہی اس کی نگاہ سامنے پڑی۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ نے پل بھر کو اس کے ہونٹوں کو بھی چھوا تھا۔

"آفس کھولا ہوا ہے۔ رشتے کرانے کا ہم کیا کہتے ہیں ہے' میرج بیورو۔" اماں نے اپنی بات کی مزید وضاحت کی۔

"اچھا! تو میرج بیورو ہے تمہارا' ویری گڈ۔" انہوں نے تعریفی انداز میں اسلم کو دیکھا۔ "ہماری رامین کے لیے بھی کوئی اچھا رشتہ ہو تو بتانا۔"

"آں۔۔۔ ہاں! آپ بائیو ڈیٹا دے دیجیے گا۔" اسلم نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔ رامین نے شکایتی نظروں سے اپنی خالہ کو دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

"لو بتاؤ! ذرا جب بھی شادی کا ذکر کرو۔ یہ ایسے ہی منہ بنا لیتی ہے۔ شادی تو ہونی ہی ہے۔ ساری زندگی اکیلے تو گزارنے سے رہی۔ یہ بھی کسی کسی کا دل گردہ ہوتا ہے' کیوں اماں؟"

"ہاں! بچی ٹھیک کہتی ہے۔ بچے جتنی جلدی اپنے اپنے گھروں کے ہو جائیں' اچھا ہے۔"

"میں ہفتہ' دس دن میں چکر لگاؤں گی پھر' ٹھیک ہے۔" اسلم سے مخاطب ہوئیں۔ "آفس کہاں ہے تمہارا؟"

"آفس کیوں؟ گھر آنا سیدھے سیدھے' اسی بہانے پرانی یادیں تازہ کر لیں گے۔" اماں نے فوراً" مداخلت کی۔

"ہاں ضرور' گھر بھی آؤں گی۔ ان شاء اللہ۔" انہوں نے فوراً" وعدہ کیا۔

☼ ☼ ☼

واپسی پر اماں' سارے راستے روبینہ اور صالحہ چچی کی ہسٹری سے اسے آگاہ کرتی رہیں۔

"بے چاری کی شادی ہوئی۔ پر اللہ نے اولاد نہ دی۔ میاں باہر چلا گیا۔ سنا تھا کہ دوسری شادی کر لی۔ ویسے پیسہ وغیرہ تو بھیجتا رہا اسے' شروع کے چند سال پاکستان آیا بھی' پھر آہستہ آہستہ آنا کم ہو گیا۔ یہ تو گورنمنٹ ٹیچر ہے۔ کچھ وقت اپنی نوکری میں کاٹ لیا۔ کچھ بچی کے سہارے سے' ثمینہ کے انتقال کے بعد اس کے میاں نے دوسری شادی کر لی۔ روبینہ' بھانجی کو اپنے گھر لے آئی۔ بچی کو ماں کا پیار مل گیا اور اسے دو سراہٹ' اکیلے انسان کی بھی کوئی زندگی ہے بھلا' نہ ہنستا اچھا لگے' نہ رونا۔"

اسلم "ہوں' ہاں" کرتا رہا۔ ان کی ایسی ہی باتوں میں سارا سفر کٹ گیا۔ گھر پہنچے تو وہاں ایک ہنگامہ بلکہ طوفان بدتمیزی مچا ہوا تھا۔ وجہ نزاع؟ ریموٹ کا حصول ایک ہی وقت میں انیلا اور منی کا پسندیدہ ڈراما' ہاشم کا کرکٹ میچ اور اکو کی پسندیدہ فلم آ رہی تھی۔ انیلا اور منی کا اتحاد دونوں الگ الگ فریقوں پہ بھاری تھا۔ سو ریموٹ تو حاصل کر لیا' مگر اسے استعمال کیسے کرتے۔ دونوں بھائی ٹی وی کے آگے ہاتھ پھیلا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ انیلا اور منی کا آدھا ڈراما نکل چکا تھا۔ دونوں نے چھوٹے بھائیوں کے بال پکڑ کر کس کس کے دو' تین جھانپڑ لگا ئے۔ ہاشم نے غصے میں اس کے ہاتھ سے ریموٹ چھین کر اتنی زور سے دیوار پہ پھینک کر مارا کہ وہ دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ غصے اور رنج کے مارے انیلا اور منی دونوں کو رونا آ گیا۔ ڈراما جس وقت نشر مکرر آتا تھا۔ وہ لوڈشیڈنگ کا ٹائم تھا۔ اب اسے دوبارہ دیکھنے کے لیے ایک ہفتہ انتظار کرنا پڑتا جب چھٹی کے دن اکٹھی قسطیں نشر ہوتی تھیں۔

"جیسے ریموٹ توڑا ہے۔ ایسے ہی دو چار پتھر مار کر اس کم بخت کو بھی توڑ دو' کچھ تو سکون ہو گھر میں' ہر وقت ہنگامہ' شور شرابا' نحوست پھیلائی ہوئی ہے۔"

شبو جو اس سارے معاملے کی گواہ اور ریفری تھی اس سے سارا قضیہ سن کر اماں نے سب کو بے نقط سنا دیں۔ ان چاروں کو بھی اور ٹی وی کو بھی جو اس سارے فساد کی جڑ تھا۔

"کہیں جانا غضب ہو جاتا ہے۔ سفر سے اتنا سر درد نہیں ہوتا۔ جتنا یہ لوگ کر دیتے ہیں اپنی حرکتوں سے۔" اماں دیر تک بڑبڑاتی رہیں۔ پھر آرام کی غرض

سے لپٹ گئیں۔
"چائے بناؤں خالہ؟" شبوان کا سر دبانے لگی۔
"بنادے۔۔۔ اسلم کو بھی دے دے، وہ بھی تھک گیا ہوگا' اسپتال مارا بھی اللہ میاں کے پچھواڑے میں ہے، اسکوٹر پہ بیٹھے بیٹھے کمر دکھ گئی۔"
"اسپتال تو ٹھیک جگہ پر ہے اماں! ہم ہی کراچی شہر کے ایک کونے میں رہتے ہیں۔" اسلم نے تولیے سے منہ رگڑتے ہوئے ان کی تصحیح کی۔ وہ ہاتھ منہ دھو کر آیا تھا۔

شبو نے چوری سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ مگر غضب کی کشش تھی۔ پینٹ شرٹ میں اس کا دراز قد اور بھی نمایاں لگ رہا تھا۔ وہ اب چھوٹے سے کنگھے سے اپنے بالوں میں کنگھا کر رہا تھا۔ اس کا ہیر اسٹائل بھی اس پر خوب جچتا تھا یا فقط شبو کو ایسا لگتا تھا۔

"بات سن شبو! بس دو کپ ہی بنانا، کبھی دیگچہ بھر کے چڑھادے چائے کا۔" اماں نے اسے تنبیہہ کی۔
وہ راشن بندی کے معاملے میں کافی سخت تھیں۔ فضول خرچی نہ خود کرتیں، نہ کرنے دیتیں۔ وسائل محدود تھے۔ مسائل اور خرچے لامحدود، جہاں تک ہو سکتا تھا، کفایت شعاری سے ہی کام لیتیں۔
"جی خالہ!" شبو کی محویت ان کی آواز سے ٹوٹ گئی۔ وہ کچن کی جانب جانے لگی۔
"ایک عرض میری بھی سن جا' چائے میں اگر چینی کی جگہ کچھ اور ہوا نا تو زبردستی ساری چائے تجھے ہی پلاؤں گا۔" اسلم نے بھی اسے تنبیہہ کی۔
"اللہ وہ تو ایک بار کا مذاق تھا بس ایسے ہی۔" شبو کھسیانی ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

اگلے ہفتے چھٹی کے دن روبینہ باجی، رامین کے ساتھ حاضر ہو گئیں۔ اسلم گھر پر ہی تھا۔ اماں کی خوشی دیدنی تھی۔ انہوں نے جلدی سے اسے مرغی لینے بھیج دیا اور انیلا کو کچن میں چائے بنانے کے لیے۔

"ڈھنگ کی چائے بنانا' پانی جیسی نہ ہو۔" تنبیہہ انیلا کے ساتھ ساتھ اسلم کے کانوں میں پڑی' وہ مسکرا دیا۔
اسلم کھانا پکانے کا سامان اور چائے کے لوازمات لے کر آیا تو محفل جمی ہوئی تھی۔ بلکہ الگ الگ محفلیں جمی تھیں۔ تین خواتین کی الگ محفل اماں، خالہ اور روبینہ باجی پر مشتمل تھی اور دوسرے کمرے میں لڑکیوں نے ڈیرا جمایا ہوا تھا۔ انیلا، شبو اور رامین۔
"بھائی! تم بھی یہیں آجاؤ۔ میں چائے نکال کر لاتی ہوں۔" انیلا نے اسے آواز لگائی۔
"رامین کو۔۔۔۔ بچپن کی بہت ساری باتیں یاد ہیں۔" انی نے باآواز بلند تبصرہ فرمایا اور تھیلے کھول کر ناشتے کا سامان نکال کر ٹرے میں لگانے لگی۔
"میرے بچپن کی یا اپنے بچپن کی۔" اسلم کو اس بے وقوفانہ بات پہ ہنسی آگئی۔ وہ اس وقت تقریباً دس سال کا تھا اور رامین چھ، سات سال کی جب وہ امی، خالہ اور نانی کے ساتھ یہاں آیا کرتی تھی۔
انیلا نے پلیٹوں میں گن کر سموسے نکالے، بندہ ایک عدد، گلاب جامنیں ثابت رکھنے کے بجائے دو، دو ٹکڑے کر کے پلیٹ میں رکھیں۔ نمکو اور بسکٹ سجائے اور دسترخوان لگا دیا' چائے دم پر رکھی تھی۔
چائے بہت خوش گوار ماحول میں پی گئی۔ ہنسی مذاق اور پرانی یادیں۔ پندرہ سال پہلے کے لوگ اور زمانہ، کچھ کی جوانی تھی اور کچھ کا بچپن مگر گفتگو میں دلچسپی سب کی یکساں تھی۔ بات سے بات نکلی تو جانے کیا کیا یاد آتا چلا گیا۔ اسلم، تمام بچوں کو درخت پہ چڑھنا سکھاتا تھا اور اس کی سب سے بڑی شاگرد رامین تھی۔ اسے درخت پر چلتے سرخ کالے چیونٹوں سے خوف آتا تھا اور اسلم اس کا خوف دور کرنے کے لیے چیونٹے پکڑ پکڑ کر اس کی طرف پھینکتا تھا۔
"ڈر کیوں رہی ہو' یہ کاٹتے نہیں ہیں۔" درخت پر جھولا ڈالا جاتا' جو بچہ ایک بار جھولے پہ بیٹھ جاتا وہ اترنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اسے بڑی مشکل سے زبردستی اتارا جاتا تھا۔
"ان میں سے کوئی بھی میرا نام ٹھیک سے نہیں لیتا تھا۔" اسلم نے سموسہ چٹنی میں ڈبوتے ہوئے ایک اور یاد تازہ کی۔
"سب اسم بھائی کہتے تھے۔ "ل" کھا جاتے تھے۔" وہ اک دم بولی۔
اسلم نے چونک کر اسے دیکھا۔ یہ رامین اسپتال والی رامین سے ذرا مختلف لگ رہی تھی۔ تھوڑی سی پراعتماد، تھوڑی سی ہنس مکھ اور تھوڑی سی بے تکلف، کم گو نہیں لگ رہی تھی۔ نہ ہی بہت زیادہ باتونی، بس سب کی گفتگو کے دوران کوئی نہ کوئی لقمہ دے دیتی۔ کبھی بچپن کی کوئی بات، کبھی بھولی بسری کوئی یاد اور کبھی ہلکا پھلکا سا مذاق۔
انیلا چائے نکال کر لے آئی تھی اور سب کو کپوں میں ڈال کر پیش کر رہی تھی۔
"تم چائے ابھی بھی نہیں پیتی ہو یا اب پینی شروع کردی ہے؟" اسلم نے اتنی دیر میں پہلی بار رامین کو براہ راست مخاطب کیا۔
"اماں! تمہارے بیٹے کی یادداشت تو بہت اچھی ہے۔ اسے یاد ہے کہ رامین جب بھی رکتی تھی تو ناشتے میں چائے کے بجائے دودھ پیتی تھی۔" روبینہ باجی حسب عادت قہقہہ لگا کر اماں سے مخاطب ہوئیں۔ جبکہ رامین نے پہلے تو حیران ہو کر اسلم کو دیکھا، پھر مسکرا دی۔
"کبھی کبھار پی لیتی ہوں، بطور مہمان کہیں پینی پڑ جائے تو۔"
"مگر یہاں تو تم مہمان نہیں ہو۔"
"اور کیا، کوئی زبردستی تھوڑی ہے۔ تمہارے حصے کی چائے بھائی پی لیں گے یا شبو، دونوں ہی چائے کے رسیا ہیں۔" منی نے لقمہ دیا۔
"تھوڑی سی دے دو، بس آدھا کپ؟"
"اچھا!" انیلا نے اس کے کپ میں تھوڑی سی چائے انڈیل دی۔

"اسلم بیٹا! میرا کام یاد ہے نا؟" روبینہ باجی نے رات میں باتوں کے دوران اسے مخاطب کیا۔
"آپ کا نمبر ہے نا میرے پاس، دو چار روز میں ان شاء اللہ میں کانٹیکٹ کروں گا۔ ویسے کوئی خاص ڈیمانڈ وغیرہ؟" اسلم نے کن اکھیوں سے ذرا دور بیٹھی رامین کی جانب دیکھا جو کوئی میگزین پڑھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ کے شریک محفل ٹی وی کے آگے محو تھے۔
"نہیں! ایسی تو کوئی خاص ڈیمانڈ نہیں۔ بس شریف لوگ ہوں، برسر روزگار ہو لڑکا، کسی تنظیم وغیرہ میں نہ ہو۔" روبینہ باجی نے ایک ہی سانس میں اپنے مطالبات گنوا دیے۔
"ٹھیک ہے۔ آپ بے فکر ہو جائیں، آپ کی ذمہ داری اب میرے کاندھوں پر۔" اسلم نے انہیں یقین دلایا۔
روبینہ باجی اور رامین ایک رات رک کر اگلے روز چلی گئی تھیں۔ مگر انیلا اور منی دونوں اماں کے ساتھ گھنٹوں ان ہی کی باتیں کرتی رہیں۔
"روبینہ باجی کی اسکن ابھی تک ۔۔۔ کتنی اچھی ہے، ہے نا۔"
"بڑی حسین تھیں دونوں بہنیں۔ ایک تو خاک کے نیچے چلی گئی، دوسری یہیں خاک دھول ہو گئی۔ بس اپنے دکھوں کا اشتہار نہیں لگایا، سارے غموں کو ایک طرف ڈال کر خوش باش رہنے کی کوشش کرتی ہے۔ اللہ بھی اپنے بندوں کو کیسے کیسے آزماتا ہے۔" اماں نے بڑی افسردہ سی سانس لی۔
"اماں! یہ لوگ اتنے سالوں سے آئے کیوں نہیں ہمارے گھر۔" منی نے اماں سے سوال کیا۔
"بس! پہلے تو بہت میل ملاپ اور آنا جانا تھا ہمارا، پھر صالحہ چچی اور ثمینہ کے انتقال کے بعد روبینہ اپنے اور رامین کے چکروں میں پھنس گئی۔ ہم اپنے گھر بار اور بچوں کے دھندوں میں لگ گئے۔ خاندان کی کسی خوشی، غمی میں ذرا دیر کو ملاقات ہو جاتی تھی کبھی کبھار، وہ مجھ سے اصرار کرتی، گھر آنے کا، میں اسے بلاتی، دونوں وعدے کر لیتے۔ مگر نہ اس کا آنا ہوا، نہ میرا جانا،

اب اس کے اسپتال جانے کا سنا تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔ بھلا بتاؤ! ہمارے سامنے کی بچیاں اور یہ نگوڑ ماری بیماریاں' میں جا کر حال چال پوچھ آئی تو بچی کو بھی آنے کا حوصلہ ہو گیا۔" اماں نے منی کے سوال کے جواب میں پوری رام کہانی سنا دی۔

"رامین ہے کتنی پیاری نا' بالکل فاطمہ گل لگ رہی تھی۔"

"کوئی نہیں' اس سے بھی اچھی ہے۔ بال دیکھے تھے رامین کے' کتنے لمبے' کتنے خوب صورت تھے۔ ایسے تو فاطمہ گل کے بھی نہیں ہیں۔" منی نے فوراً اختلاف کیا۔

"ہاں! مگر رنگ ذرا سانولا ہے۔"

"تو کیا ہوا' یہ جو ٹی وی پر آتی ہیں' سب کی سب اتنی گوری چٹی تھوڑی ہوتی ہیں۔ سب میک اپ اور کیمرے کا کمال ہوتا ہے۔" منی نے اپنی معلومات جھاڑیں۔

"ہاں! مجھے پتا ہے۔" انیلا کیوں پیچھے رہتی' جلدی سے بولی۔

"میں نے پڑھا تھا ڈائجسٹ میں "ایشوریہ" بھی کالی ہے۔"

"تو؟ اس کا میاں کون سا گورا ہے؟"

"بس۔۔۔ شروع ہو گئیں دونوں چونچیں لڑانے۔ اللہ دے اور بندے لے۔ بات کسی کی ہو' کہیں کی ہو' پہنچیں گی وہیں۔ کم بخت ٹی وی اور ٹی وی والے اور والیاں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے۔" اماں نے دونوں کو بے طرح گھورا۔

"اماں! سنجیدہ خالہ نے کمیٹی کے پیسے منگوائے تھے۔ میں بتانا بھول گئی۔ تم نہا رہی تھیں جب۔" منی نے بروقت موضوع بدلنے کی سعی کی۔

"ہاں! اسے بھی کمیٹی بھجوانی ہے' رات کو یاد دلا دینا۔ اسلم آئے تو اس سے پوچھتی ہوں۔ کچھ رقم اس کے پاس ہو تو دے دے۔"

"اچھا! ٹھیک ہے۔ میں یاد دلا دوں گی۔" منی نے بڑی فرماں برداری سے سر ہلایا۔

☼ ☼ ☼
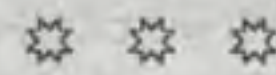
اسلم نے اپنے وعدے کے مطابق جو ایک [illegible] رامین کے لیے موزوں لگی' روبینہ باجی سے ملوا[illegible] ان لوگوں کو رامین بے حد پسند آئی اور روبینہ باجی کو [illegible] وہ لڑکا اور فیملی رامین کے لیے ٹھیک ٹھاک لگے تھے مگر ہفتہ گزر گیا تھا۔ انہوں نے ابھی تک اسلم کو [illegible] جواب نہیں دیا تھا۔ تنگ آکر اسلم نے خود ہی انہیں فون کھڑکایا۔

"آپ نے کہا تھا کہ آپ خود ہی جواب دے دیں گی۔ آپ نے فون ہی نہیں کیا' مجھے نہ کچھ بتایا۔ لڑکے والے جواب مانگ رہے ہیں' کیا کہوں؟" علیک سلیک کے بعد اسلم فوراً "کام کی بات پر آ گیا۔

"اب میں کیا کہوں۔ اسلم مجھے تو لڑکا پسند آیا مگر۔۔۔"

"مگر کیا؟"

"رامین راضی نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"یہی تو میری بھی سمجھ میں نہیں آرہا۔ اتنا سمجھا[illegible] ہوں۔ مگر وہ شاید کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتی۔"

"کوئی اور تو معاملہ نہیں ہے۔ آئی مین کوئی پسند وغیرہ؟"

"نہیں' نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ جلدی سے بولیں۔

"دراصل ایک تو وہ مجھ سے محبت بہت کرتی ہے' کہتی ہے "آپ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔" پھر شادی کے نام سے بدکتی بھی ہے۔" روبینہ باجی دھیرے دھیرے اس سے اپنے معاملات شیئر کر رہی تھیں۔

"کیوں؟" وہ چونکا۔

"کہتی ہے۔ آپ کو اور امی کو شادی کر کے کیا ملا۔ جو مجھے ملے گا۔" روبینہ باجی کی تھکی تھکی سی آواز آئی۔ بہت سارے بوجھ اکیلے اٹھاتے اٹھاتے وہ تھک چکی تھیں شاید۔ اسلم کو کچھ ایسا ہی محسوس ہوا۔

"باجی! میں کل چکر لگاتا ہوں آپ کے پاس۔"

اسلم نے نرمی سے کہا۔

اگلے روز وہ شام میں ان کے گھر جا پہنچا۔

"میں خود بات کر لوں رامین سے؟"

"ہاں! کر لو۔ مگر یہ ظاہر مت کرنا کہ میں نے تم سے کچھ کہا ہے۔" وہ جلدی سے بولیں۔

"اچھا۔"

رامین سلام کر کے اور خیر خیریت پوچھ کر اندر چلی گئی۔ اندر سے برتنوں کی کھٹر پٹر کی آوازیں آرہی تھیں۔ تھوڑی دیر میں وہ ٹرے میں کولڈ ڈرنک' چپس' کباب اور کیچپ لے آئی۔

"میں کھانا کھا کر آیا تھا۔" اسلم نے جانے کیوں تکلف کا مظاہرہ کیا۔

"یہ کھانا نہیں ہے اور زیادہ تکلف نہ کریں۔ اپنے گھر تو خوب چیزیں لا لا کر کھلا رہے تھے۔ کبھی گول گپے' کبھی چنا چاٹ' کبھی سموسے۔" رامین مسکراتے ہوئے بولی۔

"اچھا! تو قرض اتار رہی ہو۔"

"نہیں' نہیں' صرف خاطر داری ہے۔ ایسے مہمان کی جو بہت اچھا میزبان ہے۔"

"ارے! تم بولنا جانتی ہو؟" اسلم نے مصنوعی حیرت کا مظاہرہ کیا اور پلیٹ میں کباب رکھ کر کیچپ ڈال کر کھانا شروع کر دیا۔

"سننا بھی جانتی ہوں۔" رامین نے دوسری پلیٹ میں کباب نکال کر خالہ کو پیش کرتے ہوئے دعوا کیا۔

"ہوں! پھر کچھ عرض کروں۔ اجازت ہے؟" اسلم نے موقع غنیمت جان کر باری باری دونوں کو دیکھا۔

"کیا؟" رامین نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

"میں اتنا اچھا پروپوزل لایا تھا' انکار کیوں کیا؟"

"اوہ!" رامین نے ایک گہری سانس لی۔ "میرے سامنے امی اور خالہ کے تجربات ہیں۔ مجھے خوف آتا ہے شادی کے نام سے۔" رامین نے دھیرے سے کہا۔

"ضروری نہیں جو ان کے ساتھ ہوا' وہ تمہارے ساتھ بھی ہو۔ یہ تو مقدر کی بات ہے۔ اللہ پر بھروسا نہیں ہے تمہیں۔" اسلم نے سوال کیا۔

"ہے۔۔۔ بالکل ہے۔ مگر مجھے یہ لگتا ہے جیسے ہم اپنے بڑوں سے شکل و صورت' عادات اور مزاج کے کچھ رنگ ورثے میں پاتے ہیں۔ ایسے ہی نصیب کے کچھ معاملات بھی وراثت میں ملتے ہیں۔ کیا پتا مجھے بھی یہی کچھ ملے۔ شاید کم زندگی' شاید کم خوشیاں' زیادہ انتظار۔"

"تم لڑکی کم اور فلسفی زیادہ ہو اور مجھے اس طرح کی فلاسفی بھگارتی لڑکیاں بالکل نہیں پسند' نہ ہی اس قسم کی فلسفیانہ باتیں۔" اسلم نے اپنے مخصوص انداز میں بنا کسی لحاظ اور مروت کے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"پتا ہے کیا۔ زندگی بہت عجیب و غریب شے ہے۔ ہر لمحہ ہر آن بدلتی رہتی ہے۔ اس طرح کے مخصوص خیالات اور فلسفوں کی روشنی میں اسے گزارنا بے وقوفی ہے۔ حقیقت پسند بن کر چلو اور حقیقت پسند بن کر زندگی گزارو۔" اسلم نے زندگی کے بارے میں اپنے فلسفے سے آگاہ کیا۔

"حقیقت پسند بن کر ہی تو سوچ رہی ہوں۔ خوابوں' خیالوں کی دنیا میں نہیں رہتی۔" رامین نے بہت رسان سے اس کی بات کا جواب دیا تھا۔

"ابھی میں نے ان لوگوں کو منع نہیں کیا ہے۔ تم سوچو' خوب سوچو' پھر جواب دینا۔"

"چلیں! آپ کہتے ہیں تو اور سوچ لوں گی۔" کچھ توقف کے بعد وہ ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئی تھی۔

"بچپن میں تو ایسی نہ تھیں تم' بڑے ہو کر کیا ہو گیا تمہیں؟"

"بچپن تو بہت سیدھا سادا اور معصوم ہوتا ہے۔ بے فکری' لاعلمی کے ساتھ گزار آگیا وقت' جب بڑے ہوئے تو آگاہی اور شعور نے دل و دماغ میں ڈیرے ڈال لیے۔ تبدیلی آنا تو قدرتی عمل ہے۔" رامین مکمل طور پر سنجیدہ ہو گئی۔

"اللہ کی پناہ' کتنی خوف ناک قسم کی سنجیدہ باتیں

کرتی ہے یہ لڑکی۔ ہیں باجی۔ آپ کی صحبت میں رہ کر بھی اسے ہنسنا' مسکرانا نہیں آیا۔" اسلم نے شگفتہ لب و لہجے میں بولتے ہوئے روبینہ باجی کو دیکھا۔

"ہاں! دیکھو ذرا' جانے کیا الٹا سیدھا سوچتی رہتی ہے۔ لائف میں تو کیسے کیسے اپ اینڈ ڈاؤن آتے ہیں۔ بندے کو پوزیٹو رہنا چاہیے۔ میں بھی یہی سمجھاتی ہوں اسے۔" روبینہ باجی کو پہلی بار اپنا کوئی ہمنوا اور ہم خیال نظر آیا تھا۔ جلدی سے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"خالہ! آپ۔۔۔" رامین نے کچھ بے بسی اور کچھ اداسی سے انہیں دیکھا۔ اس کے لب کھلے' شاید کچھ کہنے کے لیے مگر پھر اس نے سختی سے لب بھینچ لیے۔

"کولڈ ڈرنک لیجیے' گرم ہو رہی ہے۔" وہ اسلم سے مخاطب ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ موسم یہ مست نظارے' پیار کرو تو ان سے کرو۔" خالو کے ٹی وی کی آواز اور شبو کی تشریف آوری قریباً" ساتھ ساتھ ہی گھر میں آئی اور اس کے آتے ہی موتیا' چنبیلی کے پھولوں کی دلفریب مہک پورے گھر میں پھیل گئی۔

"خالہ! یہ دیکھو پھول' کتنی اچھی خوشبو آرہی ہے' ہے نا۔" پھولوں سے بھری پلیٹ اس نے خالہ کے پاس رکھتے ہوئے بڑی مسرت سے انہیں اطلاع دی۔

"ائے ہاں! کیسی اچھی مہک ہے۔" اماں نے ایک گہری سانس لے کر وہ دلفریب خوشبو اپنے اندر اتاری۔

"چاروں گملوں میں ساری کلیاں کھل گئیں' ایک کنگن اور گجرا اماں کے لیے بنایا۔ یہ تمہارے لیے لائی ہوں۔" شبو کے چہرے پہ پھول سے کھلے ہوئے تھے۔

"ہاں! کل خبروں میں بتایا تھا کہ بہار کا موسم آگیا ہے جگہ جگہ کی فلم بنا کر دکھا رہے تھے' درختوں کی' پھول پتوں کی' ہریالی کی۔" اماں کو کچھ یاد آیا تو ہنس کر شبو کو بتانے لگیں۔

"واہ خالہ! تمہیں یہ بات بھی خبروں سے پتا چلی۔" شبو ہنس پڑی۔

"اب ہمارے گھر کوئی بڑا چھوٹا لان یا باغیں باغ تو ہے نہیں جو پھول کھلیں یا جھڑیں تو خزاں بہار کا پتا چلے' شوق میں آکر دو چار بار گملے خرید کے سجائے وہ آتے جاتے بچوں نے یا تو لڑھکا کے توڑ دیے یا پھر ان کے پھول' پتے سب نوچ تاچ کر برابر کر دیے۔" آئینے کے سامنے اپنی زلفوں کو سنوارتی انیلا نے وہیں سے لقمہ دیا۔

"خالہ! تمہارے لیے بھی کنگن اور گجرا بنا دوں۔" شبو نے پلیٹ اپنی طرف کھسکائی۔

"ہاں! بنا دے منی! ذرا سوئی دھاگا تو نکال لا۔"

"رہنے دو خالہ! دو گھنٹے لگ جائیں گے ڈھونڈنے میں۔ یہاں کوئی چیز ٹھکانے سے کبھی وقت پر ملی ہے؟ میں اسی لیے سوئی دھاگا ساتھ ہی لے آئی تھی۔" شبو نے صاف صاف کہتے ہوئے پھولوں کے ڈھیر کے نیچے سے دھاگے کی ریل اور اس میں پروئی ہوئی سوئی نکالی اور پھول پرونے لگی۔

" لائی گھٹا موتیوں کا خزانہ' آیا بہاروں کا موسم سہانا" خالو کا پسندیدہ گانا آتا تو والیوم اور اونچا ہو جاتا۔

شبو نے کنگن بنا کر خالہ کے ہاتھ میں باندھ دیا اور گجرا بنانے لگی۔

☼ ☼ ☼

"تم بہت نکمی لڑکی ہو' بے وقوف کہیں کی۔" اسلم اسے فون پر ڈانٹ رہا تھا۔ "اس کے لیے جو پرپوزل اسلم لایا تھا اس کا جواب دینے میں اتنی دیر لگائی کہ ان لوگوں نے مایوس ہو کر کہیں اور لڑکی دیکھ لی تھی۔

"پتا ہے' کتنے اچھے لوگ تھے' کتنا اچھا لڑکا تھا' بہت خوش رہتیں تم۔" اسلم کی سوئی اسی بات پر اٹکی ہوئی تھی جو ختم ہو گئی تھی۔

"اب چھوڑیں' جو بات ختم ہو گئی اس کا ذکر کیا۔" رامین ہولے سے بولی۔

"اس لیے ذکر کر رہا ہوں کہ آئندہ محتاط رہنا اور ایسی بے وقوفی مت کرنا۔" اسلم نے جتایا۔

"اچھی بھلی زندگی گزر رہی تھی' پتا نہیں آپ کہاں سے درمیان میں آگئے' پریشان کرنے کے لیے۔" رامین نے مذاقاً" کہا۔

"تمہاری اصلاح اور بہتری کے لیے آیا ہوں اور سمجھانے کے لیے کہ اگر خوشیاں دروازے پہ دستک دیں تو فوراً" دروازہ کھول کر ان کا استقبال کرنا چاہیے' بجائے اس کے کہ گم صم چپ چاپ اپنے خول میں بند' دروازہ بند کر کے بیٹھے رہیں۔"

"آپ کو دیکھ کر لگتا نہیں کہ آپ ایسی کتابی باتیں بھی کر سکتے ہیں۔" نہ جانے رامین اس کی بات سے متاثر ہوئی تھی یا یونہی کہہ رہی تھی۔

"میں نے کتابیں نہیں پڑھیں' ہاں! مگر زندگی کو اور انسانوں کو پڑھنے کی کوشش کی ہے' ان سے ہی تھوڑا بہت سیکھا ہے۔"

"زندگی سب کے پاس ہوتی ہے' آس پاس لوگ بھی' مگر ان سے سیکھتا ہر کوئی نہیں ہے۔"

"ہاں! جیسے کہ تم۔"

"میں۔۔۔؟ کیوں بھئی! میں نے کیا کیا ہے؟"

"یہی تو سارا مسئلہ ہے کہ تم کچھ کرتیں نہیں' نہ منگنی نہ شادی' حتیٰ کہ کسی سے محبت بھی نہیں' کم از کم کسی کو پسند ہی کر لیتیں' شادی کے لیے تمہیں لیکچر تو نہیں دینا پڑتا۔" اسلم بڑے دھڑلے سے بول رہا تھا۔ وہ حیران رہ گئی۔

"آپ ہر بات ڈنکے کی چوٹ پہ اسی طرح کہہ دیتے ہیں؟"

"بالکل! مجھے جس سے جو کہنا ہو' ڈنکے کی چوٹ پہ اسی طرح کہہ دیتا ہوں۔"

"یہ بہادری ہے یا بے وقوفی؟"

"میں خود کو بہادر کہلوانا پسند کروں گا۔"

"آپ بچپن میں بھی بہت ہنساتے تھے۔" رامین بے اختیار مسکرا دی۔

"میں اب بھی ویسا ہی ہوں مگر تم بدل گئی ہو' جب تو تم بڑا دل کھول کے ہنستی کھلکھلاتی تھیں' اب مسکرانے سے پہلے سوچتی ہو کہ مسکراؤں یا نہیں۔"

"نہ ہنسی انسان کے اپنے اختیار میں ہوتی ہے نہ آنسو' یہ تو بس بے اختیار آتے ہیں۔"

"روبینہ باجی سے کچھ اور نہیں تو کم از کم ہنسنا مسکرانا تو سیکھ لیتیں لڑکی!"

"وہ ہنستی مسکراتی کب ہیں' بس ڈراما کرتی ہیں۔ ان کے قہقہے مصنوعی ہوتے ہیں اور مسکراہٹ جھوٹی' خود پہ ایک خول چڑھایا ہوا ہے انہوں نے' وہ بظاہر جو نظر آتی ہیں وہ ہیں نہیں۔" رامین باتوں باتوں میں اپنی خالہ کی حقیقت آشکار کر گئی' اسلم ایک دم چپ ہو گیا۔

"میں آدم بے زار یا خشک مزاج نہیں ہوں' مجھے ہنسنا اچھا لگتا ہے' پھول اچھے لگتے ہیں' خواب دیکھنے کو میرا بھی دل چاہتا ہے مگر۔۔۔" وہ ایک لمحے کو رکی۔

"مگر کیا۔۔۔؟"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔" رامین کا مختصر سا فقرہ ہزار معنی سے بھرپور تھا' اس میں کئی کہانیاں چھپی ہوئی تھیں اس کی امی کی' خالہ کی اور ان سب پیاروں کی بھی جن کی زندگیاں کسی نہ کسی اور ناہمواری سے عبارت تھیں۔

"مگر ہم آنے والے لمحوں کا خوف خود پر طاری کر لیں تو شاید اگلی سانس بھی نہ لیں مگر کچھ بھی ہو' سانس چلتی رہتی ہے' زندگی بھی رواں دواں رہتی ہے چاہے پھولوں پہ ہو یا کانٹوں پہ۔" اسلم روانی میں' بے اختیاری میں بولتا چلا گیا' اپنی باتوں پہ وہ خود ہی نہیں' رامین بھی حیران تھی۔

"آپ اپنے کلائنٹس کو یقیناً" قائل کر لیتے ہوں گے' آئم شیور۔" وہ پھر مسکرائی تھی۔

"جب تم قائل ہو جاؤ گی تب مجھے یقین آئے گا اپنی صلاحیت پہ' اچھا' میں بعد میں بات کروں گا۔ تلاش میں ہوں' کوئی اچھا لڑکا اور اچھی فیملی ملی تو ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔" اسلم نے دھونس دیتے ہوئے خدا حافظ کہا۔

"یہ موصوف بھی بس۔" فون بند کر کے رامین بے

اختیار مسکرا دی تھی، اسلم سے باتیں کر کے اچھا لگا تھا اسے، دل کا بہت سا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ اپنا آپ ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ابھی نہا کر نکلی تھی، سرخ اور کاسنی پھولوں کا پرنٹڈ لان کا خوب صورت سوٹ زیب تن کر کے بال تولیے سے خشک کرتی ہوئی وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ آئینہ اسے بتا رہا تھا کہ وہ کتنی دل کشی اور کشش خود میں سمیٹے ہوئے ہے۔

"رامین تو ہو بہو اپنی ماں کی دوسری تصویر ہے۔" اسے دیکھنے والے سب یہی کہتے تھے جو ثمینہ کو جانتے تھے۔

"اپنی ماں کی دوسری تصویر۔" اس نے غور سے خود کو آئینے میں دیکھا۔

"کہیں ہو بہو تقدیر بھی ویسی ہی نہ ہو۔" رامین کے دل میں جانے کیسا خوف کنڈلی مارے بیٹھا تھا، آئے دن سر اٹھانے لگتا، مگر اسلم۔۔۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا، اس خوف کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا۔

اس نے دراز سے ڈرائیر نکالا اور بال سکھانے لگی۔ کل اسلم کا فون آیا تھا، آج مہمانوں کو آنا تھا، وہی خاص مہمان۔

رامین بال سکھاتی رہی اور سوچتی رہی مہمانوں کے متعلق بھی، اسلم کے بارے میں بھی۔ خالہ کا موبائل بج رہا تھا وہ اسکول سے تھکی ہوئی آئی تھیں، دوپہر کا کھانا کھا کر قیلولہ ضرور کرتی تھیں، رامین نے فون اٹینڈ کر لیا دوسری طرف اسلم تھا، یا وہاں کا فون۔

"پانچ بجے تک آئیں گے ہم لوگ۔ ٹھیک ہے؟"

"جی! ٹھیک ہے۔"

"خالہ کیا کر رہی ہیں؟"

"سو رہی ہیں۔"

"شام تک تو اٹھ جائیں گی نا؟"

بالکل اٹھ جائیں گی، اس کی تشویش اور فکر مندی پہ رامین کو ہنسی آ گئی۔

"بہت اچھے لوگ ہیں میں نے سب انویسٹی گیشن کر لی ہے، انکار مت کرنا اچھا۔" اس نے تاکید کی۔

"ہو سکتا ہے ان بہت اچھے لوگوں کو میں پسند نہ آؤں، پھر؟" رامین نے سوال اٹھایا۔

"کیوں نہیں آؤ گی، اتنی خوب صورت لڑکی کو کوئی آنکھ یا عقل کا اندھا ہی ناپسند کرے گا۔" اسلم برجستہ بولا تھا۔

"کیا خوب صورت ہونا کافی ہوتا ہے؟ چاہے میں اندر سے جیسی بھی ہوں، بد اخلاق، بدتمیز یا بدتہذیب۔"

"مجھے معلوم ہے کہ ان میں سے کوئی "بد" تمہارے اندر نہیں ہے اور دوسری بات یہ کہ کبھی کبھار انسان کی، خصوصاً لڑکیوں کی فقط خوب صورتی بھی کافی ہو جاتی ہے اس قسم کے معاملات میں تو فالتو باتیں کر کے ناشکرے پن کا اظہار مت کرو، اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے خوب صورت بھی بنایا ہے اور خوب سیرت بھی۔۔۔"

"آپ ڈانٹتے بہت ہیں۔" رامین نے منہ بنایا۔

"رامین! میں اس سے بھی کہیں زیادہ اور کہیں برا ڈانٹ سکتا ہوں اسپیشلی تمہیں، سمجھیں، اب فون بند کرو اور شام کی تیاری کرو، اللہ حافظ۔" اسلم نے فون بند کر دیا تھا مگر وہ کچھ دیر وہیں کھڑی رہی۔

"رامین!" اس نے زیر لب دہرایا۔ آج سے پہلے اسے اپنا نام اتنا اچھا کبھی نہیں لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

سفید، میرون چنری پرنٹ کا لان کا سوٹ، بڑا سا دوپٹا شانوں پہ ڈالا ہوا، سر جھکائے وہ بڑی محویت سے پھول پرو رہی تھی، بالوں کی چھوٹی چھوٹی لٹیں، کیچو کی قید سے آزاد بکھری تھیں۔ موتیا کی خوشبو کیسی مست کر دینے والی تھی۔

اسلم نے ایک گہرا سانس لے کر مہک اپنے اندر اتاری اور ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی جو روز کی طرح آج بھی پھولوں سے کنگن اور گجرا بنا رہی تھی۔

"کیوں، بے چاری پھولوں کلیوں کو توڑ توڑ کر دھاگے میں پروتی رہتی ہو۔۔۔ ایویں شغل۔"

"ہائیں! اتنے پیارے پیارے پھولوں اور پیاری پیاری خوشبوؤں کے بارے میں ایسی کڑوی سی بات؟ میں نے شاخوں پر سے تھوڑی توڑے ہیں خود ہی ٹوٹ کر گرے ہیں بہار کا موسم ہے نا، روزانہ ڈھیروں ڈھیر کلیاں کھلتی ہیں اور ہوا چلتی ہے تو اتنے سارے پھول نیچے گر جاتے ہیں، میں وہی اٹھاتی ہوں۔" شبو نے جیسے اپنی صفائی پیش کی۔

"گر جاتے ہیں تو نیچے گرے رہنے دو، ضروری ہے اٹھا کر مالائیں بناؤ، گلے میں ڈالنے کے لیے۔" اسلم پتا نہیں کیوں جھنجلا رہا تھا۔ شبو نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا ہوا؟ ایسے کیوں کہہ رہے ہو؟" اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پٹپٹائیں۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"

"ہاں! کیوں؟ میری طبیعت کو کیا ہوا۔" اسلم قریب رکھی کرسی پر جیسے گر سا گیا۔ ایسا لگ رہا تھا بہت لمبی مسافت طے کی ہو اور واقعی یکایک جانے کیا ہو گیا تھا، لمحوں میں صدیوں کا سفر کر لیا تھا اس نے، محبت کی آگہی دل میں یوں در آئی کہ وہ خود بھی حیران بلکہ ششدر رہ گیا۔ کیا یوں بھی ہوتا ہے؟ جیسے کوئی ٹنڈ منڈ شاخ راتوں رات سرسبز ہری بھری ہو جائے کہ دیکھ کر یقین نہ آئے کہ یہ ایک رات کا کرشمہ ہے یا کوئی بنجر زمین، ویرانہ جس میں آپ ہی آپ تا حد نظر پھول ہی پھول کھل جائیں اور عقل سوچتی رہ جائے کہ یہ معجزہ کیوں کر ہو گیا۔

اسلم بھی اپنی کیفیت پہ حیران تھا، اپنی حالت پہ پریشان تھا۔

"کیا ہو رہا ہے یہ سب؟" اس نے سر جھٹکتے ہوئے بے بسی کی حالت میں یوں ہی ہاتھ بڑھا کر ہتھیلی کھولنے بند کرنے لگا۔

شبو نے اس کی کھلی ہتھیلی پہ جلدی سے کچھ کلیاں اور پھول ڈال دیں۔

نرم، خوشبودار احساس نے اسے اپنی گرفت میں لیا مگر وہ تو کسی اور پھول کی خوشبو میں مست ہو رہا تھا، ہاتھ واپس کھینچ لیا، ساری کلیاں نیچے گر پڑیں۔

"ہائے کیا کر دیا۔ سارے پھول نیچے گرا دیے۔" شبو کی پر شوق نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹ کر نیچے گری کلیوں اور پھولوں پر مرکوز ہو گئیں۔

"پھولوں کو نیچے نہیں پھینکتے۔" وہ اسلم کے قدموں کے پاس بیٹھ کر انہیں چننے لگی۔

قدموں میں تیرے جینا مرنا
اب دور یہاں سے جانا کیا۔۔۔!

"ایک تو یہ تیرے ابا۔" اسلم بھنا گیا۔ ٹی وی کی آواز حسب معمول یہاں تک آ رہی تھی۔

"بات سن شبو! تو شبنم ضرور ہے مگر میں تیرا ندیم نہیں ہوں، میں اسلم ہوں، اسلم پرویز، تیری فلم کا ولن۔۔۔ ہیرو نہیں ہوں میں تیرا، سمجھ لے اچھی طرح۔۔۔"

"پتا نہیں کیا اناپ شناپ بک رہا ہے، فلمیں زیادہ دیکھتے ہیں اثر ان پر ہوا ہے۔"

شبو نے بڑے سکون سے اسے دیکھا اور اتنے ہی اطمینان سے سوال کیا۔

"آج کیا کھایا تھا۔" وہ اب سیدھی ہو بیٹھی۔

"زہر۔"

"ملاوٹ والا ہو گا، جان تو بچ گئی مگر دماغ پہ اثر ہو گیا شاید۔"

"بکواس مت کر۔۔۔"

"ہائے ہائے، مجھ سے کیوں خار کھا رہے ہو، میں نے کیا تمہاری بھینس چرائی ہے۔" شبو نے باقاعدہ برا مان کر کہا تھا۔

"کتنا بولتی ہے یہ لڑکی، توبہ ہے۔" اسلم نے اس سے زیادہ برا منہ بنایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا! اب کچھ نہیں بولوں گی۔ ناراض تو مت ہو۔" شبو بوکھلا کر کھڑی ہو گئی مگر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔

"اللہ جانے کیا ہو گیا' اچھے بھلے تو تھے۔" شبو کچھ بے بسی اور کچھ حسرت کے ساتھ اس کی چوڑی پشت دیکھ کر ہی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

حلق میں ایسے کانٹے پڑ رہے تھے کہ دو گلاس پانی پی کر بھی سکون نہ ملا۔

"کتنی گھٹن ہے۔" اسلم نے شرٹ کا اوپری بٹن کھولا' حبس کے مارے دم گھٹا جا رہا تھا۔

"اماں! میں اوپر جا رہا ہوں چھت پر۔"

"کھانا تو کھالے بیٹا! منی دستر خوان لگا رہی ہے۔"

"بعد میں کھالوں گا' اس وقت بھوک نہیں ہے۔"

وہ سیڑھیاں چڑھتا' سب سے اوپر چھت پر آ گیا۔

"اف۔۔۔۔" کھلی فضا میں دو چار گہرے گہرے سانس لے کر اسے کچھ سکون ملا۔ پینٹ کی جیب سے موبائل نکال کر اس نے ایک نمبر ملایا۔ بیل جا رہی تھی۔

"ہیلو السلام علیکم!" دوسری بیل پر ہی فون ریسیو ہو گیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔"

"کیسے ہیں؟"

"ٹھیک! تم نے اس پروپوزل کو بھی ریجیکٹ کر دیا؟" وہ بغیر کسی تمہید اور توقف کے بولا۔

"تم چاہتی کیا ہو؟" رامین کی خاموشی پہ اس نے دوبارہ سوال کیا۔

"کیسے بتاؤں؟" رامین کی آواز میں شکستگی در آئی۔

"میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔" اسلم پہلے ہی سے جھنجلایا ہوا تھا۔

"مجھے اجنبی اور انجان لوگوں سے ڈر لگتا ہے۔ پتا نہیں کون' کیسا نکلے۔"

"پھر؟ کوئی جاننے والا کہاں سے لاؤں؟"

"کبھی ہماری منزل ہمارے قریب ہی ہوتی ہے مگر یا تو ہم اسے دیکھتے نہیں ہیں یا دیکھنا چاہئیں چاہتے۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"میں کتابی بندہ نہیں ہوں رامین! خوابوں کی دنیا میں نہیں رہتا۔" اسلم کی آواز سے بے بسی واضح طور پر جھلک رہی تھی۔

"خواب دیکھنا کوئی بری بات تو نہیں۔"

"جن خوابوں کی تعبیر کا کوئی آسرا نہ ہو' انہیں دیکھنے کا فائدہ؟"

"زندگی کے ہر معاملے میں فائدہ' نقصان نہیں دیکھا جاتا۔"

"دیکھا جاتا ہے' زندگی کے ہر معاملے میں فائدہ نقصان دیکھا جاتا ہے۔ کبھی اپنا' کبھی دوسروں کا۔" اسلم کا لہجہ دو ٹوک تھا۔

"آپ سے جیتنا مشکل ہے' لیجیے! میں اپنی ہار تسلیم کرتی ہوں۔" رامین کا لہجہ ہی نہیں الفاظ بھی معنی خیز تھے۔

وہ پیاری سی لڑکی جو اس کے لیے بہت خاص ہو چکی تھی' دل ہمک ہمک کر جس کی ہمراہی کی تمنا کر رہا تھا' وہ خود بھی اس کی راہوں میں پھول لیے کھڑی تھی۔ اپنا ہاتھ بڑھائے اس کی منتظر' مگر گریز کی زنجیر اسلم کے قدموں سے لپٹی تھی' چاہتے ہوئے بھی محبت کے ان پھولوں کی اور اس کی پیش قدمی کی پذیرائی نہیں کر سکتا تھا' مگر خود کو روکنا بھی بہت مشکل۔۔۔

جیسے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لینا' ناقابل بیان تکلیف' ناقابل برداشت اذیت۔۔۔

چند دنوں میں ہی وہ کیا سے کیا ہو گیا تھا اور زندگی کہاں سے کہاں چلی گئی تھی۔ اچھی بھلی اپنی ایک ڈگر پر چلتے چلتے وہ ایک نئے موڑ پر مڑ گیا تھا۔

"رامین! میں بعد میں بات کروں گا۔" اسلم کو خود اپنی آواز ہی اجنبی لگی۔

"کیوں' ابھی کیوں نہیں؟" رامین بے تابی سے بول رہی تھی۔

"ابھی میں مصروف ہوں۔"

"پھر کب؟ میں انتظار کروں گی۔"

"مت کرو' میرا انتظار مت کرو۔" اسلم نے ہونٹ بے آواز تھرتھرائے۔ اس نے فون آف کر دیا۔ کچھ کہے بغیر' کچھ سنے بغیر' آخر کہتا بھی تو کیا کہتا اور بھی تو کیا اور کیوں' وہ جیسے جیسے اس محبت کو' اس لگاؤ کو محسوس کر رہا تھا' اس میں ڈوب رہا تھا ویسے ویسے اسے اپنے اور رامین کے درمیان جیسے ہزاروں میل کے فاصلے کا بھی احساس ہو رہا تھا۔

فون بند کر کے اس نے واپس جیب میں ڈال لیا۔ کچھ دیر منڈیر پر جھکا اندھیروں میں گھورتا رہا' آسمان کالا سیاہ پڑا تھا' نہ چاند کی ٹھنڈی میٹھی روشنی' نہ تاروں کی جگمگاہٹ' وہاں بھی تاریکی اور سیاہی کا راج تھا۔ اس اندھیرے میں جانے وہ کیا کھوج رہا تھا' شاید اپنے مقدر کا ستارہ یا تھوڑی سی روشنی' کوئی امید کی کرن' کچھ تو نظر آئے۔

دل شکستگی کے عالم میں وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے آیا اور کسی سے کچھ کہے بغیر باہر نکلنے لگا۔ اماں اسے دیکھتے ہی پیچھے پیچھے آئیں۔

"ارے لڑکے! کھانا تو کھالے' صبح بھی ناشتا یونہی سا کیا' نہ دوپہر کو کھانا کھایا' اب تو کھالے میرے چندا! ہوا کیا ہے آخر' کوئی پریشانی ہے کیا؟" وہ بے تکان بولے چلی جا رہی تھیں' فکر مندی ان کے لہجے بشرے سے واضح تھی۔

"میں ٹھیک ہوں اماں! کوئی پریشانی بھی نہیں' بس ابھی ذرا باہر جا رہا ہوں' آ کر کھانا کھالوں گا۔" نرم لہجے میں ماں کو تسلی دیتا ہوا باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

روبینہ باجی نے بلوایا تھا' وہ حاضر ہو گیا۔ اس وقت ان کے سامنے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔

"تم بھی سوچتے ہو گے کہ اچھے رشتے دار ملے' پریشان کر کے رکھ دیا۔" وہ معذرت خواہانہ انداز میں اس سے مخاطب ہوئیں۔

"نہیں! ایسی کوئی بات نہیں' آپ کو جب جس معاملے میں میری ضرورت ہو' میں حاضر ہوں۔" اسلم نے جو کچھ کہا' وہ سچے دل سے کہا تھا' نہ اس میں بناوٹ تھی نہ جھوٹ کی ملاوٹ۔

"رامین مجھے سگی اولاد سے بھی بڑھ کر عزیز ہے۔ مجھے اس کی کتنی فکر ہے' میں بتا نہیں سکتی' مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا' کیا کروں' زبردستی کر نہیں سکتی اور وہ بے وقوف جانے کیا اوٹ پٹانگ سوچتی رہتی ہے' مجھے تو تم سے بھی بے حد شرمندگی ہو رہی ہے' تم بھی کیا سوچتے ہو گے۔ میں۔۔۔"

"روبینہ باجی! آپ بلاوجہ گلٹی فیل نہ کریں' میں ایسا ویسا کچھ نہیں سوچ رہا جو آپ سوچ رہی ہیں۔ پریشان نہ ہوں' ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اسلم خود مضطرب تھا' بے چین تھا' مگر ان کو تسلی دیتے ہوئے اس نے اپنا لہجہ پرسکون اور ہموار رکھا۔

رامین گلاسوں میں ٹھنڈا یخ مشروب لے آئی تھی۔ اسلم نے نگاہ اٹھائے بغیر گلاس تھام لیا۔ نگاہ اٹھانا بھی غضب تھا۔ رامین کی بدگتی آنکھوں کے سامنے یہ جرات کیسے کرتا' اس کی آنکھوں میں محبت کے رنگوں کے ساتھ شکوے شکایات کے رنگ نمایاں تھے۔

سب کچھ جانتے ہوئے انجان بنتا' سب کچھ سمجھتے ہوئے بے رخی اختیار کرتا' وہ رامین کو ہی نہیں خود کو بھی اذیت میں مبتلا کر رہا تھا۔ خود کو دھوکا دینا آسان نہیں ہوتا' وہ دے رہا تھا

رامین سامنے ہی بیٹھی تھی' نظر بے اختیار اس پر چلی ہی گئی' اس کے خوب صورت چہرے پہ اداسی تھی' تھکن تھی' افسردگی تھی اور خاموشی بھی۔ یہ خاموشی بھی کافی اچھی شے ہوتی ہے کبھی' بہت سے راز چھپا لیتی ہے' بہت سی کہانیوں کو ان کہی رہنے دیتی ہے' مگر یہ خاموشی ایسی نہیں تھی' یہ تو بجائے خود ایک داستان تھی' ایسی داستان جو فقط واقف حال کے سامنے ہی عیاں ہوتی تھی' اسلم دھیرے دھیرے یہ داستان پڑھ رہا تھا۔

"اسلم! پھر تم دیکھو گے نا' کوئی ایسا جس سے رامین کا دل راضی ہو جائے یہ مطمئن ہو کر ہاں کرے' اپنے دل کی خوشی کے ساتھ۔۔۔" روبینہ باجی کی آواز نے اس طلسم کو توڑا جس نے ان دونوں کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ وہ زیادہ دیر اور وہاں نہ بیٹھ سکا اور ان کو تسلی دے کر چلا آیا۔

☼ ☼ ☼

"رامین! میری بچی! کیوں مجھے پریشان کر رہی ہو آج کل اچھے رشتے، اچھے لوگ ملنا کسی نعمت سے کم نہیں، کفران نعمت مت کرو، ہر قسم کے وہم اور خدشے کو دل سے نکال باہر کرو، تمہیں کچھ اندازہ نہیں ہے، میں تمہارے لیے کس قدر پریشان ہوں۔" روبینہ نے اسے سمجھانا شروع کیا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"ارے کیا ہوا...." وہ بوکھلا گئیں۔

"ایک نہ ایک روز ہر لڑکی کو بابل کا آنگن چھوڑ کر جانا ہی پڑتا ہے، پگلی ہے یہ لڑکی بالکل۔" انہوں نے کندھے سے لگا کر اس کا سر تھپکا۔

"یہ آنسو اس وجہ سے نہیں۔" رامین نے چہرہ صاف کرکے چپکے سے سوچا۔

پتا نہیں کیا ہوا تھا، کب، کیسے وہ اچھا لگنے لگا اور پھر بہت اچھا لگنے لگا، اتنا کہ وہ احساس محبت سے آشنا ہو گئی، اچھا تو یہ ہوتی ہے محبت۔ کسی کے بارے میں یوں سوچتے رہو۔ اس کا مسکرانا، ہنسنا، بولنا، دیکھنا سب کچھ اچھا لگتا ہے۔ وہ نہیں آتا تو اس کا انتظار رہتا اور وہ آجاتا تو رامین سوچتی۔ کاش! یہ وقت تھم جائے، اس کی نیند، اس کی آنکھیں، اس کے خواب، اس کا دل، اس کا اپنا کچھ بھی نہ رہا تھا اس کے پاس۔

وہ بنیادی طور پر ایک سیدھی سادی لڑکی تھی، اس کی دنیا گھر تک محدود تھی، پڑھائی ختم ہوئی تو مختصر سا حلقہ احباب سہیلیوں کا تھا وہ بھی بکھر گیا، رشتے داروں سے میل جول برائے نام ہی تھا، سوائے چند ایک رشتے داروں کے، اس کی زندگی میں لوگوں کا عمل دخل کم تھا اور صنف مخالف کا تو بالکل ہی نہ تھا، اسلم سے ملاقات نے جہاں بچپن کی بھولی بسری یادوں کے اوراق کھول دیے وہیں اس کی خاموشی اور سپاٹ زندگی میں جیسے کوئی در کھل گیا تھا۔ روشنی کا، تازگی کا، زندگی کا....

وہ جس فکر مندی اور خیال سے رامین کی بارے میں روبینہ باجی سے باتیں کرتا، وہ رامین کو اچھا لگتا، مگر اسے فکر بھی ہو رہی تھی۔ کہیں یہ محبت یک طرفہ نہ ہو اس کے دل میں نہ جانے میرے لیے کیا ہے، وہ سوچتی، اسلم کے رویے اور باتوں سے اندازہ لگانے کی کوشش کرتی، مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا تھا۔ اس الجھے ہوئے ریشم کو سلجھانے کا طریقہ اس کے بس سے باہر تھا، مگر اسلم کی بے ساختگی اور بے تکلفی کو محدود ہوتے دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔

"کیا ہے یہ؟ حقیقت سے فرار؟ محبت سے گریز؟" وہ بے چین ہو کر اسلم کا چہرہ کھوجنے کی کوشش کرتی اور وہ نظریں چرا کر دامن بچا کر نکل جاتا۔ رامین کو کسی "غیر معمولی" کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اتنی بے وقوف تو نہیں تھی اور ہوتی بھی تو کیا، محبت کو جاننے اور سمجھنے کے لیے قول کی نہیں دل کی ضرورت ہوتی ہے، وہ کچھ کچھ جان رہی تھی، سمجھ رہی تھی محبت کو، مگر اسلم کا گریز اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"محبت ہے تو اظہار کیوں نہیں؟" رامین نے شاید زندگی کے اس معاملے کو پریوں کی کہانی سمجھا تھا تب ہی حیران ہو کر سوچتی، مگر اسلم کے لیے یہ پریوں کی کہانی تھوڑی تھی حقیقت جانتا تھا پھر ایک روز اماں خود ہی ذکر چھیڑ بیٹھیں۔

"انی کے سسرال والے اگلے سال شادی کے لیے کہہ رہے ہیں۔" وہ سبزی بنا رہی تھیں۔

"رشتہ کرتے وقت تو چار سال کہے تھے، ابھی تو دو سال بھی نہیں ہوئے۔" اسلم نے اعتراض جڑا۔

"کرنی تو ہے، اگلے سال کریں یا اس سے اگلے سال، پھر میں تو کہتی ہوں کہ جتنی جلدی اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں اتنا ہی اچھا، میں تو سوچ رہی ہوں کہ انی کے ساتھ ساتھ تیرا بھی بیاہ کر دوں، بیٹی رخصت کرکے بہو گھر لے آؤں۔ تیری خالہ بھی اس روز ذکر کر رہی تھی کہ اپنی امانت لے جانے کی تیاریاں کرو۔"

"بچپن کے مذاق کو اب تک بھولیں نہیں وہ۔" اسلم نے خود کو سنبھالا۔

"مذاق؟ باؤلا ہوا ہے کیا۔ خاندان بھر کے سامنے

دونوں کی منگنی ہوئی تھی، سب کو معلوم ہے کہ شبو تجھ سے منسوب ہے اور دونوں کی شادی ہونی ہے۔" اماں نے اسے جھاڑ کے رکھ دیا۔

"اماں! بچپن میں رشتے طے کرنا بچوں کے ساتھ ظلم نہیں ہے؟ فرض کرو مجھے کوئی اور لڑکی پسند آجائے، میں اس سے شادی کرنا چاہوں پھر؟" اسلم نے جانچتی ہوئی نظروں سے ماں کو دیکھا۔

"بیٹا! بچپن میں رشتہ اس لیے طے کرتے ہیں کہ نظر اور دل کہیں اور نہ بھٹکیں دونوں کو معلوم رہے کہ وہ کسی سے منسوب ہیں پھر کہیں اور پسند کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اگر ایسا کوئی خیال ہے تو اسے دل سے نکال دو میرے بچے۔" اماں نے سبزی کاٹنا موقوف کرکے اسے بغور دیکھا۔

"اماں! اگر سچ مچ ایسی کوئی بات ہو تو....؟" اسلم اس وقت جیسے زندگی اور موت کے درمیان معلق تھا۔

"ایسا سوچنا بھی مت۔" اماں دہل گئیں۔

"اپنے خالو کو تو جانتا ہے اچھی طرح، معمولی بات پر اپنی بہن سے ناراضی ہو گئی تھی، اسے ایسا چھوڑا کہ مرنے تک بھی نہیں گیا، اگر اس رشتے کے معاملے میں کوئی اونچ نیچ ہوئی تو ہم دونوں بہنیں ایک دوسرے کی شکل کو ترس جائیں گی، اس کا کیا بھروسا، واپس حیدر آباد لے جائے، پھر انی کی سسرال بھول گیا، تیری خالہ کے دیور کے گھر تو جا رہی ہے، ہم ان کی بھتیجی کو رد کر دیں گے تو وہ ہماری لڑکی کو دودھ سے مکھی کی طرح نکال باہر پھینکیں گے، ایسی باتیں نہ کر بیٹا! کیوں اس بڑھاپے میں میری مٹی پلید کروائے گا۔" اماں نے تو ایک لمبا لیکچر جھاڑ دیا تھا۔

اسلم ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا تھا، مگر دھڑکن تو خاموش نہیں تھی، ہر آن ایک ہی نام کی پکار، ایک ہی چہرے کی طلب، اسے اب ہی علم ہوا تھا کہ راتوں کی نیند اڑنا کسے کہتے ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا، کہاں تو بستر پر پڑتے ہی آنکھیں خود بخود بند ہو جاتی تھیں، اب گھنٹوں لیٹا بس سوچتا رہتا، نیند آنکھوں سے روٹھی رہتی، کبھی تصور میں دو التجائیہ آنکھیں آجاتیں۔

"اقرار کا کوئی ناز کیسے ان آنکھوں میں سجاؤں، میں تو خود اندھیروں میں گھرا ہوا ہوں۔" اس نے دل گرفتی سے سوچا۔

"اور کیا پتا، روشنی کی کوئی کرن کہیں سے نمودار ہو جائے، معجزے اسی دنیا میں ہی ہوتے ہیں۔" دل خوش فہم نے آس کی ایک ڈوری اس کے ہاتھوں میں تھمائی۔ امید، ناامیدی کے درمیان جھولتا جائے، کب وہ نیند کی وادیوں میں پہنچ گیا۔

☼ ☼ ☼

انیلا نے بڑا دل لگا کر پورے صحن کی صفائی کی تھی۔ بکھرا سامان سمیٹا کاٹھ کباڑ اور کچرا نکالا اور دھو ڈالا۔ صحن چمک اٹھا حسب معمول شبو کی آمد ہو گئی، لان کا نیا جوڑا، نہائی دھوئی تیار، چہرے کے ارد گرد بالوں کی لٹیں، کانوں میں بالیاں، ہاتھوں میں چوڑیاں، اماں کو سلام کرکے وہ صحن میں اٹھلاتی ہوئی آئی مگر ایک چیخ مار کر رک گئی۔

"ہائے خالہ! یہ کیا؟" شبو نے منہ پہ ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ آنکھیں حیرت کے مارے حلقوں سے باہر نکلی پڑ رہی تھیں۔

"کیا ہوا؟" اماں نے دہل کر اسے دیکھا۔

"یہ... یہ... صحن...." اس نے کچھ ہکلا کر چمکتے دمکتے صحن کی طرف اشارہ کیا۔ "میں سمجھی میں کسی اور کے گھر میں آگئی۔" اماں کی سوالیہ نظروں کے جواب میں، اس کی کھی کھی شروع ہو گئی۔

"توبہ ہے! میں ڈر گئی کہ جانے کیا ہو گیا۔" اماں نے دبی ہوئی گہری سانس خارج کی۔

"انی آج صبح سے ہی صفائی میں لگی ہوئی تھی۔" اماں نے اسے اطلاع دی۔

"انی نے تو آج کمال کر دیا خالہ!" شبو اماں کے پاس بیٹھ کر تبصرہ کرنے لگی۔

"ہاں! بعد میں یہ کمال تم کرنا۔" انیلا سے اس کی کھی کھی برداشت نہیں ہوئی تھی۔

(مجھے آنے تو دو، پھر دیکھنا) شبو نے اماں کے لحاظ میں اپنے خیالات نوک زبان پر آنے سے روکے۔

"اماں! شبو نے لان کا نیا جوڑا سی کر پہن بھی لیا، ہمارے کپڑے ابھی آئے بھی نہیں۔" انی نے شبو کا نیا سوٹ دیکھ کر اماں کو دہائی دی۔

"کپڑے کیا سستے آرہے ہیں، مٹھی بھر نوٹ ہوں تو بازار جاؤں، تو اکیلی تھوڑی ہے منی کے بھی آئیں گے، میرا بھی آئے گا، اکو اور ہاشم بھی اعتراض کرتے ہیں کہ بہنوں کے کپڑے سارا سال بنتے رہتے ہیں، ہمارے کپڑے فقط عید بقر عید پر آتے ہیں۔" اماں نے پوری کہانی سنادی۔

"سب کے آتے رہیں گے، میرا تو کم از کم ایک جوڑا بنادو۔" انیلا بے صبری ہورہی تھی۔

"اب زیادہ اتاؤلا پن مت دکھا، بنادوں گی، تیرے سسرال والوں کے آنے سے پہلے لادوں گی۔" اماں نے اسے پہلے گھر کا پھر خوش خبری دی۔

"کب رخصت کررہی ہو خالہ! انی کو؟" شبو نے بڑی لگاوٹ سے پوچھا۔

"گھما پھرا کے سوال کیوں کررہی ہے یہ بول کہ خالہ! میری رخصتی کب کروا رہی ہو؟ میرے ساتھ ساتھ تو بھی تو ٹھکانے لگے گی۔" انیلا با آواز بلند اپنے مخصوص منہ پھٹ انداز میں بول رہی تھی۔ اندر لیٹے اسلم کو ان کی چھیڑ خانیوں سے کوفت ہورہی تھی۔

"ارے ہاں! اللہ رکھے، دونوں ایک ساتھ اپنے اپنے گھروں کی ہوجائیں گی۔ ان شاء اللہ۔" اماں مسکراتے ہوئے بولیں۔ شبو شرماگئی، انیلا ہنس پڑی۔

"اس کو دیکھو! کیسے شرمارہی ہے۔"

"تو؟ تیری طرح بے شرم بن کر ٹھٹھے لگائے اپنی شادی کے ذکر پر؟" اماں نے شبو کی حمایت میں انیلا کے لتے لیے۔

"مجھے تو اس کے شرمانے پر ہنسی آرہی ہے اماں!" انیلا نے اپنی صفائی پیش کی۔

"یہ نہیں ہوسکتا، میری زندگی میں رامین کے علاوہ کسی اور کی کوئی گنجائش نہیں۔" اندر لیٹے ہوئے اسلم نے فیصلہ کن انداز میں سوچا۔

☼ ☼ ☼
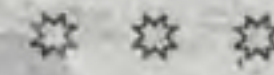
چھٹی کا دن تھا، اس کے قدم بلا ارادہ ہی روبینہ باجی کی جانب اٹھ گئے۔

"آؤ بھئی اسلم! بیٹھو۔ ہم تمہیں ہی یاد کررہے تھے۔" انہوں نے بڑے تپاک سے اس کا استقبال کیا۔

"ہم؟" وہ مسکرایا۔

"ہاں! تو ہم دونوں کے علاوہ اور کون ہے اس گھر میں؟" وہ مسکرائیں تو مگر ان کی مسکراہٹ میں ایک تھکن تھی۔

"خیریت؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" اسلم نے ان کا چہرہ بغور دیکھا جس کی شادابی کچھ ماند پڑی ہوئی تھی۔

"ہاں! بس یوں ہی۔ طبیعت کبھی اپ ڈاؤن ہوجاتی ہے۔ خیر! تم سناؤ گھر میں سب کیسے ہیں۔ کبھی خالہ اماں کو لے آیا کرو۔ بہت دل چاہ رہا تھا ان سے ملنے کا۔"

"اگلی بار لے آؤں گا۔ ان شاء اللہ۔ میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا کہ اماں کو کسی روز یہاں لے آؤں۔ وہ بھی اکثر آپ دونوں کو یاد کرتی رہتی ہیں۔"

"تمہارا کام کیسا چل رہا ہے؟"

"فرسٹ کلاس۔"

"رامین کے لیے دیکھا کوئی موزوں لڑکا؟" کچھ دیر بعد انہوں نے دھیرے سے سوال کیا۔

"دیکھ رہا ہوں جو اچھا لگا، وہ دکھادوں گا۔" اسلم کا جواب مبہم سا تھا۔

رامین کولڈ ڈرنک لے آئی تھی۔ سلام کرکے بیٹھ گئی۔

"آج تو تم کھانا کھا کر جانا۔ ہر بار جلدی جلدی کا شور مچا کر بھاگ جاتے ہو۔" روبینہ باجی ہمیشہ ہی ایسی اپنائیت کا مظاہرہ کرتی تھیں۔

"آج میں بھی اس ارادے سے آیا ہوں۔"

"ویری گڈ! اگر تم آج بھی بہانے بناتے تو میری ڈانٹ کھاتے۔"

"آپ کی ڈانٹ ہو یا کھانا، دونوں شوق سے کھالوں گا۔"

"ہوں! اچھا جملہ ہے۔" وہ ہنس پڑیں۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ نے رامین کے لبوں کو بھی چھوا۔

"رامین تو مسکرانے میں بھی کنجوسی دکھاتی ہے۔"

"جینے کے لیے اتنی مسکراہٹ کافی ہے۔" رامین نے جواب دیا۔

"پھر وہی قنوطی پن۔ آپ نے اس لڑکی کو ہنسنا کیوں نہیں سکھایا؟" اسلم روبینہ باجی سے مخاطب ہوا۔

"بھئی! ہم نے تو اپنی جانب سے ان کی ہنسی کے سارے سامان کیے، نہ جانے کہاں کمی رہ گئی۔" روبینہ باجی یک بیک سنجیدہ ہوگئیں۔

"اتنا تو ہنستی مسکراتی ہوں پھر بھی آپ ایسی باتیں کررہی ہیں۔" رامین نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔

"تم اتنی خاموش، اتنی اداس رہوگی تو مجھے یہی خیال آئے گا۔" روبینہ باجی اس سے بے خبر تھیں نہ بے نیاز۔ کئی روز سے اس کی خاموشی اور اداسی انہیں بھی بے چین کررہی تھی، پریشان کررہی تھی۔

"بس یوں ہی کبھی دل ایسے ہی ہوجاتا ہے۔" رامین رک رک کر ادھوری سی بات کررہی تھی، زندگی ہی ادھوری ہوچلی تھی تو بات پوری کیسے کرتی۔ یہ شخص جو سامنے بیٹھا ہے۔ اس کا ساتھ مل جائے تو مکمل ہوجائے، یہ زندگی بھی اور آدھی ادھوری باتیں بھی۔

"میں ابھی آتی ہوں۔" روبینہ باجی کسی کام سے اٹھیں۔

اسلم فون پہ بات کررہا تھا، اس کے کسی کلائنٹ کا فون تھا۔ بات ختم کرکے اس نے فون آف کیا۔ سیدھا ہوکر بیٹھتے ہوئے بلا ارادہ ہی رامین پر نگاہ پڑی، ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتی ہوئی وہ بہت ٹینس لگ رہی تھی۔

"مجھے لگتا ہے میں اندھیروں میں گھر گئی ہوں۔" وہ لرزتی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے بہت بے بس اور دل گرفتہ نظر آرہی تھی۔

بے اختیار ہی اسلم کا دل چاہا کہ اپنے دل کے نہاں خانوں میں اسے چھپالے کہ کسی غم کا سایہ تک نہ پڑے اس پر، مگر وہ محض پہلو بدل کر رہ گیا۔ دونوں کے درمیان بے انت فاصلہ تھا۔

"محبت اندھیرا نہیں روشنی ہوتی ہے۔ جو اس میں گھر جاتا ہے، اس کے آس پاس اجالا ہی اجالا ہوتا ہے۔" اسلم نے کہنا چاہا۔ مگر ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

"رامین! خود کو سنبھالو، ہماری زندگی، ہمارے معاملات نہ ہمارے اختیار میں ہوتے ہیں نہ ہمارے ہاتھ میں، یہ فیصلے کہیں اور ہوتے ہیں۔"

"تو پھر ہمیں زندگی کیوں دی جاتی ہے، دل کیوں دیا جاتا ہے۔" وہ بکھر رہی تھی۔

اسلم بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ ابھی اس سے کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ دونوں کے درمیان بہت کچھ تھا جس پر ان کہی کا پردہ ڈالا ہوا تھا، وہ اس پردے کو ہٹاتا تو دونوں کی بے اختیاری اور بے قراری اور سوا ہوجاتی۔ اس کے اپنے ہاتھ خالی تھے وہ کیسے کوئی امید کا جگنو ان ہاتھوں میں دے دیتا۔ ہاں اس نے خود سے عہد ضرور کیا تھا، آخری حدوں تک کوشش کرنے کا۔

"مجھے پتا تھا میری لائف میں بھی یہی کچھ ہوگا، آنسو اور تنہائی، امی اور خالہ کی طرح۔" رامین کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں، وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"رامین!" اسلم نے اسے پکارا مگر وہ نہیں رکی۔

"اچھی لڑکی! میں تمہیں کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا ورنہ کہنے کو میں کیا نہیں کہہ سکتا۔" اسلم نے شدت کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

کچھ نہ کہنے کے باوجود بھی دونوں ایک دوسرے کے احساسات سے آشنا تھے، محبت کی خوشبو محسوس ہورہی تھی مگر کوئی اظہار نہیں، اقرار نہیں۔ دونوں کے قدموں میں نادیدہ زنجیریں پڑی ہوئی تھیں۔

رامین کیسے اظہار کرتی، روایتی شرم و حیا اور جھجک نے اس کی زبان پر تالے ڈال رکھے تھے۔ واضح الفاظ

میں اظہار اس کے لیے مشکل تھا۔ وہ اسلم کی جانب سے پہل کی منتظر تھی اور اسلم اقرار اور وعدوں کی مالا اسے پہنانے میں متذبذب تھا۔

☼ ☼ ☼

ذرا تم ہی سوچو، بچھڑ کے یہ ملنا محبت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے
ملے ہو مگر اجنبی بن رہے ہو، قیامت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے

شبو بیسن کی روٹی اور چٹنی لے کر آئی تھی، اماں نے فرمائش کر کے اپنی بہن سے پکوائی تھی۔ اماں کا کوئی خاص چیز کھانے کو دل چاہتا تو اپنی بہن سے فرمائش کر دیتیں۔ اماں کا کہنا تھا کہ اپنی من پسند شے خود بنا کر کھانے میں لطف نہیں آتا، ان کی بہن کے ہاتھ میں لذت تھی، بہن کے لیے پکاتیں تو اس میں محبت بھی شامل ہوتی۔ اپنا فرمائشی کھانا، اپنے سامنے پا کر اماں نہال ہو گئیں۔

"تیری ماں کی یہ عادت بچپن سے ہے، میں جھوٹوں بھی کسی کام کو کہتی وہ فوراً" کرنے دوڑ پڑتی، بڑا ادب لحاظ کرتی ہے میرا شروع سے ہی۔" اماں کے لہجے میں بہن کے لیے بڑا فخر، بڑا مان تھا اور ساتھ ساتھ محبت بھی۔ وہ ہاتھ دھو کر آئیں اور ٹرے سامنے کھسکالی۔

"ذرا فریج سے اچار کی بوتل تو نکال دے۔"

شبو نے حکم کی تعمیل کی مگر ناکام لوٹی۔

"فریج میں نہیں ہے اچار۔" اس نے اطلاع دی۔

"وہیں تو رکھا تھا۔ ان لوگوں سے پوچھ، کس نے نکالی تھی بوتل۔"

ساری فوج ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی۔

"وہیں رکھا ہو گا، ٹھیک سے دیکھ لے۔" شبو کے سوال پر منی نے ٹی وی پر سے نظریں ہٹائے بغیر اسے بھگایا۔

شبو نے جا کر من وعن اماں کو بتا دیا اور اماں کا پارہ ہائی ہوتے دیر تھوڑی لگتی تھی۔

"منی! او منی! اس منحوس ڈبے کو بند کر اور ادھر آ۔" ان کی زوردار چنگھاڑ بلند ہوئی۔

منی جلدی سے اٹھ کر باہر آئی، فریج کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا، کچن میں ادھر ادھر دیکھا، شیلفوں میں تاکا جھانکی کی، مگر اچار کی بوتل ندارد۔

"آخری بار کس نے نکالی تھی اچار کی بوتل؟" وہ جھنجلا کر بقیہ فوج کے سر پر کھڑی ہو گئی۔ اس کا ڈراما نکل رہا تھا اسے غصہ آ رہا تھا۔

اچار کی ایسی ڈھنڈیا پڑی تھی کہ اماں کے لیے بیسن کی روٹی کا سارا مزا کرکرا ہو گیا تھا، اماں سب پر گرج برس رہی تھیں۔ شبو لپک کر اپنے گھر گئی اور فوراً" ہی واپس بھی آ گئی۔

"یہ لو خالہ!" اس نے اچار کی کٹوری ان کے آگے رکھی۔

"یہ گھر سے لائی ہے؟"

"ہاں! تمہاری روٹی ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ پہلے کھانا کھا لو، پھر فضیحتا کرنا۔"

"تم لوگ چیز کو جہاں سے اٹھاتے ہوئے وہاں واپس کیوں نہیں رکھتے؟" شبو نے سب کو ہی لتاڑا تھا۔

"تو آکر سدھار لینا سب کو۔ ہم تو ایسے ہی ہیں۔" منی نے حاضر جوابی دکھائی۔

"میں تو ایسا سدھاروں گی کہ سب کے دماغ درست ہو جائیں گے۔" شبو بھلا کیوں پیچھے رہتی، ویسی ہی پھرتی سے جواب دیا۔

"او ہو! ان کو دیکھو، گھر میں ابھی آئی نہیں۔ رعب پہلے سے جمانا شروع کر دیا۔" منی شروع ہو گئی۔ ان لوگوں کی یہ جھڑپ کوئی آج کی بات نہیں تھی۔ اکثر دونوں بہنوں میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ شبو کی منہ ماری ہو جاتی۔ ایک، دو روز بعد دونوں کے پھولے ہوئے منہ خود بخود ٹھیک ہو جاتے۔

"تم لوگ باز نہ آنا چونچیں لڑانے سے، تو ہی چپ ہو جا شبو!" اماں نے سیز فائر کرانا چاہا۔

"خالہ! یہ ہے تو ابھی اتنی سی اور زبان دیکھو، کتنی لمبی ہے۔" شبو نے خالہ کو دیکھتے ہوئے شکایتاً" کہا۔

"ہاں ہاں! خود تو جیسے گونگی ہیں محترمہ۔ سب سے تو لڑائیاں کرتی رہتی ہے۔ بدتمیز لڑاکا کہیں کی۔" منی نے ہاتھ نچا نچا کر اسے جواب اور القابات سے نوازا اور غڑاپ سے اندر گھس گئی۔

"دیکھ رہی ہو خالہ! کیا، کیا بول کر گئی ہے مجھے۔" شبو دھپ سے ان کے پاس بیٹھ گئی۔

عین اسی وقت اسلم گھر میں داخل ہوا تھا۔ سلام کر کے وہ اپنے جوتے اتارنے لگا۔

"تو کیوں اپنا دل چھوٹا کرتی ہے؟ چھوڑ! اس کی باتوں کو، یوں ہی غصے میں بول گئی ہے۔ کل کو تم دونوں پھر ہنسنے بولنے لگو گی۔" اماں نے روٹی کھاتے کھاتے اسے سمجھایا۔

"پھر کسی سے جھگڑا ہو گیا؟" اسلم نے ایک نظر اس کے ناراض چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر سر جھٹک کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کے لیے یہ معمول کی بات تھی۔ آئے دن ان لوگوں کے یہ تماشے دیکھتا رہتا۔ "ٹام اینڈ جیری" والا معاملہ تھا۔ کاٹا مجھے بھائے نہیں، کالے بن سہائے نہیں۔

☼ ☼ ☼

اور یہی ہوا۔ دو، تین روز بعد پھولے ہوئے منہ اپنے نارمل تاثرات پر واپس آ گئے اور چوتھے دن دوپہر میں کھانے اور کام سے فارغ ہو کر تینوں کی تینوں مل کر "ہی ہی، ہاہا" کر رہی تھیں۔ اس کھی کھی کا موقع انی نے فراہم کیا تھا۔ جو کاغذ قلم لے کر بیٹھی تھی۔ وہ ڈائجسٹ پڑھنے کی شوقین تھی۔ الف سے لے کر ی تک پورا ڈائجسٹ چاٹ جاتی۔ شوقین تو منی اور شبو بھی تھیں۔ مگر دونوں کا شوق فقط چند صفحات تک محدود تھا۔ اپنے پسندیدہ فنکاروں کے انٹرویوز اور حسن نکھارنے یا بڑھانے کے ٹوٹکے، کہانیوں کے معاملے میں دونوں انیلا پر حیرت کرتیں۔

"پتا نہیں کیسے اتنی لمبی لمبی کہانیاں پڑھ لیتی ہے۔ ہمارے تو دو صفحے بھی پڑھ کر سر میں درد ہو جاتا ہے۔" دونوں مل کر باتیں بناتیں۔ یہ اور بات کہ ان ہی کہانیوں پر بنے ڈرامے کئی کئی گھنٹے ٹی وی پر دیکھ لیتیں۔ تب نہ سر میں درد ہوتا، نہ آنکھوں پہ چشمہ لگنے کا خوف۔

انیلا کو ڈائجسٹ کے مستقل سلسلوں میں غیر مستقل شرکت کا شوق بھی تھا۔ کبھی اشعار، کبھی لطیفے، کبھی اقتباسات، اس بار اس نے ایک نئے سلسلے پر طبع آزمائی کی تھی۔

"جو کچھ لکھا ہے، بالکل سچ لکھا ہے، سنو۔" وہ جملہ حاضرین سے مخاطب تھی۔

جواب نمبر ایک، ہمارے ہاں کھانا پکاتے وقت صحت، غذائیت اور لذت سے زیادہ بچت کا خیال رکھا جاتا ہے جو سبزی سستی ہو، وافر مقدار میں ہماری اماں اسٹاک کر کے رکھ لیتی ہیں۔ پھر ہر دوسرے دن چل میرے بھائی۔۔۔ ہاں گاہے گاہے منہ کا ذائقہ بدلنے کو دال کا شوربہ یعنی پتلی دال بھی بنتی ہے۔ جس میں ہم غوطے کھا کھا کر دال کا دانہ ڈھونڈتے ہیں۔ ہماری پسند کا خیال فقط بقرعید کے چند دنوں میں رکھا جاتا ہے۔ جب گوشت وافر مقدار میں ہوتا ہے۔

ہمارے مہمان عموماً" بغیر اطلاع کے آتے ہیں۔ جن کی دو اقسام ہیں محلے والے یا قریب رہنے والے رشتے دار۔ ان کو ہم چائے، شربت پر ٹرخا دیتے ہیں۔ کبھی ہماری اماں فقط پان کھلا کر رخصت کر دیتی ہیں۔ ذرا دور سے آنے والے مہمانوں کے سامنے چائے کے ساتھ بسکٹ اور نمکو وغیرہ رکھ دی جاتی ہے۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ کسی خوش نصیب مہمان کے لیے کھانا پکانے کا تردد کیا جائے تو ہمارے گھر آلو کوفتے بنتے ہیں۔ ایک پاؤ گوشت کی بوٹیاں گنی چنی ہوتی ہیں۔ فی بندہ ایک ایک بھی نہیں پڑتی۔ مگر اسی گوشت کو قیمہ بنوا کر بڑی مقدار میں مسالے ملا کر کوفتے بنائے جائیں تو اتنی تعداد میں بن جاتے ہیں کہ ایک کوفتہ، دو آلو سب کے حصے میں آ جائیں۔ مہمان سمیت، اس سے ہماری اماں کی سلیقہ مندی کا اظہار ہوتا ہے۔ ہمارے فریزر میں نہ گوشت، قیمے کے پیکٹس ہوتے ہیں۔ نہ شامی کباب، کوفتے، نہ مسالا لگی مرغی، مچھلی، نہ فریز یخنی، اس میں فقط برف کے کٹورے ہوتے ہیں اور بس۔

کسی ڈش کی ترکیب یوں نہیں لکھ رہی کہ کھانا پکانے کا کام اماں ہی کرتی ہیں۔ بقول ان کے "تم لوگ گھی' تیل اور مرچ مسالوں کا نقصان کرتی ہو' کھانا کیا پکاتی ہو" لیکن پھر بھی آپ لوگوں کی دلچسپی کے لیے اس آملیٹ کی ترکیب لکھ دیتی ہوں جو میں اکثر ایمرجنسی میں اکو کے لیے بناتی ہوں کہ وہ روزانہ دال' سبزی کھانے میں منہ بناتا ہے تو اماں اس کے لیے انڈا بنوا دیتی ہیں۔ صرف گرمیوں میں سردیوں میں تو ہم کبھی کبھار ہی انڈے کی عیاشی کرتے ہیں۔

آملیٹ۔۔۔

ایک عدد انڈا لے کر پیالی میں خوب اچھی طرح پھینٹیں' اس میں ایک پیاز چوپ کر کے ڈالیں ہاں اس میں نمک اور لال مرچ ضرور ڈالیں۔ خوب اچھی طرح پھینٹ کر گرم گرم گھی میں تل لیں۔ آملیٹ تیار ہے۔

کچن ہمارا صاف ہی رہتا ہے۔ ہنڈیا ایک ٹائم پکتی ہے۔ دو ٹائم چلتی ہے۔ نہ زیادہ بکھیڑا' نہ زیادہ کام۔

ناشتے میں بھائی کے لیے پراٹھے بنتے ہیں۔ باقی سب چائے پاپے کھاتے ہیں۔ جب سے اسلم بھائی کا کام چلنے لگا ہے۔ ایک آدھ بار وہ حلوہ پوری لے آئے چھٹی کے دن' ہم نے حلوہ پوری کھائی' انہوں نے اماں کی ڈانٹ کہ اتنے پیسوں میں تو ایک ٹائم کی ہنڈیا پک جاتی۔

جی ہاں! ہم گرمیوں میں اکثر باہر کھانا کھاتے ہیں۔ عموماً" کھانے کے وقت ہی لوڈشیڈنگ کا ٹائم ہوتا ہے۔ گرمی' مچھر' اندھیرا' کمروں میں کھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے ہم باہر صحن میں کھانا کھا لیتے ہیں۔ اس سے زیادہ باہر نکلنے کی نہ ہمیں عادت ہے۔ نہ اجازت' نہ ہماری اوقات ہے۔ ہمارے ہاں موسم کی مناسبت سے کھانا نہیں' سبزیاں بنتی ہیں۔ گرمیوں میں ہم ٹھنڈا پانی زیادہ پیتے ہیں۔ سردیوں میں کم' برسات میں پکوڑے وغیرہ کھانے کا دل چاہے تو تیل' بیسن اور الاں فلاں لوازمات میں پیسے پھینکنے کے بجائے اماں بیس روپے کے پکوڑے بازار سے منگوا دیتی ہیں۔ ایک ایک پکوڑا چٹنی سمیت سب کے حصے میں آجاتا ہے' کم خرچ' بالا نشیں۔

اچھا کھانا پکانے کے لیے محنت' محبت' شوق اور لگن سے زیادہ بھری جیب کی ضرورت ہوتی ہے۔ رقم ہوتی ہے تو کھانا پکانے کا سامان آجاتا ہے اور پکانے کے لوازمات موجود ہوں تو شوق اور ذائقہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔

ٹپس یعنی ٹوٹکے' مجھ سے زیادہ اماں کو معلوم ہیں۔ مجھے ایک آدھ ٹپ یہ معلوم ہے کہ اتنی مہنگائی اور گرمی میں گھنٹوں چولہے کے آگے کھڑے ہونا بے وقوفی ہے۔ ایک ٹائم ہنڈیا پکا کر دو' تین ٹائم چلائیں' پیسہ' وقت' محنت اور گیس یعنی توانائی' سب کی بچت ہو گی۔ ملک میں توانائی کے بحران کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں۔"

"کیسا؟" انیلا نے فخریہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"یہ چھپ بھی جائے گا یا نہیں؟ کیا' کیا لکھ ڈالا؟" شبو کی ہنسی کی جگہ بے یقینی نے لے لی۔

"جو کچھ لکھا ہے حقیقت ہے' سچ ہے اور سچ کا چھپنا مشکل سہی' مگر ناممکن نہیں۔" انیلا نے کاغذ فضا میں لہراتے ہوئے کہا۔

"اللہ توبہ! میں نے تو کبھی غور ہی نہیں کیا' تمہارے گھر میں اتنی غربت ہے۔ ساری آمدنی جاتی کہاں ہے آخر؟" شبو نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"میری اور بھائی کی شادی کے لیے کمیٹیاں بھری جاتی ہیں۔ آدھی آمدنی اس میں چلی جاتی ہے۔ باقی سے اماں گھر چلاتی ہیں۔"

"تیرا گزارا کیسے ہو گا شبو ہمارے گھر میں؟" منی نے محبت میں اس سے اظہار ہمدردی کیا۔

"مجھے کیا مسئلہ ہے۔ میری اماں' ابا کا جو کچھ ہے' میرا ہی ہے' میرا اور خالہ کا کھانا امی کے گھر سے ہی آجائے گا۔" شبو نے ایک شان بے نیازی سے جواب دیا۔

"اور ہم؟" انیلا اور منی ایک ساتھ چیخیں۔

"سب کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے کیا؟ اور ویسے بھی تم لوگ اپنے اپنے گھروں کی ہو جاؤ گی۔ جو وہاں پکے گا' وہی کھانا

پڑے گا۔" وہ ایک لمحے کو رکی۔

"ویسے میرے تایا بھی میرے ابا کی طرح چٹورے ہیں۔ اچھا کھانا پکواتے ہیں گھر میں۔ تو پریشان مت ہو۔" انیلا کا اترا ہوا منہ دیکھ کر شبو نے اسے تسلی دی۔

"اچھا۔" انیلا کے منہ سے ایک مری مری سی آواز نکلی۔ شادی کی ساری فکروں میں ایک بڑی فکر یہ بھی تھی کہ "وہاں" کھانا کیسا پکتا ہے۔

☼ ☼ ☼

اپنے آفس میں وہ اکیلا بیٹھا تھا۔ صبح سے دو کلائنٹ آئے تھے جنہیں اس نے نپٹا دیا تھا۔ اب اس وقت فراغت تھی اور فراغت' فرصت اس کے لیے غضب تھی۔ فیصلہ تو کیا تھا اس نے اماں سے بات کرنے کا۔

"آخر بات کرنے میں کیا حرج ہے۔ عشق کی بازی ہے۔ ایک اور آخری داؤ لگا ہی لے' کیا خبر جیت مقدر ہو' کیا پتا کوئی رستہ نکل ہی آئے۔" وہ اپنے ہی خیالات میں الجھتا رہا۔ وہ دشمن جان کب خیالوں میں نہیں رہتی۔ مگر فرصت کے لمحات میں تو ہر گزرتی سانس اس کے نام کی مالا جپتی ہے۔ خوش فہم نظریں اس کی منتظر رہتی ہے جیسے وہ ابھی کہیں سے نکل کے سامنے آجائے گی۔

"کیوں ملیں تم؟" وہ بے بسی سے کراہا۔

رات میں موقع غنیمت جان کر اس نے اماں سے بات کرنے کی ٹھانی۔

"اماں!"

"ہوں۔"

"اماں میں۔۔۔" اس نے خشک ہوتے لبوں پہ زبان پھیری۔

"اماں! میں شبو سے شادی نہیں کروں گا۔" دھیمی آواز میں اس نے جی کڑا کر کے کہا۔

"کیا کہہ رہا ہے؟" اماں کے سر پر دھماکا ہوا تھا۔ وہ ہکا بکا اسے دیکھنے لگیں۔

"پھر کس سے کرے گا؟" بیٹے کے چہرے کو کچھ دیر دیکھنے کے بعد انہوں نے سوال کیا۔

"رامین سے۔" اسلم نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا۔

"رامین سے؟" اماں نے جیسے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی بات دہرائی۔

"اماں! میں نے بہت سوچا۔ بہت سوچا۔ ہر پہلو پر' ہر بات' مگر میں بے بس ہو گیا۔ اللہ کے بعد تم ہی ہو جو میری مدد کر سکتی ہو۔" ایسی بے بسی اور التجا بیٹے کے لب و لہجے میں وہ پہلی بار دیکھ' سن رہی تھیں۔ ورنہ وہ تو ہر وقت ہنسنے' ہنسانے والا لڑکا تھا۔

"اماں! تم کسی طرح' خالہ' خالو کو منالو' کوئی بات بنالو' کچھ بھی' کچھ بھی کرو۔"

"مگر بیٹا! میں۔۔۔ کیا کہوں گی' کیا کروں گی' یہ بات سن کر تو میرا اپنا دماغ چکرا گیا ہے۔" اماں بوکھلا گئیں۔ "بہت مشکل ہے بیٹا' بہت مشکل۔"

"ناممکن تو نہیں ہے نا؟" اسلم کی پر امید نظریں ماں پر ٹکی ہوئی تھیں۔

"ناممکن تو دنیا میں کچھ بھی نہیں ہے۔" اماں کے لبوں پہ ایک پھیکی سی مسکراہٹ در آئی۔ اسلم ان کا بہت اچھا بیٹا تھا۔ بچپن سے ہی سمجھ دار اور صابر' اس نے کبھی الٹی سیدھی فرمائش کر کے ماں کو تنگ نہیں کیا تھا اور اب شاید ساری عمر کی کسر ایک ہی بار نکال لی تھی۔ انہیں اپنا یہ بیٹا بہت عزیز تھا۔ اس کی خوشیوں کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی تھیں۔ مگر ان کے لیے یہ بڑا سخت امتحان تھا۔ بہت کڑی آزمائش' ممتا کی کسوٹی پہ پوری اترتیں تو دوسرے رشتے نبھانے مشکل تھے۔ رشتوں کی پروا کرتیں تو بیٹے کی شکایتی نظریں ان کی ممتا کو ملامت کرتیں۔

"مجھے ایک ہفتہ تو لگے گا۔ دھیرے دھیرے' آرام سے کرنے کی بات ہے یہ' پہلے تو تیری خالہ کو اعتماد میں لینا پڑے گا۔"

"جو تم مناسب سمجھو اماں!" اسلم کے چہرے پہ اطمینان کے رنگ بکھر گئے۔ معاملہ اب ماں کے ہاتھوں میں سونپ دیا تھا۔ لہٰذا اسے بے فکری سی ہو گئی۔

مگر اماں کی تو راتوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔
اگلے روز اسلم نے ان سے ایک سوال کیا تھا۔
"اماں! مجھے حیرت ہے، تم نے اتنی جلدی اور آسانی سے میری بات کیسے مان لی۔"
"ہر ماں، باپ کا دل چاہتا ہے کہ اپنی اولاد کے لیے دنیا بھر کی نعمتوں اور خزانوں کے ڈھیر لگا دیں۔ میں تم لوگوں کے لیے کچھ زیادہ نہیں کر سکی۔ مگر تمہاری اس خوشی کو پورا کرنے کے لیے کوشش تو ضرور کر سکتی ہوں۔" اماں اپنے مزاج کے برعکس دھیمے سروں میں بول رہی تھیں۔
"ماؤں کے دل اللہ کس مٹی سے بناتا ہے؟" ماں کے ہاتھ تھام کر بھیگی پلکوں کے ساتھ وہ فقط اتنا ہی کہہ سکا۔
"اولاد سے محبت کی خاصیت تو اللہ تعالیٰ نے جانوروں میں بھی رکھی ہے۔ پھر انسانوں میں بھلا کیسے نہ ہوگی۔ ایک ماں کی ہی کیا، دنیا میں جہاں کہیں محبت ہے۔ اس کی محبت کا ادنیٰ سا عکس ہے۔ جو وہ اپنے بندوں سے کرتا ہے۔" معمولی خواندہ گھریلو سی اماں کیسا گاڑھا اور گہرا فلسفہ بول گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼
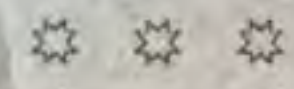
زیادہ دن تو نہیں گزرے تھے۔ مگر دل ہمک ہمک کر رامین کو دیکھنے کی امنگ کر رہا تھا۔ وہ چھٹی کے دن وہاں چلا ہی گیا۔ روبینہ باجی حسب معمول چہک چہک کر باتیں کر رہی تھیں۔ رامین کے چہرے پر بھی انوکھے رنگ پھیلے ہوئے تھے۔ وہ جب بھی شدت سے اس کے آنے کی، اسے دیکھنے کی خواہش کرتی، وہ غیر متوقع طور پر آجاتا۔
"پتا نہیں کیوں، میں اب تک تم سے ناامید نہیں ہوئی، تمہاری خاموشی کے باوجود بھی تمہارے گریز کے بعد بھی۔ جب بھی میری آس ٹوٹنے لگتی ہے، میرا حوصلہ جواب دینے لگتا ہے، تمہاری آمد میرے اردگرد پھول کھلا دیتی ہے۔ میں نہیں جانتی، میں اتنی خوش گمان کیوں ہوں۔ مگر مجھے یہی محسوس ہوتا ہے کہ مایوسی کے اس ریگستان میں کہیں قریب ہی نخلستان موجود ہے۔"
"کیا سوچ رہی ہو؟" وہ اپنے خیالات میں مگن بالکونی میں کھڑی تھی۔ جب اسلم نے اسے اچانک مخاطب کیا، وہ اچھل پڑی۔
"ڈرا دیا آپ نے۔" اس نے اپنی اتھل پتھل سانسوں کو قابو میں کیا۔
"اتنا خوف ناک تو نہیں ہوں۔" وہ مسکرایا۔
"ہاں! اتنے تو نہیں ہیں، بس تھوڑے سے ہیں۔" رامین نے "اتنے" پر زور دیا۔
"اچھا! پھر ڈر تو نہیں لگتا مجھ سے؟"
"نہیں! کبھی نہیں، قطعی نہیں۔" رامین نے نفی میں سر ہلایا۔
"تمہارا سامنے کا ویو بہت اچھا ہے۔" اسلم نے سامنے سڑک پار دیکھا، جہاں جھومتے لہراتے پھول پودوں پر مشتمل ایک بڑی سی نرسری تھی۔ بڑا خوب صورت اور مسحور کن منظر سامنے موجود تھا۔ بہار کی آمد سے ایک دلکش تر و تازگی اور شادابی کی خوشبو ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ نیچے سڑک پر بچے کھیل رہے تھے کھلکھلاتے، شور مچاتے بچے، زندگی سے بھرپور آوازیں۔
"مجھے یہاں بہت مزا آتا ہے۔ سامنے پھولوں کو، پودوں کو دیکھتے رہو، وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ لیکن شام میں نیچے بچے کھیلتے ہیں نا، بہت شور مچاتے ہیں۔" رامین آہستہ آہستہ اسے بتا رہی تھی۔
"بچوں کا شور اچھا نہیں لگتا تمہیں؟" وہ مسکرایا۔
"زیادہ شور شرابا برداشت نہیں ہوتا مجھ سے، میرے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ عادت نہیں ہے نا۔"
"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی نازک مزاج ہو۔" اسلم نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔
"بچپن سے اکیلی رہی ہوں خالہ کے ساتھ، کہیں اتنا آنا جانا بھی نہیں رہا۔ اس لیے وہی عادت پڑ گئی ہے۔ زیادہ شور و غل مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ برا لگتا ہے۔ اب خالہ سمجھاتی ہیں کہ اپنی عادت بدلنے کی کوشش کرو۔" رامین مسکرائی، اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اسلم کے ساتھ اپنی باتیں کرنا۔
"رامین بیٹا! آکر ٹیبل لگا لو۔" روبینہ خالہ نے آواز لگائی۔
"چلیں۔" رامین نے بالکونی کی ریلنگ پر سے ہاتھ ہٹائے۔
"چلو۔" اسلم ایک گہری سانس لے کر وہاں سے ہٹا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ دونوں یوں ہی ایک ساتھ کھڑے باتیں کرتے رہیں۔ اف یہ دل، اس کا چاہنا اور اس کا کہنا بھلا ضروری ہے کہ پورا ہو۔
رامین کچن میں برتن دھو رہی تھی۔ جب روبینہ باجی نے بات چھیڑی۔
"رامین کے لیے کوئی رشتہ دیکھا؟"
اسلم کا دل چاہا کہہ دے۔ آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔ مگر وہ محتاط رہا۔
"ایک پروپوزل ہے میری نظر میں، میں اچھی طرح دیکھ بھال کر بتاؤں گا۔"
"میں بہت فکر مند ہوں۔ رامین اپنے گھر کی ہو جائے تو مجھے اطمینان ہو جائے۔" وہ اسلم کے سامنے اکثر اسی طرح اپنی پریشانی کا اظہار کرتیں اور اسلم انہیں تسلی دیتا۔

☼ ☼ ☼

انیلا اور منی دونوں نے اپنی پاکٹ منی ملا کر اماں کے لیے جوڑا خریدا تھا۔ شبو نے بڑی خوب صورت سی لیس لگا کر اسے سیا، اب تینوں کی تینوں اماں کے سر ہو رہی تھیں کہ وہ نہا دھو کر نیا جوڑا پہن لیں۔
"ارے! تو کوئی ضروری ہے آج پہننا۔ رکھا رہنے دو، کہیں نہ کہیں آنا جانا نکل ہی آتا ہے، کام آئے گا، پہن لوں گی۔"
"مدرز ڈے۔ آج ہے تو سوٹ بھی آج ہی پہنیں۔" انیلا نے زور دیا۔ "اسی لیے تو ہم جلدی سے خرید کر لائے تھے۔"
"اور ایمرجنسی میں سلائی کی میں نے۔" شبو نے ٹکڑا لگایا۔
"تم لوگ تو پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتی ہو۔ چل جا منی! بالٹی لگا نل کے نیچے۔" اماں رضامند ہو ہی گئیں۔
"میں استری کر دیتی ہوں۔" انیلا نے فٹافٹ استری لگائی۔
اماں نہا دھو کر نیا جوڑا پہن کر بیٹھی تھیں۔ جب اکو گھر آیا۔
"یہ لو اماں!" ایک شاپر اماں کی طرف بڑھایا۔
"یہ کیا ہے؟"
"چوڑیاں ہیں تمہارے لیے، آج مدرز ڈے ہے نا۔" وہ بڑی شان سے گویا ہوا۔ اماں ہنس پڑیں۔
"سال میں ایک دن ہی خیال آتا ہے ماں کا؟" انہوں نے کچھ مسکراتی نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ وہ جھینپ کر وہاں سے غائب ہو گیا۔
ہاشم آئس کریم لایا تھا اماں کے لیے۔
"ٹی وی دیکھ دیکھ کر میری اولاد نے یہ دن منانے خوب سیکھ لیے۔" اماں نہال بھی ہو رہی تھیں اور ان کو ہنسی بھی آ رہی تھی۔
اسلم شام میں گھر آیا تو ایک نیا نویلا لان کا جوڑا اماں کے لیے لایا تھا۔
"ہائے بھائی! تمہیں بھی یاد تھا آج؟" دونوں بہنیں حیران ہو کر ایک ساتھ چیخیں۔
"کیوں، میں کیا کسی اور دنیا میں رہتا ہوں؟" وہ واش بیسن کے سامنے کھڑا آستینوں کے کف الٹ رہا تھا منہ دھونے کے لیے۔
"پچھلے کئی دنوں سے تو یہی لگ رہا ہے۔" انیلا باریک بین تھی اور منہ پھٹ بھی۔
"کیا مطلب؟" اسلم چونک پڑا۔
"کچھ نہیں۔ اس کی تو عادت ہے ایسے ہی بک بک کرنے کی۔" اماں نے انیلا کو ڈانٹ دیا۔ انیلا خاموش ہو گئی تھی۔ مگر اسلم یہ بات دیر تک سوچتا رہا تھا۔

رات میں کھانے کے بعد شبو اور خالہ چلی آئیں۔ وہ بھی اماں کے لیے سوٹ لائی تھیں۔ اماں خوش ہو رہی تھیں۔ ایک دن میں تین نئے سوٹ مل گئے۔

"خالہ! آج مدرز ڈے ہے، سسٹرز ڈے نہیں۔" انیلا نے ہنس کر اپنی خالہ کو چھیڑا۔

"بھئی! ہماری ماں تو ہمارے بچپن میں ہی چل بسی تھیں۔ ہم نے ہوش سنبھالا تو آپا کو دیکھا۔ ہمارے لیے تو یہی ہماری ماں ہیں۔" خالہ نے کئی بار کی کہی باتوں کو پھر دہرایا اور اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا کہ وہ واقعی اماں سے نہ صرف بہت محبت کرتی تھیں، بلکہ ایک ماں کی طرح ہی ان کا ادب، احترام بھی کرتی تھیں۔

بہت دیر بیٹھ کر بہت سی باتیں کر کے وہ رات گئے تک رخصت ہوئیں۔ ہاشم اور اکو پہلے ہی سو چکے تھے۔ انیلا اور منی بھی دن بھر کی تھکی ہوئی تھیں۔ آج انہوں نے اماں کو کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیا تھا۔ سارا کام خود ہی کیا تھا۔ دونوں دوسرے کمرے میں جا کر فوراً ہی بے سدھ ہو گئیں۔

اسلم نے موقع غنیمت جان کر اماں کے تخت کے ساتھ اپنا پلنگ لگایا اور ان سے باتیں کرنے لگا۔

"میں نے کچھ کہا تھا اماں!"

"ہاں! مجھے یاد ہے۔" کچھ توقف کے بعد انہوں نے جواب دیا۔ "معاملہ نازک ہے۔ بہت احتیاط سے کام لینا ہے۔ پہلے تو انیسہ کو اعتماد میں لوں گی۔ وہ مان گئی تو اپنے میاں کو سمجھائے گی۔"

"خالہ مان تو جائیں گی نا؟" اسلم کے لہجے میں انجانا سا خوف تھا۔

"میں کہوں گی تو مان ہی جائے گی۔ بہت لحاظ کرتی ہے میرا۔ لیکن پھر ایک طرف میں یہ بھی سوچتی ہوں کہ جیسے مجھے اپنی اولاد کی خوشی اور مرضی پیاری ہے ایسے ہی اسے بھی اپنی بیٹی عزیز ہے۔ زبان سے کچھ نہ کہے۔ دل میں تو خیال کرے گی۔" اماں نے ایک گہری سانس لی۔

اسلم چپ ہو گیا۔ جانے کیوں اسے اماں کی آواز بھیگی بھیگی سی لگی۔

☼ ☼ ☼
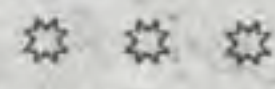
اگلے روز صبح سویرے بڑی افراتفری تھی۔ اسلم تو چلو تھوڑی دیر سے ہی جاتا تھا۔ مگر اکو اور ہاشم دونوں اسکول جاتے تھے۔ ساڑھے سات بجے اسکول لگتا تھا۔ اماں دونوں کو ناشتا کرا کے سوا سات بجے گھر سے نکال دیتی تھیں۔ اب آنکھ کھلی تو سات بج کر پچیس منٹ ہو رہے تھے۔

"ہائے ہائے! کوئی بھی نہیں اٹھا اب تک۔" اماں نے ہڑبڑا کر آواز لگائی۔ "سب کے سب بے ہوش پڑے ہیں، کل تو دونوں ساڑھے چھ بجے ہی اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ میرے جاگنے سے پہلے ہی ناشتا تیار ہو گیا تھا۔ منی، انی اٹھ جاؤ ذرا اپنے بھائیوں کو ناشتا بنا دے پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔" انہوں نے پھر سب کو آوازیں لگائیں۔ مگر بے سود، پھر انہوں نے خود ہی کمرے میں جا کر اکو اور ہاشم کو جھنجھوڑا، پھر انیلا کو۔

"کیا ہے، اماں! سونے دو نا۔" اس نے نیند میں ڈوبی آواز میں احتجاج کیا۔

"ایک تو ان لڑکیوں کا سونا ہی ختم نہیں ہوتا۔ کل بڑی جلدی جلدی سارے کام ہو رہے تھے۔ یہ اچھا طریقہ ہے۔ سال میں ایک دن کے لیے ماں کو تخت پہ بٹھا دو، باقی دن وہ جانے اس کا کام جانے ہم تو بس ٹی وی دیکھ لیں یا سو جائیں۔" اماں باآواز بلند بڑبڑاتی جا رہی تھیں اور ساتھ ساتھ بچوں کے لیے ناشتا بھی بنا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"اف! گرمی۔" گرمی کی شدت سے اک دم سے بوکھلا اٹھے تھے۔ بائیک پر کچھ ہوا لگی تو کچھ سکون احساس ہوا اور منزل مقصود پر پہنچ کر اس کی ساری تھکاوٹ یک دم ہی اتر گئی۔ رامین کا شاداب چہرہ دیکھتے ہی موسم کی ساری سختی اور شدت فراموش ہو گئی۔ اسے دیکھتے ہی موسم جیسے اک دم بہت خوب صورت ہو گیا تھا۔ ساری تپش، گرمی، گھٹن، سب کچھ اک

کی چھتری کے ذریعے غائب ہو گیا تھا۔

روبینہ باجی ڈرائنگ روم میں آئیں تو اپنی بے اختیار نظر اور دل پر قابو پا کر وہ ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"میں یہاں قریب ہی ایک کام کے سلسلے میں آیا تھا۔ سوچا آپ سے بھی ملتا چلوں۔" اسلم نے دوبارہ اتنی جلدی آنے کی وجہ بیان کی تو وہ مسکرا اٹھیں۔

"صفائی کیوں پیش کر رہے ہو؟ تم آتے ہو، ہمیں بہت اچھا لگتا ہے۔ آتے جاتے رہا کرو اور سناؤ! اماں کیسی ہیں، کبھی سب کو لے کر آؤ گھر پر، میرا تو تمہیں معلوم ہی ہے۔ جاب کرنے والوں کو ایک دن چھٹی کا ملتا ہے۔ اس دن عام دنوں سے زیادہ کام ہوتے ہیں۔ یوں ہی گزر جاتا ہے، پتا ہی نہیں چلتا۔"

"کسی روز سب کو لے کر آؤں گا ان شاء اللہ۔" اسلم نے بڑے پر اعتماد لہجے میں انہیں یقین دہانی کرائی۔ کولڈ ڈرنک لے کر آتی رامین کے لبوں پہ بے اختیار مسکراہٹ بکھر گئی۔

"کاش! ایسا ہو، کسی روز اچانک میری خوشیوں کے پیامبر بن کر سب لوگ یہاں آئیں۔" اس کے دل میں ایک خواہش نے سر اٹھایا۔ کوئی انوکھی بات نہیں کی۔ دل خوش فہم نے جانے کیا، کیا تمنائیں اور آرزوئیں پال رکھی تھیں۔ ایسا ہو جائے، ویسا ہو جائے، مگر کون جانے کب کیا ہو جائے، محبت کی ڈور کے ساتھ خوف اور اندیشوں کے ناگ بھی لپٹے چلے آتے ہیں۔ ہزار الگ کرو، دور ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔ نہ اندیشے، نہ محبت، دونوں ایک ساتھ پہلو بہ پہلو چلتے رہتے ہیں۔

کولڈ ڈرنک پیش کر کے وہ چلی گئی۔ اسلم باتیں تو روبینہ باجی سے کر رہا تھا۔ مگر اس کا بے چین دل رامین کا منتظر تھا کہ وہ دوبارہ کب آئے گی۔

اف! یہ محبت، ہائے یہ بے اختیاری، بے قراری۔ اس نے یخ بستہ کولڈ ڈرنک کا گھونٹ بھرا اور خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کی۔

"انی کی شادی کب کر رہے ہو تم لوگ؟" روبینہ باجی پوچھ رہی تھیں۔ وہ چونکا اور سنبھل کر جواب دینے لگا۔

"جی! اگلے سال تک ارادہ ہے۔ اس کے سسرال والے تو آمادہ ہیں جلدی کرنے کے لیے۔"

"اور تمہاری بھی ساتھ ہو رہی ہے؟"

"میری؟" وہ پھر چونکا۔

"ہاں! خالہ ذکر کر رہی تھیں کہ تمہاری اور انی کی شادی ساتھ کریں گی۔" روبینہ باجی سرسری سا کہہ رہی تھیں۔

"پتا نہیں۔" اسلم نے کندھے اچکا دیے۔

"خیر! تمہارے لیے تو لڑکی ڈھونڈنے کا تردد نہیں کرنا پڑے گا۔ خالہ نے یہ کام بہت پہلے ہی کر لیا تھا۔ ویسے شبو اچھی لڑکی ہے۔ ہنستی بولتی رہتی ہے میری طرح۔" وہ بات کے اختتام پر خود ہی ہنس پڑیں۔

اسلم سن بیٹھا انہیں تک رہا تھا۔

"وہ۔ وہ بات تو ختم ہو گئی۔" اس نے تھوک نگل کر رک رک کر کہا۔

"ختم ہو ہی جائے گی، جھوٹ کی کیا بات ہے۔" اس نے ملامت کرتے ضمیر کو تاویل پیش کی۔

"اچھا! حیرت ہے۔" وہ حیران ہوئیں۔

"میں چلوں۔ پھر آؤں گا۔" وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹھتے تھوڑی دیر اور۔۔۔ کھانا کھا کر چلے جانا۔" ان کی پیش کش میں تکلف یا سرسری پن نہیں تھا۔ خلوص اور اپنائیت تھی۔

"وہ پھر کبھی۔۔۔ اس وقت تو جانا ہے۔" اسلم ایک زبردستی کی مسکراہٹ لبوں پہ لایا اور اللہ حافظ کہہ کر نکل آیا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

"یہ تو گڑبڑ ہو گئی۔" بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔

"خیر! سب کچھ ٹھیک ہو ہی جائے گا۔ کوشش تو کی ہے۔ اب پتا نہیں۔" بائیک چلاتے ہوئے اس کا ذہن متضاد خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

میرا بابو چھیل چھبیلا میں تو ناچوں گی، میرا بلما رنگ رنگیلا۔

آج چھٹی کا دن تھا۔ خالو کا ٹی وی ان کے ناشتے کے بعد آن ہو گیا۔

"اف۔" اسلم نے تکیے میں منہ گھسایا۔ "یہ دروازہ تو بند کر دو، کانوں میں گھسی جا رہی ہے آواز۔"

دونوں گھروں کے بیچ کا دروازہ ہمیشہ کی طرح کھلا تھا۔ خالو اسی کمرے میں تو بیٹھتے تھے۔

"ابھی شبو آئے گی تو بند کرتی ہوئی آئے گی۔ اب تو بھی اٹھ جا، ٹائم دیکھ، کیا ہو گیا، چھٹی کے دن کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ دوپہر تک پڑے اینڈتے رہو۔" اماں نے اس کی فریاد پر کان نہ دھرتے ہوئے الٹا اسی کو نصیحت کر دی۔

"اب تو اٹھنا ہی ہے، یہ سلطان راہی کہاں سونے دیں گے اب۔" اسلم بڑبڑایا۔

"ارے لڑکے! اٹھ جا، ناشتا کر لے، وہ صفیہ تیرے پیچھے دو، تین چکر لگا چکی ہے گھر کے، میں نے کہا تھا کہ چھٹی والے دن اسلم ملے گا گھر پر، ہو سکتا ہے۔ وہ آجائے کچھ دیر میں۔ بے چاری پریشان ہو رہی ہے۔ اس کا مسئلہ تو حل کر دے۔"

"وہ پریشان ہو نہیں رہیں، کر رہی ہیں، کئی رشتے دکھا چکا ہوں، ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتے، اب کوئی لڑکی اور اس کی فیملی آرڈر پر تو بنوانے سے رہا جو ان کے معیار پہ پوری اترے۔" اسلم نے چڑچڑے پن سے جواب دیا۔

"ارے! وہ۔" اماں اس کے قریب ہوتے ہوئے دھیرے سے بولیں۔ "کچھ عرصہ پہلے رامین کو دیکھا تھا اس نے۔ یہاں ہمارے گھر، اس کے لیے کہہ رہی تھی۔ بہت پیچھے پڑی رہی میرے، کہ تمہارے رشتے دار ہیں، تم بات کرو۔"

"پاگل تو نہیں ہو گئیں صفیہ خالہ! رامین جیسی لڑکی چاہیے انہیں اپنے چڑیا گھر کے لیے؟" اسلم جوش جذبات میں اٹھ بیٹھا۔ اس کا دماغ آؤٹ ہو گیا تھا یہ بات سن کر۔

"میں نے ٹال دیا تھا اسے۔ مگر اب وہ کہہ رہی ہے کہ کوئی ایسی لڑکی ڈھونڈ دے، خوب صورت ہو، اکلوتی ہو، فیملی زیادہ نہ ہو۔" اماں نے صفیہ خالہ کی فرمائش بیٹے تک پہنچائی۔

"اپنی فیملی دیکھی ہے انہوں نے؟ سات بیٹے، تین بیٹیاں، سب شادی شدہ، اپنی اپنی فیملیز والے، ایک بس بھر کے تو ان کا اپنا گھرانہ ہے، آخری بیٹے کے لیے جانے کیا نمونہ چاہ رہی ہیں۔ کوئی بالکل ہی اکیلی چاہیے تو کسی دارالامان سے لے آئیں۔" اسلم جانے کیوں بھرا بیٹھا تھا، پھٹ پڑا۔

"اے ہائے! تجھے کیا ہوا؟" اماں حیران ہو گئیں۔

"کچھ نہیں اماں! ایسے ہی بس۔ تمہیں بتایا تھا کہ ایک شادی کروائی تھی، پچھلے سال۔ دو، چار مہینے بعد ہی لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔ اب لڑکی والے مجھے پریشان کر رہے ہیں کہ طلاق دلواؤ، میں نے کہہ دیا کہ میرا کام شادی کرانا ہے، طلاق دلوانا نہیں۔ باقی معاملات وہ خود جانیں، خود نمٹیں، روزانہ آکر میرے کان کھاتے رہتے ہیں۔ لڑکے والے طلاق دینے پر راضی نہیں۔ کہتے ہیں کہ عدالت سے خلع لے لو۔" اس نے تفصیل سے بتایا۔

"تو خلع لے لیں۔ تجھے کیوں پریشان کر رہے ہیں؟" اماں نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے مشورہ دیا۔

"حق مہر چھوڑنا پڑے گا۔ بھاری رقم ہے۔ لڑکے والے دینا نہیں چاہتے۔ لڑکی والے چھوڑنا نہیں چاہتے۔ بیچ میں میری جان مصیبت کر رکھی ہے۔" اسلم بے زار سا ہو کر بتا رہا تھا۔

"تو اتنا بھاری حق مہر باندھنے کی ضرورت کیا تھی؟"

"بس! شان شوکت کا اظہار کیسے ہوتا؟"

"خیر! چھوڑ اس قصے کو۔ صفیہ کو کیا کہنا ہے؟ کوئی دکھا دے اس کے مطلب کی۔ روزانہ میرے پاس آکر اپنا دکھڑا سناتی رہتی ہے۔"

"دکھا دوں گا۔" وہ اٹھ کر واش روم کی جانب چلا۔

☆ ☆ ☆

"ہیلو، رامین کیسی ہو؟" رامین کی ہیلو سنتے ہی وہ چہکا۔

"ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں، گھر میں سب۔"

"میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ گھر میں بھی سب خیریت ہے۔ تم بتاؤ! روبینہ باجی کہاں ہیں؟"

"وہ بازار گئی ہیں۔ آئیں گی تو کال بیک کروا دوں گی، کوئی خاص بات؟" اس نے چند لمحے ٹھہر کر سوال کیا۔

"ہاں! خاص بات تو ہے، بتا دوں تمہیں؟" خوشی اس کی آواز سے چھلک رہی تھی۔

"مناسب سمجھیں تو بتا دیں۔" رامین کا لب و لہجہ محتاط تھا۔

"تمہارے لیے ایک لڑکا ڈھونڈا ہے۔ تمہاری مرضی اور پسند کے عین مطابق۔"

"آپ کو معلوم ہے میری مرضی اور پسند کیا ہے؟"

"بالکل معلوم ہے۔" اسلم نے دعوا کیا۔

"کیسے؟"

"وہ ایسے کہ جو لوگ دل کے قریب ہوتے ہیں، ان کی مرضی، پسند، ناپسند پتا چل ہی جاتی ہے۔"

"اتنی بڑی بات کس آرام سے کہہ دی؟" رامین بھونچکارہ گئی۔ پھر خاموش ہو گئی۔

"کیا ہوا، میری بات بری لگی ہے کیا؟"

"نہیں، بری تو نہیں لگی۔"

"پھر اچھی لگی؟" وہ شوخ ہوا۔

"بتانا ضروری ہے؟" رامین نے ہیلو بچا کر نکل جانا چاہا۔

"بالکل ضروری ہے۔" اسلم نے اصرار کیا۔

"بعد میں بتا دوں گی۔"

"بعد میں کب؟"

"جب آپ آئیں گے۔"

"ابھی آجاؤں؟"

"آپ کی مرضی۔"

"تمہیں معلوم ہے، میری مرضی کیا ہے؟"

"جی۔"

"کیسے۔"

"وہ ایسے کہ جو لوگ دل کے قریب ہوتے ہیں ان کی مرضی، پسند، ناپسند پتا چل ہی جاتی ہے اور اب فون بند کریں، اللہ حافظ۔" رامین نے اس کا جواب اسے لوٹا کر جلدی سے فون بند کر دیا۔

دوسری جانب اسلم نے پہلے تو اپنے ہاتھ میں پکڑے موبائل کو حیرت سے دیکھا اور پھر ہنس پڑا۔ وہ بہت خوش تھا۔ زندگی میں سب سے زیادہ خوش، گو کہ یہ خوشی ادھوری تھی۔ مگر شروعات تو ہو گئی تھی نا۔

☆ ☆ ☆

اماں نے خالہ سے بات کی تھی۔ اسلم کو انہوں نے پوری بات تو ابھی نہیں بتائی تھی۔ بس اتنا بتا دیا کہ انہوں نے خالہ کے کانوں میں بات ڈال دی ہے۔ اب آگے اللہ مالک ہے، دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

رات میں سب سو گئے تو وہ اماں سے باتیں کرنے لگا۔

"پھر اماں! خالہ نے کیا جواب دیا؟" اسلم بہت بے چین تھا۔ سب کچھ جاننے کے لیے۔

"وہ کیا کہے گی بے چاری، پہلے تو رونے لگی، میں نے سمجھایا کہ اسلم تیرے میرے دباؤ میں یا کہنے میں آکر شادی کر لے۔ مگر نہ خود خوش رہے، نہ اپنی بچی کو خوش رکھے۔ تو ایسی شادی کا کیا فائدہ۔" اماں اتنا کہہ کر چپ ہو گئیں، مگر ان کے چہرے پہ رنج و ملال کے سائے تھے۔ نیم اندھیرے میں اسلم کو ان کا چہرہ صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ اپنے کاسہ دل میں خوشیوں کے کھنکتے سکے پڑے ہوں تو کسی اور کے چہرے پہ سجے دکھ نظر نہیں آتے۔ وہ حالانکہ اتنا خود غرض یا بے حس تو نہیں تھا۔ مگر اس وقت اپنی محبت اور خوشیوں کی فکر میں اس نے ماں کا چہرہ غور سے دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

"پھر؟" اس نے بے تابی سے دوبارہ سوال کیا۔

"بات کرے گی اپنے میاں سے، ہفتہ دس دن تو

لگیں گے۔"

"اتنے دن....."

"ہتھیلی پہ سرسوں نہیں جمتی بیٹا' دھیرج رکھو' سہج پکے سو میٹھا ہو' وہ اپنے شوہر تک بات پہنچائے گی' تب ہی کچھ بات آگے بڑھے گی۔" اماں نے اسے تسلی دی۔

"میں اب سوؤں گی' صبح اٹھنے میں دیر ہو جاتی ہے۔" اماں نے کروٹ لے لی۔

اسلم کی آنکھیں اور دل رنگ برنگے سپنوں کے تانے بانے بننے میں مصروف تھے۔ نیند کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ رات گئے تک وہ جاگتا رہا۔ سوچتا رہا۔ خواب دیکھتا رہا۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز روبینہ باجی نے اسے کال بیک کی تھی۔

"معاف کرنا بھئی! مجھے رامین نے تمہارے فون کے بارے میں بتایا تھا۔ اسکول کی کچھ مصروفیت تھی۔ پھر ایک بار چارجنگ ختم ہو گئی تھی۔ رات کو تمہیں بہت ٹرائی کیا۔ مگر نمبر نہیں ملا' اب جا کر رابطہ ہوا ہے اور تم سناؤ! سب خیریت ہے نا؟" اپنے مخصوص انداز میں بے تکان بولتے ہوئے انہوں نے سب سے آخر میں وہ بات پوچھی جو سب سے پہلے پوچھنی چاہیے تھی۔

"میں اسپتال میں ہوں۔" اسلم کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی تھی۔

"اسپتال میں؟ خیریت تو ہے۔" وہ بری طرح چونکیں۔

"اماں کا بی پی بہت شوٹ کر گیا تھا۔ ابھی ڈاکٹر نے آبزرویشن میں رکھا ہے۔"

"کون سا اسپتال ہے؟ میں نکلتی ہوں ابھی؟"

آدھ پون گھنٹا لگا تھا ان کو وہاں پہنچنے میں۔ مطلوبہ وارڈ کے باہر کوریڈور میں اسلم بیٹھا تھا۔ انہوں نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا اسے۔ وہ اکیلی آئی تھیں۔

"کیسی ہیں خالہ؟ کہاں ہیں؟" وہ ہانپتی ہوئی اس کے برابر بیٹھ گئیں۔ مین گیٹ سے وہاں تک پیدل چل کر آئی تھیں۔ اچھا خاصا فاصلہ تھا۔

"اندر ہیں' ابھی سوئی ہیں۔ ڈاکٹر سے بات ہوئی تھی' کہہ رہے تھے کہ اب حالت بہتر ہے۔ بی پی اک دم ہی بہت ہائی ہو گیا تھا۔ بے ہوش ہو کر پڑی تھیں۔"

"کوئی ٹینشن وغیرہ تو نہیں ہے؟ اس سے بھی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ کوئی پریشانی یا فکر انسان اپنے اوپر سوار کر لے تو ایسی حالت ہو جاتی ہے۔" ان کا انداز ٹوہ لینے والا نہیں تھا۔ بلکہ ہمدردی اور اپنائیت سے یہ سب کہہ رہی تھیں۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے' ٹینشن بھلا کیسی۔" اسلم کہتے کہتے رک گیا۔

"اس عمر میں ماں' باپ کا بہت زیادہ خیال رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ہمارے بڑے ہوتے ہیں نا' گھر چلانے والے' ان کے سر پر ہزاروں فکرات کا بوجھ ہوتا ہے۔ پھر ہم بھی اپنے سارے بوجھ ان ہی پر لاد دیتے ہیں۔" اسلم کی اندرونی حالات سے بے خبر وہ اپنی عادت کے مطابق بولے چلی جا رہی تھیں۔

اور اسلم کے دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ بیٹھا انہیں سن رہا تھا یا شاید وہ سن ہی نہیں رہا تھا۔ بس ان کی آواز خود بخود اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔ مگر وہ کیا کہہ رہی تھیں۔ اس کا دماغ اس طرح متوجہ نہیں تھا۔

"سنا کیا کہا میں نے؟" کچھ دیر بعد بولتے بولتے انہوں نے اچانک زور سے کہا۔

"ج..... ج..... جی۔" اسلم ایک دم اچھل پڑا۔

"میں پوچھ رہی تھی کہ تم نے فون کرنے کو کہا تھا' کوئی خاص بات تھی کیا؟" روبینہ باجی پوچھ رہی تھیں۔

"جی! میں نے کہا تھا فون کرنے کو۔" اسلم نے ایک گہرا سانس لیا۔ "رامین کے لیے ایک پرپوزل ہے' اسی کے بارے میں بات کرنی تھی آپ سے۔" اس کا لب و لہجہ مضبوط اور پر اعتماد تھا۔

"اچھا؟ کون لوگ ہیں؟"
اسلم انہیں تفصیلات بتا رہا تھا۔ وہ غور سے سن رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اماں کی طبیعت جلد ہی سنبھل گئی تھی۔ پھر گھر آ گئی تھیں۔ سب بچے ان کا بہت خیال رکھ رہے تھے۔ آگے پیچھے پھر رہے تھے۔ وہ پریشان ہو گئیں۔

"ارے بھئی! پیچھا چھوڑو میرا، میں کوئی بیمار ویمار نہیں ہوں۔" انیلا بہت دیر سے جوس ہاتھ میں پکڑے پینے کے لیے اصرار کر رہی تھی اور وہ انکار، آخر جھلا گئیں۔

"اماں! ڈاکٹر نے ہدایت دی ہے۔ آپ کا خیال رکھنے کی اور گھر میں ٹینشن فری ماحول اسی لیے تو ہمارا ٹی وی اب صرف نیوز دیکھنے کے لیے کھلتا ہے۔"

"بڑی مہربانی تم سب کی۔" اماں کو جھنجلاہٹ میں بھی ہنسی آ گئی۔

"شبو تمہارے لیے بریانی لائی ہے۔ کہہ رہی تھی کہ پرہیزی کھانے کھا کھا کر منہ کا ذائقہ بگڑ گیا ہوگا۔ تھوڑی سی کھا لینا۔ تاکہ منہ کا ذائقہ کچھ تو اچھا ہو۔" انیلا نے انہیں اطلاع دی۔

"تھوڑی سی دے دینا۔ دو، چار نوالے بچی محبت میں لائی ہے۔" اماں کے لبوں پہ پھیکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

شام میں اسلم آیا تو اماں کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ گیا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"

"ارے ہاں لڑکے! میں ٹھیک ہوں۔ ذرا سا بی پی کیا اوپر نیچے ہو گیا، تم لوگوں نے ہوا بنا لیا۔" اماں نے اس معاملے کو یوں ہی چٹکیوں میں اڑانا چاہا۔

"وہ ذرا سا معاملہ نہیں تھا اماں! خدانخواستہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اب۔۔۔" وہ آگے کچھ بولتے بولتے رک گیا۔

"ٹھیک ہوں میں، تم لوگ پریشان مت ہو۔" اماں نے نرم اور پرسکون انداز میں کہا۔ وہ مطمئن تھیں، خوش تھیں، معاملات بہتری کی طرف گامزن تھے۔

"اللہ سب کو خوش رکھے، آباد رکھے۔" اسلم کو دیکھتے ہوئے انہیں رامین کا خیال آ گیا۔ ان کے دل سے بے اختیار دعا نکلی تھی۔

☼ ☼ ☼

نہ جانے انسانوں کو ہی جلدی تھی یا نصیب زور کر رہا تھا۔ جھٹ پٹ رشتہ طے ہو کر شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔ دو ماہ بعد شادی، وقت کم، مقابلہ سخت، روبینہ باجی بیک وقت بے تحاشا خوش بھی تھیں اور پریشان بھی۔

"کیسے ہوگا سب؟ میں اکیلی۔۔۔ کیسے اتنی جلدی تیاری ہوگی۔" ان کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ مدد طلب نظروں سے اسلم کی جانب ہی دیکھا۔

"پریشان مت ہوں۔ سب ہو جائے گا اور اچھا اچھا ہی ہوگا۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ ہر وقت حاضر، کبھی بھی آواز دے کر دیکھ لیں۔" اسلم نے انہیں اپنے تعاون کا اور مدد کا یقین دلایا تھا۔ وہ اپنے لفظوں میں سچا تھا۔

روبینہ باجی کو اچھی خاصی تسلی ہو گئی۔ ورنہ وہ حقیقتاً" بہت گھبرا گئی تھیں۔ اتنی اچانک اور اتنی جلدی شادی، تیاری، کیا کیا کریں، کیسے کریں، چھوٹے بڑے کتنے معاملات تھے۔ نپٹانے کے لیے اور وہ اکیلی، ہاں، مگر بالکل اکیلی بھی نہیں۔

اسلم نے مدد اور تعاون کا فقط وعدہ ہی نہیں کیا اسے نبھایا بھی، حالانکہ اپنے گھر میں وہ بھی کچھ کم مصروف نہیں تھا۔ پھر روزگار کے مسائل، رشتوں کے معاملات میں کبھی کہیں جانا پڑتا۔ کبھی کہیں، مگر بہرحال، شادی کے ہر ہر مرحلے پر وہ روبینہ باجی کے ساتھ کھڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہو تمنا اور کیا، جان تمنا آپ ہیں۔
کیا کروں گی لے کے دنیا، میری دنیا آپ ہیں"

شبو کیری چھیلتے ہوئے بڑے مگن انداز میں گنگنا رہی تھی۔

"اللہ کے واسطے شبو! خاموش ہو جا، تیرے پھٹے بانس گلے کو یہاں کون برداشت کرے گا۔ آج تیرے ابا کا ٹی وی بند ہے تو، تو بجنا شروع ہو گئی۔" منی نے حسب عادت بغیر کسی لاگ لپٹ کے اسے لتاڑا۔

"تم لوگ تو جلتے ہو میری کوئل جیسی آواز سے، ہونہہ، جل ککڑی۔" شبو نے فوراً" ہی ترکی بہ ترکی جواب سے نوازا تھا۔

"شیرنی کو بھلا کیا ضرورت لومڑی سے جلنے کی۔" منی نے بڑے احساس تفاخر کا مظاہرہ کیا۔

"تسلیم کیا نا، ہو جنگل کی جانور۔" شبو نے ناک کے نشانہ مارا۔

"اچھا، کوئل کا شمار انسانوں میں کب سے ہونے لگا؟"

"وہ تو معصوم پنچھی ہے میری طرح۔" شبو نے گردن اکڑائی۔

"تو شیرنی ملکہ ہے میری طرح۔" منی نے بھی شان دکھائی۔

"بات سنو جنگل کی شہزادی! تمہارے ڈائیلاگز ختم ہو جائیں تو مجھے کنگھا لا دینا۔" اسلم کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ کف کے بٹن لگاتا ہوا بولا۔

"کنگھا وہیں تو رکھا ہے۔"

"وہیں کہاں؟"

"جہاں ہونا چاہیے" "آئینے پہ۔"

"حیرت ہے، ہمارے گھر میں چیزیں اپنے ٹھکانے پر موجود ہیں۔" اسلم نے آئینہ دیکھتے ہوئے کنگھا کیا۔

"کل شوز پالش اور برش حیرت انگیز طور پہ اپنی جگہ موجود تھا۔ آج قینچی ڈھونڈنے کے لیے ساری درازیں نہیں کھنگالنی پڑیں کیا انقلاب آ گیا۔"

"چیزیں ٹھکانے پہ نہ ہوں تو اماں کو چیخم دھاڑ کرنی پڑتی ہے۔ یہ بھی ایک ٹینشن ہے کہ ہر وقت کوئی نہ کوئی چیز ڈھونڈتے رہو۔ میں نے ان سب بگڑی اولادوں سے کہہ دیا ہے کہ اماں کی پروا ہے تو سدھر جاؤ، جو چیز

جہاں سے اٹھاؤ' واپس وہی رکھ دو۔" انیلا نے اس کایا پلٹ کی وجہ بیان کی۔

"اماں ہیں کہاں؟"

"صفیہ خالہ نے بلایا تھا' وہاں گئی ہیں۔"

"اف۔۔۔ یہ صفیہ خالہ۔" اسلم دل ہی دل میں کراہ کر رہ گیا۔ ان کے مطلوبہ معیار کی لڑکی ابھی تک نہیں ملی تھی۔ لہٰذا اسلم اور اماں کو پریشان کرنے کا ان کا شغل جاری تھا۔

"اماں آئیں تو بتا دینا' میں رات کو دیر سے آؤں گا۔"

"کیوں؟" انیلا کے بجائے شبو نے بے اختیار سوال کیا تھا۔

"ابھی سے بیویوں والے سوال مت پوچھا کر۔" اسلم نے اسے ڈانٹ کر چپ کرایا اور بائیک کی چابی لے کر باہر نکل گیا۔

"تمہارا بھائی ڈانٹتا کتنا ہے۔" شبو نے منہ بنایا۔

"بے فکر رہ' بھائی نے اپنے سارے ڈانیلاگز' شادی کے بعد کے لیے بچا کر رکھے ہیں۔" انیلا نے اسے تسلی دی۔

"اللہ جانے۔" شبو بے چاری ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ اسے ذرا اندازہ بھی نہیں ہوا تھا کہ پچھلے چند مہینوں میں زندگی ایک غیر معمولی کروٹ لے کر دوبارہ اپنے معمول پر آئی تھی۔ اسلم' رامین کی محبت میں بے اختیار' بے خود ہو گیا تھا۔ پختہ فیصلہ کر لیا تھا اس نے رامین کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا۔ لیکن دلوں کے اکثر فیصلے تقدیر کے فیصلوں سے تال میل نہیں کھاتے۔ پھر حالات و واقعات اپنا کردار ادا کرتے ہوئے انسان کے سامنے آتے ہیں۔ نصیبوں کے فیصلے کر۔

اس دن جب اماں اسپتال میں تھیں' اسلم ان کی ٹیسٹ رپورٹ لے کر آیا تو کمرے کے دروازے پر ہی ٹھٹک گیا۔ اندر خالہ تھیں' اماں کا ہاتھ پکڑے رو رہی تھیں۔

"آپا! تم خود کو یوں بیمار مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا' میں تمہارے بہنوئی صاحب کو... گی۔ اب مزاج میں وہ طنطنہ اور غصہ نہیں... کبھی تھا' سمجھاؤں گی تو مان جائیں گے' شبو... سمجھا دوں گی' بیٹے ماؤں کو سمجھیں نہ سمجھیں... سمجھ جاتی ہیں۔ تم خود کو یوں ہلکان مت کرو' تم... طرح اسلم مجھے سگی اولاد کی طرح عزیز ہے۔ اس... خوشی مجھے بھی عزیز ہے' مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہو گی' جو نصیب میں لکھا ہو' وہی ہو کر رہتا ہے... ندامت کا بوجھ کیوں اٹھاؤ' بس جلدی سے... ہو جاؤ۔"

وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح اماں کا ہاتھ پکڑے... رہی تھیں اماں کی آنکھیں بند تھیں شاید انہیں چھوٹی بہن سے آنکھ ملانے کا حوصلہ نہیں تھا۔

"اس بچی کا خیال آتا ہے بار بار' اس کی آنکھ... میں تو بچپن سے ایک ہی خواب سجا ہے۔ وہ... سنبھالے گی خود کو۔" اماں بند آنکھوں کے ساتھ رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔

خالہ کچھ دیر خاموش رہیں پھر پست آواز میں... ہوئیں۔

"میں سمجھا دوں گی۔"

"کس کس کو سمجھائے گی؟ مجھے' شوہر کو' بیٹی کو' کو؟" اماں نے بند آنکھیں کھول دیں۔

اسلم سامنے ہی دروازے میں کھڑا تھا' ا... آگیا۔ کمرے میں تینوں نفوس خاموش بیٹھے تھے... کے پاس کہنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں شاید۔

☼ ☼ ☼

اماں مگر حیران ہوئیں بہت حیران ہوئیں... وقت جب روبینہ باجی مٹھائی لے کر ان کے گھر آ...

"رامین کا رشتہ طے ہو گیا۔"

"رامین کا۔۔؟" اماں حیران ہو کر کبھی ان کی دیکھتیں کبھی اسلم کی۔

"ہاں' اسلم نے بتایا نہیں آپ کو؟ اس نے تو... ہے۔ کیا ہیرا لڑکا ڈھونڈا ہے رامین کے لیے...

...اچھی فیملی ہے' ابھی تک تو سب اطمینان ہے ...نصیب اچھے کرے۔" روبینہ باجی خوشی سے ...لہجے میں بتا رہی تھیں۔

...کیا چکر ہے بیٹا! کہاں تو تو رامین کے لیے دیوانہ ...ہوا تھا' میں شبو کی ماں سے بات کر کے آئی' سب کچھ ...بالا کر کے' تو کسی اور کے سنگ اسے رخصت کر رہا ...؟" روبینہ باجی کے جانے کے بعد اماں نے اسلم کی ...کلاس لی۔

"بہت کچھ سوچا اماں! پھر وہی فیصلہ کیا جو مناسب ...تھا۔ جو اس کے حق میں بھی اچھا ہو اور ہم سب کے ...لیے بھی۔" اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور لہجے میں صدیوں کی ...تھکن۔

"مگر مجھے بتا تو' آخر ایسا کیا ہوا جو یوں پیچھے ہٹ ...گیا؟"

"کیا بتاؤں اماں! میں نے بہت سوچا' ہر ہر پہلو ...سے' بس میری سمجھ میں یہی آیا کہ ایک نیا رشتہ جڑنے ...سے بہت سے پرانے رشتے ٹوٹ جائیں گے' مکمل نہ ...بھی ٹوٹیں تب بھی دراڑ تو پڑ ہی جائے گی' محبت اہم ...ہے' رشتے ضروری ہوتے ہیں' میں نے ضرورت ...کو اہمیت پر ترجیح دی ہے۔ بس اتنی سی تو بات ...ہے۔" اسلم نے مسکرانے کی کوشش کی۔

اتنی سی بات پوری زندگی پر محیط۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تو کہہ کیا رہا ہے؟ ...میں تو ہر ممکن جتن کر رہی تھی کہ تیری خوشیوں کی راہ ...میں کوئی رکاوٹ نہ ہو مگر تو خود ہی پیچھے ہٹ گیا' وہ بھی ...اتنی خاموشی سے' کتنے آرام سے۔" اماں یک ٹک ...اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

"زندگی میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے' تقدیر کے فیصلے ...ہماری مرضی کے تابع تھوڑی ہوتے ہیں۔ بس یوں ...سمجھیں کہ میں اپنے رستے جاتے جاتے ایک انجان رہ ...گزر پہ چل نکلا۔ آگے جا کر احساس ہوا کہ میری منزل ...یہاں نہیں ہے' سو واپس اپنے رستے پہ آگیا۔" اسلم نہ جانے انہیں سمجھا رہا تھا یا خود کو' اماں مطمئن تو نہیں ہوئیں مگر چپ ضرور ہو گئی تھیں۔

ایک اور بات تھی جو اسلم نے انہیں نہیں بتائی تھی۔

اس کے گھر میں اماں اور بہنوں کے ساتھ شبو یا اس جیسی لڑکی کا گزارہ ہو سکتا تھا مگر رامین۔۔۔ اس کی ایک الگ دنیا' الگ ماحول تھا۔ اس نازک اور شاداب پھول کے لیے یہاں کا موسم موافق تھا نہ آب و ہوا' وہ تر و تازہ پھول مرجھا جاتا' ختم ہو جاتا' اس نے رامین کو چھوڑ دیا اس لیے کہ اس نے رامین سے محبت کی تھی' بے تحاشا یا شدید طوفانی قسم کی محبت تو نہیں تھی۔ مگر اتنی ضرور تھی کہ وہ رامین کے لیے اچھا سوچتا' اس نے جو بہت ساری خوشیاں' ذہنی سکون اور اچھی زندگی رامین کے لیے سوچی' اس میں خود اس کا اپنا گزر اور ذکر کہیں نہیں تھا۔ بس اس نے قربانی دے دی۔ اپنے خواب اور خواہشات ایک طرف کر کے وہ رامین کی خوشیوں کے حصول کے لیے جت گیا۔

وہ "میچ میکر" تھا' لوگوں کو' رشتوں کو آپس میں جوڑنے والا' وہ توڑنے کا کام نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے قربانی دی تھی اور بے غرضی سے دی جانے والی قربانی مقبول ہوتی ہے آنے والی خوشیوں اور اچھے وقت کی تمہید ہوتی ہے۔ جو تازہ تازہ چوٹ لگی تھی' وہ ایک دن پرانی ہو جائے گی۔ زخم بھر جائے گا' اس نے خود کو سنبھال لیا تھا' سمجھا لیا تھا' زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے' محبت ہو جاتی ہے۔ مگر ملتی نہیں ہے۔

وہ اب پہلے والا اسلم بن گیا سب کے لیے۔ مگر کبھی کبھی رات کی تنہائی میں وہ ضرور سوچتا تھا' ہم کیوں ملے جب ہمیں ملنا نہیں تھا۔

سلویٰ علی بٹ

مشین کی گھرر گھرر کی خاموش فضا میں چند لمحوں کا ارتعاش بھرتی اور رک جاتی۔ نائلہ کندھے جھکائے بڑی نفاست اور مہارت سے قمیص کا گلا بنا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اتنی صفائی اور ہنرمندی تھی کہ کسی بوتیک کے ماہر ہاتھوں کا یقین ہوتا۔

دن کے بارہ بج گئے تھے اور یہ اس کا دوسرا سوٹ تھا۔ مزید سلنے والے کپڑوں کی چھوٹی سی ڈھیری باقی تھی جو اسے ہر صورت کل تک نپٹانی تھی۔ اس کے کندھوں میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں لیکن وہ ڈھیٹ بنی اپنی ساری توجہ قمیص پہ لگائے ہوئے تھی۔

"بھابھی جی! اب مزید سلائی تمہیں پکڑنی۔ اماں بری لینے گئی ہیں اور ہمارے اپنے گھر والوں کے کپڑے بھی ہیں۔ آج کا روز نکال کے پندرہ دن رہ گئے ہیں شادی میں۔"

نائلہ کی نند مدیحہ اس کی چھوٹی بیٹی کو اٹھائے باہر آئی تھی۔ وہ بات کرتے ہوئے صحن میں بنے کھرے کی طرف بڑھ گئی۔

"میں نے بھی یہی سوچا ہے۔ فریحہ اسکول سے آکر شام کا کھانا بنالے گی۔ تم مہربانی کر کے قمیصوں پہ بٹن ٹانک دینا، میری کوشش ہے کہ کل تک یہ بکھیڑا سمٹ جائے۔" اس کا اشارہ کپڑوں کی ڈھیری کی طرف تھا۔

"لگادوں گی بٹن۔ بلکہ شلواریں بھی میں سی دوں گی۔ آپ کل جاکے مونا بھابھی کا ناپ لے آئیں۔ کل بھی وہ فون پر آپ کی آمد کے متعلق پوچھ رہی تھیں۔"

مدیحہ بھتیجی کا منہ تولیے سے پونچھ کر بھابھی قریب ٹھنڈے فرش پہ آبیٹھی۔

"اچھا ہوتا، امی جب تاریخ طے کرنے گئی تھیں تب ہی ان کا ناپ والا جوڑا لے آتیں۔"

گلا بن چکا تھا، نائلہ نے قمیص جھاڑ کر درست کی۔

وہ گھر کی بڑی بہو تھی۔ اس کے چھوٹے دیور کی شادی تھی اور شادی والے گھر کے سو بکھیڑے اس کے ذمے تھے۔ سب سے بڑی ذمہ داری دلہن کی بری، گھر والوں کے کپڑے اور ساتھ میں گاہکوں کا مسئلہ الگ سے تھا۔ وہ انہیں بارہا انکار کرتی مگر وہ بھی خفگی دکھاتے اور اپنا کپڑوں سے بھرا شاپر چھوڑ جاتے۔ وہ گھن چکر بنی ہلکان ہو کے رہ گئی تھی۔

"مونا بھابھی بضد تھیں کہ وہ آپ کو اپنا ناپ ڈیزائننگ سمجھائیں گی۔" مدیحہ نے پھر سے یاد دہانی کروائی۔

تب ہی مسرت اور واجد شاپروں سے لدے پھندے گھر میں داخل ہوئے۔ مدیحہ خوشی سے کھڑی ہو گئی، نادیہ کو وہیں بیٹھا شاپنگ بیگز پکڑنے بڑھی۔ نائلہ بھی اپنی اکڑی کمر کو سیدھا کرتے ساس کے لیے پانی کا جگ لینے اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼
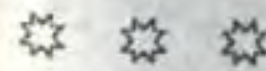
"بہتر ہوتا ماجد! اگر مدیحہ کی شادی بھی واجد کے ساتھ نپٹ جاتی۔ اس طرح ہمارا بہت سا خرچ بچ جاتا جو بعد میں خدیجہ کا جہیز بنانے کے کام آتا۔"

میٹرک پاس ماجد دونوں بڑے بچوں کو اسکول کا ہوم ورک کروا رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر چھوٹی بیٹی کو فیڈر پلاتی نائلہ کی بات بغور سنی۔

مدیحہ اپنے خالہ زاد سے منسوب تھی۔ جو دو سال سے دبئی میں مقیم تھا اور مزید سال بھر تک آنے کا ارادہ تھا۔ جبکہ واجد کی نسبت غیروں میں طے ہوئی تھی۔ منگنی ڈیڑھ سال رہی تھی اور وہ مزید ایک سال کا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔

"ہوں! واجد کے سسرال والے ہماری اتنی تاخیر پہ مشکوک ہونے لگے تھے۔ پھر میری کمیٹی بھی دس ماہ بعد ہی کھلنی ہے۔ جس سے مدیحہ کا فرنیچر بنوانا ہے۔ باقی رب مسبب الاسباب ہے، وہ خود ہی سب بہتر کردے گا۔ ہماری نیت بالکل صاف ہے۔" ماجد کا ہمیشہ والا پُر یقین انداز تھا۔

وہ اپنا ہر کام اپنے رب کی رضا میں راضی رہ کر کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے نقصان اور نفع کو انسانوں کی سمجھ بوجھ سے مشروط نہیں کرتا تھا۔

"واجد کی صرف دو ماہ کی کمیٹی باقی ہے، وہ ختم ہوجائے تو اسے کہیں کہ وہ بھی مدیحہ کے لیے کمیٹی ڈال لے، گزارا تو اچھا بھلا ہو ہی رہا ہے۔" نائلہ نے آگے کی منصوبہ بندی کی۔

وہ ایک متوسط گھرانہ تھا۔ زندگی کی بنیادی ضروریات سے ہٹ کر وہ خواہشات کو جوڑ توڑ کر کے پورا کرتے تھے۔ کفایت شعاری ان کا اوڑھنا بچھونا تھی اور اس میں زیادہ عمل دخل ماجد اور نائلہ کا تھا۔ اپنے باپ کے گزر جانے کے بعد وہ اپنی ماں کا سائبان اور چھوٹی بہنوں کا باپ بن گیا تھا۔ بیوی بھی اسے قدرت نے چن کر دی تھی۔ اس کے ہر دکھ میں برابر کی شریک۔ وہ اس کے خونی رشتوں میں ذرا برابر بھی فرق نہیں کرتی تھی۔

"بھیا۔" منہ بسورتی فریحہ اندر آئی۔ اس کے پیچھے مسرت بھی تھیں۔ ان کے چہروں سے لگ رہا تھا کہ فریحہ رو کے اور مسرت زچ ہو کے آئی ہیں۔

"کیا بات ہے فریحہ!" نائلہ اپنی بیٹی کو چادر اوڑھا کر اٹھ بیٹھی۔

ماجد بھی بہن کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"کچھ بھی نہیں، یوں ہی بچوں کی طرح ضد کیے جا رہی ہے۔" مسرت نے اسے خشمگیں نظروں سے گھورتے آنکھوں سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"کیوں روئی ہو فریحہ؟" ماجد نے اٹھ کر بہن کو

ساتھ لگالیا۔

وہ ماں کو اسے گھورتے دیکھ چکا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اب فریحہ منہ سے کچھ نہیں بولے گی۔ بھائی کا ساتھ لگاتا تھا کہ وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

"بھیا! نائنتھ کلاس ہمیں الوداعی پارٹی دے رہی ہے۔ میرا اسکول میں آخری سال ہے۔ میں کبھی کسی فن فیر یا فنکشن میں نہیں گئی، اس دفعہ ضرور جاؤں گی اور اماں مجھے منع کیے جارہی ہیں۔" اس نے روتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا۔

یہ سچ تھا، کیونکہ ان کی بجٹ اسکیم گھر کے بچوں کو یہ پارٹیز اٹینڈ کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتی تھی۔

"امی! فریحہ کا آخری سال اور آخری فنکشن ہے، آپ اسے جانے دیں۔"

بہن کے آنسوؤں پہ ماجد کا دل پسیج گیا تھا۔ بہنیں اس کے آنگن کی چڑیاں تھیں اور وہ اپنی بساط کے مطابق ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں پوری کردیا کرتا تھا۔

"بیٹا! گھر میں شادی ہے۔ اخراجات منہ کھولے کھڑے ہیں۔ سارا دن حساب کتاب لگا کے میں ادھ موئی ہوجاتی ہوں اور یہ فریحہ مزید پانچ سو مانگ رہی ہے۔ میرے پاس ان فضول خرچیوں کے لیے رقم نہیں۔" مسرت بھی بیٹی کی اس آخری خوشی کو رد نہیں کرنا چاہتی تھیں لیکن وہ مجبور تھیں۔

"امی ٹھیک کہتی ہیں فری! مہینے کا آخر چل رہا ہے، ورنہ میں تمہاری مدد ضرور کرتا۔ تم اس۔۔۔"

"مجھے نہیں پتا۔ نہ کبھی عید ملن پارٹی پہ گئی ہوں، نہ ہی مینا بازار۔ پچھلے سال میرے پاس کپڑے نہیں تھے۔ اب واجد بھائی کی شادی والے کپڑے سلوائے ہیں تو پیسے نہیں۔" وہ ماجد کے سینے سے لگی زاروزار رونے لگی تھی۔ مسرت شرمندگی اور رنجیدگی جیسے ملے جلے تاثرات لیے پریشان کھڑی تھیں۔

"دیکھو گڑیا! چپ کر جاؤ۔" ماجد بہن کو بچوں کی طرح پچکار رہا تھا۔

نائلہ نے دیکھا اس کا چہرہ مارے ضبط کے سرخ پڑ گیا تھا۔ اب یقیناً "اسے رات بھر نیند نہیں آنی تھی۔

"تم رؤو مت فری! میں تمہیں کل شام پانچ سو روپے دے دوں گی۔ تم پارٹی میں ضرور جانا۔" نائلہ کے دماغ نے بہت پھرتی سے جوڑ توڑ کرلیا تھا۔ اس نے روتی نند کو ماجد سے الگ کیا۔

"تمہارے پاس کدھر سے پیسے آئیں گے؟" مسرت بے یقین تھیں کہ کہیں وہ فریحہ کو بہلا تو نہیں رہی۔ وہ ان کی بہو سے بڑھ کر بیٹی تھی۔ جس نے ______ اپنی کمائی تک بھی سسرال سے چھپا کر نہیں رکھی تھی۔

"امی جی! صائمہ باجی کے بھائی کی پرسوں منگنی ہے۔ وہ مجھے اپنے اور بیٹی کے کپڑے سلائی کرنے کا کہہ رہی تھیں۔ میں نے کام کی زیادتی کی وجہ سے انکار کردیا تھا۔ اب صبح ان سے پوچھ کر کپڑے سلائی کردوں گی۔" دھیمے مزاج والی نائلہ نے مشکل حل کردی تھی۔

"آپ بہت اچھی ہیں بھابھی جان!" فریحہ مارے خوشی کے اس سے لپٹ گئی۔ مسرت نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ نائلہ نے ہاتھ اٹھا کر انہیں چپ کروادیا۔

"میں ابھی مدیحہ کو بتا کر آتی ہوں۔ وہ میرا کب سے مذاق بنا رہی تھی۔"

خوشی سے چہکتی فریحہ باہر دوڑی۔ مسرت بھی اس کے پیچھے ہی نکل گئیں۔

"جب تم میری بہنوں کا بالکل میری طرح خیال رکھتی ہو تو میں خود کو تمہارا مقروض سمجھنے لگتا ہوں۔" ماجد نے تشکر اور ممنونیت سے بھرپور لہجے میں کہتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

وہ اپنی بیوی پہ جتنا بھی فخر کرتا کم تھا۔ وہ ہمیشہ ہر جگہ اس کے لیے فخر کا باعث رہی تھی۔ جب سے وہ ماجد کی زندگی میں شامل ہوئی تھی، اس کے ہر مشکل وقت میں۔ اپنی ہنرمندی کے سہارے۔ اس کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی ہوجاتی۔ ماجد کو مالی مدد کی ضرورت ہو یا جذباتی تعاون کی، وہ اس کا بھرپور سہارا

تھی۔ اس عورت کے اخلاق و آداب کی وجہ سے وہ خاندان بھر میں رشک کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

واجد کی شادی بہت ہنگامہ اور خوشیاں لے کر آئی تھی۔ انہوں نے اپنی استطاعت کے مطابق ہر رسم پوری کی تھی۔ واجد بہت خوش تھا کہ ماں اور بڑے بھائی نے اس کا ہر چاؤ پورا کیا تھا اور ماجد خدا کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتا تھا کہ سب کام بخیر و خوبی انجام پا گیا تھا۔

مونا خوب صورت اور طرح دار لڑکی تھی۔ فریحہ اور مدیحہ اس سے زیادہ بولنے سے جھجکتی تھیں۔

صبح کا ناشتا بنانے کی ذمہ داری نائلہ کی تھی۔ اس کے ہاتھ کے نرم اور خستہ پراٹھے سب گھر والے بڑی رغبت سے کھاتے تھے۔ ناشتا بنا کے وہ برتن دھوتی اور کچن صاف کرکے اپنا کمرا بھی صاف کرتی۔ باقی دن وہ مشین کی مشقت میں جتی رہتی۔

"پلیز واجد! مجھے بسکٹس لادیں۔ میرا دل کچھ ہلکا پھلکا کھانے کو چاہ رہا ہے۔"

شادی کے اوائل دن تھے۔ مونا اکثر بڑی ادا سے شوہر سے کوئی نہ کوئی فرمائش کرتی پائی جاتی۔ نائلہ کو اس کا شوہر کے ساتھ بچی کی طرح بن بن کے بولنا بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔

واجد اثبات میں سر ہلاتا آخری لقمہ منہ میں ڈال کر رومال سے ہاتھ پونچھتا اٹھ کھڑا ہوا۔

تھوڑی دیر میں واجد مونا کو بسکٹس پکڑا کر آفس چلا گیا فریحہ بچوں کو لیے اسکول کے لیے نکل گئی۔ اب وہ سب بیٹھ کر ناشتا کرنے لگیں۔ مونا نے بسکٹس کا آدھا پیکٹ چائے میں ڈبو کر کھایا، باقی کا پیکٹ ہاتھ میں دبائے وہاں سے اٹھ گئی۔

وہ تینوں مونا کی اس حرکت پہ حیران و ششدر رہ گئیں۔ ان کے گھر کے اطوار طور ا ایسے تو نہیں تھے۔ وہ ہمیشہ مل بانٹ کر کھانے کے عادی تھے۔ چاہے وہ مقدار میں کتنا ہی کم کیوں نہ ہو۔ مونا کی شادی کو سترہ روز ہوگئے تھے، بھلا انہوں نے کب اس سے کچھ چھپا کر کھایا تھا۔

نائلہ نے دبے الفاظ میں ساس کو مونا کی اس پہلی حرکت پہ ہی سرزنش کرنے کو کہا۔ مسرت صرف سر ہلا کے رہ گئیں۔ وہ ساس تھیں۔ ان کی دور اندیشی نے مونا کی فطرت بھانپ لی تھی۔ وہ اتنی جلدی اسے روک ٹوک کرکے گھر میں کوئی بدمزگی پیدا نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

شادی کے بیس روز بعد مونا کا کھیر میں ہاتھ ڈلوادیا گیا۔ ورنہ وہ خود یہ دلہناپا طاری کیے ہل کے پانی پینے کی بھی محتاج تھی۔ اگلے روز اس نے طوہاً "کرہاً" گھر کے کاموں میں حصہ لینا شروع کردیا۔ وہ سب مل بانٹ کر کام کرتی آئی تھیں۔ مسرت بھی خود کو ہر وقت چھوٹے موٹے کاموں میں مشغول رکھتیں۔ فریحہ ابھی چھوٹی تھی، لیکن وہ اسکول سے آکر بیشتر کام نپٹا دیتی۔

"مونا بیٹی! ڈیڑھ بج گیا ہے، بچے اسکول سے آنے والے ہیں، تم روٹی ڈال لو۔" مسرت شام کے لیے سبزی چھیل رہی تھیں۔ انہوں نے دوسری چارپائی پہ لیٹی رسالہ پڑھتی مونا سے کہا۔

"جی۔۔۔" اس نے ناگواری سے منہ سے رسالہ ہٹایا۔

"بیٹی! مدیحہ کے سر میں درد ہے اور نائلہ نے شام کو لازمی کپڑے واپس کرنے ہیں۔" مسرت نے بہت نرمی سے اسے بتایا۔

"مدیحہ سے کہیے کہ ڈسپرین کے ساتھ چائے کا کپ پی لے۔ درد میں افاقہ ہوگا اور نائلہ ضروری کپڑے کل بھی واپس کرسکتی ہیں۔ سارے گھر کی صفائی کرکے خود میری کمر بھی دکھ رہی ہے۔" مونا نے ساس کا لحاظ رکھے بغیر صفا چٹ انکار کردیا۔

مسرت کا بہو کی اس زبان درازی پہ منہ کھلا رہ گیا۔ نائلہ نے مشین پہ جھکا اور مدیحہ نے تکیہ پر رکھا دکھتا سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ کسی سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

نائلہ نے ایک، دوبار ساس سے شکوہ کیا، لیکن جواباً "مسرت کی خاموشی نے اسے بھی چپ کروادیا۔ نائلہ بڑی بہو تھی۔ واجد اس کے اخلاق اور سمجھ داری

کا قائل تھا۔ بارہا اس کا جی چاہا کہ وہ واجد کو موناکی بدتمیزیاں بتائے لیکن وہ واجد کا بیوی کے لیے اتاؤلا پن دیکھ کر کچھ نہ کہہ سکی' خود وہ مونا سے الجھنا نہیں چاہتی تھی۔ جو ساس کی شرم نہیں کرتی تھی' اسے بھی پل بھر میں دو ٹکے کا کر سکتی تھی۔ نائلہ کو اپنی عزت بہت عزیز تھی۔

☼ ☼ ☼

"دادو! میرے اسکول کے جوتے ٹوٹ گئے ہیں' اب نئے لا دیں' ورنہ بچے میرا مذاق بنائیں گے۔" فریحہ کے اسکول کا ہوم ورک کرتے اشعر نے یاد آنے پہ مسرت سے کہا۔

شادی کی وجہ سے گھر کے حالات بہت ٹائٹ ہو گئے تھے ورنہ نائلہ اپنے بچوں کی اکثر ضروریات خود ہی پوری کر دیا کرتی تھی۔ اب وہ سلائی کے پیسے ساس کو دے دیتی' مل ملا کے گھر کا روزمرہ کا خرچ نکلتا جا رہا تھا۔ واجد کی آدھی تنخواہ قرضے اور کمیٹی کی مد میں کھپ جاتی تھی۔

"اچھا میرے بچے! اس ماہ تمہیں ضرور بوٹ دلوا دوں گی۔ تم میرے......"

"امی! میں اور مونا ذرا باہر جا رہے ہیں' جلدی آجائیں گے۔" واجد کا انداز مبہم سا تھا۔ مسرت کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ واجد ابھی دس منٹ قبل ہی آفس سے لوٹا تھا۔ اب پھر کہیں جانے کی اجازت مانگ رہا تھا۔

"بیٹا! ابھی تو آئے ہو' چائے پی لو' پھر چلے جانا۔" مسرت بیٹے کی بات پہ ذرا کی ذرا چونکیں' بیٹے نے صرف باہر جانے کا پوچھا تھا۔ یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں اور کس لیے جا رہا ہے۔ واجد کوئی بچہ نہیں تھا۔ اپنے بڑے بھائی اور بھابھی کی دس سالہ زندگی کے رنگ ڈھنگ اس کے سامنے تھے۔

"اچھا جاؤ۔" وہ اتنا ہی کہہ سکیں۔

وہ سوال و جواب کر کے بیٹے کو خود سے بدظن نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ جوان بیٹے میں اتنا ادب تو باقی تھا کہ جاتے ہوئے ماں سے اجازت لینے آگیا تھا' ان کے لیے یہی کافی تھا۔

نائلہ کو اب ساس کی مونا کے معاملے میں روز بروز بڑھتی خاموشی کھلنے لگی تھی۔ اس نے دبے لفظوں میں ساس کا دھیان مونا کی بدسلیقگی اور زبان درازی کی طرف دلایا تھا لیکن نتیجہ صفر۔

"دادو! ہماری فیس۔" چھوٹا اشعر اسکول یونیفارم میں تیار کھڑا تھا۔

"واجد! تمہیں تنخواہ نہیں ملی؟" مسرت نے ناشتا کرتے واجد سے پوچھا۔

کل تو وہ آفس سے آکر جلد ہی بیوی کو لیے باہر نکل گیا تھا اور پھر رات گئے لوٹا تھا۔

"جی امی۔" اس نے جیب میں سے ہزار' ہزار کے پانچ نوٹ نکال کر ماں کو تھما دیے۔

"صرف پانچ ہزار؟" پیسے گن کر وہ حیرت زدہ رہ گئیں۔ تنخواہ میں سے پورے پانچ ہزار کم تھے۔ نوالہ توڑتے ماجد کا ہاتھ بھی رک گیا۔

"امی! تین ہزار کے مونا نے دو گرم سوٹ خرید لیے اور دو ہزار اس نے اپنا ماہانہ جیب خرچ رکھ لیا ہے۔" واجد نے ذرا سا ہچکچاتے ہوئے بات مکمل کر دی۔

سب کا دھیان پیڑھی پہ بیٹھی مونا کی طرف گیا' جو بے نیاز نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مسرت کو بہت رنج ہوا تھا کہ بیٹے نے بالا بالا ہی سب کچھ طے کر لیا۔ کل ماں سے اجازت لیتے ہوئے تنخواہ اور شاپنگ کا ذکر تک نہیں کیا اور خود ہی جیب خرچ بھی لگا دیا۔ حالانکہ یہ ان دونوں کاموں کا مناسب وقت نہیں تھا۔ ابھی انہوں نے قرض دینا تھا اور شادی میں ہر طرح کے ہی کپڑے موجود تھے۔

بہرحال وہ پھر چپ ہی رہیں۔ صبح سویرے کا وقت تھا۔ بیٹے روزی روٹی کے لیے نکلنے والے تھے۔ وہ کوئی بحث نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن وہ دل میں مونا کو پیار سے سمجھانے کا ارادہ باندھ چکی تھیں۔

☼ ☼ ☼

جب مونا صفائی وغیرہ سے فارغ ہو گئی' تب مسرت نے اسے اپنے پاس بلایا۔

"مونا! ادھر میرے پاس بیٹھو' مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" انہوں نے نرمی سے اس کا بازو پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

"دیکھو بیٹا! میں ایک ماں ہونے کے ناتے تمہیں سمجھا رہی ہوں۔ میری باتوں کا برا نہ ماننا۔ ان لڑکیوں کی معاشرے اور عزیز و اقارب میں عزت ہوتی ہے جو اپنے سسرال والوں سے بنا کے رکھتی ہیں' پھر بیٹا اکٹھے رہنے میں بڑی برکت ہے۔ انسان بہت کچھ سیکھتا ہے۔ صبر و برداشت اور فراخ دلی پیدا ہوتی ہے۔ امن اور محبت بڑھتی ہے۔ میں واجد کی طرح تمہاری بھی ماں ہوں۔ اگر تمہیں پیسوں یا جیب خرچ کی ضرورت تھی تو تم مجھ سے مانگتیں۔ میں تمہیں انکار نہ کرتی۔ اس طرح تمہارا ابھی بھرم رہ جاتا اور میرے دل میں بھی تمہاری عزت بڑھ جاتی۔"

مسرت کا دھیان نائلہ پر گیا تھا۔ اس نے ہونٹوں پہ انگلی دھر کے ساس کو خاموش ہو جانے کا اشارہ دیا۔ مونا غیر مرئی نقطے پر نگاہیں جمائے پتھریلے تاثرات لیے بیٹھی تھی۔ نائلہ کو کسی انہونی کا خدشہ لگ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

نائلہ کے دل میں چھری سی گڑ گئی تھی۔ کئی روز سے اس کی طبیعت بوجھل اور وہ بجھی بجھی سی تھی۔ اس کے پاس کوئی ٹھوس وجہ تو نہیں تھی۔ وہ کھنچی کھنچی سی رہتی۔ منفی خیالات اس کے دماغ میں گردش کرتے رہتے۔ وہ جتنا جھٹلاتی' وہ اور زور آور ہو کے حملہ کرتے۔

اپنی شادی کے ڈیڑھ ماہ بعد ہی اس نے سلائی شروع کر دی تھی۔ اس نے کبھی اپنی ذاتی محنت کے روپے ساس' نندوں سے چھپا کر نہیں رکھے تھے۔ اس نے ماجد سے کبھی ماہانہ خرچ نہ مانگا' بلکہ وہ اپنی نندوں کو جیب خرچ دلایا کرتی تھی۔ ماجد اپنی خوشی سے اس کے لیے کبھی کبھار سوئٹر' شال یا کھانے کو کچھ لے آتا۔ وہ اتنے میں ہی راضی ہو جاتی' بچوں کے اسکول تک کے اخراجات اس نے بخوبی اٹھا رکھے تھے۔ اب مونا کی حرکات اسے شش و پنج میں ڈال دیتی تھیں۔ بچے سو گئے تھے۔ کل ویک اینڈ تھا۔ ماجد کوئی اسلامی کتاب کھولے بیٹھا تھا۔

"ماجد! آپ واجد کو سمجھائیں۔ مونا کی حرکات بہت ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہیں۔ گھر میں ایک عجیب سی بے سکونی پھیلی ہوئی ہے۔ سارا نظام تلپٹ ہوتا جا رہا ہے۔" اس نے ماجد کو ہی اس معاملات میں ڈالنا چاہا۔

اس نے کتاب بند کر کے اس کی طرف توجہ دی۔

"میں سب دیکھ رہا ہوں نائلہ! میرے خیال میں یہ تم عورتوں کا گھریلو نوعیت کا مسئلہ ہے' تم لوگ بھی عقل مندی سے سنبھالو تو بہتر ہو گا۔" پرسوچ انداز میں سر ہلاتے۔ اس نے نائلہ کو مشورہ دیا۔

وہ سب دیکھ اور سمجھ رہا تھا۔ مسرت نے بھی ماجد سے یہ مسئلہ شیئر کیا تھا۔ اس نے ہی ماں کو مونا کو پیار سے سمجھانے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ دو ہی بھائی تھے۔ وہ بھانپ گیا تھا کہ اس عورت کی نیت مل بیٹھ کے کھانے والی نہیں ہے' پھر واجد بھی بیوی کی محبت کے زیر اثر تھا۔ اسے صحیح اور غلط کی تمیز سکھانا فی الحال ایک مشکل امر تھا۔

☼ ☼ ☼

مونا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ صبح سے اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ مسرت دو بار اس کے کمرے میں پوچھنے گئیں لیکن اس نے خاصی رکھائی سے جواب دے کر' انہیں ٹال دیا۔ اس روز کے بعد اس کے تیور بہت اکھڑے اکھڑے سے تھے۔ اپنا کام کاج نمٹا کے وہ اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔

شام کو جب واجد گھر لوٹا تو مونا کو زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے انہیں خوش خبری سنائی تھی۔ واجد بے حد خوش لوٹا تھا۔ مسرت نے سنا تو مونا کا صدقہ دیا۔ واجد اپنے اور مونا کے کھانے کی ٹرے کمرے میں

ہی لے گیا۔
"اٹھو شاباش مونا! کھانا کھالو۔" واجد بڑی لگاوٹ اور اپنائیت سے پکار رہا تھا۔
"نہیں واجد پلیز! میرا جی متلا رہا ہے۔ میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔" اس کی آواز نقاہت زدہ تھی۔
"ضد مت کرو۔ تم صبح سے بھوکی ہو۔ ڈاکٹر نے ویک نیس بتائی ہے۔ بھوک تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ تھوڑا سا کھالو یا کچھ پھر اور لا دیتا ہوں۔ کیا کھانے کو دل چاہ رہا ہے؟" وہ بڑی نرمی سے اس کے بال سہلانے لگا تھا۔
مونا چہرے پہ بازو رکھ کے رونے لگی۔ واجد کے ہاتھ پیر پھول گئے۔
"کیا ہوا چندا! کیوں رو رہی ہو؟" اس نے زبردستی اس کا بازو ہٹایا۔
وہ نفی میں سر ہلاتے مسلسل روئے جا رہی تھی۔ اس کی طبیعت بہت بوجھل ہو رہی تھی۔
"واجد! آپ مجھے... مجھے امی کے گھر چھوڑ آئیں۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
"او کے! میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔ پہلے بتاؤ، ہوا کیا ہے۔ کسی نے کچھ کہا ہے؟"
"واجد! وہ امی نے مجھے..." پھر وہ ایک ایک کر کے ساس کی کل والی ساری باتیں اپنی ذہنیت کے مطابق بتاتی چلی گئی۔
واجد نے اس کے ہر کہے پہ من و عن یقین کر لیا تھا۔
"ٹھیک ہے، تم پیکنگ کر لو، کل آفس جاتے ہوئے میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

☆ ☆ ☆

اگلی صبح ماجد دکان تک سودا لینے گیا تھا۔ مسرت باتھ روم میں تھیں۔ باقی وہ سب کچن میں تھے۔ واجد نے بائیک باہر نکالی اور اندر آ کے مونا کے کپڑوں کا بیگ اٹھایا اور مونا کو لیے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اچانک نائلہ کی نظر پڑ گئی۔
"واجد... کہاں جا رہے ہو؟" اس نے چولہے کے پاس سے اٹھتے ہوئے آواز دی مگر تب تک وہ دونوں باہر نکل چکے تھے۔
ماجد نے چھوٹے بھائی کو کال کی۔ بیل جاتی رہی، اس نے فون ہی اٹینڈ نہ کیا۔
مسرت شام تک پریشان رہیں۔ باقی گھر والے مغموم و پریشان۔
واجد شام کو لوٹا۔ ماتھے پہ بل ڈالے، چہرے پہ بے گانگی سجائے، ماں کو سلام کیے بغیر ناک کی سیدھ میں چلتا اپنے کمرے کی طرف چلا۔
"واجد بیٹا! میری بات تو سنو۔" ماں کے لہجے میں التجا تھی۔ اسے رکنا پڑا۔
"مونا کو میکے کیوں چھوڑ کر آئے ہو؟" ماں کے اس بھولپن نے واجد کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔
"یہ تو مجھے آپ سے پوچھنا ہے کہ میری بیوی کی اس گھر میں کوئی جگہ ہے کہ نہیں۔" مسرت حق دق رہ گئیں۔ بیٹوں نے بیوہ ماں سے کب ایسی جرأت کی تھی۔
"تم امی سے کس لہجے میں بات کر رہے ہو واجد!" نائلہ نے ساس کی حالت کے پیش نظر اسے ٹوکا تھا۔ "اسی انداز میں کر رہا ہوں، جو آپ سب میرے پیچھے میری بیوی کے ساتھ رکھتے ہیں۔ کیا بگاڑا ہے اس بے چاری نے آپ کا، اسے آپ خود اپنے ہاتھوں سے عزت کے ساتھ بیاہ کر لائی ہیں۔ وہ بھاگ کر نہیں آئی میرے ساتھ۔ میری کمائی سے اس نے دو سوٹ کیا خرید لیے، آپ نے اس کا جینا حرام کر دیا ہے۔ آپ کو اپنی بیٹیوں کے حقوق بہت یاد رہتے ہیں۔ کیا اس کا میری کمائی پر کوئی حق نہیں تھا؟" وہ غصے سے لال سرخ ہوتا اول فول بولتا جا رہا تھا۔ بیٹے کی اس بے رحمی اور بے اعتنائی پہ مسرت کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ فریحہ اور مدیحہ کی آنکھیں بھی نمناک تھیں۔
"اب آپ رو کے مجھے اپنی صفائیاں دیں۔ وہ بھی یونہی روتی ہے۔" ماں کے رونے سے وہ کچھ دھیما

پڑ گیا۔

وہ کانوں کا کچا تھا۔ بڑے بیٹے کی طرح مضبوط قوت ارادی کا مالک نہیں تھا۔ اسے معاملات کو صحیح ڈگر پہ ڈالنے کی اہلیت نہیں تھی۔ وہ ماں تھیں۔ اپنی تربیت پر بھروسا کیے ہوئے تھیں۔ اتنی مشکلوں سے تو انہوں نے اپنے گھر کے آنگن کو آباد کیا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اس ہنستے کھیلتے آنگن کو کیسے اجاڑ سکتی تھیں۔

"واحد! تم کل مجھے اپنے سسرال لے جانا میں مونا کو منا کر گھر لے آؤں گی۔"

ان کے دل پہ منوں بوجھ آگرا تھا۔ وہ ماں تھیں اور ماں کا دل اور حوصلہ اولاد کے لیے بہت وسیع ہوتا ہے۔ انہیں بھی اپنے اسی حوصلے کو آزمانا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز ہی مونا بڑے دھڑلے سے واپس آگئی تھی۔ اب کے اس کے ناز نخرے آسمان کو چھو رہے تھے۔ ماں بننے کا زعم سونے پہ سہاگہ تھا۔ وہ صبح اپنی مرضی سے سو کر اٹھتی۔ گھر کے دو چار کام نمٹاتی اور کمرا نشین ہو جاتی۔ مسرت تو اس سے بالکل لاتعلق سی ہو گئی تھیں۔ انہوں نے اس کے کسی بھی کام میں دلچسپی لینا ترک کر دی تھی۔ فریحہ نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ گھریلو حالات کے پیش نظر اس نے ایف۔ اے پرائیویٹ کرنے کا ارادہ کیا۔ اب وہ اور مدیحہ دن بھر کاموں میں مصروف رہتیں۔ اس نئی صورت حال کا نائلہ پہ بہت برا اثر پڑا تھا۔ اس نے جلنے کڑھنے کے بجائے دوسرا رستہ اختیار کر لیا تھا۔ ماجد کاپی اور کلکولیٹر لیے کسی حساب کتاب میں مشغول تھا۔ نائلہ روٹی پکا کر اندر آئی اور ایک دروازہ تھوڑا سا بھیڑ دیا۔

الماری کھول کر اس نے کپڑوں کے نیچے سے ایک چھوٹا سا پرس نکالا اور الٹ دیا۔ سو، پچاس کے کئی نوٹ اس کی گود میں آگرے۔ وہ ان نوٹوں کو کھول کھول کے ان کی تہیں درست کرنے لگی۔ واجد عینک کے اوپر سے اسے یہ سب کرتا دیکھ رہا تھا۔

"پورے ساڑھے سینتیس سو جمع کیے ہیں میں نے۔" پیسے گن کے اس نے فخریہ بتایا۔ اس کے چہرے پہ ایک الوہی سی چمک تھی۔

"کیا کرو گی ان کا؟" واجد نے یونہی برائے بات پوچھ لیا۔

"کیا مطلب! اپنے اور اپنی اولاد کے لیے سنبھال کر رکھوں گی۔" نائلہ نے شوہر کی بات کا خاصا برا مانا تھا۔

ماجد اسے کوئی جواب دیتا کہ مسرت اندر آگئیں۔ نائلہ نے پھرتی سے پرس ٹانگ کے نیچے چھپا لیا۔ واجد نے بڑی حیرانی سے بیوی کی یہ حرکت نوٹ کی۔

"جی امی۔" وہ بمشکل خود کو ماں کی طرف متوجہ کر پایا۔

"نائلہ بیٹی! تمہارے پاس تین سو روپے ہوں گے۔ آٹے کا تھیلا منگوانا تھا۔"

مسرت یونہی بلا جھجک اس سے مانگ لیا کرتی تھیں۔ وہ بھی کبھی انکار نہیں کرتی تھی۔ اکثر وہ بن مانگے ہی تھما دیتی تھی۔

"نہیں امی جی! مجھے ابھی سلائی کے پیسے نہیں ملے۔" نائلہ نے کن انکھیوں سے شوہر کو دیکھتے ہوئے گڑبڑا کے جواب دیا۔

"اچھا۔۔۔" مسرت کے چہرے پہ پریشانی بڑھ گئی۔

اس ماہ واجد نے اکٹھے پانچ ہزار رقم دے کر سارا بجٹ درہم برہم کر دیا تھا۔ یہ مہینہ انہوں نے گھسیٹ گھسیٹ کر گزارا تھا۔ اب ان کے پاس صرف نو سو روپے پڑے تھے۔ اگر آٹے کا تھیلا منگوا لیتیں تو سبزی، دودھ کا خرچ کیسے پورا ہوتا جبکہ تنخواہیں ملنے میں ابھی تین روز باقی تھے۔

"امی۔۔۔ آپ مجھ سے لے لیں۔ میں آفس سے کسی سے ادھار لے لوں گا۔ یہ لیں۔" ماجد نے جیب میں ہاتھ ڈال کے کل تین سو پچھتر روپے نکالے۔ تین سو ماں کو دے کر باقی جیب میں ڈال لیے۔ مسرت پیسے لے کر چلی گئیں۔

"یہ آپ نے کیا کیا؟" نائلہ بھنویں اچکائے شوہر سے استفسار کر رہی تھی۔

"بے فکر رہو، تم سے نہیں ادھار مانگوں گا۔" اس نے گود میں دھری کتاب سائیڈ پہ ڈال دی۔ اس کے لہجے میں اتنی سختی اور روکھا پن تھا کہ نائلہ اپنی جگہ دنگ رہ گئی۔ شادی کو دس سال ہو گئے۔ ماجد نے کبھی اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔

"آپ ایسے کیوں پیش آ رہے ہیں، اس لیے کہ میں نے امی کو انکار کیا ہے؟" وہ مشکوک ہو رہی تھی۔

"اس لیے کہ تم نے ان سے جھوٹ بولا۔" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"ہاں تو ٹھیک ہے، دن بھر محنت کر کے کماتی ہوں۔ کمر میری اکڑ کے تختہ بن جاتی ہے اور وہ مونا بیگم خالی پلنگ توڑنے کے دو ہزار وصول کرتی ہیں۔ امی اس سے جا کر مانگ لیں اور۔۔۔ آپ کو تو دس سالوں میں اتنی بھی توفیق نہ ہوئی کہ ماہانہ دو سو ہی میری ہتھیلی پہ رکھ دیں۔ اپنی کمائی تو میں اپنی مرضی سے خرچ کر سکتی ہوں ناں۔"

وہ بغیر تولے بولتی جا رہی تھی۔ ماجد کے دل پہ ایک دم ایک بوجھ سا گر گیا تھا۔ وہ اس عورت کو سمجھنے کا دعوے دار تھا۔ وہ اتنی بدگمان ہو گئی اور اسے پتا بھی نہ چل سکا۔

"سیانے سچ کہتے ہیں کہ ایک مچھلی سارا تالاب گندا کر دیتی ہے۔" ماجد نے سانس کھینچ کر لمبا توقف کیا۔

"تم ہی کہتی ہو کہ اگر امی نے مونا کو تب ڈانٹا ہوتا جب اس نے بسکٹ ہتھیلی میں دبائے تھے تو وہ اتنا آگے نہ بڑھتی۔ آج میں نے تمہیں نہ روکا تو تم بھی مونا کی راہ پہ چل نکلو گی۔ تم دیورانی کی ضد میں، اس کی برابری کرو گی تو امی جیسے اس کی بار خاموش ہوئی تھیں، تمہیں بھی کچھ نہ کہہ پائیں گی۔ تمہاری انا اور خود پسندی کو تقویت ملے گی لیکن تم نے اپنے اس رد عمل کے نقصانات پہ غور کیا ہے۔ تمہارے اپنے میکے اور سسرال میں دس سال قربانیاں دے کر بنائی گئی عزت دو کوڑی کی ہو جائے گی۔ واجد کی اور میری ایک الگ شخصیت ہے۔ ایک الگ کردار ہے۔ اس نے زن مریدی قبول کر لی۔ لیکن اگر تم ایسا کرو گی تو اپنا مقام کھو دو گی۔ میں نے تمہیں کبھی جیب خرچ نہیں دیا تو جتنا تم کماتی ہو، اس پہ بھی کبھی قبضہ نہیں کیا۔ تم اپنی مرضی اور خوشی سے میری بہنوں کو دو یا اپنے بہن بھائیوں کے بچوں پہ خرچ کرو، میں نے کبھی نہیں پوچھا۔ میری بہنیں یتیم ہیں، آخرت میں میرے لیے نجات کا ذریعہ ہیں۔ تم اپنے اعمال کی خود ذمہ دار ہو، میں زبردستی تم پہ کوئی روک ٹوک نہیں لگاؤں گا لیکن۔۔۔ اس سب کے بعد تمہارے لیے میرے دل میں کہیں بھی جگہ نہیں بچے گی۔" اس کی سانس کے اتار چڑھاؤ نے اسے مزید نہ بولنے دیا۔

نائلہ کے دل میں آن واحد میں بہت کچھ ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ اس شخص کے کردار اور شخصیت کی وہ مداح تھی۔ وہ دنیا بھر کی نظروں میں گر جاتی، اس شخص کے سامنے ہمیشہ سرخرو رہنا چاہتی تھی۔ اس نے شوہر کی نگاہ میں اپنے لیے ہمیشہ عقیدت کا جذبہ پایا تھا۔ اب وہ اپنی سطحی سوچ کی وجہ سے اپنا مقام کھونے جا رہی تھی۔ یہ سودا بہت مہنگا تھا۔ خاص طور پر اس عورت کے لیے جو بے داغ کردار کے مالک انسان کے دل پہ بلا شرکت غیرے راج کرتی ہو۔

"مجھے معاف کر دیں ماجد۔۔۔ اللہ کے واسطے مجھے معاف کر دیں۔" وہ مٹھیاں بھینچے پھوٹ پھوٹ کے رو دی تھی۔ اس کی عقل پہ گرا پردہ ہٹ گیا۔

"میں قسم کھا کر وعدہ کرتی ہوں۔ دوبارہ ایسا نہیں سوچوں گی۔ میں اپنی اصلاح کروں گی۔ میں۔۔۔ میں امی سے بھی معافی مانگوں گی۔ اللہ بھی مجھے معاف کر دے گا۔ آپ پلیز مجھے۔۔۔" وہ زار و زار رونے لگی تھی۔

بچے نہ اٹھ جائیں یا کوئی باہر سے آوازیں سن کر نہ آ جائے۔ اسی خوف کے تحت ماجد نے اسے سینے میں بھینچ لیا۔

وہ بہت اعلا ظرف انسان تھا۔

نائلہ بھی بہت خوش نصیب تھی کہ اللہ نے اس کی پہلے ہی قدم پہ رہنمائی کر دی تھی۔ وہ بھٹکنے سے بچ گئی تھی۔ عورت کی وجہ سے ہی تو گھر جنت تھا اور ماجد نے اپنی جنت کا شیرازہ بکھرنے سے بچا لیا تھا۔

☼

صائمہ اکرم چوہدری

دیمک زدہ محبت

سکینہ جمیلہ مائی اور اللہ دتا کمہار کی اکلوتی بیٹی ہے، جو شادی کے سترہ سال بعد پیدا ہوئی اور چودہ برس کی عمر میں گردے پن کی بیماری میں مبتلا ہوگئی۔ پانچ سال لگاتار علاج کے بعد بیت المال والوں نے اسے سرکاری اسپتال میں پرائیویٹ کروا دیا۔ جہاں ڈاکٹر خاور اس کا مفت علاج کر رہے ہیں۔ عام سی شکل و صورت والی سکینہ ڈاکٹر خاور کو پسند کرنے لگی ہے۔ سکینہ کی آواز بہت خوب صورت ہے تاہم ڈاکٹر خاور اسے صرف اپنی پیشنٹ سمجھتے ہیں۔

ماہم منصور حسین ترین سائیکولوجسٹ ہے۔ اور اپنا ذاتی کلینک چلاتی ہے۔ رامس علی اس کا مریض ہے۔ ماہم بلا کی حسن پرست ہے۔ اس کی دوست عائشہ قدرے کم صورت ہے۔ عائشہ کا بھائی موحد رحیم، ماہم کو پسند کرتا ہے مگر ہوائی آپریشن میں اس کی دونوں ٹانگیں ضائع ہوجانے کے سبب ماہم اس سے کھنچ جاتی ہے۔ ماہم کی بڑی بہن ثمن، عائشہ کے کزن انصر کی بیوی ہے اور ڈیپنڈنٹ ہے۔

رامس علی اپنے نفسیاتی عارضے کی وجہ سے خودکشی کی کوشش کرتا ہے۔

لیکن بچ جاتا ہے۔ اس حادثے کے بعد رامس اور ماہم ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔

سکینہ کی خوب صورت آواز کی وجہ سے ڈاکٹر خاور اسے ایک نعت کمپٹیشن میں حصہ لینے کے لیے کہتے ہیں۔ ڈاکٹر خاور کی ساتھی ڈاکٹر زویا کو ان کا سکینہ پر مہربان ہونا ناگوار گزرتا ہے۔ سکینہ اور ڈاکٹر خاور کو ان کی ناپسندیدگی کا علم ہے۔ جمیلہ مائی وقتاً فوقتاً سکینہ کو سمجھاتی رہتی ہیں۔

ثنائلہ زبیر ایک مشہور مصنفہ ہے۔ اس کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنے فرضی کردار سکندر شاہ سے محبت میں مبتلا ہوگئی ہے۔ اسی سلسلے میں اس کی ملاقات ماہم سے ہوتی ہے۔

ناولٹ

"یار ایک دم فٹ اور لش سوٹ ہے یہ۔" ماہم نے ہاتھ میں پکڑا گہرے سبز رنگ کا فراک اپنے ساتھ لگا کر دیکھا۔ آئینے میں اس کا وجود اتنا حسین لگ رہا تھا کہ عائشہ کافی لمحوں تک اس پر سے ستائشی نظریں نہیں ہٹا سکی۔

"ماما' پاپا کی ویڈنگ اینی ورسری کے لیے یہ زبردست ہے' ہے ناں۔" ماہم کی پرشوق نظریں سوٹ پر جب کہ عائشہ کی اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ کل اس کے والدین نے اسلام آباد آرمی کلب میں سب کو ڈنر پر انوائٹ کیا تھا۔ اس کی تیاریوں نے ماہم کو بے حال کر رکھا تھا۔ وہ عائشہ کو لے کر زبردستی سینٹورس مال پر آگئی تھی۔

"یار! اس سوٹ کا میرون رنگ بھی شان دار ہے۔ یہ تم اپنے لیے کیوں نہیں لے لیتیں؟" ماہم نے اسی سوٹ کو عائشہ کے ساتھ لگا کر دیکھا تو وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔

"توبہ کرو ماہم! میں ایسے شوخ رنگ کب پہنتی ہوں۔" ماہم کا مشورہ اسے ایک آنکھ نہیں بھایا تھا اس لیے وہ عجلت میں بولی۔

"کیوں' شوخ رنگ تمہیں کاٹتے ہیں کیا؟" ماہم برہمی سے گویا ہوئی۔ "اگر رات کے فنکشن میں کوئی بوڑھی عورتوں والا کلر پہن کر آئیں تو گیٹ پر ہی عبرت کا نشان بنا دوں گی۔" ماہم نے انگلی اٹھا کر اسے دھمکی دی تو وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"یہ سرعام کس کو دھمکیاں دے رہی ہیں ماہم آپ۔۔۔" رامس اچانک ہی سامنے والی شاپ سے نکل کر ان کے پاس آیا تھا۔

"تو یہ چتا گر کہاں سے ٹپک پڑا۔۔۔" عائشہ کی بڑبڑاہٹ میں جھنجلاہٹ اور کوفت کے سب ہی رنگ تھے۔

"تھینک گاڈ! کوئی تو ینگ بندہ مجھے نظر آیا' ورنہ یہ عائشہ تو مجھے سخت بور کر رہی تھی' کہاں گھوم رہے ہو ہینڈسم۔۔۔؟" وہ ماہم کی بے تکلفی اور طوطا چشمی پر پہلو بدل کر رہ گئی۔

"بس' اگلے ہفتے سے نئی جاب جوائن کرنی ہے سوچا کچھ شاپنگ کر لی جائے۔" وہ عائشہ کو نظر انداز کرکے ماہم کو فدا ہو جانے والی نظروں سے دیکھنے میں محو تھا جو چاکلیٹ کلر کے سوٹ میں دمک رہی تھی۔ اسے یوں ٹکٹکی باندھے ماہم کو دیکھتے ہوئے عائشہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اٹھا کر نچلے فلور پر پھینک دے۔

"دیٹس گریٹ رامس۔۔۔!" ماہم نے کھلے دل سے اسے سراہا تو عائشہ کی پیشانی پر موجود شکنوں میں اضافہ ہو گیا۔

"یہ بتاؤ رامس! یہ سوٹ کیسا رہے گا؟" ماہم نے گہرے سبز رنگ کا فراک جس پر سرخ بنارسی پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس کے آگے کیا۔ جب کہ ماہم کی یہ حرکت عائشہ کو سخت زہر لگی تھی۔ اس لیے وہ سامنے لگے ہینگرز پر لٹکے سوٹوں کو زبردستی دیکھنے لگی۔

"واؤ۔۔۔! بہت خوب صورت ڈریس ہے یہ۔" رامس کی توصیفی نظریں سوٹ کو کم اور ماہم کو زیادہ دیکھ رہی تھیں۔

"بدتمیز' میرے ہاتھوں آج قتل ضرور ہو گی۔" عائشہ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا جو شعلہ جوالا بنی سامنے آئینے میں وہ سوٹ اپنے ساتھ لگا کر خود کو ہر زاویے سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی بعض دفعہ عائشہ کے صبر کا خوب امتحان لیتی تھی۔

"ڈریس اچھا ہے یا مجھ پر اچھا لگ رہا ہے؟"

"تمہاری خوب صورتی نے اس ڈریس کو زیادہ جاذب نظر بنا دیا ہے۔" اس کے ستائشی لہجے پر ماہم کھلکھلا کر ہنسی۔

"پھر شام کو آ رہے ہو ناں ڈنر پر۔۔۔؟" ماہم نے سوٹ کو اچھی طرح دیکھتے ہوئے رامس سے پوچھا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا ماہم کی کوفت بھری آواز عائشہ کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"اوہ مائی گاڈ! عائشہ دیکھو' اس کے دوپٹے میں تو سوراخ ہے۔" وہ سخت پریشانی سے عائشہ کی جانب مڑی۔

"کہاں۔۔۔" عائشہ نے جھک کر اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ وہ بہت چھوٹا سا سوراخ نہ جانے کیسے ماہم کو نظر آ گیا تھا۔

"آپ کے پاس اسی رنگ میں کوئی اور پیس ہے؟" بے تابی سے سیلز گرل کی طرف مڑی۔

"سوری میم! یہ مشہور ڈیزائنر کا سوٹ ہے اور اس کے صرف دو ہی سوٹ آئے تھے ہمارے پاس۔۔۔" سیلز گرل کے چہرے پر بڑی پروفیشنل سی مسکراہٹ تھی۔

"اوہ نو۔۔۔!" وہ سخت مایوس ہوئی جبکہ عائشہ کو تو یہ سوچ کے ہی ہول اٹھنے لگے کہ ماہم کے ساتھ ایک دفعہ پھر مختلف بوتیکس کی خاک چھاننی پڑے گی۔

"آپ چیک تو کریں۔" ماہم نے بے چینی سے کہا تو سیلز گرل اس کے بچکانہ انداز پر مسکرا دی۔

"سوری میم! مجھے اچھی طرح علم ہے۔ آپ ایسا کریں کہ اس کا میرون کلر لے لیں۔" اس نے ایک اور تجویز سامنے رکھی جو ماہم کو بالکل پسند نہیں آئی۔

"نو نیور! مجھے یہ ہی کلر اچھا لگا ہے' مجھے بس یہی لینا تھا۔" ماہم کے لہجے میں محسوس کی جانے والی ضد تھی۔

"ماہم! سوراخ بہت معمولی سا ہے' کسی کو بھی نظر نہیں آئے گا۔ اگر پسند ہے تو یہی ڈریس لے لیں۔" رامس کی بات پر ماہم کے چہرے پر ایک ناگوار سا تاثر بڑی سرعت سے پھیلا تھا۔

"بے شک یہ سوراخ کسی کو بھی نظر نہیں آئے گا لیکن مجھے تو پتا ہے ناں کہ اس میں نقص ہے' چاہے چھوٹا سا ہی سہی۔۔۔" ماہم کے عجیب سے انداز پر رامس حیران ہوا جبکہ عائشہ کو علم تھا کہ اب یہ سوٹ وہ مفت میں بھی نہیں لے گی۔

"لیکن یہ کوئی ایسا نقص تو نہیں' جس کے لیے اتنے اچھے سوٹ کو مسترد کیا جائے۔" رامس نے قدرے برا مانتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تمہارے لیے یہ خامی بڑی نہیں ہو گی۔" اس نے ناگواری سے ناک چڑھائی۔ "لیکن مجھے اپنی پسندیدہ چیز میں کوئی بھی کمی اچھی نہیں لگتی۔" ماہم کے انداز پر رامس کو جھٹکا لگا۔

☼ ☼ ☼
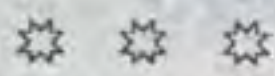
"تم جتنی خوب صورت ہو' اتنی ہی حیران کن بھی ہو۔" رات کو ڈنر پر وہ رامس کی بات پر دلکشی سے مسکرائی تھی۔ سیاہ ڈنر سوٹ میں وہ خود بھی اچھا خاصا ڈیشنگ لگ رہا تھا۔

"بس ایسی ہی ہوں۔" اس نے بڑی ادا سے اپنی راج ہنس جیسی گردن کو جھٹکا دیا۔

"تم تو رامس کو ایسے سب سے ملوا رہی ہو جیسے وہ تمہاری کوئی فخریہ پیشکش ہو۔" عائشہ کو کبھی کبھی ماہم کی حرکتیں سخت ناگوار گزرتی تھیں اور وہ اس کا اظہار بھی "فوراً" کر دیتی تھی۔

"مائی ڈیر! وہ یہاں سب کے لیے اجنبی ہے۔ اس لیے تعارف کروا رہی تھی۔ اب بھی موحد کے حوالے کر کے آئی ہوں۔" سرخ رنگ میں وہ آسمان سے اتری کوئی حور لگ رہی تھی۔ یہ سوٹ اس نے پورے مال کی بوتیکس چھان کر منتخب کیا تھا۔ آج اس نے خود کو سجانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رکھا تھا۔ آخر اس شہر کی ساری کریم اس فنکشن میں مدعو تھی۔

"تھینکس گاڈ! آج تم بھی انسانوں والے حلیے میں آئی ہو۔" ماہم نے ابھی ابھی اسے غور سے دیکھا تھا۔ رائل بلیو کلر کا سوٹ عائشہ پر جچ رہا تھا۔

"ہاں' آج ماما کے ہتھے چڑھ گئی تھی' اٹھا کر لے گئیں اپنے پارلر۔ پتا نہیں کیا کچھ میرے چہرے پر تھوپ دیا۔ سخت الجھن ہو رہی ہے۔" وہ بہت زیادہ کوفت کا شکار لگ رہی تھی۔

"آج ہی تو ڈھنگ کی لگ رہی ہو اور خبردار کوئی فضول بات کی تو۔" ماہم نے بے حد طنزیہ انداز میں اس کی بات قطع کی۔ وہ دونوں سوئمنگ پول کے کنارے پر رکھے صوفوں پر براجمان تھیں۔ بے تحاشا نیلی روشنیوں میں سامنے سفید ماربل کا سوئمنگ پول بڑا سحر انگیز لگ رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کسی نے پانی میں نیلا رنگ کھول دیا ہو۔

"آؤ، موحد کے پاس چلتے ہیں، کہیں رامس بور ہی نہ ہو رہا ہو۔" ماہم کے حواسوں پر آج ضرورت سے زیادہ رامس سوار تھا۔

"ارے یہاں تو لگتا ہے، مقابلہ، خاموشی منعقد ہو رہا ہے۔" وہ دونوں گھوم کر سوئمنگ پول کے دوسرے کنارے پر پہنچیں تو موحد کی وہیل چیئر کے سامنے والی کرسی پر براجمان رامس بے زاری سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ ماہم کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں چمکیں۔

"کہاں غائب ہو گئی تھیں تم۔" رامس کی بے تابی پر ماہم مسکرائی۔ عائشہ نے کن اکھیوں سے موحد کا سپاٹ چہرہ دیکھا۔ وہ اپنے سیل فون پر کوئی گیم کھیلنے میں مصروف تھا۔

"رامس! تم موحد سے ملے، یہ عائشہ کا بڑا بھائی ہے۔" ماہم کی بات پر رامس نے چونک کر اسے دیکھا جو لفٹ کروانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"جی! میری بات ہوئی ہے ان سے۔ ان کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی پر مجھے بہت افسوس ہے۔" رامس نے کچھ محتاط انداز سے تاسف کی رسم نبھائی۔

"لیکن میرے لیے یہ ٹریجڈی نہیں، بلکہ فخر کی بات ہے۔ میری تو خواہش تھی کہ میرا پورا جسم ہی وطن کی راہ میں قربان ہو جاتا۔" موحد کا انداز کچھ جتلاتا ہوا سا تھا اور حقیقت میں ایسا ہی تھا۔ اسے بس اپنوں کے بدلتے رویوں کا دکھ تھا۔ ماحول میں ایک اعصاب شکن سی بوجھل خاموشی نے جگہ بنالی۔

"آؤ رامس! میں تمہیں ثمن آپی سے ملواتی ہوں۔ دیکھنا میرا بھانجا کتنا کیوٹ ہے۔" موحد کی طنزیہ نظروں کی وجہ سے ماہم کے لیے وہاں بیٹھنا دشوار ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ بہانے سے وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تمہاری دوست کا بھائی کچھ عجیب سا نہیں ہے؟" فضا میں آرکسٹرا کی دھنوں کے باوجود عائشہ نے اس کا یہ جملہ پورے دھیان سے سنا تھا جو اس نے اپنی دانست میں قدرے آہستگی سے کہا تھا۔

وہ ماہم کا جواب نہیں سن سکی تھی۔ اس کی نظروں میں موحد کا دھواں دھواں سا چہرہ تھا۔ وہ کرب کی نہ جانے کن منزلوں سے گزر رہا تھا۔ ماہم اور رامس کا اکٹھے، ساتھ ساتھ چلتے دیکھنا اس کے لیے کتنا اذیت ناک تھا۔ عائشہ اس دکھ کا اندازہ بخوبی کر سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"سکینہ! یہ لے۔" جمیلہ مائی کو کمرے میں نہ پا کر جاجی "فوراً" ہی اندر گھس آیا تھا۔ آتے ہی اس نے ایک شاپر سکینہ کی طرف بڑھایا۔ وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جاجی دن بہ دن اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔

"یہ کیا ہے۔؟" سکینہ نے ابرو چڑھا کر اسے دیکھا۔

"کھول کر تو دیکھو، تمہارے لیے لایا ہوں۔" سکینہ کے سرد انداز کا بھی جاجی پر رتی برابر اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ ڈھٹائی سے کھڑا تھا۔

"کس خوشی میں۔۔۔؟"

"وہ تو نے ٹی وی پر جانا ہے ناں تو میں نے سوچا کر تیرے لیے کوئی چھوٹی موٹی جیولری لے آؤں۔" وہ بلا جھجک کہہ رہا تھا۔

"ایک بات تو بتا جاجی کہ آخر تو اپنے سارے کام کاج چھوڑ کر یہاں کیوں ٹکا ہوا ہے؟" سکینہ کا ضبط آج جواب دے گیا۔

"تیرے لیے۔" اس نے دو لفظوں میں پوری کہانی کہہ دی۔

"کیوں، مجھ میں کون سے ایسے ہیرے جڑے ہوئے ہیں؟" سکینہ نے اکتاہٹ کے ساتھ سر کو ہلکی سی جنبش دی۔

"پتا نہیں۔" وہ سادگی سے بولا۔

"تجھے میری کمر کا یہ کُب برا نہیں لگتا؟" سکینہ کے لہجے میں چھلکتی خود اذیتی پر اس نے شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا۔

"مجھے تمہاری کمر کا کُب (کوہان) نظر ہی نہیں آتا۔ مجھے تو تو کسی دیس کی رانی لگتی ہے۔" اس کی بات پر اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس کی

آنکھوں سے چھلکتے محبت کے پیمانے سکینہ کو خوف زدہ کر گئے۔

"تجھے اتنا بڑا پہاڑ نظر نہیں آتا تو فوراً" اپنی آنکھیں چیک کروا، سرکاری ہسپتال میں۔۔۔" وہ ایک دم مشتعل ہوئی۔

"کملی! جب بندہ محبت کی عینک لگا کر اپنے محبوب کو دیکھتا ہے تو اسے وہ ہی نظر آتا ہے، جو اس کا دل اسے دکھاتا ہے۔ ذرا میرے دل کی آنکھ سے خود کو دیکھ، تجھے زندگی بہت خوب صورت لگے گی۔" جاجی نے بھی آج اظہار کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمکتے ستارے سکینہ کو وحشت میں مبتلا کر رہے تھے۔

"تیری تو مت ماری گئی ہے، اب یہاں رہ رہ کر میرا دماغ خراب نہ کر۔" صبح سے ایک تو کمر کے درد نے تنگ کر رکھا تھا اور اب جاجی کے دل کے انوکھے راگ اس کو بے زار کر رہے تھے۔

"اعجاز علی! پتر یہ میرے والے موبائل میں لوڈ تو کرا دے، تیرے تائے سے بات کرنی ہے مجھے۔" جمیلہ مائی کے چہرے پر پھیلی تشویش پر جاجی نے فکر مندی سے دیکھا۔

"تائی! ضروری بات کرنی ہے تو میرے والے نمبر سے کر لے۔" جاجی نے فراخ دلی سے اپنا سیٹ اماں کی طرف بڑھایا۔

"باہر جا کر بات کرتی ہوں، اندر ڈھنگ سے آواز نہیں آتی۔" جمیلہ مائی نے کمرے سے نکلتے ہوئے جاجی کو بھی آنکھ سے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

"تائی کیا ہوا؟ خیر تو ہے ناں؟" جاجی نے باہر نکلتے ہی بے تابی سے پوچھا۔

"بس پتر! اللہ سوہنا کرم کرے اپنا، سکینہ دے ڈاکٹر نے بلایا سی۔" جمیلہ مائی کے چہرے پر پھیلی رنجیدگی کی گہری تہہ جاجی کو خبردار کر رہی تھی کہ ڈاکٹر نے کیا کہا ہو گا۔

"کیا کہا ڈاکٹر نے۔۔۔؟" اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"اللہ سائیں رحم کرے ہم پر۔ سکینہ کی رپورٹیں ٹھیک نہیں آئیں پتر۔" جمیلہ مائی کی قوت برداشت قابل رشک تھی۔ جبکہ جاجی کے چہرے کا رنگ ایک لمحے میں فق ہوا تھا۔ وہ حواس باختہ انداز سے اماں کا افسردہ چہرہ دیکھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

شیشے کے بڑے دروازے کو تیزی سے دھکیل کر نکلنے کی کوشش میں وہ سامنے والے بندے سے بری طرح ٹکرائی۔ میڈیسن والا لفافہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔ ایک لمحے کو تو عائشہ کا دماغ سن سا ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے آگے ستارے محور رقص تھے جب ایک انتہائی مہذب لہجہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا۔

"محترمہ! آپ ٹھیک ہیں ناں؟"

"دیوار چین سے ٹکرانے کے بعد کون بندہ ٹھیک رہ سکتا ہے۔" دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے وہ بلند آواز سے بڑبڑائی تھی۔

"جی۔۔۔؟" سامنے والے کو بات تو سمجھ میں آ گئی تھی لیکن تصدیق کے لیے اس نے دوبارہ پوچھا۔ عائشہ نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا تو اسے جھٹکا لگا۔ وہی شخص اپنے چہرے پر بڑی جان دار مسکراہٹ سجائے سامنے تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک دم ہی ڈھیروں جگنو چمک اٹھے تھے۔

"مانا کہ میں نے اس دن آپ کو پینٹنگ نہیں دی، لیکن اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ آپ میرا سر ہی توڑ دیں۔" عائشہ نے اپنے سر کو سہلاتے ہوئے جل کر کہا۔ اس کی بات پر سامنے موجود شخص کے حلق سے نکلنے والا قہقہہ بڑا بے ساختہ تھا۔

"آئی ایم سوری! میں نے ایسا دانستہ نہیں کیا، ویسے بھی میں دل میں بغض رکھنے والا بندہ نہیں۔۔۔" اس نے بڑے مہذب انداز سے صفائی دی لیکن اس کی آنکھوں میں شرارت رقصاں تھی۔ وہ اب اس کی تمام ادویات اکٹھی کر کے شاپر میں ڈال رہا تھا۔

"ویسے کیا آپ کا اپنا میڈیکل اسٹور کھولنے کا ارادہ ہے۔" اس نے ادویات کی تعداد کو دیکھتے ہوئے شرارت سے پوچھا۔
"نہیں' یہ مجھے ایک فری میڈیکل کیمپ کے لیے چاہیے تھیں۔" اس نے بے ساختہ کہا۔
"اوہ تو آپ ڈاکٹر بھی ہیں کیا۔" اس کو خوش گوار سی حیرانی نے گھیر لیا۔
"جی نہیں۔۔۔" اس نے شاپر پکڑتے ہوئے نفی میں سرہلایا۔
"لائیں میں یہ گاڑی میں رکھ دیتا ہوں' کافی بھاری ہے۔" اس نے پرخلوص انداز میں کہا تو وہ بھی انکار نہیں کرپائی۔ شاپر پچھلی سیٹ پر رکھ کر وہ جانے کے لیے مڑا تو عائشہ نے بے ساختہ اسے پکارا۔
"یہ میری ایگزیبشن کا انویٹیشن کارڈ ہے' آپ ضرور آیئے گا۔" عائشہ نے اپنے بیگ سے ایک کارڈ نکالا۔
"آپ مجھے کارڈ نہ بھی دیتیں تو میں ضرور آتا۔" وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولا تھا۔
"آپ کو یاد تھا کہ ایگزیبشن کب ہے؟" عائشہ نے اس کی سحرانگیز آنکھوں سے بمشکل نظریں چرائیں۔
"میری یادداشت الحمدللہ بہت عمدہ ہے۔ آپ نے اس دن ذکر کیا تھا اپنے لیے میں نے آرٹ گیلری سے تمام تفصیلات لے لی تھیں۔" اس کی بات پر عائشہ نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔
"آپ نے میری مطلوبہ پینٹنگ بنالی ناں؟" اس کا پریقین لہجہ اسے چونکا گیا۔
"جی ہاں' لیکن ایگزیبشن سے پہلے میں آپ کو نہیں دوں گی۔" عائشہ کی سادگی پر وہ مسکرایا۔
"مائی گاڈ! آپ نے واقعی پینٹنگ بنالی' میں تو سمجھا تھا کہ آپ نے یونہی میرا دل رکھنے کے لیے ہاں کردی ہوگی۔" اس کی چہکتی ہوئی آواز میں سخت حیرانی تھی۔
"جبکہ میں سمجھی تھی کہ آپ نے یونہی میرا دل رکھنے کو فرمائش کردی ہوگی۔" عائشہ کے منہ سے بے ساختہ پھسلا' وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔
"اس کا مطلب ہے کہ ہم انجانے میں ایک دوسرے کے دلوں کی حفاظت کرتے پھر رہے تھے۔" اس کی گہری نظروں کے حصار پر عائشہ بوکھلا گئی۔ ذومعنی لہجہ' بولتی نگاہیں اور گھنی مونچھوں کے نیچے مسکراتے گلابی لب' تمام چیزوں نے عائشہ کو مجرم سا کردیا تھا۔ دل میں اٹھتے انوکھے راگ الگ ہاتھ پاؤں پھیلا رہے تھے۔

☆ ☆ ☆
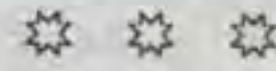
"اماں۔۔۔" اس نے گلا کھنکھار کر کروشیے کی بیل بناتی جمیلہ مائی کو مخاطب کیا تو اس نے سر اٹھا کر سکینہ کو دیکھا۔ جو بڑی مہارت سے آنکھوں میں کاجل لگارہی تھی۔
"سکینہ تو نعت کے مقابلے میں جارہی ہے یا کسی کی جنج (بارات) میں۔۔۔" جمیلہ مائی کی آنکھوں میں ہلکی سی ناگواری تھی' اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی سکینہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے فوراً" کوفت بھرے انداز سے بولنے سے روکا۔
"دیکھ اماں! خدا کے واسطے' آج کچھ نہ کہنا' ٹی وی کی اسکرین پر بغیر میک اپ کے بالکل بے سوادی آؤں گی۔" سکینہ کے لہجے میں عجیب سی بچکانہ ضد محسوس کرکے جمیلہ مائی بادل نخواستہ چپ کرگئی۔ وہ اب سخت حیرت سے سکینہ کی لوہے کی ڈرم سے نکلنے والا میک اپ کا سامان دیکھ رہی تھیں جو اس نے نہ جانے کس سے اور کب منگوایا تھا اور انہیں خبر ہی نہیں ہوئی۔ وہ اب اپنی آنکھوں پر نیلے پیلے رنگوں کے آئی شیڈ لگارہی تھی۔
"تاں سکینہ! تیرا کی خیال اے کہ کہ تو یہ کالے پیلے رنگ لگا کے بہت سوہنی لگ رہی اے؟" جمیلہ مائی نے ناک پر انگلی رکھ کر تعجب کا اظہار کیا تو جھنجلا گئی۔
"ہاں کہہ دے کہ اپنے پنڈ کے شیدے قصائی کی کالی کٹی (کالی بھینس کی بچی) لگ رہی ہوں۔"
"تو مجھے کہنے کی کیا ضرورت ہے' تجھے تیرا یہ دس روپے والا شیشہ خود بتادے گا۔" جمیلہ مائی نے ہنس کر دوپٹا اٹھالیا۔ سکینہ نے چوری چوری شیشے میں دیکھا اسے اپنا چہرہ واقعی عجیب مضحکہ خیز سا لگا۔
"اماں کبھی کبھی واقعی کتنی سچی باتیں کرتی ہے۔" اس نے دل ہی دل میں سوچتے ہوئے فوراً" پاس پڑے تولیے سے منہ رگڑ کر صاف کیا۔
"اماں سچ سچ بتا' کہ اب تیری سکینہ کیسی لگ رہی ہے؟" سرخ لان کا دوپٹا سر پر سلیقے سے اوڑھتے ہوئے اس نے بے تابی سے پوچھا تو اماں نے رنگوں سے مبرا اس کا چہرہ دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔
"میری دھی تو مجھے ویسے ہی پریوں کی رانی لگتی ہے۔" جمیلہ مائی کو اچانک ہی اس پر پیار آیا۔
"اماں! شکل وصورت کا تو مجھے پتا نہیں لیکن یہ بات طے ہے کہ تیری دھی کی آواز پورے پنڈ کی لڑکیوں سے زیادہ پیاری ہے۔" سکینہ کے لہجے میں جھلکتے غرور پر جمیلہ مائی کا دل دہل سا گیا۔ اس نے ناگواری سے اپنی بیٹی کو ایک دفعہ پھر شیشہ دیکھتے ہوئے دیکھا۔
"ہزار دفعہ سمجھایا ہے سکینہ! سوچ سمجھ کر بولا کر' بے' اللہ نوں اتنا مان پسند نئیں۔"
"اماں! کیا ہے' آج کے دن تو نصیحتیں نہ کر۔" سکینہ نے ہاتھ میں پکڑا فیس پاؤڈر تکیے پر پٹخا تو اس کا مزاج برہم دیکھ کر سکینہ مائی دانستہ خاموش رہی کچھ توقف کے بعد اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔
"دیکھ سکینہ! یہ پہلی اور آخری دفعہ تجھے ٹی وی پر لے کر جارہی ہوں۔ لیکن اگلی دفعہ مجھ سے امید نہ رکھنا۔" جمیلہ مائی نے اس کی بات سنی ان سنی کرکے ایک اور نصیحت کی۔
"اچھا ناں اماں' اب ڈاکٹر صاحب کے سامنے یہ پینڈو باتیں نہ کرنا' خدا خدا کرکے تو تو نے اپنی پنڈ والی بولی بولنا یہاں چھوڑی ہے۔" سکینہ بری طرح چڑ گئی تھی۔ "ہاں اور اپنے جاجی کو بتادیا ہے ناں کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں جائے گا۔" اسے ایک دم یاد آیا۔
"زیادہ اوکھی نہ ہوا کر۔۔۔" جمیلہ مائی نے ناک سے مکھی اڑائی۔ "بتادیا ہے کہ میڈم صبیحہ کا دماغ ٹھکانے نئیں اے' اس لیے وہ کملا یہیں بیٹھ کر ہمیں اڈیک تے گا۔" جمیلہ مائی نے غصے سے کہا تو اس نے بھی مزید تبصرہ نہیں کیا۔
ڈاکٹر خاور کا ڈرائیور انہیں اپنی گاڑی پر ہوٹل چھوڑ آیا تھا۔ ان کے ساتھ سسٹر ماریہ بھی تھی جس کو ڈاکٹر خاور نے اماں کی مدد کے خیال سے ساتھ آنے کو کہا تھا۔ تاکہ وہیل چیئر سے اتارنے اور چڑھانے میں مدد کرسکے۔

☆ ☆ ☆
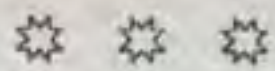
مشہور معروف ہوٹل کے اس خوب صورت ہال میں بے شمار کیمرے' روشنیاں اور لوگوں کو دیکھ کر سکینہ کافی بوکھلا سی گئی تھی۔ اس کے مقابلے میں جمیلہ مائی پرسکون تھیں۔ اور حسب معمول اپنی تسبیح میں مگن تھیں۔ سکینہ کو اسٹیج پر پہنچا دیا گیا تھا جہاں اس مقابلے میں شرکت کرنے والے شرکاء موجود تھے۔ بہت سی آنکھوں میں اپنے لیے ترحم کے جذبات دیکھنا سکینہ کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ لیکن اس وقت وہ عجیب سی گھبراہٹ کا شکار ہورہی تھی۔ اس نے بے شمار لوگوں میں بھی ڈاکٹر خاور کو ایک دراز قد خوب صورت مگر پروقار خاتون کے ساتھ اندر آتے دیکھا تو اس کے دل کی دنیا ہی بدل گئی۔ لوگوں کی آنکھوں میں موجود تمسخر' ترحم اور ہمدردی اب اسے کوفت میں مبتلا نہیں کررہا تھا۔
مقابلے کا آغاز ہوچکا تھا۔ اسٹیج سیکریٹری حصہ لینے والے افراد کو باری باری بلا رہی تھی۔ سکینہ کو پہلی نعت سننے کے بعد ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ مقابلہ اتنا آسان نہیں اور دنیا میں ہزاروں لوگ ایسے موجود ہیں جن کی آوازیں دل پر اثر کرتی ہیں۔
"اماں! بتاناں میں نے نعت کیسی پڑھی۔۔۔؟" مقابلے کے اختتام پر سسٹر ماریہ اس کو وہیل چیئر پر بٹھا کر ہال میں لے آئی تھی۔ نتائج کا اعلان ایک وقفے کے بعد تھا۔ سکینہ نے اماں کے پاس پہنچتے ہی بے تابی سے پوچھا تھا۔ اس سے پہلے کہ جمیلہ مائی اس کے سوال

کا جواب دیتیں ڈاکٹر خاور گرے رنگ کے سوٹ میں ملبوس ایک سو بر سی خاتون کے ساتھ وہاں آگئے۔ سکینہ کی دھڑکنوں نے اودھم سا مچادیا۔

"ماما! ان سے ملیں' یہ سکینہ ہیں' جن کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔" ڈاکٹر خاور کو ایک دم اپنے سامنے پاکر وہ بوکھلا سی گئی۔

"ماشاء اللہ بیٹا! آپ کی آواز بہت خوب صورت ہے۔" اس خاتون نے تھوڑا سا جھک کے سکینہ کے ماتھے پر بوسا دیا۔ ان کے محبت بھرے انداز پر سکینہ ششدر سی رہ گئی۔ اپنی بیماری کے دنوں میں جمیلہ مائی کے بعد یہ اس کی زندگی میں دوسری خاتون تھیں جنہوں نے انتہائی محبت اور شفقت بھرے انداز سے سکینہ کو مخاطب کیا تھا۔ اس کی تو سخت حیرت سے قوت گویائی ہی سلب ہوگئی تھی۔ وہ خاتون اب اسی انداز سے جمیلہ مائی سے مخاطب تھیں۔

"خاور آپ کا اور سکینہ کے والد صاحب کا بھی بہت ذکر کرتا ہے۔ وہ بہت متاثر ہے آپ دونوں سے۔" ڈاکٹر خاور کی والدہ کا خمیر بھی محبت سے گندھا ہوا لگ رہا تھا۔ ان کے محبت بھرے انداز پر جمیلہ مائی اور سکینہ کھل کر مسکرائیں۔ دونوں کو ہی وہ خاتون بہت اچھی لگی تھیں۔

"بس بہن جی میرے مولا کا کرم ہے' سب تعریف اسی ذات کی ہے' ہم انسانوں کا تو کوئی زور نہیں۔" جمیلہ مائی کا لہجہ شکر گزاری سے لبریز تھا۔

"میں تو خاور سے کہہ رہی تھی کہ بچی کی آواز میں دل کو چھو لینے والا سوز ہے۔" ڈاکٹر خاور کی والدہ کے اپنائیت بھرے انداز کے باوجود سکینہ سے ایک لفظ بھی نہیں بولا گیا۔ وہ کن اکھیوں سے اپنے بالکل سامنے بلیک پینٹ پر لائٹ پرپل شرٹ پہنے مردانہ وجاہت سے مالا مال ڈاکٹر خاور کو دیکھ رہی تھی جو سسٹر ماریہ سے گفتگو میں مگن تھے۔ ان کی والدہ کچھ دیر ان کے پاس ٹھہرنے کے بعد کسی اور سے ملنے کے لیے بڑھ گئی تھیں۔

اسی دوران پروگرام کے دوسرے مرحلے کا آغاز ہوگیا تھا۔ سسٹر ماریہ نے سکینہ کی وہیل چیئر کو اسٹیج سے بالکل قریب کردیا۔ مہمان خصوصی کے خطاب کے بعد نتائج کا اعلان ہونا تھا۔ سکینہ کو عجیب سی بے چینی لاحق ہوئی۔ دل میں عجیب سی پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسٹیج سیکریٹری سے نتائج والا صفحہ چھین کر پڑھ لیتی۔ وہ اماں سے کچھ فاصلے پر دیوار کے پاس تھی۔

"نی سکینہ! جدوں دل بے چین ہووے تے آیت الکرسی پڑھیا کر۔" ماں کی بات اچانک ہی ذہن کے پردے پر روشن ہوئی وہ آنکھیں بند کرکے آیت الکرسی کا ورد کرنے لگی۔

"کوئی فائدہ نہیں' جو چیزیں اللہ تعالیٰ قسمت میں لکھ دیتا ہے' وہ ہو کر رہتی ہیں۔" یہ بات سن کر وہ دنگ رہ گئی۔ اس نے گردن گھما کر اپنے سے چند گز کے فاصلے پر ایک انتہائی ہینڈسم شخص کو وہیل چیئر پر بیٹھے دیکھا۔ جس کے چہرے پر ایک بے رحم سی مسکراہٹ تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہیں کہ اتنے خوب صورت اور ہینڈسم بندے کو قسمت نے کہاں لا بٹھایا ہے۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ سکینہ اپنے خیالات کے عیاں ہونے پر ایک دم خفت زدہ ہوئی۔

"ویسے آواز آپ کی اچھی تھی اور نعت کا انتخاب بھی اچھا تھا۔" وہ اسٹیج پر موجود مہمان خصوصی کی تقریر سننے کے بجائے اس پر بے لاگ تبصرہ کر رہا تھا۔ سکینہ کی ساری حسیات چاق و چوبند ہوگئیں' لیکن وہ دانستہ چپ رہی۔

"کیا آپ کا بھی دل کرتا ہے کہ ایک دفعہ تو ضرور زمین کو اپنے قدموں سے چھو کر دیکھیں۔" وہ تھکن گزیدہ لہجے میں اس سے پوچھ رہا تھا سکینہ نے ایسے تعجب سے آنکھیں کھول کر اس کی بات سنی جیسے کوئی بہت غیر معمولی بات ہو۔

"بتائیں ناں سکینہ اللہ دتا۔" اس کے منہ سے اپنا نام سن کر سکینہ کا رنگ فق ہوگیا۔ اسے پہلی دفعہ اس بندے سے خوف محسوس ہوا۔ جو اپنی وہیل چیئر اس کے قریب لے آیا تھا۔

"پ۔۔۔ پتا نہیں۔" وہ تھوک نگل کر بمشکل بولی۔

"دیکھو لڑکی! زندگی بہت ظالم چیز ہے۔ اس میں کچھ پتا نہیں چلتا کہ کب آپ کے قدموں کے نیچے سے زمین سرکے اور اوپر سے آسمان چھن جائے۔ اس لیے خود کو ہر قسم کے حالات کے لیے تیار رکھنا چاہیے ورنہ میرے جیسا حال ہوتا ہے۔" وہ اس اجنبی شخص کی بے موقع اور بے محل نصیحت کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ جس کے چہرے پر اذیت' بے بسی اور تلخی کا بسیرا تھا۔

سامنے اسٹیج پر نتائج کا اعلان شروع ہوگیا تھا۔ سکینہ کا سارا وجود مجسم سماعت بن گیا تھا کچھ لمحوں کے لیے وہ اپنے پہلو میں موجود وہیل چیئر والے خوب صورت شخص کو بھی بھول گئی۔ اس کے اعصاب پر منوں وزن آن گرا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی دھڑکنیں مدھم ہوتی جارہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"وقت کی زنجیر میں الجھا ہوا لمحہ۔۔۔" اس نے پینٹنگ کا عنوان پڑھا اور ٹھٹک کر رک گیا۔

"سورج پر دستک دیتا ہوا موی ہاتھ۔۔۔" اس تصویر نے تو گویا اس کی قوت گویائی سلب کرلی تھی۔

"خزاں رت کی آخری کونپل۔۔۔" وہ مبہوت سا ہوگیا۔ اس کی ستائشی نظریں اگلے کئی لمحوں تک اس پینٹنگ پر جمی رہی تھیں۔

"آپ کے تخیل کی دنیا بہت وسیع ہے۔ بہت اچھوتے خیالات کو آپ نے کینوس پر منتقل کیا ہے۔"

سیاہ پینٹ پر کاسنی شرٹ پہنے اور آستینوں کو کہنی تک فولڈ کیے وہ تازہ تازہ کی گئی شیو میں انتہائی خوبرو اور وجیہہ لگ رہا تھا۔ وہ نمائش کے پہلے دن شام چار بجے کے قریب پہنچا عائشہ کو یقین ہوگیا تھا کہ وہ اب نہیں آئے گا۔ اس وقت وہ یونیورسٹی کے طلبا و طالبات میں گھری ہوئی تھی۔

"آپ کب آئے؟" ایک فطری سی خوشی کے بڑے بے ساختہ رنگ اس کے چہرے پر چھلکے۔ آج گلابی رنگ کی لمبی قمیص اور سفید چوڑی دار پاجامے کے ساتھ' اپنے کندھوں تک آتے بال کھولے وہ عام دنوں سے ہٹ کر بڑی دلکش لگ رہی تھی۔

"میں اس وقت آیا تھا جب آپ عوام الناس کو آٹو گراف دینے میں مگن تھیں۔" اس کے لہجے سے زیادہ آنکھوں میں شرارت رقصاں تھی۔ وہ اس کی بات پر جھینپ کر ہنس پڑی۔

"مائی گاڈ! بہت سحر انگیز ہے یہ تصویر۔" وہ ایک پینٹنگ کے سامنے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کی طرف مڑا۔ اس کی آنکھوں میں موجود ستائش پر وہ مسکرائی۔

سمندر کے پانیوں پر رقص کرتی ہوئی لڑکی اتنی خوب صورت لگ رہی تھی کہ اس شخص کی نظریں کسی مقناطیس کی طرح اس تصویر پر جم گئیں۔

عائشہ نے اس پینٹنگ کو "محبت" کا عنوان دیا تھا۔

"محبت میں وصل کا خمار جب دل کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے تو زندگی ایسے ہی رقص کرتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ انسان اپنے بازوؤں میں خوشبوؤں کو اوڑھ لیتا ہے۔ اسے ہواؤں کی سرگوشیاں' چٹکتی کلیوں کی صدا اور درختوں کی برہنہ شاخوں پر کونپلوں کی شرارتیں تک سمجھ میں آنے لگتی ہیں۔"

اس کے الفاظ میں بہتے پانیوں کی سی روانی تھی۔ اب حیران ہونے کی باری عائشہ کی تھی۔ وہ چونک کر اس شخص کو دیکھ رہی تھی جس کے نقوش میں کسی دیوتا کی سی تمکنت اور بے نیازی تھی۔

"آپ کے نزدیک محبت کیا ہے عائشہ۔۔۔؟" اس کی گہری نگاہ نے عائشہ کے دل کی دنیا اتھل پتھل کردی تھی۔ وہ ہال کے ایک ستون سے ٹیک لگائے بازوؤں کو سینے پر لپیٹے بڑی فرصت سے اس طرح اس سے مخاطب تھا جیسے دونوں میں صدیوں کی شناسائی ہو۔

"میں کوئی مصنفہ نہیں' ایک عام سی اور معمولی سی مصورہ ہوں۔ مجھے اپنے جذبات کا اظہار رنگوں کی صورت میں کرنا آتا ہے۔ میں لفظوں کے معاملے میں تہی دست ہوں۔" اس نے بے بسی سے کندھے

اچکائے تو وہ بڑے دھیمے سروں میں ہنسا۔

"محبت کسی خزاں رسیدہ شاخ پر پھوٹنے والا پہلا شگوفہ ہے۔ کسی کی آنکھ میں خوشی کا احساس جاگزیں کرنے والا جذبہ ہے۔ کسی معصوم بچے کی پہلی قلقاری ہے اور تتلی کے پروں کی آہٹ ہے۔" ماہم منصور بہت خاموشی سے اس منظر کا حصہ بنی تھی۔ وہ دونوں چونکے۔

لیمن کلر کے سوٹ میں وہ موسم بہار کا کوئی اولین پھول محسوس ہو رہی تھی۔ اس شخص نے سوالیہ نظروں سے اس لڑکی کو دیکھا جس کی آنکھوں میں ایک مسحور کن سی چمک تھی۔ جبکہ وہ ان کی بات کا جواب دے کر اپنے ہاتھ میں پکڑا بکے عائشہ کے ہاتھوں میں منتقل کرتے ہوئے بولی۔

"میں ماہم منصور ہوں' عائشہ رحیم کی بہترین دوست۔۔۔" وہ اپنے سامنے کھڑے انسان کی شخصیت میں چھپی تمکنت سے بری طرح مرعوب ہو چکی تھی۔ "آپ کی تعریف؟" ماہم نے انتہائی اشتیاق بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

"مجھے علی کہتے ہیں۔" وہ بے نیازی سے اپنے سامنے دیوار پر آویزاں پینٹنگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے ماہم پر صرف ایک سرسری سی نگاہ ڈالی۔

"کون ہے یہ۔۔۔؟" ماہم نے آنکھ کے اشارے سے عائشہ سے دریافت کیا۔

"الو کا مجسمہ۔۔۔" ماہم نے اس کے کان میں سرگوشی کی تو وہ ٹھٹک گئی اور سخت حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

"عائشہ۔۔۔ یہ تو حقیقت میں آپ کا ماسٹر پیس ہے۔" وہ مڑا اور چند قدم کے فاصلے پر کھڑی عائشہ کو دیکھا جو اس کی بات پر سادگی سے مسکرائی جبکہ ماہم جو ٹکٹکی باندھے اسے دیکھنے میں مگن تھی۔ اس کے اس طرح اچانک پلٹنے پر ہڑبڑا کر اس تصویر کی طرف متوجہ ہوئی۔

"صنم کدے میں دیوتا کے چرنوں میں بیٹھی ہوئی داسی کی آنکھوں میں اتنی وحشت ہے کہ مجھے لگتا تھا کہ کسی بھی لمحے یہ مورت بول پڑے گی۔" وہ پر[illegible] نظروں سے اس پینٹنگ کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

"وحشت' خوف' ڈر' اضطراب' نفرت' محبت [illegible] کوئی بھی جذبہ لفظوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ وہ [illegible] گویائی نہیں رکھتا لیکن اس کی زبان پھر بھی سمجھ [illegible] آتی ہے۔" عائشہ نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"ڈیٹس مائی پوائنٹ۔۔۔" وہ پرجوش ہوا۔

"آپ کی بات سے میں سو فیصد متفق ہوں لیکن اس کے باوجود محبت واحد ایسا جذبہ ہے' جب بولتا ہے [illegible] پوری کائنات رقص کرنے لگتی ہے۔ سماعتیں اس کے ذائقے کو چکھنا چاہتی ہیں۔ دل کی بنجر زمین پر جب لفظوں کے پھول کھلتے ہیں تو ہر چیز بہار کا پیراہن اوڑھ لیتی ہے۔ آنکھ کی بستی میں جب محبتوں کے موسم اترتے ہیں تو زندگی سرخ گلابوں سے سجی سیج محسوس ہوتی ہے۔" اس کا لہجہ دل کو چھوتا ہوا اور لفظوں کا انتخاب اس قدر عمدہ تھا کہ وہ دونوں ہی چونک گئیں۔

"آپ کیا کوئی شاعر ہیں یا ادیب۔۔۔؟" ماہم کا دل چاہا کہ وہ اس ساحر سے مخاطب ہو' اس لیے وہ خود کو بولنے سے نہیں روک پائی۔

"کیا مطلب۔۔۔؟" وہ حد درجہ سنجیدہ ہوا۔

"دراصل میں آپ لفظوں کا استعمال اس قدر خوب صورتی اور مہارت سے کر رہے ہیں کہ مجھے لگتا ہے کہ آپ کا تعلق ادب و شاعری سے ہے۔" ماہم کو اپنا سارا اعتماد اس شخص کے سامنے بھک کر کے فضا میں تحلیل ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"دیکھیں محترمہ! خوب صورت لفظوں پر صرف ادبی لوگوں کی اجارہ داری نہیں ہوتی اور ضروری نہیں کہ جن لوگوں کا تعلق ادب سے نہ ہو تو وہ سارے کے سارے "بے ادب" لوگوں کی کیٹیگری میں آتے ہوں۔"

اس کے دو ٹوک سپاٹ سے انداز پر ماہم کا چہرہ سرخ ہوا۔ جب کہ وہ اب اگلی تصویر کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ ماہم کو تحقیر سی محسوس ہوئی۔ وہ دل ہی دل میں اس لمحے کو کوس رہی تھی جب اس نے اس مغرور شخص کو مخاطب کرنے کی غلطی کی۔ وہ دوبارہ سے بڑی بے نیازی کے عالم میں پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے بڑی فرصت سے تصویریں دیکھنے میں مگن تھا۔

"ہم اس کے ملازم نہیں ہیں جو یہاں اسے پروٹوکول دینے کو کھڑے رہیں۔" ماہم نے سخت ناگواری سے عائشہ کو ہلکے لہجے میں کہا تو وہ گڑبڑا سی گئی۔

"ایکسکیوزمی۔۔۔ ہمیں کچھ اور لوگوں سے ملنا ہے' امید ہے آپ مائنڈ نہیں کریں گے۔" عائشہ نے بڑے محتاط سے انداز سے اسے مخاطب کیا تو وہ فوراً مڑا۔

"اوہ۔۔۔ شیور' وائے ناٹ۔۔۔" اس کی آنکھوں میں بڑا نرم سا تاثر تھا۔

"یہ شخص دیکھنے میں جتنا ہینڈسم اور ڈیشنگ ہے۔ اس سے زیادہ روڈ اور بدتمیز ہے۔ کوئی ضرورت نہیں اس کو منہ لگانے کی۔" ماہم تھوڑا سا فاصلے پر جاتے ہی پھٹ پڑی۔ "اس کو تو خواتین سے بات کرنے کی بھی تمیز نہیں۔" ماہم کے رخسار غصے کی زیادتی سے سرخ ہو گئے تھے۔

"تم خوامخواہ حساس ہو رہی ہو۔ وہ ایسا نہیں ہے۔" عائشہ نے تحمل بھرے انداز سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تمہیں بڑی لوگوں کی پہچان ہے۔ پتا نہیں خود کو کیا سمجھتا ہے' ذرا سی شکل اچھی ہے لیکن اخلاقیات نام کی کوئی چیز اسے چھو کر بھی نہیں گزری۔" ماہم کو بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔ اسے پہلی دفعہ کسی نے اس طرح نظر انداز کیا تھا۔

"ری لیکس ماہم۔۔۔" عائشہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنائیت بھرے انداز سے کہا اور پھر صرف اس کا موڈ تبدیل کرنے کے لیے بات کا رخ بدلا۔ "تم نے رامس کو نہیں انوائٹ کیا تھا ایگزیبیشن میں۔۔۔؟"

"میں نے انوائٹ کیا تھا۔ وہ آج کچھ بزی ہے اس لیے کل آئے گا۔" اس نے بمشکل اپنے تنتے ہوئے اعصاب پر قابو پایا۔ "ایک بات تو بتاؤ عائشہ؟" اس کا انداز اتنا عجیب نہیں تھا جتنا آنکھوں میں موجود تاثر اسے عجیب سا بنا رہا تھا۔

"ہاں پوچھو۔۔۔" عائشہ نے اس کی پیشانی پر موجود ان گنت شکنوں کی تعداد کو گننا چاہا۔

"کیا یہ شخص رامس سے زیادہ ہینڈسم ہے؟" وہ ماہم کے اس بے تکے سوال پر ہکا بکا رہ گئی۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ ماہم کی سوئی اس شخص پر آ کر کیوں اٹک سی گئی ہے۔ اس کے چہرے پر سوچ کا تاثر خاصا نمایاں تھا۔

"ماہم! اس کا رامس سے کیا مقابلہ۔۔۔؟" اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے ماہم کو دیکھا جو بڑے عجیب سے انداز سے اپنے سے کچھ فاصلے پر موجود اس شخص کی پشت پر نظریں ٹکائے کھڑی تھی۔ اس کے لبوں پر پھیلتی پراسرار سی مسکراہٹ جوں جوں گہری ہو رہی تھی عائشہ کو ویسے ویسے اپنا دل کسی گہری کھائی میں ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ سخت بے یقینی' تعجب اور حیرت سے سامنے اسٹیج کی طرف دیکھ رہی تھی' جہاں سے کوئی صور ہی تو اس کی سماعتوں میں انڈیلا گیا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب کا ایک جہان آباد تھا۔ الجھن' حیرت' دکھ اور نہ جانے کیا کیا کچھ اس کی آنکھوں میں جامد ہو گیا تھا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ زندگی انسانوں کو ہمیشہ ہر چیز بہترین نہیں دیتی۔ بعض دفعہ کوئی دکھ' تکلیف یا رنج کسی اندھے اسپیڈ بریکر کی طرح اچانک ہی سامنے آ جاتا ہے۔ انسان کو زیادہ نہ سہی' ایک جھٹکا ضرور لگتا ہے۔" وہ ہی جسم کو چھیدتی ہوئی نگاہیں اس کے چہرے پر ٹھہریں تو سکینہ کے اعصاب تن سے گئے۔ اسے اپنے حلق میں نمک کا کھارا سا ذائقہ محسوس ہوا۔

وہ آنسو جن کو آنکھوں کے ذریعے باہر نکلنے کا راستہ نہ ملے' وہ دل میں کتنی آگ لگاتے ہیں۔ اس کرب کا اندازہ اسے پہلی دفعہ ہوا اور وہ زیادہ دیر تک اس کرب

کو برداشت نہیں کرپائی۔ سر جھکائے بے آواز آنسو بہاتے ہوئے وہ کچھ دیر تک کرسی کے ہتھے پر ہاتھ پھیرتی رہی۔

اسے نہ جانے کیوں یقین نہیں آرہا تھا کہ پہلی تین پوزیشنز میں اس کا نام شامل نہیں۔ ہاں حوصلہ افزائی کے انعام کے لیے اس کا نام پکارا جارہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو زبردستی بند کرلیا تھا۔ اس کے جسم کی لرزش سے اس کی ابتر ذہنی کیفیت کی عکاسی ہورہی تھی۔

"سکینہ! اسٹیج پر تمہارا نام پکارا جارہا ہے۔" سسٹر ماریہ نے عجلت میں اس کا کندھا ہلایا۔

"مجھے نہیں جانا اسٹیج پر۔۔۔" اس کے دوٹوک قطعی انداز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔ سسٹر ماریہ نے بوکھلا کر اس کا آنسوؤں کی بارش سے بھیگا چہرہ دیکھا۔ وہ ان آنسوؤں کے پیچھے چھپے محرک کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا اور تعجب سے پوچھا۔

"کیوں نہیں جانا۔۔۔؟"

"اپنے پاس رکھیں حوصلہ افزائی کا انعام، مجھے نہیں لینا۔۔۔" اس نے بھیگے لہجے میں کہا۔ سسٹر ماریہ حیران ہوئی۔

اسٹیج پر دوسری دفعہ اس کا نام پکارا جارہا تھا۔ سسٹر ماریہ بوکھلا کر خود ہی اس کا انعام لینے اسٹیج کی طرف چلی گئیں۔ جبکہ سکینہ کو ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے بدن سے ساری توانائی نچڑ کر رہ گئی ہو۔ مقابلے کے نتائج سے اسے یوں گمان ہورہا تھا جیسے کسی نے اسے ایفل ٹاور سے دھکا دے دیا ہو۔

"دل چھوٹا نہیں کرتے پتر۔۔۔" جمیلہ مائی نے اس کے چہرے پر پھیلا کرب دیکھا تو بے اختیار ہی اس کا سر سہلایا۔ جبکہ ان کی تسلی پر سکینہ کے بہتے آنسوؤں کی روانی میں یک لخت اضافہ ہوا تھا۔

"فراڈ کیا ہے ان لوگوں نے میرے ساتھ۔۔۔" اس نے بے دردی سے اپنے بازوؤں کی پشت سے آنکھوں کو صاف کیا۔

"اوں، ہوں۔۔۔!" جمیلہ مائی نے تاسف بھرے انداز سے اپنی لاڈلی کو دیکھا جو کسی صورت سنبھلنے کو تیار نہیں تھی۔ انہوں نے دانستہ اسے کچھ کہنے سے اجتناب بخشا۔

"بھائی! ماما نے مجھے فون کرکے بھیجا ہے کہ آپ کو گھر لے چلوں۔" سکینہ کی سماعتوں سے ایک آواز ٹکرائی تو اس نے گردن موڑ کر اپنے سے تھوڑے فاصلے پر کھڑی ایک مہربان سی لڑکی کو دیکھا، جو اپنے بھائی کو جھک کر کہہ رہی تھی۔ جس کی نظریں سکینہ پر جمی ہوئی تھیں۔

"ماما کہہ رہی تھیں کہ ان کو دیر ہوجائے گی۔ سو چلیں گھر۔۔۔؟" سکینہ اپنی آنکھوں کو دوپٹے کے ساتھ رگڑ کر خشک کرنے لگی۔ وہ اپنی وہیل چیئر کو بڑی تمکنت کے ساتھ چلاتا ہوا اس کے پاس آن رکا۔ سکینہ کے دل کی دھڑکنیں کسی ٹرین کی طرح بھاگنے لگیں۔

"سنیں۔۔۔!" اس کے لہجے میں تبدیلی کا عمل بڑی تیزی سے وقوع پذیر ہوا تھا۔ سکینہ نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"قسمت کتنی بھی ظالم سہی، لیکن اس کے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہے۔ اسے پتا ہوتا ہے کہ جب دل پر چوٹ لگتی ہے تو ہر رگ میں ایک محشر بپا ہوجاتا ہے۔ قسمت اگر کسی کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچتی ہے تو وقت آنے پر اس شخص کے مانگتے ہاتھوں پر کلیاں بھی رکھتی ہے۔ اس کے سر پر ایک مہربان کی ردا بھی تان دیتی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے سکینہ، جمیلہ مائی اور اپنی بہن کے سخت حیرت زدہ چہروں سے محظوظ ہورہا تھا۔

"ان شاء اللہ زندگی تم پر بھی مہربان ہوگی اور وہ وقت ضرور آئے گا۔"

"میرے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔" سکینہ کے حلق سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے۔

"جس دن اپنے دل سے توقع کا پودا اکھاڑ کر پھینک دوگی، یقین مانو، کوئی چیز دکھ نہیں دے گی۔ جسمانی معذوری تو ایک دکھ ہے ہی۔۔۔ لیکن ہر لمحہ ٹھوکریں کھانے والا دل معذور ہوجائے تو زندگی میں اس سے بڑا کرب نہیں ہوتا؟" اس نے سکینہ کو دیکھا جس کی آنکھوں میں شکووں کا ایک جہاں آباد تھا۔ کانپتی ہوئی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پیوست کیے وہ سر جھکائے اب بالکل خاموش تھی۔

"آپ کی آواز ماشاء اللہ بہت اچھی ہے۔" وہ مسکراہٹ والی لڑکی دوستانہ انداز سے اس مہربان کی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہی تھی۔ ایک جری مسکراہٹ نے سکینہ کے چہرے کا احاطہ کیا۔

"وش یو بیسٹ آف لک۔۔۔" وہ اسے کھلے دل سے سراہ رہی تھی۔ جبکہ سکینہ اور جمیلہ مائی اب سخت حیرت اور بے یقینی سے ان دو بہن بھائیوں کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کسی اور ہی سیارے کی مخلوق ہوں۔

☼ ☼ ☼
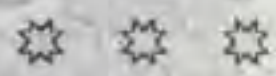
"اف میرے خدا۔۔۔!"

ثنائلہ نے ہاتھ میں پکڑا کاغذ گول مول کرکے ڈسٹ بن کی طرف اچھالا۔ ایک تو صبح سے فضا میں تپش کا احساس کافی زیادہ تھا۔ اب شام کچھ بہتر محسوس ہوئی تو اس نے پہلے صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کیا اور پھر پیڈسٹل فین باہر نکال کر چارپائیاں بچھائیں۔ انار کے درخت کے پاس چارپائی پر بالکل خاموش امی کسی گہری سوچ میں تھیں۔ ان کی نظریں برآمدے میں رکھے ہوئی گیس کے چولہے پر جمی ہوئی تھیں جسے دوپہر میں گرمی زیادہ ہونے کی وجہ سے ثنائلہ اکثر برآمدے میں نکال لیتی تھی۔ آلو گوشت کا سالن بنا کر اس نے آٹا گوندھ کر رکھا اور اپنی کہانیوں والی فائل نکال کر لے آئی۔

"تمہاری اس مہینے چھپنے والی کہانی نے زیادہ مزا نہیں دیا۔" ساتھ والی دیوار سے نابیہ کا چہرہ برآمد ہوا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ڈائجسٹ دیوار پر رکھا اور سوچوں میں گم ثنائلہ کو مخاطب کیا۔ درمیانی دیوار زیادہ بلند نہیں تھی اس لیے چارپائی پر کھڑے ہوکر آرام سے بات ہوجاتی تھی اس چیز کا فائدہ وہ دونوں بچپن سے اٹھاتی آرہی تھیں۔

"کیوں کیا ہوا۔۔۔؟" ثنائلہ نے چونک کر دیوار پر ٹکی نابیہ کو دیکھا جس نے آج صبح سے کوئی چکر نہیں لگایا تھا۔

"مزا نہیں آیا، لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ کہانی تم نے لکھی ہے۔ عجیب سی اور بے ربط سی۔" نابیہ کا شمار بڑے سفاک اور جنونی قسم کے ناقدین میں ہوتا تھا۔ جو پسند آجانے والی چیز پر تخلیق نگار کو منٹوں میں آسمان پر پہنچادیتے اور پسند نہ آنے کی صورت میں بخیے ادھیڑ کر رکھ دیتے۔

"بھئی تم قارئین بہت ظالم لوگ ہوتے ہو۔ کسی بھی لکھاری کو تھوڑا بہت بھی مارجن دینے کو تیار نہیں ہوتے اور ہمیشہ ہی یہ چاہتے ہو کہ تخلیق نگار شاہکار تخلیق کرتا رہے۔ بھئی ہم بھی انسان ہیں۔ اچھے برے حالات کی زد میں آتے ہیں تو قلم کی روانی متاثر ہوسکتی ہے۔" ثنائلہ نے برآمدے کی دھوئیں سے جھلسی ہوئی دیوار کو غور سے دیکھتے ہوئے تلخی سے کہا تو وہ اس کے منہ بنانے پر ہنس پڑی۔

"ہم تخلیق نگاروں کو اپنے دل کی مسند پر بٹھاتے ہیں اس کے لکھے لفظوں کو سراہتے ہیں۔ یہ ہماری ان سے معصوم سی محبت ہی ہے کہ ہم ان کے کرداروں کے ساتھ ہنستے اور روتے ہیں۔ ہمارا المیہ ہے کہ ہم جان بوجھ کر یہ سمجھنا نہیں چاہتے کہ ان لوگوں کا شمار بھی عام لوگوں میں ہوسکتا ہے۔ اس لیے کوئی بھی ہلکی سی خامی، جو چاہے ان کی تحریروں میں ہو یا ان کی ذات میں ہمیں بری طرح کھٹکتی ہے۔" نابیہ قارئین کا مقدمہ ہمیشہ دلائل کے ساتھ لڑتی تھی اور اکثر کامیاب بھی ٹھہرتی تھی۔

وہ بڑی مہارت سے دیوار پھلانگ کر ان کے صحن میں آچکی تھی اور بے تکلفی سے دیگچی کا ڈھکن اٹھا کر دیکھ رہی تھی۔

"واہ آلو گوشت۔۔۔" اس نے چٹخارہ بھرا۔

"ہماری طرف تو آج ٹینڈوں نے سخت موڈ آف کر رکھا ہے۔" وہ رکابی میں سالن ڈال کر ہاٹ پاٹ سے

دوپہر کی بچی روٹی نکال کر بے تکلفی سے شروع ہو چکی تھی۔

"خالہ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟" اس نے بالکل خاموش لیٹی اس کی امی کو فکر مندی سے دیکھا جو شاید سو چکی تھیں۔

"ہاں! ٹھیک ہیں' دوائی کھا کر لیٹی ہیں اس لیے غنودگی سی طاری ہے۔"

"جب سے شہیر باہر گیا ہے' خالہ کو تو چپ ہی لگ گئی ہے۔ پہلے تو ذرا محلے میں گھوم پھر آتی تھیں۔ اب تو انہوں نے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا ہے۔" نابیہ نے کولر سے اسٹیل کے گلاس میں پانی انڈیلا۔

"بس یار! امی کے اپنے دکھ ہیں۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ "ان کی زندگی میں صرف تین مرد آئے اور تینوں نے ہی بڑی بے درد اور بے مروت قسم کی طبیعت پائی تھی' ان ہی تینوں کا دکھ انہیں گھن کی صورت کھا تا جا رہا ہے۔"

"میں سمجھی نہیں..." نابیہ نے پودوں کی کیاری میں گلاس کا بچا ہوا پانی پھینکتے ہوئے ثنائلہ کو دیکھا جس نے آج اپنے چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ چسپاں کر رکھی تھی۔

"بھئی' ایک ان کے شوہر صاحب تھے جو بھری جوانی میں ان کا ساتھ چھوڑ کر ابدی نیند سو گئے۔" وہ رنجیدہ ہوئی۔

"دوسرے اس کے اکلوتے بھائی صاحب' جو سات سمندر پار گئے تو دوبارہ مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس کے بعد اکلوتا بیٹا تھا جو بے مروتی اور خود غرضی میں سب سے آگے نکل گیا۔ یہ ہے مختصر داستان..." وہ بجلی کے اچانک جانے پر ہاتھ کا پنکھا اٹھا کر اپنی امی کو جھلنے لگی۔

"لیکن ان تینوں مردوں پر ان کی اکلوتی بیٹی بھاری ہے۔" نابیہ اس کے پاس آن بیٹھی۔ "خالہ تو بہت خوش قسمت ہیں کہ ان کو تمہاری صورت میں' نیک فرماں بردار اور ذہین بیٹی ملی۔" نابیہ نے اپنی مخلص سی دوست کا سادہ سا چہرہ دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی اپنی ماں میں جان تھی۔

"اچھا چھوڑو ان سب چیزوں کو' یہ دنیا کے [illegible] ختم ہی نہیں ہوتے' یہ بتاؤ کہ صحن میں کاغذوں [illegible] طوفان کیوں آیا ہوا ہے۔" نابیہ نے بات تبدیل کر[ne] کے لیے یونہی پوچھا۔ اسے اپنی دوست کے [illegible] رنجیدگی اور تلخی کا کوئی بھی رنگ اچھا نہیں لگتا تھا۔

"کچھ نہیں بس خود سے اور لفظوں سے [illegible] تھی۔" وہ حیرت سے ثنائلہ کا بے تاثر چہرہ دیکھنے [لگی]۔

"مجھے تو پہلی دفعہ احساس ہوا کہ لفظ بھی اڑیل گھوڑ[ے] کی طرح ہوتے ہیں۔ جب کسی بات پر بدک جائیں [تو] لاکھ کوشش کریں' قابو ہی نہیں آتے۔"

"کیا مطلب؟" نابیہ نے اچنبھے سے اسے دیکھا جس کے اعصاب تن سے گئے تھے۔

"بھئی سیدھا سا مطلب ہے کہ ذہن میں کہانیاں اودھم مچا رہی ہیں۔ باہر نکلنے کو بے تاب ہیں لیکن لفظ مجھ سے روٹھ گئے ہیں۔ خیالات کا ہجوم ہے اور الفاظ ندارد۔" اس نے مختصراً اپنا مسئلہ بتایا۔ نابیہ نے اس کی سکڑی ہوئی بھنوؤں کو دیکھا اور ہموار لہجے میں [گویا] ہوئی۔

"ہوں...!" نابیہ نے پرسوچ انداز سے اسے دیکھا۔ "تم ٹینشن مت لو' کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ [ایسا] کرو تھوڑا سا بریک لے لو۔" اس نے خلوص دل سے مشورہ دیا۔ "تم ماہم منصور کے پاس سیشن کے لیے نہیں گئیں؟" ایک دم اسے یاد آیا۔

"گئی تھی کتھارسس ہوا۔ اس بے چاری کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھے فوراً اس ذہنی الجھن سے چھٹکارا دلا دے۔" ثنائلہ بمشکل مسکرائی۔

"پھر...؟" نابیہ نے استفسار کیا۔

"میرے ساتھ بس ایک ہی مسئلہ ہے جو اس سائیکولوجسٹ کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔" اس [کی] آنکھوں کی روشنی مدھم ہوئی اور اس کی شکست خوردہ آواز پر نابیہ نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"میں اصل میں خود سمجھنا ہی نہیں چاہتی اور جب آپ خود سمجھنا نہ چاہیں تو چاہے ساری دنیا مل کر بھی نہ زور لگا لے' کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔" اس نے شدید

بے بسی سے کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔ نابیہ اس کے چہرے پر رقم دکھ کی تحریر بڑے آرام سے پڑھ سکتی تھی۔ صحن میں اتنا اندھیرا نہیں چھایا تھا جتنا اسے ثنائلہ کا وجود مایوسی کے اندھیرے میں ڈوبا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼
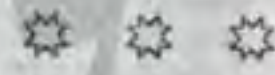
اس نے آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھایا اور اپنے بالکل سامنے بیٹھے ڈاکٹر خاور کو دیکھا۔ وہ ہچکیوں کے درمیان روتے ہوئے بمشکل بول رہی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب! میرے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ ان لوگوں نے نتیجے میں دھاندلی کی ہے۔" دکھ' تکلیف اور بے خوابی کے عطا کردہ بوجھل پن نے سکینہ کو بری طرح نڈھال کر رکھا تھا۔ وہ پچھلے دو دن سے نہ تو کچھ کھا رہی تھی اور نہ ہی سو پا رہی تھی۔ اس کی اس حالت نے سکینہ مائی کے ہاتھ پاؤں پھلا رکھے تھے۔

"دیکھو سکینہ..." ڈاکٹر خاور اس کے بیڈ کے پاس کرسی رکھ کر بیٹھے۔ "تم ابھی کم عمر اور ناتجربہ کار ہو۔ بہت سی چیزوں کو سمجھ نہیں پا رہیں۔" ڈاکٹر خاور نے تاسف سے اس خستہ حال لڑکی کو دیکھا وہ گزشتہ دو دنوں سے لاہور گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر آتے ہی جمیلہ مائی نے ان سے رابطہ کیا اور سکینہ کی حالت کا بتایا تو وہ فوراً چلے آئے۔

"بلاشبہ تم نے بہت خوب صورت آواز میں نعت پڑھی تھی' لیکن مقابلے میں بہت سی اور چیزوں کو بھی دیکھا جاتا ہے' میں نے کاظمی سے کہہ کر رزلٹ منگوایا ہے۔ تمہاری نعت میں تلفظ کی دو غلطیاں تھیں اور ایک جگہ تمہارا سانس ٹوٹا تھا۔" ان کی بات پر سکینہ کے آنسو اور بھی روانی سے اس کے گالوں پر لڑھکنے لگے۔

"ایسا ہو جاتا ہے' تمہارا یہ پہلا تجربہ تھا۔ ان شاء اللہ اگلی دفعہ تم اپنی ان خامیوں پر قابو پا لوگی۔" انہوں نے اسے سمجھانے کی ایک دفعہ پھر کوشش کی۔

"میں اگلی دفعہ کسی مقابلے میں حصہ ہی نہیں لوں گی۔" وہ بے آواز سسکنے لگی۔

"کیسے حصہ نہیں لیں گی۔ میرا پتا ہے نا آپ کو؟" ڈاکٹر خاور کے لہجے میں جتاتا ہوا مان تھا۔ سکینہ نے بے یقینی سے ان کا چہرہ دیکھا جس پر اس قدر خلوص تھا کہ اس نے کسی مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔

"اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپ ایسے دریا بہائیں گی تو زندگی کیسے گزاریں گی؟" ڈاکٹر خاور کے اپنائیت سے لبریز انداز پر اس نے بازو کی پشت سے اپنی آنکھوں کو بے دردی سے صاف کیا۔

"آپ مجھے ایک بات سچی سچی بتائیں۔" وہ ہونٹ کچلتے ہوئے آنکھوں میں تنی دھند کی چادر کو ہٹانے کی کوشش میں ہلکان تھی۔

"میں مانتی ہوں کہ میرے نعت پڑھنے میں ہزار غلطیاں ہوں گی' لیکن کیا اس مقابلے میں کسی ایک کی بھی آواز میری آواز سے زیادہ اچھی تھی بھلا؟" اس کے بچگانہ انداز پر ڈاکٹر خاور بے ساختہ ہنس پڑے۔

"ہرگز نہیں' اس بات کا اعتراف تو کاظمی صاحب نے بھی کیا ہے۔ ان کے بقول آپ کو بس ایک اچھے استاد کی ضرورت ہے۔" ڈاکٹر خاور کی بات پر سکینہ کا تھما ہوا دل پھر دھڑکنے لگا۔

"ہاں! تب ہی انہوں نے مجھے بہلانے کو حوصلہ افزائی کا انعام تھما دیا۔" پرحدت قطرے مسلسل اس کے گالوں پر لڑھک رہے تھے۔

"ہونہہ بس کر سکینہ! کیا یہاں اسپتال میں رو رو کر سیلاب بہائے گی۔" جمیلہ مائی نے تنبیہی نظروں سے اسے گھورا تو اس نے خفگی سے سر جھٹکا۔ جبکہ ڈاکٹر خاور نے اس کے منہ پھلانے پر زیر لب مسکراتے ہوئے شاپر سے ایک خوب صورت سوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔ "یہ ماما نے آپ کے لیے بھجوایا ہے' وہ لاہور سے لائی ہیں۔"

"نن نئیں پتر..." جمیلہ مائی کو کرنٹ سا لگا۔

"بھلا اس کی کیا ضرورت ہے۔ سکینہ کو عادت نئیں اتنے مہنگے کپڑوں کی۔" جمیلہ مائی نے سکینہ کی ستائشی نظروں سے بوکھلا کر فوراً انہیں منع کیا۔ سفید

شاپر سے جھانکتا لان کا سوٹ اپنی قیمت خود بتا رہا تھا۔ جبکہ سکینہ، اماں کی اس بات پر صدمے سے گنگ رہ گئی۔

"ارے یہ کیا بات ہوئی۔ ماما تو سکینہ کی آواز سے سخت متاثر ہیں اور انہوں نے بہت محبت سے ان کے لیے خرید کر تحفہ بھیجا ہے۔"

"آپ کی بات سولہ آنے درست ہے ڈاکٹر صاحب!" جمیلہ مائی سخت الجھن کا شکار تھیں۔ "آپ کی والدہ نے اس نمانی کو یاد رکھا' ان کی اتنی ہی مہربانی بہت ہے پتر! برا نہیں ماننا' آپ یہ کپڑے اپنی بہن کو دے دینا۔" جمیلہ مائی اس سوٹ کو لینے پر کسی صورت تیار نہیں تھیں۔

"بھئی' پہلی بات تو یہ ہے کہ میری کوئی بہن نہیں۔" وہ کھل کر مسکرائے۔ "دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہوتی بھی تو کم از کم سکینہ کی چیز میں اسے بھی نہ دیتا۔" وہ فیصلہ کن انداز میں کہتے ہوئے کھڑے ہوئے تو جمیلہ مائی بوکھلا گئیں۔

"پتر! سچ بتاؤں میرا دل نہیں مان رہا لینے کو۔" جمیلہ مائی عجیب سی کشمکش کا شکار تھیں۔

"ٹھیک ہے' آپ اسے فی الحال یہیں رکھیں' پرسوں ماما نے یہاں چیک اپ کے لیے آنا ہے اور وہ سکینہ سے بھی ملنے آئیں گی تو آپ انہیں خود واپس کر دیجیے گا۔" ڈاکٹر خاور نے انتہائی سلیقے سے کہا اور فوراً" کمرے سے نکل گئے۔

"ہائے اماں! کتنا نرم و ملائم جوڑا ہے' خوامخواہ واپس کر رہی ہے۔" سکینہ نے ان کے کمرے سے نکلتے ہی فوراً" بے تابی سے سوٹ کھول کر پھیلا لیا۔ آسمانی رنگ کے سوٹ پر گہرے رنگوں کی نفیس سی کڑھائی نے اس کی خوب صورتی کو چار چاند لگا دیے تھے۔ سکینہ کا دل اس میں اٹک کر رہ گیا تھا۔

"سکینہ زیادہ شوہدی بننے کی لوڑ نئیں پتر! پرائے ریشم سے اپنا کھدر اچھا ہوتا ہے۔" جمیلہ مائی نے دو ٹوک انداز سے کہہ کر سوٹ دوبارہ شاپر میں ڈالا تو سکینہ کو جھٹکا سا لگا۔

"اماں! واپس نہ کرنا۔" اس کے چہرے پر اتنی لجاجت تھی کہ ایک لمحے کو جمیلہ مائی کا اپنا دل بھی ڈگمگا سا گیا۔

"دیکھ پتر! میری بات سمجھنے کی کوشش کر۔" جمیلہ مائی نے محبت کی زبان میں سمجھانے کی کوشش کی۔ "تحفے اپنے ہی جوڑ کے لوگوں سے لیتے ہیں۔ اپنے سے اونچے لوگوں سے دوستی نرا سیاپا ہی ہوتی ہے۔ بندا ہر ویلے ان کے ساتھ پورا اترنے کی کوشش میں وخت میں ہی پڑا رہتا ہے۔"

"لے اماں! میرا ابا بھی تو جب بھی پنڈ سے آتا ہے تو کوئی نہ کوئی پنڈ کی سوغات ان کے لیے لاتا ہے نا۔" سکینہ کے جتاتے ہوئے لہجے پر جمیلہ مائی کو افسوس ہوا۔

"نی سکینہ! تو کتنی تھوڑدلی (چھوٹے دل) ہے۔ تو نے اپنے دل میں کتنا بغض پال رکھا ہے۔ توبہ توبہ۔" انہوں نے انتہائی رنج سے اپنے ماتھے کو چھوا۔

"تو نے مجھے بہت مایوس کیا ہے سکینہ۔" جمیلہ مائی کا دکھ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

"اماں! یہ ساری باتیں تیری ٹھیک سہی پر میں نے یہ سوٹ واپس نہیں کرنا۔" سکینہ نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"کیوں۔" اماں نے ابرو چڑھا کر سختی سے اسے دیکھا۔

"دیکھ نا اماں! اس سے ملتا جلتا سوٹ اس دن ڈاکٹر زویا نے بھی پہن رکھا تھا۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا نا۔" سکینہ کے مچلتے انداز پر جمیلہ مائی کو اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔

"اماں! میرا بھی دل کرتا ہے کہ ایسے قیمتی اور نفیس کپڑے پہنوں۔" اس کے لہجے میں چھلکتی حسرت پر جمیلہ مائی کے فیصلے میں بڑی مضبوط دڑار پڑی جبکہ سکینہ اب بڑے شوق سے سوٹ پر ہاتھ پھیر کر اس کی ملائمت محسوس کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اتنا اشتیاق تھا کہ جمیلہ مائی بالکل ہی ڈھے گئی۔

☼ ☼ ☼

"موحد نے انکل کی فیکٹری سنبھال لی اور تم نے مجھے بتانا بھی مناسب نہیں سمجھا۔" ماہم نے اس کے گھر پر کامیاب چھاپہ مارا تھا۔

"تو یہ کون سی اتنی بڑی خبر تھی جو میں اعلان کرتی پھرتی۔" اپنی نئی پینٹنگ پر کام کرتی عائشہ کھلکھلا کر ہنسی۔ اس کی ہنسی کی آواز ماہم کے اعصاب پر چابک بن کر پڑی۔ اس نے خفگی بھری نگاہ اس پر ڈالی جو ایک خوب صورت پینٹنگ پر بڑی دل جمعی سے کام کر رہی تھی۔

"ویسے حد ہی ہو گئی ہے بے مروتی کی۔ مجھے مسز رندھاوا نے بتایا تو مجھے تم پر سخت افسوس ہوا کہ تم نے ذکر کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔" ماہم حقیقتاً" خفا تھی۔

"میرا خیال تھا کہ موحد نے تمہیں بتایا ہوگا۔" اس نے حتی المقدور اپنے لہجے کو خوش گوار رکھنے کی سعی کی۔

"موحد بہت بدل گیا ہے یار! اس کی آنکھوں میں اب شناسائی کی کوئی رمق نہیں رہی۔" وہ اب کشن سر کے نیچے رکھ کر ٹانگیں پھیلا چکی تھی۔

"بھئی! میں کیا کہہ سکتی ہوں' یہ تم دونوں کا آپس کا معاملہ ہے۔" عائشہ نے جواب میں محض مسکرا کر کندھے اچکائے تو وہ جل کر بولی۔

"یہ اپنی جان چھڑانے کا بھی بہترین طریقہ ہے۔" اس کی بات کے جواب میں وہ ہنس کر خاموش رہی۔

"ویسے یہ اپنا بزنس کرنے کا آئیڈیا اسے کس عقل مند نے دیا ہے؟" ماہم کے لہجے میں طنز کی آمیزش عائشہ کو بالکل اچھی نہیں لگی تھی۔

"بھئی ذہین تو وہ شروع ہی سے ہے اور ہر وہ کام جس میں کوئی چیلنج چھپا ہو' اسے کرنے میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔" عائشہ نے دانستہ خوش گوار لہجے میں جواب دیا۔ "بس بابا کے جس فیکٹری میں سب سے زیادہ شیئرز تھے وہ انہوں نے موحد کے ہی حوالے کر دی' آج کل وہ مینجنگ ڈائریکٹر بن کر سارے معاملات دیکھ رہا ہے اور خود کو خاصا انرجیٹک بھی محسوس کر رہا ہے۔"

"چلو اس نے یہ کام تو اچھا کیا' کم از کم اس کی قنوطیت تو ختم ہوگی۔"

"ہاں ماشاء اللہ خاصی تبدیلی آئی ہے اس میں۔" عائشہ کے ہر انداز میں اپنے بھائی کے لیے محبت تھی۔ "اب تو وہ امریکا جا کر مصنوعی ٹانگیں لگوانے کے لیے بھی تیار ہو گیا ہے۔"

"رئیلی۔۔۔؟" ماہم اس اطلاع پر فوراً" اٹھ بیٹھی۔ "یہ تو واقعی اس صدی کی حیران کن خبر ہے۔ اس کو میں نے کتنا سمجھایا تھا لیکن تب اسے یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔"

"ساری بات وقت کی ہوتی ہے اور چیزیں اسی وقت سمجھ میں آتی ہیں جب انسان سمجھنا چاہتا ہے۔" عائشہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہوں۔" وہ سر ہلا کر گلاس وال سے نظر آنے والے پھولوں کو دیکھنے لگی۔ کاسنی اور ارغوانی رنگ کے پھول آنکھوں کو بہت خوشنما لگ رہے تھے۔ ماہم کی نظریں ان پر تھیں۔ جبکہ دھیان کی ساری کھڑکیاں کہیں اور کھلی ہوئی تھیں۔

"ماہم! کچھ الجھی الجھی سی لگ رہی ہو' خیر ہے نا۔۔۔" ماہم کے چہرے پر کسی گہری سوچ کی پرچھائیں عائشہ کو حیران کر رہی تھیں۔ اس لیے وہ خود کو پوچھنے سے روک نہیں پائی تھی۔

"کچھ نہیں بس ویسے ہی طبیعت میں کچھ اکتاہٹ سی تھی' اس لیے اٹھ کر ادھر آ گئی۔" اس نے اپنے لہجے کو حتی الامکان ہلکا پھلکا رکھنے کی کوشش کی تو عائشہ نے سوالیہ انداز سے دیکھا۔

"پاپا کسی کورس پر لندن گئے ہوئے ہیں' ماما بھی ان کے ساتھ چلی گئیں۔ جب کہ ثمن آپی نے کافی دنوں سے چکر ہی نہیں لگایا۔" اس نے تفصیلاً" بتایا۔

"تم نے بتایا نہیں کہ شائلہ زبیر دوبارہ آئیں؟" عائشہ بھی اپنا کام مکمل کر کے اس کے پاس ہی فلور کشن پر آن بیٹھی تھی۔ اسے اچانک ہی یاد آیا تھا۔

"ہاں آئی تھیں۔" اس نے لمبا سا سانس لیا۔ "دو تین سیشن کے بعد کافی بہتر ہیں' لیکن عشق کا بخار اتنی

آسانی سے تھوڑی اترتا ہے۔" ماہم کے لہجے میں محسوس کی جانے والی بے دلی اور اکتاہٹ تھی اور یہ چیز عائشہ کو بہت حیران کر رہی تھی۔ اسے علم تھا کہ ماہم میں لاکھ خامیاں ہوں لیکن وہ اپنے پروفیشن کے ساتھ بہت مخلص تھی۔

"خیر دفع کرو تمہاری ایگزیبیشن تو بہت زبردست گئی ہے۔ میڈیا نے کافی کوریج دی تمہیں۔"

"بس اللہ نے بہت کرم کیا' ورنہ سچ پوچھو تو مجھے کوئی ایسی خاص توقع نہیں تھی۔" عائشہ کے انداز میں انکساری اور عاجزی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

"خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ اچھا خاصا تمہارا کام تھا خوامخواہ خود کو انڈر اسٹیمیٹ مت کیا کرو۔" عائشہ نے حیرت سے اسے دیکھا جو بدستور کھڑکی سے باہر نظریں جمائے محو گفتگو تھی۔

"کیا حال ہے تمہارے اس اینگری ینگ مین کا...؟" ماہم نے اچانک ہی مڑ کر اس سے پوچھا تو سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ وہ کس کے متعلق بات کر رہی ہے۔

"خدا کا خوف کرو ماہم! وہ میرا کہاں سے ہو گیا۔" عائشہ کی پیشانی پر بل پڑے۔

"بھئی! وہ مغرور بندہ تمہاری تخلیقات کو اتنی عقیدت سے دیکھ رہا تھا کہ مجھے لگا کیوپڈ کا تیر چل گیا ہے۔" ماہم کا انداز کچھ کھوجتا ہوا تھا۔

"میں ان کیوپڈ صاحب کے تیروں پر یقین نہیں رکھتی۔" عائشہ نے لاپروائی سے کہہ کر سنگھار میز سے لوشن اٹھایا اور اپنے ہاتھوں پر ملنے لگی۔ "ویسے بھی وہ آرٹ سے محبت کرنے والا بندہ ہے۔ روز پتا نہیں کتنے آرٹسٹوں سے ملتا ہو گا۔"

"لیکن عائشہ رحیم نام کی آرٹسٹ کے کام کے پیچھے تو وہ دیوانہ ہو رہا تھا۔ دیکھا نہیں تھا' پوری نمائش میں اسے تمہارے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔" ماہم کی آواز خاصی دھیمی تھی۔ عائشہ نے الجھ کر اسے دیکھا۔ وہ نہ جانے کیا جتانا چاہ رہی تھی۔

"خیر اب اتنی بھی لمبی نہ چھوڑو۔" عائشہ نے منہ بنایا۔ "اس نے پیرس' لندن' اسپین اور پتا نہیں کہاں کہاں سے آرٹ کے شاہکار اکٹھے کر رکھے ہیں۔" عائشہ اپنی انگلیوں سے رنگ کے دھبے اتارتے ہوئے بولی۔ "میری تو حوصلہ افزائی کے چکر میں وہاں آیا تھا۔" وہ نہ جانے کیوں ماہم کو خوامخواہ صفائی دے رہی تھی۔

"لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اسے تمہاری ہی حوصلہ افزائی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" ماہم کی بات پر اس نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"تم کہنا کیا چاہ رہی ہو...؟"

"مجھے کیا کہنا ہے یار..." وہ زہریلی سی ہنسی ہنس دی۔

"کیوں اس بے چارے غریب بندے کے پیچھے پڑ گئی ہو...؟" عائشہ نے دانستہ اپنا انداز ہلکا پھلکا رکھا۔

"وہ کہاں سے غریب لگا ہے تمہیں...؟" ماہم نے طنزیہ انداز سے اسے دیکھا۔ "محترمہ! ہنڈا اکارڈ میں موصوف آئے تھے۔"

"مجھے کیا پتا بھئی..." اس نے بے زاری سے کندھے اچکائے۔

"اتنی مہنگی گاڑی' اوپر سے موصوف کے سوٹ' جوتے' سن گلاسز سب برانڈڈ تھے۔ ہاتھ میں راڈو باندھ رکھی تھی اور تمہیں وہ غریب لگ رہا تھا؟" ماہم نے دل کھول کر اس کا مذاق اڑایا۔

"تمہیں اچھی طرح پتا ہے کہ میں برانڈ کانشس کبھی بھی نہیں رہی' میری بلا سے اس نے جو بھی پہنا ہو..." عائشہ نے بظاہر سادہ سے انداز میں کہا تھا لیکن دل ہی دل میں وہ ماہم کے بھرپور مشاہدے پر حیران تھی۔

"کل میں نے اسے اسلام آباد گولف کلب میں دیکھا تھا۔" وہ اس کی بات پر چونکی۔ یہ انکشاف کر کے وہ خود گلاس وال کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

"اچھا...؟" عائشہ لوشن کی بوتل کا ڈھکن بند کرنا بھول گئی۔ "پھر...؟"

"پھر کیا؟ انتہا کا بے مروت اور بدلحاظ قسم کا بندہ

ہے۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی بھی جھلک نہیں تھی۔" ماہم کے لہجے میں کڑواہٹ گھلنے لگی تھی۔

"اس نے تمہیں دیکھا نہیں ہو گا' ورنہ یہ کیسے ممکن ہے۔" عائشہ نے ٹشو باکس سے ایک ٹشو نکالتے ہوئے اسے تسلی دی جس کا چہرہ توہین کے احساس سے سرخ ہو رہا تھا۔

"خیر ایسے بھی کوئی حالات نہیں تھے۔ وہ میرے بالکل برابر میں ایک خوب صورت سی لڑکی کے ساتھ واک کر رہا تھا۔" ماہم کی اطلاع پر اس کا سانس اٹکا۔

"کس کے ساتھ...؟" وہ ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اسے لگا کہ اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

"ایک اچھی شکل و صورت کی نک چڑھی سی لڑکی تھی۔ جو ایک کلومیٹر چلنے کے بعد ہی تھک گئی تھی۔" ماہم کے لہجے میں حسد کی جھلک اس کے لیے بالکل نئی تھی۔

"تو کیا تم ایک کلومیٹر تک ان کے پیچھے چلتی رہی ہو؟" عائشہ کی بات پر وہ کھسیا سی گئی۔

"کیوں میرا کیا دماغ خراب تھا۔" اس کے جل کر بولنے پر عائشہ کو ہنسی آ گئی۔ "میں جس بینچ پر بیٹھی ہوئی تھی اس کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ محترمہ اسے کہہ رہی تھیں کہ وہ اب مزید نہیں چل سکتیں۔" ماہم نے جھنجلا کر وضاحت دی۔

"اوہ..." عائشہ نے ماہم کے چہرے پر واضح ناگواری کی لہر دیکھی۔ "تمہیں غصہ کس بات پر آ رہا ہے اس لڑکی کی نازک مزاجی پر یا اس شخص کی بے مروتی پر...؟" عائشہ نے شرارت سے پوچھا تو ماہم نے اس کے کندھے پر ایک چپت رسید کی۔

"مجھے تم پر غصہ آ رہا ہے کہ آخر کیا ضرورت تھی اپنی اتنی خوب صورت پینٹنگ اس سڑیل کو دینے کی۔" وہ خفا ہوئی۔

"تو میں نے کون سا مفت میں اٹھا کر دے دی تھی اسے۔" وہ آہستگی سے اٹھی اور کھڑکی کے پاس آ کر پام کے درختوں کے گہرے پتوں کو دیکھنے لگی۔ "اس نے اچھا خاصا بھاری بھر کم سا چیک دیا تھا معاوضے میں..." اس نے مڑ کر ماہم کا چہرہ دیکھا جس پر الجھن کے رنگ نمایاں تھے۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے اندازہ لگانے کی کوشش کی اور پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے بولی۔

"کیا سوچ رہی ہو ماہم...؟" اس کی بات پر ماہم چونکی۔

"میں سوچ رہی ہوں کہ آخر اس کے ساتھ وہ اسٹائلش سی لڑکی کون تھی۔" ماہم کی آواز اسے کسی گہرے کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ عائشہ کو بھی اپنا دل اسی کنویں میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ ماہم کی آنکھوں میں چبھن بھری سی چمک سے عائشہ کو پہلی دفعہ خوف سا محسوس ہوا۔

☼ ☼ ☼
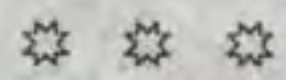
"تائی! یہ ڈاکٹر زویا کچھ عجیب سی ڈاکٹرنی نہیں بھلا...؟" جاجی ایک ٹرے میں دو چائے کے کپ اور رسک لے کر اندر آیا تو جمیلہ مائی کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"کی ہویا پتر؟" جمیلہ مائی نے ہڑبڑا کر جاجی کا پریشان چہرہ دیکھا۔

"کچھ نہیں تائی! اتنے غصے سے گھورتی ہے کہ لگتا ہے آنکھوں سے ثابت ہی نگل جائے گی۔" جاجی نے اپنے صافے سے ماتھے کا پسینہ صاف کرتے ہوئے سکینہ کو دیکھا۔ جو ململ کا دوپٹہ منہ پر ڈالے گہری نیند میں تھی۔ اسے دوپہر میں اعصاب کو پرسکون کرنے کے لیے کچھ ادویات ڈاکٹر خاور نے زبردستی کھلائی تھیں۔

"پتر! وڈے لوکاں دیاں وڈیاں گلاں ہوندیاں نے... اساں غریباں نوں کی کہنا۔" جمیلہ مائی کے لہجے میں دکھ کی کیفیت تھی۔

"تائی! تو تو ہمیشہ کہتی تھی کہ انسان بڑا اپنے رویے اور اخلاق سے ہوتا ہے۔" جاجی نے الجھن بھری نظروں سے اپنی تائی کو دیکھا جو آج کل بیٹھے بیٹھے کسی

گہری سوچ میں گم ہو جاتی تھی۔
"میریاں گلاں تے زیادہ غور نہ کریا کر جاجی! میں تاں نری جاہل تے اللہ دی مسکین بندی آں۔" جمیلہ مائی نے بسم اللہ پڑھ کر چائے کا کپ اٹھایا۔ آج کل وہ کبھی کبھار پنجابی بولنے کا شوق بھی جاجی کے ساتھ ہی پورا کر رہی تھی۔ ورنہ سکینہ تو بری طرح چڑ جاتی تھی۔
"تیرے تائے دا کوئی ٹیلی فون نئیں آیا پتر!" جمیلہ مائی نے گہری سوچ سے نکلتے ہوئے پوچھا۔
"کل آیا تھا۔ تایا کہہ رہا تھا کہ اس جمعرات کو لاری پر چڑھے گا اور ان شاء اللہ جمعے کی نماز اسی اسپتال کی مسجد میں پڑھے گا۔" جاجی کی اطلاع پر جمیلہ مائی نے سکون کا سانس لیا۔
"خیر تو ہے نا تائی! تو کچھ پریشان سی لگ رہی ہے۔" جاجی کی آنکھوں میں الجھن سی تیرنے لگی۔
"کچھ نئیں پتر! اے پریشانیاں تے زندگی دا حصہ اے۔ سوہنا رب بس کسی آزمائش میں نہ ڈالے۔" جمیلہ کا لہجہ پرسکون تھا۔
"تجھے ہزار دفعہ سمجھایا ہے تائی کہ تو سکینہ کی ٹینشن نہ لیا کر، اس کے علاج کے لیے مجھے اپنا سارا مال ڈنگر بھی بیچنا پڑا تو بیچ دوں گا۔" جاجی کی بات پر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔
"پتر۔ اگر سکینہ فیروی ٹھیک نہ ہوئی؟" جمیلہ مائی نے کھوجتی نظروں سے اس کا چہرہ پڑھا۔
"مجھے فیروی کوئی مسئلہ نئیں۔ میں خود سنبھال لوں گا، تائی! تجھے مجھ پر اعتبار نہیں ہے کیا؟" جاجی کی بات پر ایک بے بسی سے لبریز مسکراہٹ جمیلہ مائی کے لبوں پر ابھری۔
"پتر۔ تجھ سے زیادہ اپنے سوہنے رب پر اعتبار ہے۔ وہ میرے دل کے ٹکڑے کو کسی آزمائش نہیں ڈالے گا۔" جمیلہ مائی کے لہجے میں اندھا یقین ہلکورے لے رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر کھوجتی نظروں سے دیوار پر چڑھتی مکڑی کو دیکھا۔
"جاجی! ایک گل تے دس پتر۔" وہ جمیلہ مائی کی بات پر چونکا۔ "کیا تجھے واقعی میری سکینہ چنگی لگدی اے؟" جمیلہ مائی کے سوال پر وہ پہلے تھوڑا سا جز بز ہوا پھر ہنس پڑا اور پھر اپنے ہاتھوں کے کٹورے میں رکھ کر بولا۔
"چاچی! یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ جب سکینہ چھوٹی سی ہوتی تھی تو میں اس کی انگلی پکڑ کر پورے پنڈ میں گھوما کرتا تھا۔ ماسی شیداں کے (صحن) سے جامن چوری چوری لا کر دیتا تھا۔ اسی وجہ سے مجھے بے بے سے کتنی چھینٹی پڑتی تھی۔"
"ہاں بھئی، تیری بے بے کو غصہ بھی تو بہت آتا ہے نا۔" جمیلہ نے انتہائی محبت سے اپنی دیورانی کا ذکر کیا۔ وہ کچھ توقف کے بعد اداسی سے گویا ہوئی۔ "مگر جاجی! تیری بے بے کو میری سکینہ سے بہت خار چڑھتی ہے نا؟"
"نہیں نہیں تائی!" جاجی تھوڑا سا بوکھلایا۔ "میں اتنے دن سے یہاں ڈیرے ڈالے بیٹھا ہوں، وہاں گندم کی کٹائی ہو رہی ہے۔ اس لیے بے بے تو کھا گئی ہے۔" وہ بڑے عجلت بھرے انداز میں صفائی دے رہا تھا۔
"پتر! جمیلہ نے یہ بال دھوپ میں کھڑے ہو کر نہیں کیے۔ ایک ایک چٹے بال میں سالوں کا تجربہ ہے۔" جمیلہ مائی اس کی معصومیت پر مسکرائی۔
"بس تائی! بے بے وی نا۔" اس نے کان میں انگلی گھماتے ہوئے خجالت سے کہا۔ "ایویں سکینہ کی بیماری سے گھبرا گئی ہے۔"
"پتر! بیماری بھی تو آزمائش ہی ہوتی ہے اور آزمائش جو کسی بے گانے بندے کی ہو، اسے کون پکڑ کر اپنے گھر لاتا ہے۔" جمیلہ مائی کی بات جتنی بھی علجہ اتنا ہی سادہ تھا۔ جاجی ان کی بات پر کچھ کہنے کے بجائے سامنے دیوار کے کونے میں گھر بناتی مکڑی کو غور سے دیکھنے لگا۔ جس نے بڑی تیزی سے جالا بنا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میری سمجھ میں نہیں آتا بیٹا کہ میں آپ کا کیسے شکریہ ادا کروں۔" رامس کی ماما کے لہجے میں ماہم کے لیے محبت ہی محبت تھی۔

ماہم نے مسکراتے ہوئے اپنے سامنے بیٹھی خوب صورت خاتون کو دیکھا جن کی شخصیت دلکشی، متانت اور محبت کا بہترین امتزاج تھی۔ اس وقت وہ سفید اور سیاہ رنگ کے بلاک پرنٹنگ والے سوٹ میں بلا کی جاذب نظر لگ رہی تھیں۔
"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ صرف چھ ماہ میں میرا بیٹا بالکل پہلے کی طرح صحت مند انداز سے زندگی گزارے گا۔" وہ بڑے پروقار انداز میں مسکرائیں۔
"اسے بہت اچھی جاب ملی۔ لیکن آپ نے اسے اپنی گارمنٹس فیکٹری لگانے کا مشورہ دیا اور ماشاء اللہ وہ بہت عمدگی کے ساتھ اس پروجیکٹ پر کام کر رہا ہے۔"
"جی آنٹی! میرا خیال تھا کہ اپنا بزنس کرنے سے اس کے اعتماد میں مزید اضافہ ہو گا۔ اپنے کام کو انسان بھرپور توانائی کے ساتھ سرانجام دینے کی کوشش کرتا ہے نا۔" ماہم نے ہاتھ میں پکڑا نفیس سا قلم میز پر رکھ کر انہیں دیکھا جو حد درجہ مطمئن اور خوش نظر آ رہی تھیں۔
"جی میں آپ کی بات سے سو فیصد متفق ہوں۔" رامس کی ماما نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اس پروجیکٹ نے میرے بیٹے کو ماشاء اللہ ایک نئی زندگی بخش دی ہے۔ اس کے پاپا کی بھی لیدر کی پروڈکٹس کا بزنس تھا۔ اس حوالے سے ان کے دنیا بھر میں کونٹیکٹس تھے جو رامس کے بہت کام آئیں گے۔"
"جی ویٹس مائی پوائنٹ۔۔۔!" ماہم پرجوش ہوئی۔ "وہ آزاد منش انسان ہے، کسی کے ماتحت رہ کر کام کرنا اس کی فطرت میں نہیں ہے، اسی وجہ سے میں نے اسے یہ مشورہ دیا تھا۔" ماہم نے ہنستے ہوئے انہیں دیکھا جو توصیفی انداز سے ماہم کے بے داغ، اجلے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔
"آپ نے اس کی شخصیت کا بالکل سو فیصد درست تجزیہ کیا ہے ماہم!" انہوں نے کھلے دل سے اسے سراہا۔ "آپ واقعی بہت اچھی سائیکولوجسٹ ہیں۔" "مگر مجھے کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے مجھے خود بھی کسی اچھے سائیکولوجسٹ کی ضرورت ہے۔" اس کی صاف گوئی پر رامس کی ماما بڑے پروقار انداز سے مسکرائیں۔
"خیر ایسی تو کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔" انہوں نے ماننے سے صاف انکار کیا۔
"کیوں آنٹی۔" وہ دلچسپی سے ان کا پریقین چہرہ دیکھ رہی تھی۔
"آپ تو خود دوسروں کو اپنے علم سے فائدہ پہنچا رہی ہیں تو اپنی ذات سے اتنی لاپروا کیسے ہو سکتی ہیں؟" انہوں نے اپنی طرف سے بھرپور دلیل دی۔
"اچھا! تو کیا ڈاکٹر خود بیمار نہیں ہوتے؟" ماہم اب اس گفتگو سے محظوظ ہو رہی تھی۔
"جی ڈاکٹر بھی بیمار ہوتے ہیں۔ لیکن ان کو بیماری کے علاج کے طریقوں سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔" انہوں نے اپنی تیسری انگلی میں موجود ڈائمنڈ رنگ کو گھماتے ہوئے جواب دیا۔
"لیکن آپ کے معاملے میں تو میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی کہ آپ کو بھی کسی سائیکولوجسٹ کی ضرورت ہو سکتی ہے۔" وہ سنجیدہ ہوئیں۔ ماہم ہنس دی۔
"بیٹا ایک پرسنل سوال کر سکتی ہوں؟" وہ تھوڑا سا جھجک کا شکار ہوئیں تو ماہم نے دوستانہ انداز سے سر ہلایا۔
"آپ کی کہیں انگیجمنٹ وغیرہ تو نہیں ہوئی؟" ان کے کھوجتے انداز پر وہ ٹھٹکی۔
"نہیں آنٹی! ابھی ایسا تو کوئی سلسلہ نہیں۔" وہ تھوڑا سا محتاط ہوئی۔
"حیرت کی بات ہے، میں تو سوچ رہی تھی کہ اتنی پیاری بچی کے حقوق کسی نہ کسی کے نام محفوظ ہو چکے ہوں گے۔ اچھی چیزوں کی طرف تو لوگ فوراً لپکتے ہیں۔" رامس کی ماما کے دلچسپ انداز بیان پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔
"لوگ تو آنٹی بہت لپکتے ہیں، لیکن ماما کا کہنا ہے کہ میری خاص بیٹی کے لیے کوئی خاص الخاص چیز ہی ہونی

چاہیے۔" تاہم نے شریر انداز سے انہیں آگاہ کیا۔
"یہ تو وہ بالکل ٹھیک کہتی ہیں۔" وہ فوراً متفق ہوئیں۔ "ملواؤ نا اپنی ماما سے کسی دن ہمیں۔" انہوں نے اصرار بھرے انداز سے فرمائش کی تو وہ مسکرا دی۔
"جی آنٹی! کیوں نہیں' ماما ایک مہینہ پہلے پاپا کے ساتھ لندن گئی ہیں۔ پندرہ دن تک ان کی واپسی ہو جائے گی ان شاء اللہ۔ آپ آیئے گا ہمارے ہاں۔" اس نے کھلے دل سے انہیں دعوت دی۔
"آپ کے ہاں تو اب آنا ہی پڑے گا۔ رامس بھی کئی دفعہ مجھے کہہ چکا ہے۔" ان کے ذومعنی انداز پر تاہم کے دماغ میں گھنٹی بجی۔ اس نے چونک کر انہیں دیکھا جو محبت بھرے انداز سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

وہ اپنی سوچوں میں مگن اچانک ہی اس سنسان سی گلی سے باہر سڑک پر آئی تھی اور پیچھے سے آنے والی گاڑی کے زوردار ہارن کی وجہ سے اچھل کر فٹ پاتھ پر چڑھ گئی' اگر ڈرائیور فوراً بریک نہ لگاتا تو شاید اب تک گاڑی اس کو روندتی ہوئی چلی جاتی۔ وہ بڑی سرعت سے فٹ پاتھ کی دیوار سے ٹکرائی۔ تکلیف کے احساس کے ساتھ ہی جھک کر اپنے پاؤں کے انگوٹھے کو دیکھنے لگی۔ ناخن فٹ پاتھ کے فرش کے ساتھ ٹکرانے کی وجہ سے تھوڑا سا اکھڑ کر تکلیف کا باعث بن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔
"محترمہ! آپ کا اگر خودکشی کا ارادہ ہے تو اس سڑک پر میری گاڑی کے علاوہ بھی بے شمار گاڑیاں ہیں۔" سیاہ رنگ کا چشمہ اتار کر اس نے سامنے کھڑی حواس باختہ سی لڑکی کو دیکھا' جو ہراساں نظروں سے سامنے کھڑی گاڑی کو منہ کھولے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے نے ایک منٹ میں کئی رنگ بدلے تھے۔
"آپ سکندر شاہ ہیں؟" ثنائلہ اپنے پاؤں کی تکلیف بھول کر ٹکٹکی باندھے اس شخص کو دیکھ رہی تھی' جو اسے پورے ایک ماہ اور دس دن کے بعد نظر آیا تھا۔
"کیا مطلب؟" اس کے ماتھے کے بل
ہوئے۔
"آپ سکندر شاہ ہیں نا؟" اس نے بے صبر
پوچھا۔
"جی نہیں' میرا نام ہرگز سکندر شاہ نہیں۔" بادامی رنگ کی آنکھوں میں الجھن کے رنگ
وہ گاڑی کا شیشہ نیچے کیے بغور اسے دیکھ رہا تھا۔
"پھر آپ کا کیا نام ہے؟" ثنائلہ کا سوال اتنا
نہیں تھا جتنا پوچھنے کا انداز بچکانہ تھا۔
"آپ کی تعریف؟" اس نے طنزیہ انداز
بھنویں اچکا کر اس لڑکی کو دیکھا جو خوامخواہ بے تکلف ہونے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔
"مجھے ثنائلہ کہتے ہیں۔" اسے اپنی حماقت
احساس اس شخص کے چہرے پر چھائی بےزاری
بخوبی ہو گیا تھا۔
"پھر۔" اس کی سوالیہ نظروں سے وہ بوکھلا
گئی۔
"اصل میں آپ کی شکل میری ایک دوست
بھائی سے بہت ملتی ہے۔" اس نے انتہائی بے
انداز سے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔
"تو محترمہ اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے
کے کام ہیں۔" اس نے اکتاہٹ بھرے انداز سے
لڑکی کو دیکھا۔ جس کے ہاتھ میں موجود فائل سا
کیچڑ میں گر گئی تھی اور وہ اس سے بے نیاز اس
تفتیش کرنے میں مگن تھی۔
"محترمہ! پہلے اپنے ڈاکومنٹس سنبھالیں آپ
اس کے توجہ دلانے پر ثنائلہ نے اس کی نظروں
تعاقب میں دیکھا۔
"اوہ نو۔" وہ فوراً لپکی' لیکن ایک ہی قدم چل
کوشش میں لڑکھڑا گئی۔
"میڈم! یہ لیں اپنے کاغذات۔" اس کا ڈرائیور
لپک کر اترا اور فائل اس کی طرف بڑھائی' جو
خراب ہو چکی تھی۔ جبکہ ثنائلہ بے بسی سے

اکھڑے ہوئے ناخن کو دیکھ رہی تھی جو اسے تکلیف دے رہا تھا۔
"نہیں اب اس کا کیا اچار ڈالوں گی۔ مجھے انٹرویو کے لیے جانا تھا۔" اس نے چڑ کر گاڑی کی سیٹ پر ڈھٹائی سے براجمان شخص کو دیکھا۔ جس نے نیچے اترنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔
"کہاں انٹرویو کے لیے جانا ہے آپ کو؟" وہ رسٹ واچ پہ ٹائم دیکھتے ہوئے سرد مہری سے بولا تھا۔
"جہاں بھی جانا ہو۔ سارا ٹائم تو یہیں نکل گیا ہے۔" ثنائلہ نے رنجیدگی سے ڈرائیور کے ہاتھ میں اپنی فائل کو دیکھا۔ جس پر کیچڑ کا بڑا سا داغ لگ گیا تھا۔ اس سے بھی بڑا داغ اس کے دل میں سکندر شاہ کی طرف سے لگ گیا تھا۔
"جو ہونا تھا محترمہ! وہ تو ہو گیا۔ آپ اپنی ڈاکومنٹس والی فائل میرے ڈرائیور کو دے دیں۔ میری کمپنی کو بھی کچھ ورکرز کی ضرورت ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ ایڈجسٹمنٹ ہو جائے۔" اس نے سنجیدگی سے کہہ کر اپنے ڈرائیور کو اشارہ کیا' جو بڑی سرعت سے اپنی سیٹ پر آن بیٹھا تھا۔ وہ اس کی اس قدر غیر متوقع بات پر ششدر رہ گئی۔
"لل... لیکن۔" اس نے بولنا چاہا۔
"آپ کا سی وی ہے نا اس میں؟" اس کے دوٹوک اور حتمی انداز پر ثنائلہ نے بوکھلا کر گردن ہلائی۔ "لیکن اس پر تو کیچڑ لگ گئی ہے۔"
"انسان کے اپنے کردار پر کوئی کیچڑ نہیں لگنی چاہیے۔ کاغذوں کی خیر ہوتی ہے۔" اس نے اپنے ڈرائیور کو گاڑی چلانے کا اشارہ کیا اور اگلے ہی لمحے گاڑی فراٹے بھرتی اس کی نظروں سے دور ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

"واہ! تم نے تو یہ بڑا افسانوی سا واقعہ سنایا ہے مجھے۔" کیریوں کو نمک لگا کر کھاتی ہوئی تابیہ نے بڑے مزے سے اپنی دوست کو دیکھا جو دھلے ہوئے کپڑے جھٹک جھٹک کر تار پر پھیلا رہی تھی۔ وہ جیسے ہی شام میں اس کی طرف آئی۔ ثنائلہ نے اسے صبح پیش آنے والے واقعے سے آگاہ کر دیا۔
"ہاں۔ مجھے تو خود بھی یقین نہیں آرہا۔" ثنائلہ نے تولیے کو نچوڑتے ہوئے سادگی سے کہا۔ "ایک لمحے کو تو میں دنگ ہی رہ گئی تھی کہ وہ اس طرح میرے سامنے آجائے گا۔"
"ویسے تھا وہ کیسا؟" تابیہ نے بہت شوخی سے پوچھا تو وہ مسکرا دی۔
"حلیہ تو ویسا ہی تھا جیسے کہ میں نے اپنی کہانی میں بیان کیا تھا لیکن مزاجاً وہ مجھے کچھ اکھڑا اکھڑا اور خشک سا لگا تھا۔ سچ پوچھو تو مجھے اس سے بات کر کے مایوسی سی ہی ہوئی۔" وہ کسی سوچ کے تانے بانے میں الجھی اب کپڑے اور زیادہ جھٹک جھٹک کر پھیلا رہی تھی۔
"یہ تو بالکل فطری سی بات ہے۔ وہ تمہاری کہانی کا ایک کردار تھا اور تم لکھاری لوگ تو ویسے بھی زیب داستاں کے لیے کچھ بڑھا چڑھا کر لکھ دیتے ہو' جبکہ وہ شخص ایک جیتی جاگتی حقیقت کے طور پر سامنے تھا۔" تابیہ نے ہاتھ میں پکڑی ایک چھوٹی سی کیری انار کے درخت پر بیٹھی گلہری کو ماری' جو اچھل کر دوسری شاخ پر چڑھ گئی۔
"ویسے خالہ نے تمہیں نوکری کرنے کی اجازت کیسے دے دی؟"
"کیسے نہ دیتیں۔" اس نے رنجیدگی سے بھرپور سانس بھری۔ "حالات تمہارے سامنے ہیں۔ گھر آثار قدیمہ کا اعلا نمونہ بن چکا ہے اور شمیر کی طرف سے کوئی امید نہیں۔"
"ہاں یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔ سب سے پہلے اس کھنڈر گھر کا حلیہ ٹھیک کرنا۔" تابیہ کو اس گھر کی خستہ حالی ہمیشہ دکھی کرتی تھی۔
"ہوں... ارادہ تو یہ ہی ہے۔" اس نے آزردگی سے کہا تھا۔
"اگر سکندر شاہ کی طرف سے کوئی کال نہ آئی تو؟" تابیہ کی بات پر اس کی سانس اٹکی۔
"تو کوئی بات نہیں' اللہ کوئی اور سبب بنا دے گا۔"

اس نے پریقین انداز سے کہا تو تابیہ مسکرا دی۔

☼ ☼ ☼

صبح راؤنڈ پر ڈاکٹر خاور کے ساتھ سکینہ کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ڈاکٹر زویا کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اس نے سخت حیرت اور بے یقینی سے سامنے آسمانی رنگ کے لان کے سوٹ میں ملبوس سکینہ کو دیکھا جو خاصی نکھری سی لگ رہی تھی۔

"واہ ڈاکٹر زویا! آج تو آپ کا اور آپ کی مریضہ کا سوٹ بالکل ایک جیسا ہے۔" سسٹر ماریہ کی بات پر تو گویا ڈاکٹر زویا کو کرنٹ سا لگا تھا۔ جبکہ سکینہ کی فائل کو دیکھتے ڈاکٹر خاور نے بھی سر اٹھا کر بڑی خوش گوار حیرت کے ساتھ دونوں کو دیکھا۔ سکینہ کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ جبکہ ڈاکٹر زویا نے اپنے چہرے پر پھیلی ناگواری کو بمشکل چھپایا۔ توہین کے شدید احساس کی وجہ سے ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اتنا مہنگا سوٹ سکینہ جیسی لڑکی نے خرید بھی کیسے لیا۔ جس کا تو علاج ہی بیت المال کے توسط سے ہو رہا تھا۔

"کیا آپ دونوں یہ سوٹ اکٹھے لے کر آئی تھیں؟ رنگ، کڑھائی، سب کچھ ایک جیسا ہے۔" سسٹر ماریہ کی چلتی زبان ڈاکٹر زویا کو سخت زہر لگ رہی تھی۔

"سسٹر! آپ فالتو باتیں کرنے کے بجائے کام پر دھیان دیں۔" ڈاکٹر زویا کے تنبیہی لہجے پر وہ تھوڑا سا سنبھل گئی۔ جبکہ سکینہ کی خوشی کی کوئی انتہا ہی نہیں تھی۔ ڈاکٹر خاور اس کی فائل پر کچھ لکھتے ہوئے زیر لب مسکرائے۔ انہیں علم تھا کہ یہ وہ ہی سوٹ ہے، جو ان کی ماما نے سکینہ کے لیے بھجوایا تھا۔

"سکینہ! یہ جو آپ کے کمرے کے کونے میں واکر رکھی ہے، اس کا مقصد شوپیس بنا کر رکھنا نہیں، بلکہ استعمال کرنا ہوتا ہے۔" انہیں یاد آیا تو انہوں نے ہلکے پھلکے انداز سے ڈانٹا۔

"ڈاکٹر صاحب! مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں۔" سکینہ نے اپنی کاجل لگی آنکھوں کو پھیلا کر بات ادھوری چھوڑی۔

"ڈر کس بات کا۔" انہوں نے دونوں بازو باندھ کر اس کی بات قطع کی اور دلچسپی سے ...

"مجھے لگتا ہے کہ میں اس کی مدد سے چل ... جاؤں گی۔" سکینہ نے جھجکتے ہوئے اپنا ... تو وہ کھل کر مسکرائے۔ "بھئی جب تک ... کوشش نہیں کریں گی تو مسئلہ حل کیسے ہوگا؟ ... سی ہمت پکڑیں یہ قطعاً" مشکل کام نہیں ..." انہوں نے نرم لہجے میں کافی سارے امید کے ... پکڑا ئے۔

"کوشش تو کرنا پڑے گی، ظاہر ہے آپ ... زندگی تو اسپتال میں نہیں رہ سکتیں۔" ڈاکٹر زویا ... تیکھے لہجے پر ایک تاریک سا سایہ جمیلہ مائی کے ساتھ سکینہ کے بھی چہرے پر دوڑا تھا۔

"نہیں، نہیں زویا! آپ کو پتا نہیں ہے، سکینہ ... بہادر لڑکی ہے۔" ڈاکٹر خاور کی تصحیح پر زویا ... مسکرائیں۔ حالانکہ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب ... رہی تھیں کہ کون سا لمحہ ہو اور وہ گھر جا کر ... اپنے جسم سے اتاریں جس کی وجہ سے آج ... بڑی سبکی کا احساس ہوا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب میں کوشش کروں گی۔" سکینہ ... کچھ سوچ کر کہا۔

"شاباش، گڈ گرل۔۔۔" وہ مسکرا کر ایک دفعہ ... سکینہ کے دل کی دنیا تہ و بالا کر گئے۔ اب تو شکر ... سکینہ نے خود کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا۔ وہ ڈاکٹر ... کے سامنے اپنا چہرہ سپاٹ رکھنے کی بھرپور کوشش ... اور اس کوشش میں کسی نہ کسی حد تک کامیاب ... رہتی۔

"دیکھا اماں! ڈاکٹر زویا کی شکل پر کیسے بارہ بج ... تھے۔ قسم سے مجھے تو سواد ہی آگیا تھا۔" ان لوگوں ... کمرے سے نکلتے ہی سکینہ نے باقاعدہ چٹخارہ لیا تو ... مائی نے تاسف بھری نظروں سے اس کے ... کو دیکھا جس پر اتار پھوٹ رہے تھے۔

"یہ امیر لوگ ہر چیز پر اپنی ہی اجارہ داری ... کسی گھر میں کام کرنے والی ملازمہ اگر مالکن کی ... کا پرنٹ بھی پہن لے تو مالکن دوبارہ اس سوٹ کو ... ہاتھ بھی نہیں لگاتی۔ یہ کہاں کی انسانیت ہے اماں!"

سکینہ کی تلخ بات پر جمیلہ مائی نے سنجیدگی سے کہا۔

"پتر! پرائی چیزوں کے اوپر مان بجا نہیں ہے۔ ... مقابلے بازی بھی اپنے ہاں (مقابلے) کے لوگوں میں بجتی ہے۔" جمیلہ مائی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی ... حسب عادت چڑ گئی۔

"اماں! میں نے کب ڈاکٹر زویا کے ساتھ اپنا مقابلہ کیا ہے۔ وہ ہی خوامخواہ میرے پیچھے پڑ گئی ہیں۔"

"پتر! تجھے اچھی طرح پتا ہے کہ وہ تیرے پیچھے کیوں پڑی ہے۔" جمیلہ مائی کے جتاتے ہوئے لہجے پر اس کا منہ سرخ ہوا۔ "پرائی چیزوں پر نظر رکھے گی تو مالکوں کی آنکھوں میں کھٹکے گی ہی، اس لیے مخمل پر ٹاٹ کا پیوند لگانے کی کوشش نہ کر، سنبھل جا۔"

"اماں۔۔۔" سکینہ کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ "اماں! تیری باتوں سے مجھے اب لگتا ہے تو میری سگی نہیں، سوتیلی ماں ہے۔" اس کی بدلحاظی اور بدگمانی عروج پر تھی۔

"سگی ماں ہوں تو سمجھاتی ہوں، ورنہ سوتیلی کو کیا پڑی کہ تجھے اندھے کنویں میں گرنے سے بچائے۔" جمیلہ مائی نے اس کی نم آنکھوں سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"اس دن میری نعت کے مقابلے میں کوئی پوزیشن نہیں آئی۔ تب بھی تو نے میرا ذرا بھی لحاظ کیے بغیر کہہ دیا کہ باقی لوگوں نے نعت زیادہ اچھی پڑھی تھی۔" سکینہ کو اپنا ایک پرانا دکھ بالکل صحیح موقع پر یاد آیا تھا۔

"چل تو نے اس دن والی بات کر ہی دی تو اچھا ہے، تجھے بتا دوں۔" جمیلہ مائی وضو کے لیے کھڑی ہوئیں۔ "آج ایک بات کان کھول کے سن لے سکینہ! پتا ہے تیری پوزیشن کیوں نہیں آئی؟" سکینہ نے دہل کر اس کی شکل دیکھی۔

"تیرے غرور کی وجہ سے۔۔۔" جمیلہ مائی نے ایک خنجر تو اس کے نازک دل میں اتارا تھا۔

"تو اپنی خوب صورت آواز پر بہت مان کرتی تھی نا، اللہ نے تجھے سبق سکھانے کو جھٹکا دیا ہے کہ سنبھل جا، لیکن یہ جھٹکے بھی شاید عقل والوں کے لیے ہوتے ہیں۔" جمیلہ مائی کی صاف گوئی نے سکینہ کا دل چکنا چور کردیا۔ وہ سخت صدمے اور بے یقینی سے اماں کو دیکھتی رہ گئی۔ جو اپنی بات کر کے فوراً" ہی غسل خانے میں گھس گئی تھیں۔ جبکہ سکینہ کی آنکھوں سے آنسو ایک قطار کی صورت میں بہنے لگے۔ اسے لگا کہ اس کی قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی ہے۔

☼ ☼ ☼

"کیا اس سڑک پر آپ کا کوئی سیاسی جلسہ وغیرہ کرنے کا ارادہ ہے؟" شرارت سے بھرا ایک لہجہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا تو عائشہ کے لبوں سے بڑی پرسکون سی سانس خارج ہوئی۔ اس نے بے اختیار مڑ کر دیکھا۔ سیاہ پینٹ پر آسمانی شرٹ پہنے آنکھوں پر سیاہ گاگلز چڑھائے وہ عین اس کے پیچھے تھا۔

"ایسا کوئی ارادہ تو نہیں تھا۔" عائشہ نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا جو گلاسز اتار کر اپنی سحر انگیز آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"لیکن سوچ رہی ہوں کہ جتنے لوگ اکٹھے ہو چکے ہیں ایک آدھ تقریر کھڑکا ہی دوں۔" اتنی سخت گرمی میں بھی عائشہ کی خوش اخلاقی عروج پر تھی۔

"پوچھ سکتا ہوں کہ یہ عوام الناس کس خوشی میں آپ کی گاڑی کا گھیراؤ کیے ہوئے ہے۔" اس نے جانچتی نظروں سے معاملہ سمجھنے کی کوشش کی۔

"سب اپنے اپنے ہنر آزما رہے ہیں میری معصوم گاڑی کے جگر پر۔" عائشہ نے مزے سے کہا۔

"کیا مطلب، کون سے ہنر؟" اس نے اب غور سے ان کی کارروائی کو دیکھا۔

"گاڑی کی چابی اندر رہ گئی ہے اور دروازے سب لاک ہیں۔"

"اوہ، لیکن اتنے سارے لوگ کیسے اکٹھے

ہوگئے۔" اس کی حیرت کم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

"قوم کے نوجوانوں نے اپنی بہن کی ایک آواز پر لبیک کہا اور آ گئے۔" عائشہ نے ہلکے پھلکے انداز سے اپنا مسئلہ بتایا۔

"واہ کیا بات ہے۔ میرے جیسا کوئی مسکین بندہ ہوتا تو یقین کریں کوئی بھی گھاس نہ ڈالتا۔" اس کے انداز میں شرارت محسوس کر کے وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ اب اس کی گاڑی کے دروازے کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ تجربات کرنے سے بہتر ہے کہ ہم کوئی مکینک لے آئیں۔" اس کے مشورے پر عائشہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ وہاں موجود لوگوں سے کسی قریبی شاپ کا پوچھ کر اب اپنی گاڑی کا دروازہ اس کے لیے کھول چکا تھا۔

"اور آج کل کس پینٹنگ پر کام چل رہا ہے؟" اس نے گاڑی کا کلچ دباتے ہوئے اشتیاق بھرے انداز سے پوچھا۔

"کوئی خاص نہیں، بس آج کل موحد کے آغس کے لیے ایک خاص چیز بنانے کا ارادہ ہے۔" اس نے بے تحاشا ٹریفک کے ہجوم میں بڑی مہارت سے گاڑی چلاتے اس شخص کو دیکھا جس سے ایک عجیب سی اپنائیت محسوس ہوتی تھی۔

"گڈ! جب مکمل ہو جائے تو مجھے ضرور دکھائیے گا۔" اس نے گیئر بدلتے ہوئے فرمائش کی۔

"ہرگز نہیں، پھر آپ کہیں گے کہ مجھے بھی ویسی بنا کر دیں۔" عائشہ کی شوخی اسے اچھی لگی تھی۔ تب ہی وہ بڑے دل سے قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"نہیں کہتا جناب! ہمیں معلوم ہے کہ آپ ہم جیسے غریب لوگوں کو لفٹ نہیں کروائیں گی۔"

"جی جی! پہلا غریب بندہ دیکھا ہے جو اتنی مہنگی گاڑی میں گھوم رہا ہے۔" اسے بالکل درست موقع پر ماہم کی بات یاد آئی تھی۔ اس کی بات پر وہ ایک دفعہ پھر ہنسا۔

"مائی گاڈ کتنی پہچان ہے آپ کو گاڑیوں کی۔" اس کی بات پر وہ ایک دم خفت زدہ ہوئی۔

"خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں، میری فرینڈ اصل میں گاڑیوں کا کریز ہے۔ اسی کے ذریعے معلومات ملتی رہتی ہیں۔" اس نے خوامخواہ صفائی دی تو وہ چونک گیا۔

"کون سی فرینڈ؟ وہ جو اس دن ایگزیبیشن میں آپ کے ساتھ چپکی ہوئی تھیں؟"

"جی! وہ ہی جن کو اس دن آپ نے اسلام آباد گولف کلب میں پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔" عائشہ کی زبان بڑے غلط موقع پر پھسلی تھی۔

"اچھا! میں نے تو نہیں دیکھا انہیں۔" اس کے لہجے کی سچائی پر عائشہ کو یقین آ گیا تھا۔ "ویسے دیکھ بھی لیتا تو شاید بات نہ کرتا۔ کیونکہ میں ان کو بالکل بھی نہیں جانتا۔"

"جانتے تو آپ مجھے بھی نہیں تھے۔" وہ جو گاڑی پارکنگ میں کھڑا کرنے کے لیے مناسب جگہ دیکھ رہا تھا، اس کی بات سے لطف اندوز ہوا۔

"آپ کو تو پہلی نظر دیکھنے پر ہی مجھے یوں لگا کہ جیسے ہمارے درمیان صدیوں کی آشنائی ہے۔ کبھی کبھی اچانک ہی ہماری کسی بندے کے ساتھ کیمسٹری میچ کرنے لگ جاتی ہے۔ ہے نا؟" وہ تھوڑا سا جھک کر مسکراتے ہوئے اس سے تصدیق کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کے لہجے میں کچھ تھا کہ عائشہ گڑبڑا سی گئی۔

"ہاں شاید۔" اس نے اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"شاید نہیں، یقیناً۔" وہ اس کی گہری نظروں کے حصار میں تھی۔

"اوہ نو...!" عائشہ کی نظر سامنے سڑک پر پڑی۔ لوگ ایک ورکشاپ کے بالکل سامنے تھے۔ جب دس بارہ سالہ بچے کو ایک موٹر سائیکل سوار شخص مار کر بھاگ گیا تھا۔

"مائی گاڈ!" وہ بہت عجلت میں گاڑی سے اترا۔ ورکشاپ کے آگے کچی سی جگہ پر مٹی کے اوپر گرے بچے کو اس نے تیزی سے جا کر اٹھایا۔ اس کے سر سے خون ایک فوارے کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ عائشہ ایک دم گھبرا سی گئی تھی۔

"عائشہ! یہاں پاس ہی میرے دوست کا کلینک ہے۔ پہلے اسے وہاں لے جاتا ہوں۔ اسے فوری ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہے۔" اس بچے کا خون اس کی شرٹ کو خراب کر چکا تھا۔ اس بچے کے کپڑوں اور ہاتھوں پر لگی گریس کے نشانات سے انہوں نے اندازہ لگایا کہ وہ سامنے والی ورکشاپ پر کام کرتا ہے۔ اب وہاں کافی لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ اس نے اپنا رومال اس بچے کے سر پر مضبوطی سے باندھ دیا تھا۔

اگلے دس منٹوں میں وہ قریبی کلینک میں تھا۔ عائشہ کو اس نے گاڑی میں ہی بیٹھے رہنے کی تلقین کی اور وہ خود اس بچے کو لے کر کلینک میں چلا گیا۔ عائشہ حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جس کی شرٹ بالکل خراب ہو چکی تھی۔ اور وہ اس سے لاپروا بڑے پراعتماد انداز سے چل رہا تھا۔ عائشہ کو پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ ان دونوں کی کیمسٹری بالکل ٹھیک میچ ہوئی ہے۔

☼ ☼ ☼
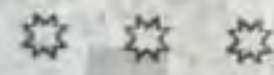
"ماہم! تمہیں آخر ہوا کیا ہے؟" رامس کو اس کا مضطرب انداز بہت بے چین کر رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ساتھ نہیں تھی۔

"تم سب لوگوں کو آخر یہ کیوں لگ رہا ہے کہ مجھے کچھ ہوا ہے؟" اس کے ساتھ ڈنر کرتی ماہم جھنجھلا گئی۔ "ادھر عائشہ کی تفتیش نے بھی بے زار کر رکھا ہے۔"

"دیکھا؟ اس کا مطلب ہے کہ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ جب میرے علاوہ بھی کسی اور کو لگ رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہی ہے کہ تم میں کوئی نہ کوئی تبدیلی تو آئی ہے نا۔"

"کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بس تم لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" ماہم نے ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑا تو وہ تعجب انگیز نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"حیرت ہے کہ تمہیں بھی غصہ آتا ہے۔" وہ فرائیڈ رائس پر منچورین ڈالتے ہوئے سادگی سے بولا۔

"کیوں میں انسان نہیں ہوں کیا؟" ماہم نے ہاتھ میں پکڑا کانٹا پلیٹ میں پٹخا تو وہ اور حیران ہوا۔

"انسان تو ہو، لیکن تم ایک سائیکولوجسٹ بھی ہو۔"

مجھے بھی ان تمام مسائل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے جو ایک عام انسان کو درپیش ہوتے ہیں۔" ماہم کو نہ جانے کیوں اپنے غصے پر قابو پانا دشوار ہو رہا ہے۔

"لیکن تم عام انسانوں سے زیادہ ان مسائل پر قابو پانے کی اہلیت رکھتی ہو ماہم!" رامس کی آنکھوں میں نرمی کا تاثر دیکھ کر وہ کچھ ڈھیلی ہوئی۔ "آئی ایم سوری رامس! پتا نہیں کیوں طبیعت پر کچھ بے زاری سی ہے۔ پچھلے کچھ دنوں سے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا۔"

"ہوں..." وہ ذو معنی انداز سے مسکرایا۔ "مجھے تو یہ سب آثار محبت کے لگ رہے ہیں۔ کہیں محبت وحبت تو نہیں ہو گئی تمہیں؟" اس نے چھیڑا۔

"محبت..." وہ چونکی۔ "مجھے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اس نے برا سا منہ بنایا۔

"کیوں؟ تم انسان نہیں ہو، کیا تمہیں محبت نہیں ہو سکتی؟" اس نے شریر انداز سے اسے جتایا تو وہ ہنس دی۔

"بہت تیز ہو تم فوراً ہی حساب برابر کرتے ہو۔"

"ہائے گاڈ نہیں، ایسے ہی زبان پھسل گئی تھی۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے فوراً صفائی دی۔

"ہوں... تمہیں لگتا ہے کہ مجھے محبت ہو گئی ہے۔ کیسے بھلا؟" وہ اب بڑی دلچسپی سے پوچھ رہی تھی۔ بے زاری کا احساس ایک دم ہی ختم ہوا تھا۔

"کیونکہ جب میں محبت کی واردات سے گزرا تھا تو میرے ساتھ بھی یہ ہی ہوا تھا۔ عجیب سی بے چینی اور جھنجھلاہٹ نے پورے وجود کا احاطہ کر لیا تھا۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ بس دل کرتا تھا کہ ایک ہی شخص سے ملوں۔ اسی کو دیکھوں۔ اسی سے بات کروں۔" وہ

کانٹے اور چھری کا بڑی مہارت سے استعمال کرتے ہوئے اسے اپنی داستان مزے سے سنا رہا تھا۔ ماہم نے خوش گوار حیرت سے اس کا انتہائی پراعتماد انداز دیکھا۔ وہ اس وقت بلیو جینز پر پنک ٹی شرٹ پہنے ہوئے بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔

"اچھا۔" ماہم نے اپنے گلاس میں پانی انڈیلا۔

"ویسے بائی داوے تمہیں کس سے محبت ہوئی تھی؟"

اس کی خود ساختہ بے نیازی پر وہ ہنسا۔

"تمہیں نہیں پتا۔"

"نہیں۔" ماہم نے بمشکل اس کی آنکھوں میں چمکتے جگنوؤں سے نظریں چرائیں۔

"اگر تمہیں نہیں پتا تو پھر تو پوری دنیا میں کسی کو بھی نہیں پتا ہوگا۔" اس نے مصنوعی مایوسی سے اسے دیکھا۔

"یہ کیا بات ہوئی بھلا۔" ماہم نے بمشکل اپنی مسکراہٹ کو چھپایا۔

"ذرا میری آنکھوں میں دیکھ کر یہ بات کرو۔" اس کے لہجے سے زیادہ اس کی نظروں کی حدت نے ماہم کے چھکے اڑائے۔

"اس میں کون سی مشکل ہے۔" وہ خود کو سنبھالے اب اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں! تم ایسا کر سکتی ہو کیونکہ تم کوئی عام سی لڑکی تھوڑی ہو۔" اس نے توصیفی انداز سے اسے سراہا۔

"اس میں کوئی شک بھی نہیں۔" اس نے اپنی راج ہنس جیسی گردن اٹھا کر دیکھا۔ اسی لمحے اس کی نظر گلاس وال سے باہر پارکنگ کی طرف پڑی۔ اس کا دل دھک کر کے رہ گیا۔ گلاس وال چونکہ رامس کی پشت پر تھی۔ اس لیے وہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جبکہ ماہم سخت بے یقینی سے اسی شخص کو دیکھ رہی تھی جو اسی دن والی لڑکی کے ساتھ اپنی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ وہ لوگ شاید اس ہوٹل کے فرسٹ فلور پر بنے فیملی ہال سے کھانا کھا کر نکلے تھے۔

"کیا ہوا۔" رامس نے جانچتی نظروں سے اس کا پھیکا پڑتا چہرا دیکھا۔

"کچھ نہیں۔" ماہم نے اپنی مرتعش ہوتی دھڑکنوں کو بمشکل سنبھالا۔ زبردستی مسکراتے ہوئے اس نے پانی کا گلاس لبوں سے لگایا۔ وہ اب تنقیدی نظروں سے کبھی رامس اور کبھی اس شخص کو دیکھ رہی تھی جو گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ رہا تھا۔ جبکہ اس کے ساتھ سیاہ سوٹ میں اسٹائلش سی لڑکی اس کے برابر کی سیٹ سنبھال چکی تھی۔ اس لڑکی کے انداز میں ایک محسوس کیا جانے والا استحقاق تھا۔

"کن سوچوں میں گم ہو جاتی ہو؟" وہ ہلکا سا جھنجلایا۔

"تمہارے دھیان سے نکلوں تو کچھ اور سوچوں۔" ماہم نے سراسر اسے بہلایا۔ جبکہ اس کے ایک چھوٹے سے جملے نے رامس کے چہرے پر اتنی روشنیاں پھیلا دی تھیں کہ ماہم کو اس کی طرف دیکھنا دشوار ہو گیا تھا۔

"تم سوچ بھی نہیں سکتی ہو کہ تم نے میری زندگی کو کتنا بدل دیا ہے۔ میں جو سوچتا تھا کہ بابا کے اس بہیمانہ قتل کے بعد میں دوبارہ کبھی نہیں سنبھل سکوں گا اور ٹینشن کے فیز سے کبھی نکل نہیں پاؤں گا، تم نے کتنی خوب صورتی اور مہارت سے مجھے زندگی کا یہ حسین رخ دکھایا ہے۔" وہ کھلے دل سے اس کو سراہ رہا تھا۔

"ماما تو صبح و شام تمہیں دعائیں دیتی ہیں۔ بھائی کو بھی تم سے ملنے کا اشتیاق ہے۔ کسی دن آؤ نا ہمارے گھر۔"

"انکل جواد کے ساتھ آؤں گی کبھی۔" ماہم نے اسے یوں ہی تسلی دی۔ اس کا اس ڈنر سے ایک دم ہی دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ سب کچھ چھوڑ کر اس شخص کے پیچھے نکل جائے جو اپنی ہنڈا اکارڈ میں ابھی ابھی یہاں سے نکلا تھا۔

"آخر مجھے ہوا کیا ہے۔" وہ بری طرح جھنجلا گئی۔ وہ خود بھی اپنی حالت کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

"اس شخص کے ساتھ کسی لڑکی کو دیکھ کر مجھے آخر کیوں غصہ آتا ہے۔" ذہن میں نمودار ہوتے اس

سوال پر وہ چونکی اور اگلے ہی لمحے اسے جھٹکا لگا اور اس نے سخت خوف زدہ نظروں سے اپنے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا، جس کے دل کی دنیا اس کے نام سے آباد ہو چکی تھی۔ جبکہ اسے اپنے دل میں ویرانیاں سی اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼
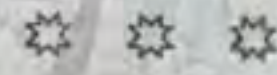
وہ سکینہ اللہ دتا کی زندگی کا ایک اہم ترین دن تھا۔ موسم کی دل فریبی اپنی جگہ، ہلکی ہلکی سی کن من نے ایک سماں باندھ رکھا تھا۔ ٹھنڈی ہوا اپنے ساتھ چمپا اور رات کی رانی کی مہک لیے آ رہی تھی۔ اس دن نہ جانے سکینہ کو کیا ہوا جو وہ واکر کے ساتھ چلنے پر چل اٹھی حالانکہ اس سے پہلے ڈاکٹر خاور اور دوسرے ڈاکٹرز نے کئی دفعہ ہمت بندھائی تھی لیکن سکینہ زمین پر پاؤں رکھنے کو آمادہ نہیں ہوئی تھی۔ اس دن اس نے سسٹر ماریہ سے خود ہی تھوڑا سا چلنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا وہ بھی اس کایا پلٹ پر حیران رہ گئی۔

"شاباش سکینہ! ہمت کرو۔" سسٹر ماریہ نے خلوص دل سے سکینہ کی ہمت بندھائی۔ وہ اپنے ساتھ ایک اور نرس کو مدد کے لیے لے آئی تھیں۔ اس وقت وہ چاروں کاریڈور میں تھیں جہاں شام کا وقت ہونے کی وجہ سے اکا دکا لوگ ہی تھے۔

"اماں۔۔۔" سکینہ نے ڈرتے ڈرتے وہیل چیئر سے اٹھ کر پاؤں زمین پر رکھا اور اس کا سارا وجود ہی لرز گیا۔

"بہت مشکل ہے اماں۔۔۔" وہ ایک جھٹکے سے وہیل چیئر پر بیٹھ گئی۔ اس کی سانسیں بے ربط اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمایاں تھیں۔ وہ اب زور زور سے سانس لے رہی تھی۔

"دیکھ پتر! تیری جسمانی حالت کچھ مضبوط ہوگی تو ڈاکٹر وڈا آپریشن کریں گے ناں، چل میری شہزادی۔۔۔"

"سکینہ اٹھو ناں، دیکھو! وہ ڈاکٹر خاور آ رہے ہیں، وہ تمہیں واکر کے ساتھ چلتا دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔" سسٹر ماریہ کی بات پر اسے کرنٹ سا لگا۔ سارا خوف اور ڈر ایک لمحے میں فضا میں تحلیل ہو گیا۔ وہ بڑے جوش کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔

"شاباش۔۔۔!" وہ واکر کو مضبوطی سے پکڑ کر کھڑی ہوئی تو سسٹر ماریہ نے کھلے دل سے اسے سراہا۔

"اماں۔۔۔" پہلا قدم اٹھاتے ہی اس نے باقاعدہ چیخ کر خوشی کا اظہار کیا تو جمیلہ مائی بے ساختہ مسکرائی۔ سکینہ کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ہوا میں خنکی تھی لیکن اس کے باوجود اسے لگ رہا تھا کہ پسینہ ہر مسام سے بہہ رہا ہے۔

سکینہ نے دوسرے کے بعد تیسرا قدم اٹھایا ہی تھا کہ اسے اپنی پشت پر ایک نسوانی قہقہے کا احساس ہوا۔

"ویری گڈ سکینہ!" ڈاکٹر خاور کے توصیفی لہجے پر سکینہ کے واکر پر جمے ہاتھ بری طرح کپکپائے۔ وہ ساکت پلکوں کے ساتھ وہیں جم گئی۔ اسے اپنی پشت پر ڈاکٹر خاور کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اس وقت مجسم سماعت تھی۔ اسے علم تھا کہ وہ اس کاریڈور کے دوسرے کونے سے اس طرف ہی آ رہے تھے۔

"ویری نائس۔۔۔! سکینہ اور ہمت کریں۔۔۔" ڈاکٹر خاور کی آواز سن کر خوشی کے مارے سکینہ کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ بڑھ گئی۔

"بسم اللہ۔۔۔" اس نے جیسے ہی اگلا قدم اٹھایا۔ اماں کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"دھیان سے، کہیں بہت تیز چلنے کی کوشش میں کوئی نقصان نہ کروا لینا۔"

زہر میں بجھے اس لہجے نے سکینہ کے پاؤں جکڑ لیے۔ وہ جھٹکے سے مڑی، آواز کی سمت دیکھنے کی کوشش میں اس کا پاؤں لڑکھڑایا اور ہاتھوں کی گرفت واکر سے بالکل ختم ہو گئی۔ ڈاکٹر زویا کی آواز پر دونوں نرسوں اور جمیلہ مائی کا دھیان بھی ایک لمحے کو ہٹا اور سکینہ اسپتال کے ٹائلوں والے فرش پر بری طرح گر پڑی۔ اس کی دل دہلا دینے والی چیخوں سے پورا کاریڈور گونج اٹھا۔ اس کی آواز میں اتنا کرب اور تکلیف کا احساس تھا کہ وہاں موجود تمام لوگوں کو اپنا دل پھٹتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ ایک لمحے کو تو ڈاکٹر زویا کو بھی اپنی روح فنا ہوتی ہوئی اور جسم کے رونگٹے کھڑے

ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔

☼ ☼ ☼

"شائلہ زبیر! آپ جاب کیوں کرنا چاہتی ہیں؟" وہ پیپر ویٹ اپنی ہتھیلی پر گھماتے ہوئے اپنے سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے چہرے پر لکھی کوفت کی تحریر با آسانی پڑھی جاسکتی تھی۔ اس نے دو دن پہلے ہی اسے انٹرویو کے لیے کال کیا تھا۔

"لوگ جاب کیوں کرتے ہیں؟" شائلہ کو اپنا بنایا ہوا بت ٹوٹنے کا اتنا افسوس تھا کہ وہ زیادہ دیر تک تحمل کا مظاہرہ نہیں کرسکی تھی۔ اس کے لہجے کی تپش پر وہ مسکرایا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس نے پورے تین گھنٹے انتظار کے بعد اسے اپنے آفس میں بلوایا تھا۔ سیاہ آبنوسی لکڑی کی میز کے پیچھے بیٹھا وہ خاصا شان دار لگ رہا تھا۔

"ہوں، اچھا سوال ہے کہ لوگ جاب کیوں کرتے ہیں؟" اس نے ہاتھ میں پکڑا پیپر ویٹ میز پر رکھ کر اسے غور سے دیکھا اور کچھ توقف کے بعد گویا ہوا۔

"کچھ لوگ معاشی حالات کی تنگی کی وجہ سے جاب کرتے ہیں، کچھ ٹائم پاس کے لیے اور کچھ اپنی صلاحیتوں کو آزمانے کے لیے۔۔۔"

"اور کچھ اپنے گھر کی ٹپکتی چھتوں کو ٹھیک کروانے اور اپنی بیمار والدہ کا بہتر علاج کروانے کے لیے۔۔۔" شائلہ نے اس کی بات عجلت میں کاٹ کر تلخی سے کہا تو وہ ایک لمحے کو چپ سا رہ گیا۔

"آپ کے والد۔۔۔؟" اس نے تھوڑا سا سنبھل کر پوچھا۔

"انتقال ہوگیا ہے۔" اس کے دل پر بوجھ سا آن پڑا۔

"بھائی کتنے ہیں۔۔۔؟"

"صرف ایک اور وہ بھی ملک سے باہر۔" وہ ناخن کھرچتی بے نیازی سے بولی۔

"ملک سے باہر ہیں پھر تو انکم اچھی خاصی ہونی چاہیے آپ کی۔" اس کے لہجے میں طنز کی آمیزش شامل ہوئی تو شائلہ نے گہرا سانس بھرا۔

"جی انکم اچھی خاصی ہی ہے۔" وہ استہزائیہ انداز سے ہنسی۔ "لیکن ان کے اخراجات بھی زیادہ ہیں۔ ہمارے لیے گنجائش نہیں نکل پاتی۔ میرے کوئی اور بہن بھائی نہیں' اس لیے مجھے ہی کچھ خود ہی کرنا ہے۔" اس کی بات پر سامنے بیٹھے شخص نے ایک لمبا سانس لیا تھا۔

"ایسا ہے کہ آپ کی کوالیفکیشن تو اچھی ہے اور کمپیوٹر ڈپارٹمنٹ میں سیٹ بھی ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہاں پر آپ کے علاوہ کوئی خاتون نہیں ہیں۔"

"تو اس میں کیا مسئلہ ہے۔۔۔؟" شائلہ نے تعجب سے پوچھا۔

"مسئلہ تو کوئی نہیں ہے، مجھے لگا کہ کہیں آپ اتنے سارے مردوں کے درمیان کام کرنے پر تیار نہ ہوں۔" اس نے بڑی دلچسپی سے اپنے سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھا جو اس کو لمحہ لمحہ حیران کررہی تھی۔

"جب کوئی عورت کسی کام کے لیے گھر سے نکل آئے اور اس کے پلو کے ساتھ مجبوریوں کی ایک لمبی قطار بھی بندھی ہوئی ہو تو وہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے ویسے ہی لاتعلق ہوجاتی ہے۔" اس کے لبوں پر وہی دل جلا دینے والی مسکراہٹ نے احاطہ کیا تھا۔

"محترمہ! لاتعلق ہوجانا اتنا آسان بھی نہیں ہوتا جتنا آپ سمجھ رہی ہیں ایسی صورت میں جب آپ صنف مخالف سے تعلق رکھتی ہوں اور اپنے ڈپارٹمنٹ میں واحد خاتون بھی ہوں۔" اس کی آنکھوں میں تمسخرانہ سی چمک اتنی واضح تھی کہ شائلہ کی پیشانی پر خاصے گہرے بل پڑے۔

"اب آپ مجھے کیا جتانا چاہتے ہیں۔"

"میں آپ کو "جتانا" نہیں "سمجھانا" چاہتا ہوں کہ کسی اسکول سائیڈ پر کوئی جاب دیکھیں تو بہتر ہے۔" اس نے وضاحت دینے کی کوشش کی۔

"پھر میں آپ کی طرف سے انکار سمجھوں۔۔۔؟" اس نے ایک ہی جملے میں اس شخص کو چپ کروایا۔

"میں نے ایسا کب کہا۔۔۔؟" وہ حیرانی سے اسے گھورتا ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا شائلہ کا چہرہ شدید قسم کے تناؤ کا شکار لگ رہا تھا۔

"مطلب یہی تھا آپ کا۔" اس کے انداز میں عجلت تھی۔

"مطلب سمجھنے والی حس خاصی کمزور ہے آپ کی۔ اس کا پہلی فرصت میں علاج کروائیں۔" اس کے چہرے پر شگفتگی رقم تھی۔ شائلہ عجیب سے مخمصے کا شکار ہوئی کہ چلی جائے یا یہیں کھڑی رہے۔

"آپ کو اپائنٹمنٹ لیٹر مل جائے گا سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجیے گا۔ میری یہ بالکل نئی فیکٹری ہے، میں کام کے معاملے میں کوئی رعایت ہرگز نہیں دوں گا۔" اس کی بات پر شائلہ کے ساکت صامت وجود میں گویا بجلی سی دوڑی۔

"تھینکس۔۔۔! اپنے کام میں رعایت لینا میرے اصولوں میں بھی کہیں شامل نہیں، آپ بھی اس بات کو اپنے ذہن میں رکھیے گا۔" شائلہ کی بات پر اس کے چہرے پر محظوظ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ جب کہ شائلہ بڑی متوازن چال کے ساتھ اس کے آفس سے نکل آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"مائی گاڈ۔۔۔!" نابیہ نے ساری داستان سن کر شرارت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔ "تم نے یہ ساری باتیں سکندر شاہ کو کہہ دیں؟" شائلہ انٹرویو کے بعد سیدھی نابیہ کے پاس ہی آئی تھی جو خوب صورت موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے برآمدے میں چارپائی بچھائے بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر جھٹ پکوڑے تل لائی، جن کا آمیزہ اس نے آسمان پر بادل دیکھتے ہی بنا لیا تھا۔ پکوڑوں اور چائے کی مہک پورے صحن میں پھیل گئی تھی۔

"تم نے اسے اپنی کہانی کے کردار سکندر شاہ کا بتایا؟" اس کی بات پر شائلہ نے ایک دھپ اسے رسید کی تو وہ ہنستی چلی گئی۔

"مجھے اٹھا کر اس نے آفس سے باہر پھینک دینا تھا

ویسے ہی بڑا روکھا پھیکا سا بندہ لگتا ہے۔" اس نے آسمان پر روئی کے گالوں جیسے بادلوں کو دیکھتے ہوئے اسے اطلاع دی۔
"تمہاری اسٹوری کا سکندر شاہ تو بڑا رومانٹک سا تھا۔" نابیہ نے متبسم لہجے میں کہا۔
"ہاں! لیکن یہ تو اس سے بالکل مختلف ہے۔" ثنائلہ تھوڑا سا اداس ہوئی۔ "اس میں سکندر شاہ والی کوئی بات ہی نہیں۔۔۔"
"نہیں ہے تو اس میں وہ تمام خوبیاں ڈال دو۔" نابیہ نے ہری مرچ پکوڑے میں سے نکالتے ہوئے مفت مشورہ دیا۔

☼ ☼ ☼
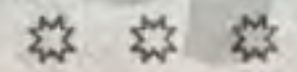
"ابا۔۔۔" سکینہ نے دیسی گھی میں شکر ڈال کر روٹی کھاتے اللہ دتا کمہار کو مخاطب کیا۔ جو صبح ہی سفر کر کے اسپتال پہنچا تھا۔ اب تازہ دم ہونے کے بعد سکون سے روٹی کھا رہا تھا۔
"کیا ہوا پتر۔۔۔؟" اللہ دتا نے مسکرا کر اپنی لاڈلی بیٹی کا سنجیدہ چہرہ دیکھا۔
"ابا! اگر اللہ بدصورت جسم کے سینے میں دل نہ ڈالتا تو کتنا اچھا ہوتا۔" سکینہ کی بات پر اللہ دتا اگلا لقمہ لینا بھول گیا۔ جبکہ سکینہ نے جمیلہ مائی کی غیر موجودگی کا بھرپور فائدہ اٹھا کر یہ سوال کیا تھا۔
"وہ کیوں پتری۔۔۔؟" انہوں نے کھوجتی نظروں سے استفسار کیا۔ سکینہ کے انداز پہلی دفعہ اسے کچھ چونکا سے گئے تھے۔
"دیکھ نا! یہ دنیا ہر خوب صورت چیز پر بس خوب صورت لوگوں کا حق سمجھتی ہے۔ ہم جیسوں کی طرف ہر بات کے جواب میں ایسے دیکھتی ہے جیسے کہہ رہی ہو کہ پہلے اپنی اوقات پہچانو، پھر چاند کو اپنے دامن میں بھرنے کی خواہش کرنا۔" سکینہ کا لہجہ بڑا بے بس کر دینے والا تھا۔
"ہاں تو پتری! چاند کو پکڑنے کی خواہش کرنا بھی تو کوئی سمجھ داری نہیں۔" ان کا لہجہ ناصحانہ تھا اور وہ اب سکینہ کی ہر بات کو غور سے سن رہے تھے۔ بھوک کا احساس ایک دم ہی ختم ہو گیا تھا۔
"پھر ابا، دل کو انوکھا لاڈلا کیوں کہتے ہیں؟" سکینہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔
"پتری! یہ انوکھے لاڈلے زندگی میں اکثر وختے ڈالے رکھتے ہیں۔ اسی لیے ان کو اتنے لاڈ میں نہ رکھا جائے تو چنگا ہوتا ہے۔ ورنہ بندہ بڑا تنگ ہوتا ہے۔" اللہ دتا نے شکر کا ڈبا بند کرتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔
"یہ جاجی کہاں گیا ہے؟" جمیلہ مائی نے برا سا منہ [illegible] کر کہا۔
"وہ ذرا فوٹو اسٹیٹ والی دکان پر میرے شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی کروانے گیا ہے۔" اللہ دتا نے جتایا۔
"شناختی کارڈ کی کاپی کیا کرنی ہے؟" جمیلہ مائی نے کھانے کے برتن سمیٹتے ہوئے سادگی سے پوچھا۔
"ڈاکٹر خاور نے منگوائی ہے، سکینہ کی فائل میں لگانے کو۔" ڈاکٹر خاور کے نام پر سکینہ کا دل بے ہنگم انداز میں دھڑکا۔ اس نے کن انکھیوں سے دونوں کو دیکھا جو اپنی اپنی جگہ کسی گہری سوچ میں تھے۔ سکینہ نے بھی اپنا لان کا دوپٹا منہ پر ڈالا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔
"کیا کچھ کہا ہے ڈاکٹر صاحب نے۔۔۔؟" جمیلہ مائی نے اپنے شوہر کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لیا۔
"ڈاکٹر صاحب زیادہ پر امید نہیں ہیں۔۔۔" اللہ دتا نے گہری سانس بھر کے دل گرفتی سے کہا۔ البتہ اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ بس جمیلہ مائی کی سماعتوں تک بمشکل پہنچی تھی۔
"ڈاکٹروں سے امید تو مجھے بھی نئیں، بس مولا سائیں اپنا کرم کرے گا۔" جمیلہ مائی نے تسلی آمیز انداز سے اپنے شوہر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
"کہیں آپریشن کرنے سے انکار تو نہیں کر دیا انہوں نے۔۔۔" جمیلہ مائی نے اپنے بدترین خدشے کا اظہار کیا۔

"انکار تو نہیں کیا، لیکن وہ کہتے ہیں کہ سکینہ کی جسمانی حالت جب تک بہتر نہیں ہو جاتی، ہم کوئی رسک نہیں لے سکتے۔" اللہ دتا نے فوراً وضاحت کی۔ کمرے میں ایک بوجھل سا سناٹا بڑی سرعت سے پھیل گیا تھا۔ سکینہ دوپہر کے کھانے کے بعد اب گہری نیند میں تھی۔
"سکینہ کی ماں۔۔۔" اللہ دتا نے اپنی بیوی کے جھکے سر کو دیکھتے ہوئے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔ "یہ اپنی سکینہ کچھ بدل نہیں گئی۔۔۔"
"کیا مطلب۔۔۔؟" جمیلہ مائی نے بوکھلا کر اپنے شوہر کی شکل دیکھی۔
"وہ اب بہت عجیب و غریب سے سوال کرنے لگی ہے، اس کی باتوں میں قناعت اور شکر گزاری کم اور گلے شکوے زیادہ جھلکنے لگے ہیں۔" اللہ دتا کی بات پر جمیلہ مائی آمادگی سے مسکرا دیں۔
"اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے۔" انہوں نے تحمل بھرے انداز مناسب الفاظ کا چناؤ کرتے ہوئے مزید کہا۔ "ہماری دھی رانی کی سوچیں تو کسی جھرنے کے پانی کی طرح صاف شفاف تھیں۔ بس بیماری اور آزمائش نے اسے تھوڑا سا گدلا کر دیا ہے۔ اس میں اس نمانی کا کیا قصور، بندے کی ذات میں ہی بے صبرا اور ناشکراپن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔" جمیلہ مائی نے بھرپور طریقے سے اپنی بیٹی کا دفاع کیا۔
"اک تو مجھے تیری سمجھ نئیں آئی، ویسے سارا دن اس معصوم کے پیچھے ڈنڈا سوٹا لے کر پڑی رہتی ہے اور اب کیسے اس کی طرف داری کر رہی ہے۔" اللہ دتا نے ان کی سادگی پر ہنستے ہوئے کہا۔ جمیلہ مائی نے فٹ جواب دیا۔
"ہاں ناں، اس کے سامنے کہوں گی تو زیادہ شوخی ہو جائے گی۔"
"ویسے سکینہ کی ماں! تجھے کبھی کبھی اللہ سے گلہ تو ہوتا ہو گا کہ اللہ سوہنے نے اکوں اک دھی دی اور وہ بھی معذور۔۔۔" اللہ دتا کو نہ جانے آج کیا سوجھی تھی جو جمیلہ مائی سے یہ سوال کر بیٹھے۔
"توبہ کرو سکینہ کے ابا توبہ۔۔۔" جمیلہ مائی نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "کیوں مجھے گناہ گار کرتے ہو، پہلے ستاراں سال سوہنے رب کی منتیں مرادیں کر کے اولاد لی، اور اب کیا اس ذات سے گلہ کر کے میں چنگی لگوں گی، میں کون ہوتی ہوں سوہنے رب کو مشورے دینے والی کہ اللہ ایسی نئیں، ویسی اولاد دینی تھی۔ مولا کا کرم ہے، اس کا احسان ہے کہ میری سونی گود کو اس نے بھرا۔" جمیلہ مائی فطرتاً قناعت پسند تھیں۔ اللہ دتا کو ان کی یہی ادا سب سے زیادہ بھاتی تھی۔
"فیروی سکینہ کی ماں، اگر تیری دھی ٹھیک نہ ہوئی تو۔۔۔" اللہ دتا نے ایک اور دل دکھاتا سوال کیا تھا۔
"مجھے فیروی سوہنے مالک سے کوئی شکوہ نہیں۔۔۔" جمیلہ مائی نے اپنی ایک بات سے انہیں چپ کروا دیا تھا۔ "اگر اللہ سوہنے نے میری دھی کو ایسے ہی رکھنا ہے تو اس میں بھی کوئی اس کی مصلحت ہو گی۔ جب اللہ سوہنا مجھے سترہ سال کی دعاؤں کے بعد اولاد دے سکتا ہے تو اگلے سترہ سال کی دعاؤں سے میری دھی کو شفا بھی دے سکتا ہے۔ بس بندے کی نیت صاف اور اللہ پر بھروسا ہونا چاہیے۔" جمیلہ مائی آج اپنے شوہر کو حیران کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"واٹ۔۔۔؟" عائشہ نے سخت تعجب سے ماہم کا پھیکا سا چہرہ دیکھا۔
"تم مجھے آج بتا رہی ہو کہ رامس کی ماما اس کا پرپوزل لے کر پرسوں تمہارے گھر آئی تھیں؟" عائشہ نے ہاتھ میں پکڑی گاڑی کی چابی میز پر پٹخی تھی۔ وہ آج اچانک ہی ماہم کے آفس کی طرف نکل آئی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

آسیہ علی محسن

لڑکیوں کے ہائی اسکول کی خوب صورت عمارت کے سامنے سے رکشا گزرا تو مصباح کو پرانے روڑی پرائمری اسکول کی چند باتیں شدت سے یاد آئیں۔

ایک آپا جی ارشاد۔ روڑی اسکول کی ہیڈ مسٹریس اور دوسری پتلی لسی والی چنا چاٹ۔ تیسرے نجمی اخبار والا۔ آپا جی ارشاد بہت زندہ دل عورت تھیں۔ بچیوں کو ڈانٹ بھی لیتیں۔ کبھی کبھار ایک آدھ تھپڑ بھی مار لیا۔ مگر زیادہ وقت ایک دھیمی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر کھیلتی رہتی۔ گوری رنگت والی نرم مزاج، ہنس مکھ آپا جی ارشاد، مصباح کی پسندیدہ استانی تھیں۔

ہر مہینے استانیاں اسکول میں مینا بازار لگا لیتیں۔ بچیاں یونیفارم کی بجائے رنگ برنگے کپڑے پہن کر اسکول آتیں۔ کھانے پینے کے مختلف اسٹال لگتے اور بچیوں کے جھولنے کے لیے جھولے بھی ہوتے۔ لڑکیاں چنا چاٹ بہت شوق سے کھاتیں۔ چاٹ سے زیادہ مزے دار لسی ہوتی، جو چاٹ میں دہی کی جگہ شامل ہوتی۔ سونی نے تو ایک بار آپا جی ارشاد سے کہا تھا۔

”آپا جی! آلو اور چنے رہنے دیں۔ ایک روپے کی لسی ڈال دیں پیالے میں۔“ ماہی منڈا سونی، مصباح کی سہیلی تھی۔

نجمی اخبار والا آٹھویں میں پڑھتا تھا۔ اسکول جانے سے پہلے صبح کے وقت وہ تازہ اخبار گھروں میں پھینکتا تھا۔ بیوہ ماں کا اکلوتا اور بہت ذہین بیٹا تھا۔ آپا جی ارشاد کو وہ عورتوں کی کہانیوں والا رسالہ دینے اسکول آتا تھا۔ ایک بار مصباح کی موجودگی میں اس نے آپا جی کو اخبار میں بچوں کے صفحہ پر چھپی ہوئی کہانی دکھائی جو نجمی نے لکھی تھی۔ آپا جی نے خوش ہو کر نجمی کو ایک روپیہ انعام دیا تھا۔

مصباح ہیڈ مسٹریس آپا جی ارشاد والے اس روڑی اسکول میں پانچویں جماعت تک پڑھی تھی۔ امام دین کمہار کی بیٹی نزہت اس کی پکی سہیلی تھی۔ دونوں زوارے گونگے والی گلی سے گزر کر اسکول جاتی تھیں۔ اسکول سے واپسی بھی اکٹھے ہوتی۔ زوارے کو لوگ ”زوارا جھلا“ بھی کہتے تھے۔ وہ پاگل تو نہیں تھا۔ مگر اس کی لال لال آنکھوں اور پچکے ہوئے گالوں سے بچوں کو بہت خوف آتا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کو گھر والے ایک کوٹھڑی میں بند رکھتے تھے۔ جس کی کھڑکی گلی میں کھلتی تھی۔ سلاخوں والی کھڑکی میں کھڑا زوارا جھلا گلی سے گزرنے والے لوگوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ بچے تو خوف کے مارے اس کی طرف دیکھتے نہیں تھے۔ مگر بڑی عمر کے مردوں اور لڑکوں سے وہ سگریٹ مانگ لیتا تھا۔

ایک بار مصباح کو اکیلے اس گلی سے گزرنا پڑا تھا۔ خوف کے مارے اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ کھڑکی میں لال آنکھوں والا زوارا جھلا کھڑا تھا۔ شکر ہے اسی وقت صابر بھی اپنے سر پر گیس کا سلنڈر اٹھائے گلی سے گزر رہا تھا۔ ڈری ہوئی مصباح کی رونی صورت دیکھ کر وہ زوارے کی کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر زوارے کو دی اور بڑے پیار سے مصباح سے کہا۔

”چل کاکی! جا۔ میں کھڑا ہوں یہاں۔“

ساتویں جماعت والی مصباح کو اس وقت صابر بہت اچھا لگا تھا، مگر وہ ڈری سہمی کھڑی رہی۔ اس وقت سائیکل کی گھنٹی بجاتا نجمی اخبار والا گلی میں نمودار ہوا۔ مصباح اس کی سائیکل کی اوٹ میں تیز تیز قدموں کے ساتھ زوارے کی کھڑکی کے سامنے سے گزر گئی۔

”ڈرتی کیوں ہو ڈرپوک؟ وہ کھا جائے گا تمہیں؟“ نجمی نے ہنستے ہوئے مصباح سے کہا۔

مصباح نے تھوک نگل لیا۔ مگر جواب نہیں دیا۔ مڑ کر دیکھا تو صابر ابھی تک زوارے کی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ زوارے گونگے نے ”اوں اوں“ کر کے پتا نہیں کیا صابر سے پوچھا تھا۔

صابر نے ہنس کر کہا۔ ”اگلے مہینے کی چودہ تاریخ پکی ہے۔ زوارا! تم ضرور آنا۔“

زوارے جھلے نے پتا نہیں جواب میں کیا کہا۔ مصباح تو پھولے سانس کے ساتھ گھر کی طرف بھاگی تھی۔

نویں جماعت تک مصباح گاؤں میں پڑھی تھی۔ جانگلیوں والے قبرستان کے سامنے ماموں جان املی والے کے گھر کی دیوار سے دیوار ملتی تھی مصباح کے گھر کی۔ ماموں جان بہاری تھے۔ روڑی اسکول کے سامنے چارپائی پر ٹافیوں، سونف، چورن اور املی کی چھوٹی سی دکان سجا کر بیٹھ جاتے تھے۔ ان کی املی بہت مزے دار تھی۔ وہ سیدوں کے گاؤں کے نہیں تھے۔ باہر سے آکر کرائے کے مکان میں رہ رہے تھے۔ مگر گاؤں کے سارے بچوں کے ماموں جان تھے۔ مصباح، ماموں جان کی دکان سے املی لے کر کھاتی تھی۔ ایک بار وہ املی جانگلیوں والے قبرستان میں پھینک کر روتی چیختی بھاگ کر گھر پہنچی تھی۔ مصباح اور نزہت کے بستے بھی قبرستان میں رہ گئے تھے۔ وہ اسکول سے واپس آرہی تھیں۔ قبرستان میں خالی جگہ پر لڑکے بیٹ بال کھیل رہے تھے کہ اچانک ہاتھ میں کلہاڑی پکڑے بابا عیسیٰ نمودار ہوا۔

”ہاتھ پیر کاٹ دوں گا سب کے۔“ بابا عیسیٰ کلہاڑی لہرا کر دہاڑا۔

سب لڑکے بیٹ بال چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ مصباح اور نزہت کی تو جیسے جان نکل گئی۔ انہوں نے بستے وہیں پھینکے اور روتی چیختی چلاتی ہوئی اپنے گھروں کی طرف بھاگیں۔ ماہی منڈا سونی البتہ ڈٹ کر وہیں کھڑی رہی۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتی تھی۔ بابے عیسیٰ سے بھی نہیں۔ مصباح کی پھینکی ہوئی املی سونی نے اٹھائی اور مزے سے کھا گئی۔ نجمی اخبار والا مصباح کا پھینکا ہوا بستہ دینے اس کے گھر آیا تھا۔ مصباح کی اماں نے اسے بہت دعائیں دی تھیں۔ جھکی کمر، سفید بالوں، چھوٹے قد والا بابا عیسیٰ غصے کا بہت تیز تھا۔ وہ لڑکوں کو قبرستان میں کھیلنے سے منع کرتا تھا۔ مگر لڑکے کہاں باز آنے والے تھے۔ روزانہ بیٹ بال لے کر کرکٹ کھیلنے آجاتے۔ پھر ایک دم بابا عیسیٰ ہاتھ میں ڈنڈا یا درانتی پکڑے نمودار ہوتا اور لڑکوں کی دوڑ لگ جاتی۔

نویں جماعت تک بھی زوارے جھلے اور بابے عیسیٰ کا خوف مصباح کے ساتھ ساتھ رہا۔ مگر گاؤں میں صابر اور مختار شاہ ڈور جیسے بے ضرر، معصوم لوگ بھی تھے جن سے مصباح کو کبھی ڈر نہیں لگتا تھا۔ نجمی اخبار والا بھی تھا، جس کی سائیکل کی گھنٹی مصباح کو بہت اچھی لگتی تھی اور نجمی کا اخبار لہرا کر دروازے کے

نیچے سے پھینکنے کا انداز بھی مصباح کو پسند تھا۔ تو عمر لڑکا سائیکل چلاتے ہوئے سائیکل کی ٹوکری سے اخبار نکال کر بڑی مہارت کے ساتھ گھر کی دیوار کے اوپر سے اخبار صحن میں پھینک دیتا تھا۔ مصباح کے ابا اکثر نجمی کو اس مہارت کی داد دیتے تھے۔

صابر درمیانے قد کا لمبوترے سر والا دبلا پتلا مرد تھا۔ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کرکے روٹی کماتا تھا۔ کسی کو بازار سے سودا سلف لا دیا۔ کسی کو گیس کا سلنڈر بھروا دیا۔ کسی کے بیٹے کے ولیمہ کی دیگیں پکوادیں۔ شامیانے' کرسیاں بچھادیں۔ کسی کی مرگ پر قبر کھدوادی۔ مرد اور شرارتی لڑکے اس کا مذاق اڑاتے۔ مصباح کے ابا بھی اس سے اکثر پوچھتے۔

"صابرے! تیری شادی کب ہو رہی ہے؟"

صابر ہنس کر کہتا۔ "اگلے مہینے کی چودہ تاریخ پکی ہے۔ بھائی صفدر! تم ضرور آنا۔"

بھائی صفدر قہقہہ لگاتے اور پوچھتے۔ "کس سال کی؟ کس مہینے کی چودہ تاریخ صابرے؟ تیرے ساتھ کے تو اب دو' دو بچوں کے باپ ہیں۔" صابرے ذرا سا ہنستا اور اپنے کام میں جت جاتا۔

مختار شاہ ڈور کو دیکھ کر مصباح ڈرتی نہیں تھی' خوش ہوتی تھی۔ پتا نہیں کس نے اس کا نام ڈور رکھ دیا تھا اور کیوں رکھ دیا تھا۔ دبلا پتلا' کھمبے کی طرح سیدھا' ہر سانس کے ساتھ ہچکی لیتا تھا مختار شاہ۔ اسے سنائی نہیں دیتا تھا۔ وہ دونوں کانوں سے بہرا تھا۔ سیدوں والے گاؤں کی ہر شادی میں اس کی شرکت لازم تھی۔ بلکہ آس پاس کے سات گاؤں میں بھی اس کی خوش خوراکی کے چرچے تھے۔ وہ بن بلائے ہر ولیمہ میں پہنچ جاتا تھا۔ سب لوگ اسے بخوشی شریک کرتے' خوش آمدید کہتے۔ ولیمہ کے کھانے کا آغاز مختار شاہ کرتا اور جب مہمان ولیمہ کھا کر اپنے گھروں کو لوٹ چکے ہوتے' شامیانے اور کرسیاں سمیٹی جارہی ہوتیں تو تب بھی مختار شاہ زردے کی پلیٹ پکڑے جلدی جلدی لقمے منہ میں ڈال رہا ہوتا۔

مصباح نویں جماعت میں تھی تو صفدر گاؤں سے شہر منتقل ہوگئے۔ مصباح کا دل گاؤں چھوڑنے کو نہیں چاہتا تھا۔ مگر مجبوری تھی۔ جس دن گاؤں سے جانا تھا' اس دن مصباح کو آمنہ ماچھن پر بھی بہت پیار آیا۔ میلی کچیلی آمنہ' بوسیدہ کپڑے' کھچڑی بال' ننگے پیروں والی ہر صبح ان کے گھر سلور کے گلاس میں چائے لینے آتی تھی۔ دو کپ چائے صفدر اور شمع کے لیے بنتی اور ایک گلاس آمنہ ماچھن کے لیے۔ میلی کچیلی آمنہ کو دیکھ کر مصباح بہت چڑتی تھی۔

"اماں! یہ کیوں ہر روز گلاس اٹھا کر آجاتی ہے؟ ہم نے ٹھیکہ لیا ہوا ہے اس کا؟"

"بری بات ہے' ایسا نہیں کہتے۔" شمع اسے ڈانٹتی اور آمنہ ماچھن کے گلاس کو گرم چائے سے بھر دیتی۔

گاؤں چھوٹنے والی صبح آمنہ ماچھن آئی تو گھر کا سامان بندھا پڑا تھا۔ مگر چولہے پر چائے کی دیگچی چڑھی ہوئی تھی۔ اس روز پہلی بار مصباح نے خود اپنے ہاتھوں سے دیگچی میں سے چائے نکال کر آمنہ کے گلاس میں ڈالی اور اپنا دیسی گھی والا پراٹھا جس کا صرف ایک لقمہ توڑ کر منہ میں ڈالا تھا' دسترخوان میں لپیٹ کر آمنہ کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

"یہ بھی کھالینا خالہ!"

وہ پہلا دن تھا' جب میلی کچیلی آمنہ ماچھن سے مصباح کو بدبو نہیں آئی۔ ابھری ہوئی رگوں والے کمزور سیاہ ہاتھ سے آمنہ ماچھن نے مصباح کے گال کو تھپتھپایا گیا تو مصباح کو بالکل برا نہیں لگا تھا۔ اس صبح نجمی اخبار دینے آیا تو صفدر نے اخبار لیتے ہوئے کہا۔

"بس! کل سے اخبار بند۔ اپنا حساب لے لو نجمی۔" نجمی حیرانی سے صفدر کی شکل دیکھنے لگا۔

"ہم شہر جارہے ہیں' گاؤں چھوڑ کر۔" صفدر نے نجمی کو بتایا۔

پتا نہیں کیوں نجمی کو یہ سن کر بہت افسوس ہوا تھا۔

پندرہ یا سولہ دن کے اخبار کا بل بنتا تھا۔ جو نجمی نے نہیں لیا۔ صفدر نے بہت کوشش کی۔ مگر نجمی نے پیسے لینے سے انکار کردیا۔ نجمی گلے مل کر صفدر سے رخصت ہوا۔

صابر نے اسے پچاس یا سو روپے کا ایک نوٹ دیا تھا۔ اپنا ایک نیا سفید کپڑوں کا جوڑا اور تلے والی چپل بھی۔

اس روز امام دین کمہار کی بیٹی نزہت سے گلے مل کر مصباح بہت روئی۔ سوفی کو تو ذرا رونا نہ آیا۔ کھڑی دانت نکالتی رہی۔ پتا نہیں کیوں مصباح نے صابر سے ویسے ہی شرارتی انداز میں پوچھا تھا۔ جیسے سب شریر لڑکے پوچھا کرتے تھے۔

"صابرے! کب ہو رہی ہے تیری شادی؟"

مصباح کی بات سن کر ٹرک پر لدے سامان کو رسے سے باندھتے ہوئے صابر نے ہنس کر کہا تھا۔

"اگلے مہینے کی چودہ تاریخ پکی ہے' تم ضرور آنا کاکی۔" صابرا کا جواب سن کر مصباح اور نزہت روتے روتے ہنس پڑی تھیں۔

☼ ☼ ☼

مصباح نے میٹرک کرلیا' ایف اے اور پھر بی اے بھی۔ شہر میں گاؤں والی مٹھاس تو نہیں تھی' مگر رہنے لگے تو دل لگ ہی گیا۔

وہ بی اے میں تھی تو اسے پہلی بار پتا چلا کہ گاؤں سے شہر آنے کا فیصلہ کاروبار یا مصباح کی تعلیم وجہ سے نہیں تھا۔ چچیروں نے صفدر علی کی زمین پٹواری سے مل کر اپنے نام کرالی تھی اور یہی دکھ صفدر علی کو گاؤں سے شہر لے آیا۔ وہ حیران ہوتی تھی کہ کوئی رشتے دار ان سے ملنے نہیں آتا تھا اور نہ ہی صفدر علی' مصباح اور شمع کو گاؤں لے جاتے۔ حالانکہ شہر سے گاؤں کا فاصلہ اتنا بھی نہیں تھا کہ سالہا سال ملاقات نہ ہو۔ مگر دلوں میں جو دوری آگئی تھی اس نے فاصلے بڑھا دیے۔

مصباح بی اے کے پیپر دے رہی تھی تو اس کا پہلا رشتہ آیا۔ لڑکا اسٹیٹ لائف میں ملازم تھا۔ تنخواہ بھی اچھی تھی۔ مگر شمع کو وہ قد کا چھوٹا لگا اور صفدر علی نے تو صاف کہہ دیا۔

"بیٹی ابھی پڑھ رہی ہے۔ اس کی شادی کا سوچا تک نہیں۔"

مصباح کے رزلٹ آنے سے پہلے ایسے چار رشتے آئے۔ صفدر علی تو خیر ابھی اس کی شادی کا ارادہ ہی نہیں رکھتے تھے۔ مگر شمع کو کسی لڑکے کے پیر میں لنگڑاہٹ نظر آجاتی تو کسی کی زبان کی ہکلاہٹ کام خراب کردیتی۔ کسی کی ماں کا بڑبولا پن ناگوار لگتا تو کسی لڑکے کی ملازمت میں کیڑے پڑ جاتے۔ ایک لڑکے کے سگریٹ پینے پر اعتراض ہوگیا۔ حالانکہ وہ بہت اچھی فیملی کا اسمارٹ ایم ایس سی اسٹوڈنٹ تھا۔ باپ کا فرنیچر کا شوروم تھا۔ مصباح نے بی اے تو اچھے نمبروں سے پاس کرلیا۔ مگر صفدر علی کی زندگی دھوکا دے گئی۔ صفدر علی کیا گئے' زندگی کے سارے سکھ اپنے ساتھ لے گئے۔

شمع کو کالے یرقان نے گھیر لیا۔ مصباح نے ماں کے علاج اور گھر کا خرچا چلانے کے لیے ایک کے بعد ایک نوکری بدلی۔ کہیں ماحول اچھا نہیں تھا' کہیں تنخواہ کم' کبھی فیکٹری بند ہوجاتی' تو کبھی اسکول والے کوئی اور ٹیچر رکھ لیتے۔

عمر ڈھل گئی۔ رنگ روپ جاتا رہا۔ خواب مر گئے۔ باپ زندہ تھا۔ حالات اچھے تھے تو ہر چوتھے روز کوئی رشتہ مانگنے آجاتا۔ جواں عمر میں تو وہ کسی نہ کسی کی نظر میں سمائی رہی۔ ایک' دو نے تو وعدے بھی کیے۔ ساتھ جینے' ساتھ مرنے کی قسمیں بھی کھائیں۔ مگر عملی طور پر کچھ نہ کیا۔ بس جھوٹے وعدے اور جھوٹی قسمیں۔

ڈھنگ کی جاب ملی تو بالوں میں چاندی اتر آئی تھی۔ حالات اچھے ہوئے تو ہاتھ پر مہندی رچانے والے دن نکل گئے۔ بیمار ماں اس کا سہارا تھی اور وہ بوڑھی ماں کا آسرا۔

☼ ☼ ☼

رکشا اسد شاہ کے ڈیرے کے پاس سے گزرا تو

مصباح کو کئی سال پہلے کے منظر یاد آنے لگے۔ وہ نزہت اور سونی کے ساتھ اسد شاہ کے ڈیرے کے سامنے والی بیریوں سے بیر کھانے آتی تھی۔ سونی بیری کے اوپر چڑھ جاتی اور بیر توڑ توڑ کر اپنی جیبیں بھر لیتی تھی۔ نزہت اور مصباح للچائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی رہتیں۔ وہ انہیں دکھا دکھا کر پکے بیر کھاتی اور گٹھلیاں نیچے پھینکتی جاتی۔

"یہ اسد لنگڑے کا ڈیرہ ہے نا؟" مصباح نے پوچھا تھا۔ رکشے والا چونکا۔

"جی ہاں! اسد شاہ مر گیا تو ڈیرہ بھی اجڑ گیا۔" رکشے والے نے جواب دیا۔

ڈیرہ ویران پڑا تھا۔ کسی زمانے میں یہاں بڑی رونق ہوتی تھی۔ ڈیرہ آباد ہوتا تھا۔ اسد شاہ کی گائے اور بھینسیں بندھی ہوئی تھیں اور وہ خود گھوڑی پر سوار ہو کر ڈیرے پر آتا تھا۔ یاروں کے ساتھ تاش کھیلتا، موج میلہ کرتا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ کٹ گئی تھی۔ بیساکھی سے چلتا تھا۔ اس لیے لوگ اسے اسد لنگڑا کہتے تھے۔

گاؤں اتنے سالوں میں بہت بدل گیا تھا۔ کمہاروں والی گلی کی بجائے رکشے والا امام بارگاہ والی گلی سے گزر رہا تھا۔ جانگلیوں والے قبرستان کی چار دیواری بن چکی تھی۔

"بابا عیسیٰ اب بھی کلہاڑی پکڑ کر لڑکوں کے پیچھے بھاگتا ہے؟"

مصباح کی بات سن کر رکشے والا پھر چونکا۔

"اللہ جنت نصیب کرے۔ بابے عیسیٰ کو مرے تو کئی سال ہو گئے۔"

شمع نے ایک آہ بھری۔ مصباح کا دل بھی دکھ گیا۔

"یہ ولایت شاہ کا گھر ہے ناں؟" ایک گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے شمع نے فوراً پوچھا۔

"ہاں جی۔ اللہ جنت میں گھر کرے۔ ولایت شاہ جی بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔"

شمع نے آنکھیں موند لیں۔ ٹیک لگا لی۔ مصباح کی پلکیں بھی گیلی ہو رہی تھیں۔ بمشکل اس کے لبوں سے نکلا۔

"وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں۔"

یہ ولایت شاہ کی پسندیدہ ترین نعت تھی۔ مسجد کے لاؤڈ اسپیکر پر وہ فجر کے وقت روزانہ یہ نعت اپنے مخصوص انداز میں پڑھتے تھے۔ جسے سن کر مصباح کی آنکھ کھلتی تھی۔

امام دین کمہار کی بیٹی نزہت بیاہ کر سیالکوٹ چلی گئی تھی۔ اس کے دو بچے تھے۔ بیٹا میٹرک میں فیل ہو کر کسی گاڑیوں کی ورکشاپ میں انجن کا کام سیکھ رہا تھا۔ بیٹی لائق تھی۔ ایف ایس سی کر رہی تھی۔ باقی منڈے سونی کی شادی اس کے ننھیال میں ہو گئی تھی۔ وہ گاؤں میں سال دو سال بعد ہی چکر لگاتی۔ ایک آدھ دن کے لیے آتی۔ مگر جب بھی آتی، روڑی اسکول والی آپا جی ارشاد کی قبر کی مٹی ٹھیک کر کے جاتی۔ اسکول کی بیری پر چڑھ کر وہ بیر توڑا کرتی تھی تو آپا جی ارشاد نیچے کھڑی اسے ہاتھ کے اشارے سے پکے بیروں کی نشان دہی کرتی جاتی تھیں۔

"سونی... ادھر... یہ دیکھو! میری انگلی ہے جدھر... اس طرف... ذرا آگے... سنبھل کر... ہاں یہ ہی... پکا ہوا ہے... لال..." اور سونی پکے بیر توڑ توڑ کر آپا جی ارشاد کے دوپٹے والی جھولی میں پھینکتی جاتی تھی۔

رکشے سے اتر کر وہ زوارے والی گلی میں داخل ہوئیں تو مصباح کو خوف کی پھریری آئی۔ وہ اب ساتویں کلاس کی بچی نہیں تھی۔ جو لال آنکھوں والے زوارے جھلے سے ڈر جاتی۔ چونتیس پینتیس سال کی عورت۔ عورت نہیں لڑکی تھی۔ زندگی نے جس چکی میں اسے پیسا تھا، اس کے سارے ڈر، خوف اتر گئے تھے۔ مگر آج کئی برس بعد زوارے کی گلی میں پتا نہیں کیوں وہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ شمع کے بازو سے لگی جب وہ زوارے کی کوٹھڑی کے پاس پہنچی تو کن اکھیوں سے دیکھا۔ سلاخوں والی کھڑکی کھلی تھی۔ مگر کوٹھڑی خالی تھی۔

گاؤں والے گھر میں آ کر مصباح کو جو سکون ملا، وہ شہر میں نصیب نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کا بچپن ان ہی درودیوار میں گزرا تھا۔ بے شمار یادیں اس گھر سے وابستہ تھیں۔ سارے اچھے دن یہیں گزرے تھے۔

شہر سے دوسری بار شمع اور مصباح اپنے گاؤں والے گھر میں آئی تھیں۔ پہلی بار صفدر علی کی میت لے کر۔ صفدر علی کی وصیت تھی کہ اسے گاؤں والے قبرستان میں دفنایا جائے۔

اب دوسری بار، جب ڈاکٹروں نے شمع کو لاعلاج قرار دے دیا تھا۔ وہ کچھ دنوں کی مہمان تھی۔

پہلی بار بھی مصباح راضی نہیں تھی۔ وہ کہتی تھی جب زندگی میں رشتہ داروں نے منہ موڑ لیا تو مرنے کے بعد بڑے بھائی کے پہلو میں دفن ہونے کی کیا منطق ہے۔ مگر شمع نے اپنے مرحوم خاوند کی وصیت پر عمل کیا۔

اب بھی مصباح گاؤں آنے پر رضامند نہیں تھی مگر شمع نے رو رو کر اسے منالیا۔ وہ زندگی کی آخری چند سانسیں اپنے گاؤں میں لینے کی خواہش مند تھی۔

بند دروازہ کھلا تو کئی بند راستے بھی کھل گئے۔ پچھیرے آئے۔ مگر ان میں کوئی ایسا نہیں تھا، جو مصباح کے سر پر ہاتھ رکھتا۔ کوئی ایسا نہیں تھا، جو مصباح کا ہاتھ پکڑ لیتا۔

شمع تو اسی امید پر گاؤں آئی تھی کہ گاؤں، برادری میں کوئی نہ کوئی مصباح کے جوڑ کا نکل آئے گا تو وہ بیٹی کے دو بول پڑھا کر سکون کے ساتھ صفدر علی کے ساتھ والی قبر میں جا سوئے گی۔ مگر شہر والوں کی طرح گاؤں والے بھی بے فیض ہو چکے تھے۔ صرف اپنا نفع دیکھتے تھے۔

صبح سویرے جب دروازے کی کنڈی بجا کر کسی نے اونچی آواز میں پوچھا۔

"کوئی آٹا، چینی، دال، بیسن منگوانا ہے آپا جی؟" تو کھانستی ہوئی شمع فٹا فٹ دروازے پر آئی۔

"صابرے تم؟" صابرے کو دیکھ کر شمع کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ وہ تو سمجھی تھی۔ صابر بھی مرکھپ گیا ہوگا۔

"جی آپا جی! کچھ منگوانا ہے؟" صابرے کا سر بالوں سے خالی ہو چکا تھا۔ چہرے پر جھریاں تھیں۔ مگر اتنی نہیں جتنی مصباح کے چہرے پر۔

"صابرے! تیری شادی ہو گئی؟" شمع نے مذاق میں پوچھا۔

"اگلے مہینے کی چودہ تاریخ پکی ہے۔ آپا جی! آپ ضرور آنا۔" صابرے نے ہنس کر کہا۔

شمع نے پلٹ کر مصباح کو دیکھا، جس نے صابرے کے جواب پر قہقہہ لگایا تھا اور ہنس ہنس کر دوہری ہو رہی تھی۔ مدت بعد شمع نے مصباح کو ہنستے دیکھا تھا۔

اسی وقت سائیکل کی گھنٹی "ٹرن ٹرن ٹرن" کرتی ہوئی دروازے کے نزدیک آ گئی۔

"نجمی..." شمع نے خوشی سے لرزتی آواز میں کہا۔

مصباح کی ہنسی کو جیسے ایک دم بریک لگ گیا۔ کئی سال بعد اس نے نجمی اخبار والے کو اپنے دروازے پر دیکھا تھا۔

"اخبار کے دفتر میں کام کرنے والا بابو بن گیا ہے مگر سائیکل کی جان نہیں چھوڑتا۔" صابرے نے ہنس کر کہا۔

"اگلے مہینے کی چودہ تاریخ پکی ہے صابرے؟" نجمی نے قہقہہ لگاتے ہوئے صابرے کو مخاطب کیا۔

اس کی نظریں مصباح کی نظروں سے ملیں اور پتا نہیں کیوں مصباح نے شرما کر انگلی دانتوں تلے دبالی۔

"پکی!" صابرے نے کہا۔

مصباح نے چوری چوری ایک نظر نجمی کو دیکھا، جو اسے "ڈرپوک" کہہ کر زوارے جھلے والی گلی پار کراتا تھا۔

ویسی ہی چور نظروں سے نجمی، مصباح کو دیکھ رہا تھا۔

شمع نے ان دونوں کی چوری پکڑ لی۔

"تو بول نجمی؟" شمع نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"میری طرف سے پکی خالہ!" نجمی نے مصباح کے چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر شوخ لہجے میں کہا۔

فاخرہ جبیں

برف زاروں کی تتلی

"بخت..... مجھے لگتا ہے میں کسی سے محبت کرنے لگی ہوں۔"

جس پل ماہین وجدان کے سرگوشی بھرے لہجے نے یہ انکشاف کیا۔ خزاں کی سرد مگر بے رونق ہوا خشک پتوں کو درختوں کی شاخوں سے جدا کرتی بڑی دور تک اڑا لے گئی تھی۔

میں نے چونک کر بڑی توجہ سے اسے دیکھا وہ اپنے بے ترتیب گھونگھریالے بال کندھوں پہ بکھیرے زرد پتوں میں دفن مردہ تتلیوں کو کھوج رہی تھی اور اب بڑی دیر سے خاموش تھی۔

"یہ کیا کہا ہے ابھی اس نے؟" میں نے گھڑی بھر کے لیے سوچا۔

"اسے محبت ہو گئی ہے؟ ماہین وجدان کو؟" میرے دل پر جیسے کوئی بھاری پتھر آن پڑا تھا۔

"یہ بے وقوف سی لڑکی... جو ایک عرصہ ہوا اپنے ماں، باپ کے لیے ایک معمہ، ایک آزمائش بنی ہوئی ہے۔ بھلا اسے کیا خبر... کہ محبت کیا ہے؟" میری سوچ کے تسلسل کو ایک بار پھر اس کی آواز نے توڑا تھا۔

"میں نے بس اسے اچانک ہی دیکھا۔ صرف ایک نظر... صبح واک کرنے کے لیے نکلی تھی، آج نہیں...

مکمل ناول

کئی دن پہلے کی بات ہے' وہ مجھے دیکھ کر ذرا سا مسکرایا تھا اور پھر میرے سامنے سے ہٹ گیا۔ شاید مجھے راستہ دینے کے لیے۔۔۔ لیکن بخت۔۔۔ وہ بعد میں مجھے بھولا ہی نہیں۔" وہ کھوئی کھوئی سی تھی۔

"اور اس سے تم سمجھیں کہ تمہیں اس سے محبت ہو گئی ہے۔" میرا انداز کسی حد تک مذاق اڑانے والا تھا۔ لیکن وہ سنجیدہ تھی۔

"ہاں۔۔۔" اپنی شہد رنگ آنکھوں میں یقین بھر کے اس نے مجھے یوں دیکھا کہ میں کچھ کہتے کہتے بھول سی گئی۔

"اس کی مسکراہٹ۔۔۔ اس کا چہرہ۔۔۔ نقش ہو گیا ہے دل پر۔۔۔ مجھے لگا ہی نہیں کہ میں نے اسے پہلی بار دیکھا ہے۔۔۔ اور۔۔۔"

وہ مزید کچھ کہنے والی تھی کہ میں بے اختیار ہی ہاتھ جھاڑتے ہوئے بینچ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "جانے دو یار۔۔۔ ایسی افسانوی باتیں۔۔۔ میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔۔۔ چلو۔۔۔ چل کر کافی پیتے ہیں۔۔۔ امو بھی انتظار کر رہی ہوں گی۔"

اس نے قدرے بے بسی سے مجھے دیکھا۔۔۔ وہ یقیناً" اس موضوع پر مزید بولنا چاہتی تھی۔۔۔ کچھ اور شیئر کرنے کی خواہش مند۔۔۔ لیکن پھر مزید کچھ کہے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کی مٹھی میں تتلیوں کے بے جان پر دبے ہوئے تھے اور میں جانتی تھی۔ اسی طرح بہت سی باتیں وہ اپنے لبوں میں دبائے کھڑی ہے۔ لیکن میں "محبت" کے نام پر اور کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔ خصوصاً" ماہین وجدان سے۔

میرے اندر کا خوف تھا۔ ڈر تھا یا گریز۔۔۔ لیکن راستے بھر اسے دوبارہ بولنے کا موقع دیے بغیر میں ہی نان اسٹاپ بولتی اور وہ سنتی رہی۔ حالانکہ یہ خلاف معمول تھا۔ عموماً" ماہین بولتی اور میں سنتی رہتی تھی۔

مگر آج۔۔۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں شدت سے یہ خواہش ابھر رہی تھی کہ ابھی ابھی جو کچھ ماہین نے مجھ سے کہا۔ وہ بھول جائے۔ گھر جانے تک وہ یہ فراموش کر دے کہ وہ کسی کی محبت میں گرفتار ہو رہی ہے۔۔۔ یا کوئی شخص اسے ابھی تک نہیں بھولا ہے جسے اس نے آج سے کئی روز پہلے دیکھا تھا اور اسی خواب کی تکمیل میں ہمیں یوں ہی فضول بہت سا بولتی رہوں۔

ماہی نے میری کسی بات کا کوئی خاص ریسپانس نہیں دیا تھا۔ وہ بس چاپ چپ میرے ساتھ چلتی رہی اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔

وہ ایسی ہی تھی۔

اپنی کہہ کر خیالوں میں کھو جانے والی۔

بیس منٹ کی واک میں ایک آدھ کے سوا اس نے شاید ہی میری کوئی بات سنی ہو۔ اس کی ساری توجہ زرد' اڑتے ہوئے پتوں پر تھی اور درختوں کی سوکھی ٹہنیوں پر۔۔۔ جو بلند ہو کر آسمان کے سینے میں گڑی جاتی تھیں۔۔۔ لیکن میرے لیے یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ خاموش تھی۔

لکڑی کا پھاٹک عبور کرتے ہوئے میں نے پلٹ کر دیکھا' وہ کچھ فاصلے پر کھڑی اندر نہ آنے کے لیے معذرت کر رہی تھی۔

"میں شام میں دوبارہ چکر لگاؤں گی۔" وہ اپنے مخصوص' نرم' دھیمے انداز میں کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی تو میں طویل سانس لے کر بادام کے درختوں میں گھری روش پر چلتی گھر کے اندرونی حصے کی طرف چلی آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ارے۔۔۔" بلند بخت کا قہقہہ خاصا جان دار تھا۔

مالی سے خشک پتوں کی کھاد تیار کرواتے ہوئے امو جان نے خاصی ناگواری سے بلند بخت کو گھورا تھا۔

اس میں اتنا فکر مند ہونے والی کون سی بات ہے۔ ہو گئی ہو گی۔۔۔ محبت اسے۔۔۔ یہ کوئی سوچ سمجھ کر منصوبہ بندی کے تحت کی جانے والی چیز تو نہیں۔۔۔ کسی کو بھی' کسی وقت بھی' کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔"

"تم نہیں جانتے نا۔۔۔ وہ بہت۔۔۔ بہت زیادہ جذباتی لڑکی ہے۔۔۔ ایک ایسی لڑکی جو اس محبت کے پیچھے دوبارہ خودکشی کی کوشش کر چکی ہے۔" کرسی پر آگے کی طرف جھکتے میں نے ازحد فکر مندی سے کہا تھا۔

"نہیں یار۔" اس کا لہجہ بے یقین تھا۔

"ہاں نا۔۔۔ سچ کہہ رہی ہوں۔ ایک بار وہ اپنے فادر کے کسی انکل ٹائپ پارٹنر کے پیچھے پاگل ہو گئی تھی اور دوسری بار وہ مفلس سا ٹیوٹر اسے پھنسا بیٹھا تھا۔ آنٹی' انکل نے ان دونوں سے تو کسی نہ کسی طرح جان چھڑا لی۔۔۔ مگر ماہی کو اس کرائسس سے نکلنے میں بہت وقت لگا اور جان تو اس کے لیے اتنی ارزاں ہے کہ ایک بار ٹی وی پر خواتین کے تشدد کے بارے میں کوئی رپورٹ پیش کی جا رہی تھی جسے دیکھ کر وہ اس قدر ٹینس ہوئی کہ ڈیٹول کی پوری بوتل اس نے اپنے اندر انڈیل لی' انکل اور آنٹی تو۔۔۔"

"بخت آور! آج کیا باتیں ختم نہیں ہوں گی۔" امو نے دور سے آواز لگائی تو میری بات ادھوری رہ گئی۔

"تم اگر جا کر باورچی خانے میں جھانک آؤ۔۔۔ تو بڑی مہربانی ہو گی۔" امو جان کی طنز بھری پکار پر میرا منہ بن گیا۔

"آج کچھ نیا ہو رہا ہے وہاں۔" میں نے بڑبڑاتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔ وہ پانی کا پائپ لگائے کیاریوں میں مصروف ہو چکی تھیں۔

میں عجلت میں دوبارہ بلند بخت کی طرف جھکی۔

"اور میں تو مارے ڈر کے اس سے یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ وہ کون ہے؟ اس سے کہاں ملا؟ اور کتنی بار؟"

"تو یہ ساری باتیں جان کر تم کیا۔۔۔"

"بخت آور۔۔۔" امو کی ایک اور پکار۔۔۔ بلند بخت کی آدھی بات نگل گئی تھی۔

"اُفوہ۔۔۔ ایک تو یہ امو جان۔" میں ناراضی سے بڑبڑائی۔۔۔ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"رات جب امو سو جائیں گی تو میں تمہیں میسج کروں گی۔ تب کال کرنا۔۔۔ پھر ساری بات۔"

"کیا مجھے خود جانا پڑے گا باورچی خانے میں؟" امو جان کی ناراضی بھری آواز۔

"امو جا رہی ہوں۔"

"آج بڑے دنوں بعد امو نے بریانی بنائی ہے۔ دیکھتی ہوں ناصرہ نے چپاتیاں بنالی ہیں تو ٹیبل پہ لگاتی ہوں کھانا۔ اتنے مزے کی بریانی۔۔۔ بس انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ گے۔"

میں نے عجلت میں کرسی کھسکائی۔ آگے بڑھی' میز سے ٹکرائی اور پھر جاتے جاتے بلند بخت کا پیر کچل دیا۔

"اُف۔۔۔" وہ فوراً" اپنے پاؤں پہ جھکا۔

میں "سوری۔۔۔ سوری" کہتی کچن کی طرف بھاگی تھی۔

☼ ☼ ☼
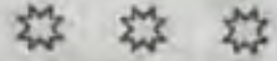
بچپن کے بہت سے سال میں نے اور بلند بخت نے پنجاب کے گاؤں میں اکٹھے سرسوں کے پھول چنتے ہوئے گزارے تھے۔ وہ میری خالہ کا بیٹا بھی تھا اور چچا کا

بھی۔۔۔ یعنی دوہرا رشتہ۔

عمر میں۔۔۔ وہ مجھ سے دو ڈھائی سال ہی بڑا تھا۔ لیکن ہم دونوں میں دوستی انتہا کی تھی۔ گاؤں کا کونا کونا ہمارا دیکھا بھالا تھا۔ گرمیوں میں ہم آم کے درختوں کو اپنا مسکن بناتے، سردیاں گنے چوستے اور بھٹے کھاتے ہوئے گزرتیں۔

ہمارا کھیل کوئی خاص نہیں ہوتا تھا۔ بس ہم لوگ باتیں بہت کرتے تھے۔ دنیا جہان کی باتیں۔۔۔ سارے زمانے کی۔۔۔ بے تحاشا باتیں۔۔۔ اور یہ باتیں کبھی ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔۔۔ ہم بھری دوپہروں میں چیل کے گھونسلوں میں انڈے کھوجتے اور بولتے رہتے۔ کبھی خشک زمین پر لہریے دار لکیروں کے تعاقب میں سانپ ڈھونڈتے۔۔۔ ٹیوب ویل کے ٹھنڈے یخ پانی میں پاؤں ڈبو کر بیٹھتے۔۔۔ یا نہر کے گدلے پانی میں کبھی کبھار دکھ جانے والی مچھلیوں کو گنتے۔۔۔ باتیں ہماری۔۔۔ ہر حال میں جاری ہی رہتیں۔ حتیٰ کہ کبھی کبھار رات گئے بستر میں لیٹے لیٹے بھی اچانک کوئی بات یاد آجاتی تو میں بے اختیار ہی۔۔۔ اسے پکار اٹھتی اور پھر امو کی ڈانٹ سن کر ہی لحاف میں گھستی۔

ہماری دادی جان جو امو کی سگی پھپھو تھیں۔ سنا ہے ہماری نسبت بچپن میں ہی طے کر گئی تھیں۔ ہمارا نام بھی انہوں نے خود ہی تجویز کیا تھا۔ وہ بلند بخت تھا اور میں بخت آور۔۔۔ بڑے ہونے پر گو یہ بات دوبارہ کبھی دہرائی نہیں گئی تھی۔ لیکن میرے دل میں دبا، بلند بخت کی محبت کا بیج اب ایک تناور درخت تھا۔ جس کی جڑیں میری ہر رگ کے ساتھ جوان ہوئی تھیں۔

بلند بخت کے سوا کسی دوسرے مرد کا گزر بھی میرے خواب سے نہ ہوا تھا۔ حالانکہ ہم دونوں کے بیچ کم از کم پندرہ سال تک سات سمندر حائل رہے۔ جب اس کی فیملی باہر شفٹ ہو گئی۔ اس دوران کبھی کبھار فون یا خط و کتابت کا رابطہ رہا۔ مگر دو سال قبل یہ لوگ واپس آئے تو سلسلے پھر وہیں سے جڑے تھے۔

میری فیملی اس دوران پنجاب کے دور افتادہ گاؤں سے نکل کر یہاں سرسبز پہاڑوں میں گھری وادی میں قیام پذیر ہو چکی تھی۔ وجہ ابا جان کا خشک میوہ جات کا کاروبار تھا۔ یہاں کسی سے بھی بہت قریبی تعلقات قائم نہ ہو سکے۔ مگر ماہین وجدان سے میری دوستی کا آغاز ادھر کالج میں ہی ہوا تھا اور مجھے یاد ہے۔۔۔ جب میں اس سے پہلی بار ملی۔۔۔ وہ رو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ رو رہی تھی۔۔۔ زارو قطار۔۔۔ ہچکیوں سے۔

اور آنسو اس کی شہد رنگ آنکھوں سے ایک تسلسل کے ساتھ بہتے ہوئے اس کے شفاف لو دیتے سنہری چہرے کو بھگوئے جا رہے تھے۔

اس کے پاس کھڑی لڑکیاں خاموش تھیں۔ لیکن مختلف تاثرات چہروں پہ سجائے ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"اسے کیا ہوا؟" میں نے ایک شناسا طالبہ سے دریافت کیا۔

"پروفیسر کومل کوئی ٹیسٹ لے رہی تھیں۔۔۔ محترمہ بیٹھ کر کوئی نظم لکھنے لگیں۔۔۔ بس انہوں نے خوب ہی جھاڑ دیا سب کے سامنے۔"

"اوہ!" نہ جانے کیوں مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔

میں دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ تو وہ بازوؤں میں اپنی فائل بھینچے کالج کے بیرونی گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے گھونگھریالے بال اس کے کاندھوں پر بکھرے تھے اور بڑی سی شال کا کونا زمین کو چھو رہا تھا۔ وہ سر جھکائے جا رہی تھی اور شاید ابھی تک رو بھی رہی تھی۔

پھر اس کے بعد بہت دنوں تک میں نے اسے کالج میں نہیں دیکھا۔ کسی سے استفسار کیا تو پتا چلا کہ اس نے کالج چھوڑ دیا ہے۔

☆ ☆ ☆

پھر اس واقعے کے چند دن بعد۔۔۔ محض چند دن بعد میں اس سے دوبارہ ملی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی لائبریری میں تھے۔ ایک ہی الماری کے سامنے۔ اور

ہم دونوں نے دفعتاً ایک ہی کتاب کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور پھر ذرا سے تذبذب کے بعد اس نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا تھا۔

کتاب اب میرے ہاتھ میں تھی۔ لیکن اس کی نظروں کے حصار میں۔

"میں بہت دنوں سے اس کتاب کی تلاش میں تھی۔" یاسیت بھرا لہجہ۔۔۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ مسل رہی تھی۔۔۔ یوں جیسے کوئی بہت ہی قیمتی چیز اس سے چھن گئی ہو۔

میرے لیے وہ کتاب صرف ایک کتاب تھی۔ جس کا نام بھی شاید آج پہلی بار میں نے پڑھا تھا۔

"یہ بہت اچھی کتاب ہے کیا؟" میں نے یوں ہی اس کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔

"ہاں۔۔۔ مجھے پسند ہے۔۔۔ بہت زیادہ۔۔۔ میں نے اسے کئی مرتبہ پڑھا ہے۔۔۔ اور پھر میرا دل چاہ رہا ہے پھر اسے پڑھوں۔"

وہ اخروٹی رنگ کے لمبے سے کرتے میں بہت سادہ اور معصوم لگ رہی تھی۔۔۔ بال کلپ میں جکڑے ہوئے۔

مجھے یوں ہی اس کے خوب صورت چہرے پہ پیار سا آیا تو میں نے کتاب اس کی طرف بڑھا دی۔

"میں تو صرف شوق کی خاطر لے جا رہی تھی۔۔۔ تمہیں ضرورت ہے تو پھر ضرور پڑھو۔"

"واقعی۔۔۔؟" اس کی بے یقین آنکھوں میں جگنو سے چمکے۔

"ہوں۔۔۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"پلیز۔۔۔ آپ مجھے یہ کتاب ایشو کروا دیں۔۔۔ میں اپنا کارڈ گھر بھول آئی ہوں۔"

"ضرور۔۔۔"

میں نے کتاب ایشو کروا کے اسے تھمائی۔۔۔ تو لائبریرین جھٹ سے اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا۔

"یہ آپ نے کیا کیا؟ کتاب انہیں کیوں دے دی؟"

"کیوں کیا ہوا؟"

"یہ محترمہ کتاب واپس نہیں کریں گی۔" وہ سخت غصے میں تھا۔

میں نے ایک نظر گھبرا کر اسے دیکھا جو مڑے سے لائبریری کا بیرونی دروازہ پار کر رہی تھی۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟" میں نے بے یقینی سے لائبریرین کو دیکھا۔

"تو بتائیے۔۔۔ یہ ناممکن کیسے ہے؟ جو کتاب انہیں پسند آجائے محترمہ ہتھیا لیتی ہیں اور دگنی تگنی قیمت چکا کر یہ جا۔۔۔ وہ جا۔۔۔ بعد میں اس کتاب کو کھوجنے کی خواری میری۔۔۔ جہاں سے بھی ملے لائبریری میں رکھو لا کر۔۔۔ ہونہہ۔۔۔ ان کے پاس تو رٹا رٹایا جملہ ہوتا ہے۔ "کتاب کھو گئی۔" اب اس کتاب کی ذمہ دار آپ ہوں گی۔ یہ بتائے دے رہا ہوں۔۔۔ مقررہ وقت پر واپس جمع کرائیں، ورنہ ممبر شپ منسوخ۔"

وہ بڑبڑاتا ہوا۔۔۔ الماری میں کتابیں درست کرنے لگا۔

میں اپنی بے وقوفی پر پچھتائی۔ امو جو میری عقل کے بارے میں فرماتی ہیں تو کچھ کچھ درست ہی لگا اس لمحے۔

مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ میں اپنا سا منہ لے کر واپس چلی آئی۔ مگر فکر مندی سی رہی۔

امو تو اکثر ہی لائبریری سے کتب منگوایا کرتی تھیں۔۔۔ یہ کارگزاری ان تک پہنچتی تو خوب ہی لعن طعن کرتیں۔۔۔ دو، تین روز چپ سادھے رکھی۔

چوتھے روز لائبریرین کا فون آگیا۔

"اس صدی کا یہ انوکھا واقعہ ہے کہ ماہین وجدان وہ کتاب واپس دے گئی ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "اس بار کتاب نہیں کھوئی کیا؟"

فرمانے لگیں۔ "میں کتاب کھو دیتی تو آپ اور ڈھونڈ لاتے۔۔۔ کسی کا اعتبار کھو دیتی تو کیا لے آتے کہیں سے، قیمت دے کر۔"

اس نے بات ہی ایسی کی کہ میں چپ ہو رہا۔

بہرحال فرصت ہو تو آکر لے جائیے گا' یہ کتاب میں نے آپ کے لیے سنبھال رکھی ہے۔"

☼ ☼ ☼

اور تیسری بار۔۔۔ میں نے اسے تب دیکھا۔۔۔ جب بہار اپنے عروج پر تھی۔۔۔ وادی پہ پھیلے سبزے کا رنگ چمک دار اور ہوا پہاڑی پھولوں کی خوشبو سے بوجھل تھی۔۔۔ میں کیاریوں سے پھولوں کی خوش رنگ پتیاں جمع کر رہی تھی اور میرا گلابی آنچل ان رنگ برنگی پتیوں سے تقریباً" بھر گیا تھا۔ جب لکڑی کے گیٹ کے اس جانب کوئی آکھڑا ہوا۔ ہلکی سی دستک کی آواز پر' میں نے یوں ہی سر اٹھایا۔

بند گیٹ سے نظر آتے پاؤں دودھیا اور گلابی تھے۔ کڑھائی والی چپل جیسے بنی ہی ان پیروں کے لیے تھی۔

"یہ گھر بہت خوب صورت ہے۔ کل رات میں نے اسے خواب میں دیکھا ہے۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں یہ اندر سے کیسا ہے؟ کیا تم مجھے اندر جانے دو گے؟"

آواز سن کر ہی سراپا نگاہوں میں گھوم گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ چوکیدار نفی میں جواب دیتا۔ میں نے آگے بڑھ کر گیٹ کھول دیا تھا۔ وہ بالکل میرے سامنے کھڑی تھی۔

"میرا نام ماہین ہے۔۔۔ ماہین وجدان۔"

"میں بخت آور ہوں۔"

ہم دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما اور یہیں سے ہماری دوستی کا آغاز ہوا تھا۔ ایک ایسی دوستی جس سے امو عاجز اور ہم دونوں سرشار تھیں۔

شرائط و دلائل سے بے نیاز' مخلص دوستی۔

☼ ☼ ☼

وادی کی ہوا سرد' بوجھل اور نم آلود ہو چکی تھی۔

پہاڑوں کے اس پار سے آنے والے بادل صنوبر اور چیڑ کے درختوں کو کہیں پیچھے چھوڑتے ہوئے گھروں کی بالکونی میں گھومتے اور کھڑکیوں سے بند کمروں کے اندر جھانکتے تھے۔ ایسی ہی سرد سی شام میں' میں ٹی وی اور کتابوں کی کمپنی سے گھبرا کر باورچی خانے میں چلی آئی۔ جب ماہین وجدان کا ایس ایم ایس مجھے ملا۔

"تمہارے گھر کے باہر کھڑی ہوں۔ جلدی سے آجاؤ۔۔۔ ہم کافی پینے جا رہے ہیں۔"

"اوہ نو۔۔۔" میں نے تاسف سے مگ میں پھینٹی ہوئی کریم اور کافی کو دیکھا۔ پھر کسی آس کے تحت اسے جوابی پیغام لکھا۔

"اندر چلی آؤ۔۔۔ کافی تیار ہو چکی ہے۔"

"ہم کافی بار جا رہے ہیں اور بس۔۔۔"

اس کی زبان سے زیادہ اس کا ایس ایم ایس فاسٹ ہوتا تھا۔ مجھے اندازہ تو پہلے سے تھا۔ لہٰذا مگ کو ڈھک کر بھاگم بھاگ موزے چڑھائے۔ ٹوپی کانوں تک کھینچی اور بڑی سی شال لپیٹ کر چپکے سے باہر نکل آئی۔

امو جان اس وقت اپنے کمرے میں تھیں اور یوں خاموشی سے کھسک جانا زیادہ آسان لگتا تھا۔ بہ نسبت ان سے اجازت لیتے ہوئے ان کے چہرے پہ در آنے والی فوری ناگواری اور خفگی کو دیکھنا۔ ایسے میں امو جان کے بھنوؤں کے بیچوں بیچ دو لکیریں بڑی تیزی سے گہری ہو جاتی تھیں۔ انہیں در حقیقت یوں میرا اور اور پھرنا سخت ناپسند تھا اور پھر ماہی بھی ان کی بہت پسندیدہ ہستیوں میں شمار نہیں ہوتی تھی۔ لیکن میں بھی کیا کرتی؟ من چاہی صحبت اور بلاوجہ و بلامقصد گھومنا بچپن سے طبیعت میں ایسا رچا بسا تھا کہ اب یہ "واک" ضرورت ہی لگتی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔۔۔ واپس کر رات کا کھانا بنانے میں مدد کروں گی۔ رات کی چائے بھی میں ہی بناؤں گی۔ امو کی ساری کتابوں کی ڈسٹنگ کر دی تو امو ساری ناراضی منٹوں میں بھول جائیں گی۔"

میں نے دل ہی دل میں منصوبہ بنایا۔ چوکیدار کو جانے کی اطلاع دی اور بھاگ کر ماہین کے ساتھ ہولی۔

"تم دیکھو تو سہی۔۔۔ موسم کتنا خوب صورت ہے۔ کیا ایسے موسم میں گھر میں بیٹھ کر کافی پی جا سکتی ہے؟ بخت یار دیکھو تو سہی۔۔۔ یہ ہوا' یہ بادل' یہ درخت پودے' پتھر یہ سب اس وقت کتنے خوش' سرشار اور بھرپور دکھائی دے رہے ہیں۔۔۔ کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ سب ہماری نگاہ کے منتظر تھے۔ یہ اس امید میں تھے کہ دو لڑکیاں اپنے اپنے گرد قائم چار دیواری کے حصار سے نکل کر ان کی کھلی بانہوں میں آئیں۔۔۔ ان کو دیکھیں' سراہیں' پیار کریں۔"

سرد ہوا اس کے گالوں کو کچھ اور گلابی بنا رہی تھی۔ کافی بار پہنچنے تک وہ سڑک کنارے اگی خودرو جھاڑیوں پہ کھلے ننھے ننھے پھولوں کو چن کر صد ہا رنگ اپنے ہاتھوں میں سما چکی تھی اور بولتی جا رہی تھی۔۔۔ یہ دیکھے بغیر کہ میں اس کو سن بھی رہی ہوں یا نہیں۔۔۔ لیکن میں سن رہی تھی اور دیکھ رہی تھی۔

کافی کا آرڈر دے کر ہم کھڑکی کے قریب لگی میز کی طرف آگئے تھے۔ وہ پھولوں کو میز کے وسط میں ڈھیر کر کے کھڑکی سے جا لگی تھی۔

"بخت۔۔۔!" وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی اور اس کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ "میں تمہیں بتاؤں۔۔۔ میں نے بہت دنوں سے اسے نہیں دیکھا۔ لیکن۔۔۔ میں نے اسے یاد بہت کیا ہے۔" اس کے چہرے پہ اضطراب تھا اور بے چینی بھی۔

اسی بے چینی کو اپنے دل میں محسوس کرتے ہوئے میں نے ذرا سا پہلو بدلا۔۔۔ ہلکا سا کھنکھارتے ہوئے میں نے خود کو بے نیاز اور لاعلم ظاہر کرنا چاہا۔ لیکن وہ میری طرف متوجہ نہ تھی۔ اس کی نگاہیں ہنوز کھڑکی سے باہر کسی کو کھوج رہی تھیں اور ان شہد رنگ آنکھوں میں اترتی نمی نے ساری فضا میں اداسی بھر دی تھی۔

"میں بارہا ان ہی راستوں سے گزری ہوں۔۔۔ درختوں تلے گھنٹوں سرد ہوا میں ٹھٹھری ہوں۔ صرف اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے۔۔۔ لیکن وہ کہیں کھو سا گیا ہے۔۔۔ دکھائی نہیں دیتا۔" اس نے اپنے ہونٹ کاٹ کاٹ کر سرخ کر ڈالے تھے۔

"صرف ایک بار دیکھنے کے بعد تم اسے جوگیوں کی طرح۔۔۔" میں نے ایک بار پھر اسے جھٹلانا چاہا تھا' مگر اس نے بے تابی سے میری بات کاٹ ڈالی۔

"صرف ایک بار۔۔۔ نہیں تو بخت۔۔۔ صرف ایک بار نہیں۔۔۔ میں نے اسے کئی بار دیکھا ہے۔" وہ عجلت میں کرسی کھینچ کر میرے سامنے آبیٹھی تھی۔

"ان ہی جانے پہچانے راستوں پر' اپنے آس پاس میں اسے کئی بار دیکھتی ہوں۔ لیکن میں اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔ کبھی اچانک سامنا ہو بھی جائے تب بھی یقین مانو' میں ایک پل کے لیے بھی اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو جاتا ہے؟ میں بس اسے دور ہی دور سے دیکھ سکتی ہوں۔" وہ انگلیاں چٹخا رہی تھی اور اس کے سامنے پڑی کافی بڑی تیزی سے اپنی گرمائش کھو رہی تھی۔

"کون ہے وہ؟" میں نے جیسے ہار مانتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں جانتی۔" اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔۔۔ لیکن میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔۔۔ میرا دل اپنی برداشت کھو رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے میں چند دن مزید اسے نہ دیکھ پائی تو شاید میرا دل بند ہو جائے گا۔ دھڑکنا بھول جائے گا بخت۔"

"اوہ میرے خدا!" میں تھرا سی گئی۔

"کیا ضروری تھا کہ یہ افلاطونی قسم کی محبت اس بے وقوف لڑکی کے نصیب میں لکھ دی جاتی۔" میں کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم مجھے بتاؤ بخت! میں اسے کہاں تلاشوں؟" بے چارگی کی انتہا تھی اور میرے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"چلو! چلتے ہیں۔۔۔ کافی کا موڈ نہیں ہو رہا۔" اس کی باتوں نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔

وہ بھی چپ چاپ میرے ساتھ ہولی تھی۔ کافی بار سے نکلتے ہی ایک ادھیڑ عمر عورت ہم لوگوں کے سامنے اپنا دوپٹا پھیلائے کھڑی تھی۔

"میرے بچے کا آپریشن ہے۔ خدارا میری میری مدد کرو۔"

میں خالی ہاتھ تھی۔ سو کندھے اچکا کر آگے نکل

آئی۔ چند قدم رک کر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ماہی ابھی تک اس عورت کے قریب کھڑی تھی۔ میرے اشارہ کرنے پر وہ "تقریباً" بھاگ کر میرے برابر آگئی۔ وہ عورت وہیں کھڑی اسے دعاؤں سے نواز رہی تھی۔

"ان لوگوں کے پاس ہزار بہانے ہوتے ہیں مانگنے کے۔" میں نے یوں ہی گردن موڑ کر ماہی کو دیکھا اور پھر چونک گئی۔

"ارے۔۔۔ تمہارا ایک ٹاپس۔۔۔" اس کے ایک کان میں گولڈ کا ٹاپس جگمگا رہا تھا۔ جبکہ دوسرا کان خالی تھا۔

"ٹاپس۔۔۔" اس نے قدرے گڑبڑا کر کان کی لو کو چھوا تھا۔

"شاید کہیں گر گیا۔"

اس کے جواب پر میں وہ ٹاپس ڈھونڈنے کے لیے پلٹ ہی جاتی، اگر اس کا لہجہ چغلی نہ کھا رہا ہوتا۔ مجھے صرف چند لمحے لگے تھے حقیقت کو جاننے میں۔ اس دنیا میں شاید میں وہ۔۔۔ واحد انسان تھی، جس کے سامنے ماہین وجدان کم از کم جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔

"ماہی! تم نے وہ ٹاپس۔۔۔ اس عورت کو دے دیا؟" میرے لہجے میں بے یقینی سی تھی۔ حالانکہ مجھے یقین تھا کہ وہ یہ کر چکی ہے۔

"بخت! پلیز۔۔۔ نو نصیحت۔۔۔ اس بے چاری کو ضرورت تھی نا؟ تم جانتی ہو، میں پلک جھپکتے میں ایسے کئی ٹاپس خرید سکتی ہوں۔۔۔ پلیز۔" اس کا یہ فعل سرزنش کیے جانے کے قابل تھا یا نہیں۔ لیکن مجھے رائے دینے سے منع کرنے کے لیے وہ "تقریباً" میری منت کر چکی تھی۔ لہٰذا میں چپ ہی رہی۔۔۔ لیکن ٹھیک دو دن کے بعد بلند بخت مجھے اس کے گھر تک ڈراپ کر کے گیا تھا، تو اس کی ماما وہ ایک ٹاپس ہاتھ میں لیے بیچ کھڑی تھیں اور اس کی ٹھیک ٹھاک کلاس لے رہی تھیں۔

ماہی بال کندھے پہ بکھرائے۔۔۔ دونوں پاؤں صوفے پہ رکھے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی تھی۔

"یہ نئے ٹاپس ہیں، جو صرف پندرہ روز قبل اس کے ضد کرنے پر میں نے اسے دلوائے۔" اس کی ماما نے وہ ٹاپس میری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

"اور آج ملازمہ اس کی سائیڈ ٹیبل کے نیچے سے نکال کر مجھے دے رہی ہے اور دوسرا ٹاپس غائب ہے۔ بخت! مجھے بتاؤ، کیا یہ ایسی چیز ہے کہ بندہ اسے اپنی سائیڈ ٹیبل پہ رکھ کر بھول جائے۔ اب میں دوسرا ٹاپس کہاں سے ڈھونڈوں؟" ماما اسے چھوڑ کر اب میرا گھر دبائے بیٹھی تھیں۔

"گھر میں بیسیوں ملازم ہیں جو دن میں دسیوں بار اس کے کمرے کے چکر لگاتے ہیں۔ کبھی کھانے کے لیے۔۔۔ کبھی چائے کے لیے۔۔۔ کبھی کسی مہمان کی آمد پہ۔۔۔ کبھی صفائی ستھرائی کے چکر میں۔۔۔ اب بتاؤ۔۔۔ میں کس پہ الزام دھروں۔۔۔ کس سے پوچھ گچھ کروں۔۔۔ کس کی تلاشی لوں؟"

ان کی بے بسی دیکھ کر مجھے ماہی پہ بے حد غصہ آرہا تھا۔

ایک پل کے لیے دل چاہا، انہیں سچ بات بتا ہی دوں اور شاید میرے تاثرات سے خائف ہو کر ہی وہ جھٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"ماما پلیز۔۔۔ مل جائے گا نا؟ کمرے میں ہی ہو گا۔ میں ڈھونڈ لوں گی اور پھر کسی نے چرائے ہوتے تو دونوں ٹاپس ہی چرا لیتا۔ لائیں، یہ مجھے دیں، میں لا کر میں رکھتی ہوں اور دوسرا ٹاپس بھی ڈھونڈ لیتی ہوں۔"

"ماہی! مجھے چیز کے جانے کا دکھ نہیں ہے۔ لیکن یہ تمہارا لاپروا رویہ۔۔۔ مجھے پریشان کر کے رکھ دیتا ہے۔" انہوں نے وہ ٹاپس ماہین کو تھمایا تو وہ مجھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

میں کیسے اٹھ سکتی تھی کہ میرا ہاتھ آنٹی کے ہاتھ میں دبا تھا اور شاید بہت دنوں بعد انہیں کوئی ایسا کندھا ملا تھا جس پہ سر رکھ کر وہ اپنے دل کا غبار ہلکا کر سکتی تھیں۔

"مجھے تو لگتا ہے، اس نے خود ہی کسی کو دے دلا دیا ہے۔ نہ کچھ سوچتی ہے، نہ سمجھتی ہے۔ میں تو عاجز آگئی ہوں اس کی ہمدردیوں سے۔ اس روز یہاں کوئی بھکاری، سوالی آگیا تو محترمہ نے اسٹور سے نیا نکور "دسورا" کا کمبل نکلوا کر اسے تھما دیا اور وہ بھی مجھ سے چوری۔۔۔ وہ تو ملازمہ مارے ڈر کے مجھے بتا گئی کہ کل کلاں اس کا نام نہ لگ جائے۔" وہ تاسف سے بولیں۔

"تم پلیز۔ اسے کچھ سمجھاؤ۔۔۔ تم ایسی سمجھ دار، باشعور لڑکی کی دوستی میں اسے کچھ تو سیکھنا چاہیے۔"

پورا آدھا گھنٹہ میں اپنا سر اثبات میں ہلا ہلا کر تھک گئی تو آخر کار ہلکی سی بے مروتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں نے ماہی کی ماما سے معذرت کی اور اس کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ چائے کے ساتھ دیگر لوازمات سے بھری ٹرالی لیے میرے انتظار میں بیٹھی تھی۔

"سوری۔۔۔ بہت بور کیا نا ماما نے تمہیں؟" اس کے سوال سے زیادہ میں اس کے اطمینان پر تپی تھی۔

"توبہ! کس قدر ڈھیٹ ہو ماہی تم۔۔۔ اتنی ڈانٹ اگر مجھے امو سے پڑے نا تو مارے خفت کے میں شاید پورا ہفتہ بے ہوشی میں گزار دوں۔" میں نے اسے شرم دلانی چاہی۔

"ارے۔۔۔" وہ ذرا سا ہنسی۔ "تم ماما کی ڈانٹ سن رہی تھیں؟"

"کیوں۔۔۔ تم نے نہیں سنی؟" میں چڑ گئی۔

جواباً" اس نے بڑے اطمینان سے چپس چبانے شروع کر دیے تھے۔

"سوری۔۔۔ مجھے دھیان نہیں رہا۔۔۔ ورنہ شاید سن ہی لیتی۔ میں تو صرف یہ سوچ رہی تھی کہ اسکائی بلیو کلر میں ماما پہلے سے اسمارٹ اور ینگ لگ رہی ہیں۔ شاید تازہ تازہ فیشل کا اثر ہو گا۔ ماما کا میک اپ بھی اچھا ہوتا ہے۔ بس اوپر والے ہونٹ کا کٹاؤ اچھا نہیں بناتیں۔۔۔ وہاں ماما کی لپ پنسل ہمیشہ جلدی نیچے گر جاتی ہے۔ خیر۔۔۔ کسی دن میرے ہاتھ لگ گئیں تو بہت اچھی سی آؤٹ لائن بنا دوں گی۔۔۔ تم یہ چائے لو نا۔" اسے یکایک ہی میزبانی یاد آگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"او خدایا! کس قدر اسٹوپڈ لڑکی ہے وہ۔۔۔ ناقابل یقین بات ہے نا۔۔۔ اس کی ماما اس کی حرکتوں سے نالاں، پریشان اس کے سامنے رو پیٹ کر ہلکان ہو رہی ہیں اور وہ صرف اس بات پر غور کرتی رہی کہ اسکائی بلو کلر میں اس کی ماما کیسی لگتی ہیں؟ اور یہ کہ۔۔۔ اس کی ماما لپ پنسل ٹھیک طرح سے نہیں لگاتیں۔ یہ بات کہی بھی کس نے؟ ماہین وجدان نے۔ جس کے ہاتھ میں، میں نے کبھی لپ اسٹک بھی پکڑی ہوئی نہیں دیکھی اور شاید اسے ڈھنگ سے پکڑنا آتی بھی نہ ہو گی۔" ہنستے ہنستے میری آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔

بلند بخت نے میرے ہاتھ میں پکڑی کتاب کھینچ کر کاؤنٹر پہ پٹخی اور پھر مجھے بازو سے پکڑ کر شاپ سے باہر نکل گیا۔

"ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ یہ کیا؟ بلند بخت؟ رکو تو۔۔۔" میں چلاتی رہ گئی، مگر بلند بخت مجھے گاڑی میں دھکیل کر خود بڑے آرام سے ڈرائیونگ سیٹ پر آکر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا تھا۔

"تمہارا کتاب خریدنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔۔۔ تم اس وقت صرف بک بک کرنے کے لیے گھر سے نکلی ہو۔" گاڑی ریورس کرتے ہوئے اس نے مجھے بغور دیکھ کر جتایا تو میری ایک بار پھر ہنسی نکل گئی۔

"بالکل درست۔۔۔ گھر میں تو امو مجھے ڈھنگ سے نہ بولنے دیں، نہ ہنسنے دیں، یقین جانو، کبھی بھولے سے اونچی آواز میں ہنس دوں تو امو جان کے اندر کی ہیڈ ماسٹرنی جھٹ انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہو جاتی ہے۔"

"خیر۔۔۔ اب میری خالہ جان ایسی بھی ہٹلر نہیں۔۔۔ تم اکلوتی ہو اور پھر لڑکی۔۔۔ اس لیے توجہ ذرا زیادہ دیتی ہیں تم پر۔"

"ارے! تمہیں کیا معلوم؟ امو جان کا بس چلے تو مجھے مکھی بنا کر کسی کتاب پہ چپکا دیں یا کسی بیل کی صورت درخت پر چڑھا دیں اور جب دل چاہے میری کتر بیونت کرتی رہیں۔ ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ یہ کیا؟ کہاں جا رہے ہو؟" لکڑی کا گیٹ پیچھے رہ گیا تھا۔ میں بے اختیار بلند بخت کی جانب پلٹی۔

"تمہاری خالہ کے گھر۔"

"ہائے۔۔۔ نہیں۔۔۔ بلند بخت اس وقت نہیں۔" میں نے اپنے حلیے کو دیکھا۔
"میں نے تو کپڑے بھی چینج نہیں کیے اور بال بھی یوں ہی بکھیرے پھر رہی ہوں صبح سے۔"
"تو پھر کیا ہوا؟ ایسے بھی ٹھیک لگ رہی ہو۔" اس نے ایک سرسری نگاہ مجھ پر ڈالی تھی۔
"بالکل سادھو لگ رہی ہوں اس وقت اور پھر امو کو بنا بتائے جائیں گے؟ تمہیں پتا ہے۔ وہ مجھ سے خفا ہوں گی۔" میں خوامخواہ ہی بہانے گھڑنے لگی۔۔۔ خالہ بہت نک سک سے درست رہنے والی خاتون تھیں اور اس حلیے میں ان کے سامنے جا کر میرا تو سارا اعتماد زیر زبر ہو جانا تھا۔
"مجھے معلوم ہے، میری خالہ ہمیشہ یوں ہی چکمہ کھاتی ہیں تم سے۔۔۔ انہیں ہمیشہ تمہارے جانے کی خبر، تمہارے جانے کے بعد ہی ملتی ہے، میں بھی گھر پہنچ کر اطلاع کر دوں گا۔"
وہ بڑے آرام سے گاڑی روک کر نیچے اتر رہا تھا۔ میں نے بیک ویو مرر کو جلدی جلدی اپنی طرف سیٹ کر کے دو چار ہاتھ اپنے بالوں میں مارے اور بلند بخت کے پیچھے بھاگی۔ ابھی مہینہ بھر پہلے ہی یہ لوگ یہاں شفٹ ہوئے تھے اور غالباً" دوسرا یا تیسرا چکر تھا میرا اس گھر میں۔ حسب توقع خالہ نے بڑے پرتپاک انداز میں میرا استقبال کیا تھا۔ بہت قریب ہونے کے باوجود امو میرا خالہ کی طرف بہت زیادہ آنا جانا پسند نہیں کرتی تھیں۔ وجہ شاید میرا اس گھر سے وہ رشتہ تھا جو عنقریب گہرے بندھن میں جڑنے والا تھا۔
کوئی کچھ کہے نہ کہے، میرے دل کو تو خبر تھی ناں۔ سو امو جان کے سب گریز میں بخوبی بھانپ لیتی تھی۔
"کل ہی تو واپس آئے ہیں ہم لوگ ساہیوال سے اور بلند بخت کو جلدی پڑی ہوئی تھی کہ تمہارے تحائف تم تک پہنچا دے۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ میں خود اپنی بیٹی کے حوالے کروں گی اور دیکھو، اب تمہیں بھی لے آیا۔ مجھ پہ زیادہ اعتبار نہیں ہے میرے بیٹے کو۔" خالہ مسکراتے ہوئے اسے چھیڑ رہی تھیں۔
"نہیں ماں! ہم لوگ صرف کچھ بکس خریدنے کے لیے نکلے تھے۔ کچھ خاص پسند نہیں آیا تو سیدھا ادھر ہو لیے۔ آپ کہیں تو ابھی واپس چھوڑ آتا ہوں۔" وہ بھی شرارت کے موڈ میں تھا۔ خالہ مجھے اپنے ساتھ لیے بیڈ روم میں آ گئیں۔
کچھ ملبوسات تھے اور کچھ حلوے، بیسن وغیرہ سردیوں کے موسم کی خاص سوغاتیں جو پھپھو نے بھجوائی تھیں۔
"یہ دیکھو۔۔۔ یہ نازیہ نے خود تمہارے لیے کاڑھا ہے۔" سیاہ کرتے پہ زرد اور نارنجی رنگ کے پھول بڑی نفاست سے کاڑھے گئے تھے اور بے حد خوشنما لگ رہے تھے اس سیاہ کرتے کو دیکھ کر مجھے جو خیال فوری طور پر آیا تھا۔ وہ اپنی وجدان کا تھا۔
"اس کی برتھ ڈے کب آ رہی ہے؟" میں نے دل ہی دل میں حساب کرنے کی کوشش کی۔
"یہ تم پہ بہت اچھا لگے گا۔ اسے تم اپنی برتھ ڈے کے لیے سنبھال رکھو۔" یہ بلند بخت تھا جس نے مجھے میرے خیال سے چونکا دیا تھا۔
میں نے بس ایک نظر بخت کو دیکھا اور پھر اس کرتے کو تہہ کرتے ہوئے فوراً" ہی اپنے خیال سے تائب ہو گئی۔
"یہ سوٹ بلند بخت کو پسند ہے۔ تو بس پھر اسے میں ہی پہنوں گی۔"
میں نے سب تحائف سمیٹ کر ایک طرف رکھ لیے اور پھر پاستا کا پیالہ اور کولڈ ڈرنک لے کر ہم دونوں گھر کے عقبی حصے کی طرف آ گئے۔۔۔ یہ سبزے سے ڈھکا ہوا ڈھلوان راستہ تھا۔ جس کے بڑے بڑے پتھروں پہ جگہ بنا کر ہم بیٹھے تو سبز لمبی ٹہنیوں پہ کھلے جامنی پھول ہمارے کندھوں کے برابر لہرا رہے تھے اور نم آلود ہوا میں گھاس کی سبز، تازہ خوشبو رچی بسی تھی۔ یہ خالص، معطر ہوا ہمارے چہروں کو چھو کر گزرتی تو ہم لوگ ہلکا سا کپکپا جاتے تھے۔
"یہ وقت۔۔۔ یہ مقام اور موسم چائے، کافی انجوائے کرنے کا ہے نہ کہ کولڈ ڈرنک۔" بلند بخت نے ہلکا سا

اعتراض کیا۔
اور یہ کولڈ ڈرنک خالہ سے بڑی تگ و دو سے نکلوائی تھی اس نے میرے لیے۔
خالہ کافی کے لیے مگ نکال رہی تھیں اور میں بے تواز کولڈ ڈرنک کے نعرے لگا رہی تھی۔ جسے پہلے تو بلند بخت نے نظر انداز کر دیا تھا۔ مگر بعد میں ہار مان لی۔ خالہ تو ارے، ارے ہی کرتی رہ گئیں اور ہم دونوں باہر۔
اور پھر ہم دونوں بہت دیر تک وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کافی میں بنا کر لائی تھی۔ خالہ اپنے چھوٹے بیٹے احمر کے ساتھ فون پر محو گفتگو تھیں۔
ہم وہاں بیٹھے باتیں کرتے تھے اور نم آلود ہوا دھیرے دھیرے ہمیں چھو کر بہتی تھی۔ اس ہوا میں بلند بخت کے وجود کی خوشبو تھی جو مجھے مدہوش کرتی تھی تو میں مارے گھبراہٹ کے کافی کے گرم اور بڑے گھونٹ بھر کر اپنے ہونٹ جلاتی اور خود پہ قابو رکھتی تھی۔

☼ ☼ ☼
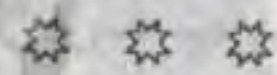
بابا کی واپسی اسلام آباد سے پورے ایک ہفتے کے بعد ہوئی تھی اور ہم تینوں بے حد خوش تھے۔ گھر میں تیسرے فرد کی آمد نے اور خصوصاً" اس فرد کی جو میرے سارے لاڈ پیار خصوصی اہمیت کے ساتھ اٹھاتے تھے، مجھے نہال کر دیا تھا۔
امو جان بھی بڑی پھرتی سے کچن کے سارے کام ایک کے بعد ایک نپٹاتی جا رہی تھیں۔۔۔ کھانے کی لمبی میز آج خوب بھری ہوئی اور خاصی بارونق لگ رہی تھی۔۔۔ بابا میٹھا شوق سے کھاتے تھے اور امو نے ٹرائفل اور کھیر کے ساتھ ساتھ انڈوں کا حلوہ بھی بنا لیا تھا۔ سیخ کباب، بریانی اور کڑاہی۔۔۔ کھانے پہ اچھا خاصا اہتمام دیکھ کر بابا نے فوراً" ہی بلند بخت کو فون کھڑکا ڈالا تھا۔
"کھانا بے حد مزے کا ہے۔ اپنی ماں کو لے کر فوراً" چلے آؤ۔"
اور وہ واقعی خالہ جان کے ساتھ فوراً" چلا آیا تھا۔ چچا جان ابھی تک ساہیوال میں ہی تھے۔ لیکن ان کی کمی ہم سب نے محسوس کی تھی۔
بے حد خوشگوار ماحول میں کھانا کھاتے ہوئے میرے موبائل پر میسج ٹون ایک بار نہیں، بار بار آ رہی تھی۔
سب کو باتوں میں مگن دیکھ کر میں نے جھٹ میسج پڑھا۔
"میں نے آج شام اسے دیکھا۔۔۔ بخت! آج کی رات بہت روشن ہو گی۔"
دوسرا میسج۔
"وہ بائیک پر تھا اور اس نے سیاہ گلاسز لگا رکھے تھے۔"
تیسرا میسج۔
"وہ ڈھلتے ہوئے سورج کی زردی میں نہایا ہوا۔۔۔ بے حد خوب صورت لگ رہا تھا۔"
چوتھا میسج۔
اس سے قبل کہ پڑھ پاتی "ٹھک" سے کوئی چیز میرے پاؤں پہ لگی۔
میں نے سٹپٹا کر نظریں اٹھائیں۔۔۔ وہ امو کا بھاری جوتا تھا اور سامنے امو کی تنبیہہ کرتی، گھورتی ہوئی نگاہیں۔ میں کھسیانی سی ہو کر موبائل آف کرنے لگی۔ بلند بخت کے ہونٹوں پہ مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ واقف حال قسم کی۔ میں ڈھٹائی سے مسکرا کر ٹرائفل چکھنے لگی تھی۔
رات کھانے کے بعد گول کمرے میں محفل بڑی دیر تک جمی رہی۔ خالہ جان، امو کو ساہیوال کے ٹور کے بارے میں بتا رہی تھیں۔ وہی خالصتاً" گھریلو خواتین والی گفتگو۔
کس کا گھر کیسا؟
کس کا رویہ ناقابل برداشت؟
کس کی اولاد سلجھی ہوئی؟
کس کا سگا کون؟ اور کس کا جھکاؤ کس طرف؟
ایسی بور ترین گفتگو میں میرا گزارہ کہاں؟ آخر

کھسکتے کھسکتے بابا جان اور بلند بخت کی محفل میں آگھسی' یہاں سیاست تھی' کھیل تھے' کتابیں تھیں۔
نیوز چینل پر چلنے والے گرماگرم پروگرام اور معاشی و معاشرتی مسائل۔۔۔

باہر ہوا بہت سرد تھی اور جب بلند قامت درختوں' پتوں کو چھیڑ کر گزرتی تو کئی قسم کی آوازیں پیدا کرتی تھی۔ بلند بخت نے اٹھ کر پردے برابر کیے۔۔۔ آتش دان میں سلگتی لکڑیوں پر کچھ اور خشک لکڑیاں ڈالیں۔۔۔ میں بابا جان کی لوئی میں سمٹی ان کے کندھے سے لگی بیٹھی تھی۔

ثقیل قسم کے ڈنر اور جی بھر کے بول چکنے کے بعد ہم سب ایک اچھی نیند کے خواہاں تھے۔ لہٰذا بلند بخت اور خالہ جان کے اٹھتے ہی میں انہیں خدا حافظ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ امو اور بابا جان البتہ انہیں کچھ دور تک چھوڑنے گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

صبح میری آنکھ کافی دیر سے کھلی تھی۔ لیکن سورج بہرحال ابھی بھی نہ نکلا تھا۔ گھر میں خاموشی کا راج تھا۔ امو ابھی نہیں اٹھی تھیں۔ گویا مکمل آزادی۔

میں ہلکے پھلکے ناشتے کے بعد کافی کا مگ لے کر ٹیرس پہ آگئی۔ دور' قریب کا ہر منظر گہری' دبیز دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ درخت ساکت و صامت تھے اور اس دھند میں ان کی پوری قامت دکھائی نہ دیتی تھی۔ چوکیدار گیٹ کے اس پار کھڑا تھا اور اپنے منہ سے سفید بھاپ نکال نکال کر موبائل پہ کسی سے بات کر رہا تھا اور تب ہی مجھے خیال آیا کہ میرا موبائل رات سے ہی بند پڑا تھا۔

”او خدایا! وہ بلی تو مجھے نوچ کھائے گی۔“ سب سے پہلا خیال مجھے ماہی کا ہی آیا تھا اور تب ہی میں نے اسے دیکھا۔

سفید کہرے میں چھپے راستے پہ قدم اٹھاتی' رکھتی وہ ماہین وجدان ہی تھی۔ وہ بھاری' اونی لباس پہنے ہوئے تھی اور اس کا لمبا مفلر اس کے قدموں کو چھو رہا تھا۔

”پتا نہیں۔۔۔ کون سی بے چین روح سمائی ہوئی ہے اس لڑکی میں۔۔۔ جو اسے کسی پل چین نہیں [illegible] نے بجی ہوئی کافی کے ساتھ مگ کمرے میں میز [illegible] اور خود بھاگم بھاگ باہر نکل آئی۔ وہ حسب معمول [illegible] دیکھ کر خوش نہ ہوئی تھی' بلکہ طویل سانس لے کر [illegible] نے رخ موڑ لیا تھا۔

”اوئے اوئے۔۔۔ مزاج کچھ برہم سے لگ رہے ہیں۔“ میں نے دانستہ خوشگوار موڈ میں اسے چھیڑا۔

”تم بہت بری ہو بخت۔“ اس کی آنکھوں میں بہت سا شکوہ اتر آیا تھا۔

”یہ نئی اطلاع ہے میرے لیے۔“

”میں نے بہت بار فون کیا۔۔۔ میں تم سے بات کرنا چاہتی تھی۔ تمہیں پتا ہے نا۔ دنیا میں تم واحد ہو جس سے میں' ہر وقت' ہر بات شیئر کرنا چاہتی ہوں۔ بلکہ صرف تم سے ہی شیئر کر سکتی ہوں۔“

”میں جانتی ہوں' لیکن کل۔۔۔“ میں نے اسے [illegible] چاہا۔ مگر وہ اپنی بات میں کھوئی ہوئی تھی۔

”میں نے کل اس کے لیے ایک نظم بھی لکھی۔ کل وہ لمحہ میرے لیے بہت بہت عجیب اور حیران کن تھا۔ جب میں نے اسے دیکھا۔ دراصل میں اس کو دیکھنے کی امید کھو بیٹھی تھی۔ مجھے لگتا تھا شاید وہ کسی اور دیس سے آیا ہوا مہمان تھا' جو اب جا چکا ہے۔ لیکن۔ پھر میں نے اسے دیکھ لیا۔“ وہ جیسے تھک کر وہیں ایک پتھر پہ ٹک گئی تھی۔

”اور جیسے۔۔۔ برف میں منجمد تتلی کسی پر حرارت لمس سے ایک دم زندہ ہو جائے۔۔۔ اسی طرح کل میں بھی زندہ ہو گئی بخت آور۔۔۔ اس کی ایک جھلک سے ہی میری آنکھوں میں نور اتر آیا اور پھر میں رات بہت دیر تک جاگی۔ تم جانتی ہو نا۔۔۔ تمہارے بعد میرا قلم ہی میرا دوست ہے۔ میں نے ایک نہیں' کئی نظمیں لکھیں اور ساری اس کے نام۔۔۔“

”لیکن کس کے نام؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم کسی الوژن۔۔۔؟“

”فار گاڈ سیک بخت! امما کو میری ذہنی حالت پہ پہلے

ہی کچھ شک رہتا ہے۔ اب تم بھی۔۔۔“

”ارے نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میرا یہ مطلب تو نہیں۔ لیکن پھر بھی آخر اس کا کوئی نام' پتا۔۔۔ اچھا چلو چل کر اسے ڈھونڈتے ہیں۔ چلو۔۔۔ چلو۔“ اسے بے وجہ سی اداسی میں ڈوبتے دیکھ کر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”لیکن کہاں؟ کہاں ڈھونڈیں گے اسے؟“

”چلو بتاؤ تم نے اسے کہاں کہاں دیکھا؟“ ہم دونوں سڑک سے ہٹ کر ڈھلوان پر اتر گئے۔ یہاں گھاس پہ کہرا جما ہوا تھا اور کئی چھوٹے چھوٹے پتھر ہمارے پیروں تلے آکر پھسلتے اور صبح کی خاموشی میں ہلکا سا ہنگامہ پیدا کرتے تھے۔ ماہی مجھے بتا رہی تھی' وہ اسے کہاں کہاں نظر آیا۔

”دیکھنے میں کیسا ہے؟“ وہ بتانے لگی اور جو وہ بتاتی تھی اس سے تو لگتا تھا' آسمان سے کوئی دیوتا ہی نازل ہوا ہے۔

”بھلا کوئی مرد اتنا خوب صورت کیسے ہو سکتا ہے؟“ میں نے بے یقینی سے سوچا' لیکن کہا نہیں۔ مبادا پھر وہ برا مان جائے۔

چلتے چلتے ہم دونوں کی سانس پھول گئی اور ٹانگیں دکھنے لگی تھیں۔ ہم لوگ ہر اس مقام سے گزرے جہاں سے وہ ”دیوتا“ گزرتا تھا۔ مگر اس بلا کی سردی میں چند ہم جیسے خبطی اور کچھ مجبوراً گھر سے باہر نکلنے والوں کے سوا کوئی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ میں نے تو بلکہ نہایت شرافت سے ایک آنٹی سے بھی پوچھ ڈالا۔

”اس حلیے کا کوئی نوجوان لڑکا۔۔۔ کبھی آپ نے دیکھا ہو تو؟“

پھر ایک گھر کا دروازہ بھی بجا ڈالا۔۔۔ اور ماہی یوں ڈر کر میرے پیچھے چھپ رہی تھی جیسے دروازہ کھلنے پر وہ یوسف ثانی ہی نکل کر سامنے آکھڑا ہو گا۔

مگر اس گھر سے برآمد ہونے والے انکل دیکھنے میں خاصے خوف ناک تھے۔

”دیکھیں جی۔۔۔ ہمیں ایک ایسے شخص کی تلاش ہے' جس کا ہم نام نہیں جانتے۔۔۔ اور وہ۔۔۔“ کھٹاک سے دروازہ بند ہو گیا تھا اور ساتھ ہی میرا منہ بھی۔

میں نے شرمندگی محسوس کرتے ہوئے پلٹ کر اسے دیکھا' وہ اپنے مفلر کو منہ پہ یوں لپیٹ کر کھڑی تھی جیسے پردے کے طور پر آدھا چہرہ چھپا رکھا ہو اور اپنی ہنسی روکنے کی کوشش میں بے حال ہو رہی تھی۔

”چلو ہٹو۔۔۔ اب میں اسے ڈھونڈ کر ہی دم لوں گی۔“ میں نے پر عزم انداز میں کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

مدھم لہجے میں اپنے بالوں کی موٹی سی لٹ اپنی انگلی پر لپیٹتے' کھولتے اس نے مجھے ایک نہیں' کئی نظمیں سنا ڈالی تھیں۔ اس کے پاس سنانے کے لیے بہت کچھ ہوتا تھا۔ سارا دن ادھر سے ادھر آوارہ گردی کے بعد اپنے کمرے میں بند ہو کر وہ کچھ نہ کچھ لکھتی رہتی تھی۔ اس کے پاس اپنی ادھوری اور مکمل نظموں کا ایک ڈھیر جمع تھا۔ ایک پلندہ ان کہانیوں کا بھی تھا' جو وہ صرف مجھے سناتی تھی اور پھر بہت سنبھال کر رکھ لیا کرتی تھی اور ان کہانیوں میں اس کی اپنی زندگی سے اخذ کردہ فلسفہ بولتا تھا۔

اور اس کی وہ طویل کتاب ”سرد موسموں کی تتلی“ جو نہ جانے کتنی نشستوں میں اس نے مجھے سنائی اور وہ اتنی دلچسپ تھی کہ مجھے باقاعدہ جھگڑا کر کے اس سے یہ کتاب حاصل کرنی پڑی اور پھر ایک ہی رات میں اسے ختم بھی کیا۔ اس کتاب میں کرداروں کی بھرمار تھی اور ہر کردار کی اپنی ایک کہانی تھی۔ اردو کی قدیم داستانوں کا سا انداز۔۔۔ ماورائی کردار' اچانک رونما ہونے والے واقعات' برف زاروں کا تذکرہ' کہیں دریاؤں اور صحراؤں کا' اس کتاب میں تتلیاں تھیں' پھول تھے' ناکام خواہشات' مرجھائی ہوئی امیدیں' قسمت کے تانے بانے' وچھوڑا اور ملاپ۔ میں اس کتاب کو پڑھتی تھی اور حیران ہوتی جاتی تھی۔

”تمہیں اسے شائع کروانا چاہیے۔“ میں نے اسے مخلصانہ مشورہ دیا تھا۔

”ہاں' ضرور کرواؤں گی' اس کتاب کا انتساب جس

کے نام کروں گی' وہ مل جائے تب۔" اس نے پختہ ارادے سے کہا۔
اور آج اس نیم تاریک کمرے میں' کھڑکیوں کے پردے گرائے' کافی کا جھاگ سے لبریز بھاپ اڑاتا گرم مگ ہاتھ میں لیے وہ بڑے جذب کے عالم میں' مجھے وہ نظمیں سنا رہی تھی جو اس نے اس انجانے دیوتا کے نام لکھ چھوڑی تھیں اور جنہیں سناتے ہوئے اس کی شہد رنگ آنکھوں میں ہلکی سی نمی بے وجہ اترتی تھی۔ ہونٹ کپکپاتے تھے اور کافی کا ہر گھونٹ بمشکل اس کے حلق سے نیچے اترتا تھا۔
ماہی کی یہ کیفیت' جیسے محبت درد آلود زہر بن کر اس کی رگوں میں دوڑتی ہو' مجھے ہمیشہ ہی خوف زدہ کردیتی تھی اور یہ ہی خوف تھا جو مجھے اس سے دور بھاگ جانے پر مجبور کردیتا تھا۔ ابھی بھی کمرے کی نیم تاریکی کو گہرا ہوتا دیکھ کر میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
"وقت بہت ہو گیا ہے۔ اب چلنا چاہیے۔"
"چلو۔ میں ساتھ چلتی ہوں۔" اس نے اٹھنا چاہا مگر میں عجلت میں اسے منع کرتی باہر نکل آئی تھی۔ یہاں آسمان گہرے بادلوں سے ڈھکا تھا اور وادی پر جھکا آرہا تھا۔ میں اتنے تیز قدم اٹھا رہی تھی جتنے اس وقت اٹھا سکتی تھی۔ موسم کی خرابی' اس پر امو کی ناراضی کا ڈر۔ میرے بھاگتے بھاگتے بھی آسمان سے زمین پر پانی برسا تو لمحوں میں جل تھل کر گیا۔ چوکیدار نے مجھے آتے دیکھ کر دور سے ہی گیٹ کھول دیا تھا۔ میں سرخ روش پہ جمع ہوتے پانی پہ چھپاک چھپاک قدم رکھتی کاریڈور تک آئی تھی اس حالت میں کاریڈور سے ہو کر اپنے کمرے تک جاتی تو امو مجھے قتل کرنے سے بمشکل ہی خود کو روک پاتیں۔ کپکپاتے ہوئے میں نے شال اور سویٹر اتار کر ہاتھ میں لیا تب ہی گول کمرے سے امو عجلت میں باہر آئیں اور ان کے پاس اس وقت مجھے گھورنے کے سوا اور حربہ نہ تھا جس سے وہ مجھے اپنی انتہائی ناراضی کا پتا دیتیں۔
"س۔۔۔ سوری امو۔۔۔ میں تو پہلے ہی نکل آئی تھی مگر بارش۔۔۔!" امو کے عقب سے کوئی اور بھی نکلا تھا جس کی تنبیہہ کرتی نگاہوں نے میری [illegible] کرادی تھی۔
"کوئی وقت' کوئی موسم ہوتا ہے باہر نکلنے کا [illegible] نے تمہیں اتنی ڈھیل تو کبھی بھی نہیں دی [illegible] یوں۔۔۔" امو شروع ہو چکی تھیں۔
میں نے مدد طلب نظروں سے بلند بخت کو دیکھا وہ سنجیدہ تھا اور اس کی آنکھوں سے امو کی تائید جھلک رہی تھی۔ امو جان کی طویل ترین تقریر یہ ضبط کرتے کرتے بھی میری آنکھوں سے نمکین سیلابی بہہ نکلا تھا اور اس شرمندگی سے بچنے کا اور کوئی طریقہ نہیں تھا کہ میں بند جوتوں سے پانی چھلکاتی اور بھاری لباس سے ٹپکاتی وہ کاریڈور اور سیڑھیاں عبور کر کے اپنے کمرے میں روپوش ہو جاتی۔
ان ہی گیلے کپڑوں سمیت باتھ روم کے دروازے سے لگ کر میں نے خوب رو کر اپنا جی ہلکا کیا اور پھر گرم پانی سے نہا دھو کر اپنے بستر میں جا گھسی۔
"حد ہے کہ اپنی مرضی سے اندر' باہر جانے پر بھی اتنی باتیں سننی پڑیں اور وہ بھی بلند بخت کے سامنے امو کو میرا ذرا بھی خیال نہیں۔" نیم غنودگی میں دروازے پر ہوتی دستک میں نے جیسے دور سے ہی جانی پہچانی دستک' لیکن اس وقت کسی کا سامنا کرنے کا موڈ نہیں تھا۔ سو میں سر منہ لپیٹ کر گہری نیند میں کھو گئی۔

☼ ☼ ☼
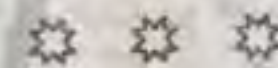
سرد موسم کی بارش میں بھیگنا اور پھر سہہ جانا ایسا بھی آسان نہ تھا۔ سو اگلے کئی روز بخار میں بے سدھ پڑے رہ کر گزارے۔ امو جان تو اس روز کچھ زیادہ ہی خفا تھیں۔ فون پر نجانے بابا سے کیا کیا کہہ ڈالا۔ بابا کی میرے موبائل پہ آنے والی نصیحت بھری کال آدھے گھنٹے سے بھی زیادہ کی تھی اور میں بھی جانے کیوں اس روز اتنی حساس ہو رہی تھی کہ ان کی امرت بھری نصیحتیں سنتی بھی رہی اور بے آواز آنسو بھی بہاتی رہی۔ رات کا کھانا بھی اسی آزردگی میں گول کر دیا۔ اور

پھر اس رات سوئی تو آنکھ اگلی صبح نہیں' بلکہ کئی روز بعد کھلی' بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حواس کئی روز بعد بیدار ہوئے۔
بیماری کے ان چند دنوں میں امو جان' خالہ اور بلند بخت چوبیس گھنٹے میرا گھیراؤ کیے رہے تھے۔
"اس لڑکی نے تو مجھے عاجز کر دیا ہے۔ کیا کروں میں اس کا۔۔۔؟" امو اس دوران بھی پریشان ہی رہیں۔
"بہت من مرضی کرنے لگی ہے۔ اب اس کا کوئی علاج کرنا ہی پڑے گا۔"
"جی۔۔۔ جی۔۔۔ خالہ ضرور۔۔۔" بلند بخت کی تائید اور خالہ کی زوردار ہنسی۔
"علاج کیا کرنا ہے بھئی۔۔۔ ہماری امانت ہمارے حوالے کرو۔۔۔ سنبھال لیں گے خود ہی۔۔۔"
خالہ کے لقمے۔۔۔ میں سوتی جاگتی کیفیت میں سنتی رہی۔
تندرست ہونے کے بعد میں دانستہ کئی روز تک گھر سے باہر نہ نکلی تھی۔ حتیٰ کہ بلند بخت کے ساتھ بھی نہیں اور ایک روز اس نے میرے سامنے ہاتھ ہی جوڑ دیے تھے۔
"فار گاڈ سیک یار! اتنی روتی بسورتی شکل کے ساتھ تم بالکل اچھی نہیں لگ رہی ہو۔ پچھلے دنوں تم ویسے ہی ہمیں خاصا پریشان کر چکی ہو اس لیے بہتر ہے اب اس ڈرامابازی کو ختم کردو۔۔۔ چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔"
"مجھے نہیں جانا کہیں بھی۔۔۔ یہیں کہیں کنواں کھدوادو۔۔۔ پڑی سڑتی رہوں گی اس میں۔"
میں نے کن اکھیوں سے امو جان کو دیکھا' جو بڑی توجہ سے کسی اکھڑے ہوئے فریم کی مرمت میں مصروف تھیں' لیکن چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ ہماری باتوں سے غافل نہ تھیں۔
"کنواں کھدوانے کی کیا ضرورت ہے؟ کسی کھونٹے سے تھوڑی بندھی ہو۔ جاؤ گھومو' پھرو۔۔۔ کودو' پھاندو' عیش کرو' چوکڑیاں بھرو۔ میری بلا سے۔۔۔ اگلے ہفتے گاؤں جا رہے ہیں' وہیں دو بول تمہارے بھی پڑھوا کے میں تو اپنی جان چھڑا لوں گی پھر تم جانو اور یہ بلند بخت جانے۔۔۔ کنواں کھدوائے یا شتر بے مہار چھوڑے۔ اس کی مرضی۔"
غصے میں فریم کی حالت پہلے سے بھی بگڑ گئی تھی سو امو سب کچھ وہیں چھوڑ چھاڑ واک آؤٹ کر گئیں۔ میں کھلے منہ کے ساتھ ہکا بکا سی بلند بخت کو دیکھے گئی۔
"کیوں۔۔۔ کوئی اعتراض۔۔۔؟" وہ کرسی کی دونوں ہتھیوں پہ ہاتھ رکھے میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔
"نن۔۔۔ نہیں تو۔۔۔" بہت ہی بے ساختہ میرے منہ سے نکلا تھا۔
بلند بخت کا جوابی قہقہہ اس سے بھی بے ساختہ تھا۔ میں جھٹ اٹھ کر امو کا فریم درست کرنے میں لگ گئی۔

☼ ☼ ☼
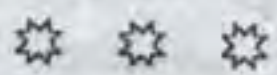
ہم لوگ گاؤں پہنچ چکے تھے۔
اس گاؤں میں جہاں میں نے کچی گندم کے سبز خوشوں جیسی نوخیز جوانی کے ابتدائی ایام گزارے تھے۔ جہاں پیروں تلے آنے والی مٹی نرم' زرخیز اور خوشبودار تھی۔
جہاں چوراہے کے گرد بستے دسیوں گھر میرے اپنے تھے۔
اور کل رات آنے کے بعد گاؤں میں یہ ہماری پہلی صبح تھی۔ جب سورج ابھی پوری طرح نکلا نہ تھا اور کہر فصلوں سے ذرا اوپر سر اٹھائے ٹھہری گئی تھی۔ چڑیوں کے غول کے غول گھنے درختوں سے اڑتے اور ان کی چہکاریں فضا میں شور سا بھر دیتیں۔
ہم دونوں پگڈنڈیوں پر چلتے چلتے نہر کے گدلے پانی کو چھونے چلے آئے تھے۔
میں۔۔۔ اور وہ۔۔۔ ماہین وجدان۔۔۔ جو پہلی بار کسی گاؤں کو دیکھ رہی تھی۔ جو ننھے بچوں کی طرح زرد پروں والی تتلی کے پیچھے بھاگتی تھی اور شیشم کے درختوں میں کوکتی کوئل کو کھوجنے کے لیے ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔ ہمارے پیچھے بہت سے لوگ تھے جو بلاوے کے

لیے آئے تھے۔ آج رات پھپھو کی بڑی بیٹی کی مہندی تھی۔ میں جانتی تھی گھر میں بہت سے کام ہوں گے۔ مہندی کے تھال سجانے چراغوں میں تیل بھرنے سے لے کر گھر کی صفائی ستھرائی تک۔ آتے جاتے مہمانوں کی تواضع سے لے کر کل آنے والی بارات کے استقبال کی تیاریاں۔۔۔ ہم سب لڑکیاں ہاتھوں ہاتھ کام لے کر بوجھ ہلکا کرنے کی عادی تھیں۔

مگر آج میرے ساتھ ماہین وجدان تھی۔ جو اپنی فیملی کے ساتھ کسی فارن ٹرپ پر جانا پسند نہیں کرتی تھی اور گاؤں کی کچی پگڈنڈیوں پر اپنے قدموں کے نشان بنتے دیکھ کر یوں سرشار تھی کہ خوشی اس کے گالوں سے سرخی بن کر پھوٹ رہی تھی۔

میں نے ایک آدھ بار اسے گھر چلنے کے لیے منانا بھی چاہا تو اس نے لجاجت سے کہا۔

"پلیز۔۔۔ کچھ دیر اور۔۔۔ دیکھو یہاں نہر کے پاس۔۔۔ گیلی مٹی کی خوشبو پاگل کر دینے والی ہے۔ کچھ دیر رک جاؤ نا۔"

یہ چھوٹی سی نہر تھی اور پانی اس قدر سکون سے رواں دواں تھا کہ جب ہم نے اس میں اپنے پیر ڈبوئے تو ہلکی سی گدگدی کے سوا پانی میں کوئی اور ارتعاش نہ ہوا تھا۔

میں خوش تھی لیکن میرے دل میں ہلکا سا خوف اور غم تھا۔

یہاں صرف امو نہیں تھیں۔ ان سے بھی بڑی ہستیاں موجود تھیں جن کی آنکھوں سے چھلکتی ناگواری ماہین وجدان کے لیے تھی اور لہجوں میں حیرانی بولتی تھی۔

"ماں باپ نے بھجوا دیا۔۔۔ یوں اکیلے۔۔۔ اتنی دور۔۔۔؟"

اور میں ماہین وجدان کو کل سے پروں میں چھپائے پھر رہی تھی۔

پھر بہت سا اچھا وقت گزارنے کے بعد جب ہم دونوں اپنے پیروں پہ بے تحاشا گرد چڑھائے گھر لوٹے تو سب سے پہلا واسطہ امو سے ہی پڑا۔

"کم از کم موبائل تو ساتھ لے جانا تھا۔ بیسیوں کالز آچکی ہیں تمہارے گھر سے۔۔۔"

امو نے موبائل اس کے ہاتھ میں تھمایا اور مجھے تو یوں گھورا جیسے کہہ رہی ہوں۔۔۔ "تمہیں تو میں بعد میں پوچھتی ہوں۔"

موبائل پہ کال دوبارہ آرہی تھی۔ ماہین نے جھجکنا چاہتے ہوئے اٹینڈ کی اور پھر مختصر سی ہوں ہاں کے بعد موبائل بند کر دیا۔ اس کے چہرے پر عجب سی سرد مہری تھی۔

"خیریت۔۔۔؟"

"ہوں۔۔۔ بجیا آئی ہیں اور مما نے ڈرائیور کو بھیج دیا ہے۔ مجھے واپس جانا ہوگا۔"

"ارے اتنی اچانک۔۔۔" مجھے حیرانی ہوئی۔ وہ انگلینڈ میں ہوتی تھیں۔

"سرپرائز دینے کی پرانی عادت ہے ان کی۔" وہ سر جھکائے اپنی چیزیں سمیٹنے میں لگ گئی۔ میرا دل چاہا اسے آج رات کے لیے روک لوں۔

گاؤں آنے سے پہلے امو نے کہا تھا۔

"زیادہ جوڑے مت رکھو۔ تمہاری خالہ لے آئیں گی کام دار سوٹ ہمارا ارادہ ہے تہنیت کی مہندی کے روز تمہارا اور بلند بخت کا نکاح بھی کر دیا جائے۔"

لیکن بلند بخت بزنس ڈیلنگ کے سلسلے میں آخری دم تک تو ہمارے ساتھ گاؤں کے لیے روانہ نہ ہو سکا تھا اور آج بھی نہ آتا تو۔۔۔ لہٰذا میں نے چپ چاپ ماہین وجدان کو اس کے ڈرائیور کے ہمراہ روانہ کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

مہندی کی رونق عروج پر تھی جب بلند بخت کا میسج آیا۔

"سوری۔۔۔ آج نہیں آسکوں گا۔"

اور میرا دل اس قدر برا ہوا کہ ایک کونے میں لگ کر بیٹھ رہی۔

"تم بہت برے ہو۔۔۔" بس ایک میسج کر کے میں اپنے جی کو جلاتی رہی۔ کتنا انتظار تھا مجھے۔۔۔ اپنے نام کے ساتھ بلند بخت کے نام کو جڑے دیکھنا میری زندگی کی سب سے بڑی پہلی اور آخری خواہش تھی۔

زیادہ خواہشیں میں پالتی ہی کب تھی اور بلند بخت۔۔۔ اتنا لاپروا۔۔۔ اتنا اہم موقع یونہی گنوا رہا تھا۔

چاہت میں کسی کا ہو جانا کسی کو اپنا کر لینے سے زیادہ سکون بخشتا ہے اور بلند بخت۔۔۔ ہونہہ۔۔۔ میں جی بھر کے بدمزا ہوئی تھی تب ہی امو نے مجھے بلوایا۔

"یہ اتنا منہ بنانے کی کیا ضرورت ہے تمہیں؟"

"اُفوہ۔۔۔ اب بندہ اپنی مرضی سے منہ بھی نہیں بنا سکتا۔"

"بدتمیزی نہ کرو۔۔۔ بیٹھو یہاں۔۔۔" امو نے مجھے بازو سے پکڑ کر تہنیت کے برابر سجے سنورے صوفے پر دھکیلا۔ اسی گاگوٹے کناری والا دوپٹا میرے سر پہ پھیلا دیا گیا تھا۔

"ہائیں۔۔۔ یہ کیا۔۔۔؟"

میں نے پلو ہٹانا چاہا کہ امو نے پہلو میں چٹکی کاٹی۔

ذرا دیر ہی میں ایک مولوی صاحب آ گئے جنہوں نے تہنیت سے قول قرار کہلوائے اور پھر رخ میری جانب۔

جانے کیا کیا بولتے رہے۔۔۔ مجھے تو بس بلند بخت کا نام سنائی دیا اور میں ہر بار ہی آنکھیں میچ کر زور زور سے سر ہلاتی رہی۔

مولوی صاحب گئے تو میں دوپٹا ایک طرف اچھال کر امو سے لپٹ گئی۔

"میری پیاری امو۔۔۔!" آنکھوں سے آنسو کیوں بہہ نکلے یہ میں جانتی تھی یا امو جان باقی سب تو والدین سے میری وفاؤں کو سراہتے رہے۔

رات گئے سونے کے لیے بستر پہ لیٹی تب ایک میسج ملا۔

"لو بھئی۔۔۔ آج تم میری ہو ہی گئیں۔۔۔ اب خوش۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ خوش۔" میں نے ہیپی فیس بنا کر جواب بھیجا اور آنکھیں بند کر لیں۔

☼ ☼ ☼

روئی کے گالوں سی نرم پھوار کی صورت برف باری کل رات سے شروع ہوئی تو آج شام تک بھی اس کے رکنے کی کوئی صورت نظر نہ آرہی تھی۔ سردی سے ٹھٹھر ٹھٹھر کر میرا تو برا حال ہو گیا۔ گھر سے باہر نکلنا محال تھا۔ وجدان غالباً "مصروف" تھی۔ نہ کوئی فون کال نہ میسج نہ ہی کوئی چکر لگایا تھا میری طرف۔۔۔ موبائل کے سگنل بار بار دغا دے رہے تھے۔ بجلی کا بھی یہی حال۔۔۔ بوریت اپنی انتہا کو پہنچ رہی تھی۔ گاؤں کی خوب رونق سے واپسی ہوئی تھی لہٰذا اس روکھے پھیکے ماحول میں دل کہاں لگتا۔

امو جان تو اس موسم میں گول کمرے میں گویا محصور ہو کر رہ جاتی تھیں۔ آتش دان میں لکڑیاں جلتی رہتیں اور وہ مزے سے صوفے پر نیم دراز کمبل لپیٹے موٹے موٹے ناول پڑھتیں یا اونگھتی رہتیں۔ بلند بخت سے میل ملاقات کا سلسلہ پہلے جیسا نہ رہا تھا۔ وجہ۔۔۔ ہماری ہیڈ ماسٹرنی صاحبہ!

ابا کئی روز سے اسلام آباد میں ہی تھے لہٰذا کھانے کا بھی کوئی خاص تردد نہ کرنا پڑتا تھا۔ بس چائے اور کافی تھی جو سارا دن وقفے وقفے سے چلتی رہتی۔ اب بھی کھانے کا موڈ نہیں تھا تو میں کافی بنانے لگی۔

کافی پھینٹتے ہوئے یونہی کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔ جب چوکیدار کی سگریٹ کا ننھا سا شعلہ کسی جگنو کی طرح چمکا۔۔۔ اس غریب پر ترس آیا تو فلاسک بھر کر چائے اسے دینے بھاگی گئی۔

واپس آئی تو برستی پھوار کی سفید بوندیں شال پر اتر آئی تھیں۔ سردی سے دانت بجنے لگے تھے۔ میں ابھی تک پہاڑوں کی سردی برداشت کرنے کی عادی نہ ہو سکی تھی۔ تیزی سے کافی کے دو مگ تیار کر کے میں نے ڈرائی فروٹ کا جار نکالا اور ٹرے میں رکھ کر گول کمرے میں چلی آئی۔

امو حسب عادت کمبل تانے اونگھ رہی تھیں۔ موٹا سا ناول قریبی میز پر اوندھا پڑا تھا۔ آتش دان میں

آگ تڑاتڑ جل رہی تھی۔

"امو۔۔۔! کافی لیں گی۔۔۔ بڑے مزے کی بنی ہے۔" میں نے کشن گھسیٹ کر آتش دان کے قریب رکھتے ہوئے انہیں پکارا۔

جواب ندارد۔۔۔

"سو گئیں کیا۔۔۔؟" میں نے برا سا منہ بنایا۔

میری آنکھوں میں تو نیند کا شائبہ تک نہ تھا اور اکیلے بیٹھنا۔۔۔ اففو۔۔۔ تب ہی باہر سے کسی کے بولنے کی آواز آئی تھی۔

میں ذرا سا چونکی۔ اس سے پہلے کہ توجہ دیتی۔ امو کی گردن خیمے سے باہر آچکی تھی۔

"ہائیں۔۔۔ کون۔۔۔؟ بلند بخت۔۔۔ اس وقت۔۔۔؟" وہ کمبل ہٹا کر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھیں اور شامت اعمال کہ نظر سیدھی کافی کی ٹرے پہ جا پڑی۔

"اوہو۔۔۔ تو یہ پلان ہے۔۔۔ بری بات۔۔۔ میں نے تمہیں منع کیا تھا نا۔۔۔ نکاح کے بعد اب تم لوگوں کا یوں ملنا بالکل مناسب نہیں۔۔۔"

"ارے میں نے کب۔۔۔؟" میں نے کچھ کہنا چاہا مگر انہوں نے سنا کب۔۔۔؟ سٹر پٹر کرتی باہر نکل گئیں۔

"حد ہو گئی۔۔۔ میری پکار پر تو کان نہیں دھرے اور بلند بخت کو سنتے ہی چوکنا ہو گئیں۔"

انٹر کام بند تھا۔ چوکیدار یقیناً "اجازت لینے آیا تھا۔ لمحوں میں ہی امو جان دانت کٹکٹاتی آئیں اور سیدھی کمبل میں۔۔۔

"جو بھی بات کرنی ہو یہیں کرنا۔۔۔ خبردار جو واک شاک کے بہانے سارے گھر میں گھومتی رہیں۔۔۔ میں نے کہا نا۔۔۔ نکاح کے بعد۔۔۔"

"امو پلیز۔۔۔!" میرا چہرہ خفت سے یقیناً "سرخ ہو گیا تھا۔

تب ہی بلند بخت کمرے میں داخل ہوا۔ ہشاش بشاش۔ دونوں ہاتھ رگڑتا ہوا۔

"اور اگر یہ بات بخت سن لیتا تو۔۔۔؟" میں نے شکایتی نظروں سے امو جان کو دیکھا۔ انہوں نے بڑی بے نیازی سے گردن گھمائی اور بخت سے خالہ کا احوال طلب کرنے لگیں۔

"حالات کا بھی خیال کرو بخت۔۔۔ یہ کوئی وقت نہیں باہر نکلنے کا بچے۔۔۔!"

"امو جان! ابھی تو صرف سات بجے ہیں۔" اس نے گھڑی کا چمکتا ڈائل ان کے سامنے کیا۔

"وقت اور حالات گھڑی کے ہندسوں کے تابع نہیں ہوتے۔ خیر کافی پیو۔۔۔ کھانا میں لگواتی ہوں کچھ دیر میں۔۔۔"

"ارے نہیں۔۔۔ کھانا کھانے کا کوئی موڈ نہیں۔" وہ بھی کشن گھسیٹ کر میرے برابر آبیٹھا۔

"تمہیں میرے آنے کی پہلے سے خبر تھی کیا؟" اس نے کافی کا مگ اٹھاتے ہوئے سرگوشی کی۔ امو کی تنبیہہ کی کڑوی گولی ابھی تک میرے حلق میں پھنسی ہوئی تھی للہذا اس کی بات کا جواب دیے بغیر کاجو کا جار کھول کر اس کے سامنے رکھنے لگی۔

"غضب کی سردی ہے باہر۔۔۔ تم تو مزے میں بیٹھی ہو۔ ورنہ میرا پکا ارادہ تھا تمہارے ساتھ باہر واک کرنے کا۔۔۔ یہ دیکھو! میرے ہاتھ کس قدر ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔" اس نے ایک پل کے لیے اپنے دونوں ہاتھ میرے ہاتھوں پہ رکھے تو میں سٹپٹا گئی۔

صد شکر کہ امو کمبل تان چکی تھیں۔

"رات کے وقت آسمان سے برستی برف کی پھوار۔۔۔ اوہ یار۔۔۔ غضب کا نظارہ۔" وہ تیز تیز بولتے ہوئے کافی کی چسکیاں لیتا رہا۔

رفتہ رفتہ امو جان کے خراٹے گونجنے لگے اور میں بھی وہ کڑوی گولی نگل کر اسے اپنی بوریت کے قصے سنانے لگی۔

نجانے کتنے دنوں کی جمع شدہ باتیں تھیں۔ فلم ڈراما، سیاست، خاندان۔۔۔ کچھ بھی تو نہ چھوڑا تھا۔ جوں جوں رات بھیگنے لگی۔۔۔ ہماری باتیں بھی دم توڑنے لگیں اور اگلے چند لمحوں میں ہم دونوں اپنی اپنی سوچوں میں کھو چکے تھے۔ گول کمرے میں جلتی آگ کے نارنجی شعلوں کی لپک تھی یا لکڑی کے چٹخنے کی آواز۔۔۔ یا پھر۔۔۔ ہم دونوں کی ہموار سانسوں کی

سرسراہٹ۔۔۔

نہ جانے کس خیال سے ابھر کر واپس آتے ہوئے میں نے یوں ہی ذرا کی ذرا پلٹ کر اپنے برابر بیٹھے بلند بخت کو دیکھا اور پھر ساکت رہ گئی۔

اس کی سیاہ آنکھیں میرے چہرے پر ثبت تھیں۔ پرخیال نگاہیں۔ چہرے پہ اطمینان اور ہونٹوں پہ ایسی تھمی سی مسکراہٹ۔۔۔

میرا دل قدرے زور سے دھڑکا تو میں نے رخ موڑ لیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اپنے اور اس کے درمیان موجود مضبوط بندھن سے جڑے جذبات میں نے اس کی آنکھوں سے چھلکتے دیکھے تھے۔

"میرا خیال ہے میں۔۔۔ اب چلتا ہوں۔" کچھ دیر بعد وہ کھنکھار کر بولا۔ میں نے امو کی طرف دیکھا۔ وہ جاگ رہی ہوتیں تو شاید اسے رکنے کے لیے کہہ دیتیں۔

"رات کافی بیت گئی ہے۔" میرے لہجے میں فکر مندی تھی۔

"یہ چند گز کا تو فاصلہ ہے۔ جب تک تم گیٹ سے اپنے کمرے تک آؤ گی میں گھر کے دروازے تک پہنچ چکا ہوں گا۔" اس نے خود کھڑے ہو کر اپنا مضبوط ہاتھ میری طرف بڑھایا تو میں بھی سہارا لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

امو مجھے کمبل کے اندر سے بھی گھورتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

"گھر پہنچتے ہی مجھے میسج کر دینا۔" ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے گول کمرے سے باہر آئے تھے۔

راہداری میں بس ایک ہی شمع دان دیوار پہ گڑی تھی جس میں جلتی شمع نجانے کب سے بجھ چکی تھی۔ مجھ سے دو قدم آگے چلتا ہوا بلند بخت چلتے چلتے یکلخت ہی رکا تو میں اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔

"کیا ہوا۔۔۔؟" میں نے قدم پیچھے ہٹانے چاہے مگر بلند بخت نے ہلکے سے جھٹکے سے مجھے واپس کھینچ لیا۔

"بخت آور۔۔۔!" اس کی بوجھل آواز سرگوشی سے زیادہ نہ تھی۔

میں بری طرح گھبرا گئی۔

"بخت۔۔۔" میں کچھ کہنے کی کوشش میں بوکھلا سی گئی۔ اس کے دونوں بازو میری کمر کے گرد گھیراؤ تنگ کر رہے تھے۔ اس کے مضبوط بازوؤں کے حصار میں نرمی بھی تھی گرمی بھی اور شدت بھی۔۔۔ اس کی گرم، بے ترتیب سانسیں میرے بالوں اور گالوں کو چھو کر میری گردن تک پہنچ رہی تھیں۔

مجھے لگا۔۔۔ ایک پل بھی مزید گزرا تو اس کے جذبات کی شدت مجھے بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

"بخت پلیز۔۔۔" دو انگارہ لبوں نے میرے چہرے کو دہکایا تو میں تڑپ سی گئی۔

"چھوڑو بخت۔۔۔ دس از ناٹ فئیر۔۔۔" میں نے پوری کوشش سے اسے پرے ہٹانا چاہا۔

"مجھے لگتا ہے۔۔۔ میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔" اس نے میرے کان کی لو کو چھوا۔

"چلتا ہوں۔" بہت نرمی سے اس نے مجھے خود سے الگ کیا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا راہداری سے نکلتا چلا گیا۔

"اوہ میرے خدا۔۔۔!" میں نے لڑکھڑا کر دیوار کا سہارا لیا اور کچھ دیر کے لیے سنسناتی ہوئی تاریکی میں کھڑی اپنی ہی سانسوں کی آواز سنتی رہی۔ کچھ دیر قبل جو گرم آگ میرے کانوں سے لے کر تلوؤں تک مجھے جھلسا رہی تھی، اب سرد ہو کر مجھے کپکپائے دے رہی تھی۔

میرا ہاتھ بے اختیار میرے چہرے کو چھو رہا تھا۔

"کیا یہ کوئی خواب تھا۔۔۔ نہیں۔۔۔ مگر خواب جیسی حقیقت۔۔۔" میں نے سرد دیوار کو اپنی پوروں سے چھو کر اس حقیقت کا ادراک کرنا چاہا۔

کمرے میں کروٹ بدلتے ہوئے امو جان ہولے سے کھنکھاریں۔۔۔

میں اپنے بکھرے بال اور ڈھلکی ہوئی شال کو سمیٹ کر کمرے میں چلی آئی تھی۔ چور نگاہوں سے سوئی ہوئی امو جان کو دیکھا اور پھر وہیں کشن پہ سر رکھ کر کمبل اوڑھ لیا۔

"آج کی رات نیند نہیں آئے گی۔" میں نے کھلی آنکھوں سے چھت کو گھورا۔

آج کی رات ایک نئے اور اک کی رات تھی۔ جھیل پہ اترتی مرغابیوں کی طرح دل کے ساحل پہ جو کیفیات آج اتری تھیں، وہ بہت نئی اور انوکھی تھیں۔

"آج کی رات جیسی کوئی اور رات... آج سے پہلے نہیں آئی تھی...." میں نے سمٹ کر کروٹ بدلی اور کمبل بھینچ لیا۔

☼ ☼ ☼
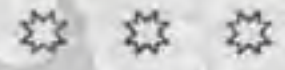
اگلے دو دن طبیعت عجب کھوئی کھوئی سی رہی۔

کچھ بے زاری، کچھ اکتاہٹ... ایک ہلکی سی کسک سارے بدن میں نشاط انگیز بے چینی بھر رہی تھی۔

امو جان سے الگ آنکھیں چرائے پھرتی تھی۔

بلند بخت کا خیال آتا تو اس گھڑی بھر کی قربت مدہوشی میں لے جاتی۔

عجب بات تھی... بلند بخت کی اس جرأت پر میں اس سے ناراض تھی، نہ بدگمان... خبر نہیں... یہ اس رشتے کا اعجاز تھا جو میرے اور اس کے درمیان بندھ چکا تھا یا اس محبت کا جو میرے دل میں اس کے لیے تھی اور آج سے نہیں، برسہا برس سے تھی۔

یا شاید صدیوں سے....

تب سے جب اس کائنات میں پہلی بار "محبت" کا ظہور ہوا تھا۔

"سارے دن میں انسان کوئی کام تو اٹھ کر کرتا ہوگا۔ کسی نہ کسی طور ہاتھ بٹاتا ہی ہوگا نا؟"

"افوہ... امو کی وہی نان رومانٹک باتیں۔" میں چونکی اور جی بھر کے بدمزا بھی ہوئی۔

"تم نے تو ہڈ حرامی کے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ اگلے گھر میں یہ سب نہیں چلے گا بنو... تمہارے ابا آ رہے ہیں۔ اٹھ کر جھاڑ پونچھ کروالو... میں ذرا مصروف ہوں باورچی خانے میں...."

"تو آپ کم ڈشز بنالیں۔ ابا کیا سارے ہفتے کا ایک ہی دن میں کھائیں گے۔" میں بڑبڑائی پھر اٹھ کر دو چار ہاتھ ادھر ادھر مارے بھی۔ مگر کام میں دل کہاں تھا۔ گلدان میں سجانے کے لیے تازہ پھول لینے نکلی۔ راہداری سے برآمدے... برآمدے سے سرخ اینٹوں کی روش اور وہاں سے لکڑی کا گیٹ پار... لان پیچھے رہ گیا۔

ماہین وجدان نے بھی اتنے دنوں سے ادھر جھانکا تک نہیں۔ میں سیدھی اسی کی طرف ہولی۔ آج میرے پاس بہت کچھ تھا جو میں اس سے شیئر کرنا چاہتی تھی۔

گیٹ تک پہنچی تو چوکیدار قہوے کا بڑا سا پیالہ ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی دور سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"بی بی تو ابھی ابھی... باہر...."

"اوہ... نو...." مجھے افسوس ہوا۔ امو سے ڈانٹ الگ پڑے گی گھر سے نکلنے پر....

میں واپسی کے لیے پلٹی مگر چند قدم اٹھانے پر ہی وہ مجھے دور سے آتی دکھائی دی۔ مجھے پکارتے ہوئے وہ باقاعدہ اپنے ہاتھ لہرا رہی تھی مجھے متوجہ کرنے کے لیے۔

قریب آتے ہی وہ یوں دوڑ کر مجھ سے لپٹی تھی گویا بہت عرصے بعد ملی ہو۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

مجھے اس کی کیفیت غیر معمولی سی لگی۔

"بہت بری ہو۔ اتنے دن بعد ملی ہو...." اس کی شکایت کرنے کی عادت تو نہ تھی شاید یونہی کہہ دیا تھا۔

"پتا ہے بخت! میں ابھی ابھی اسے دیکھ کر آئی ہوں۔"

"اوہ...." میں نے سر ہلایا۔ جب ہی تو اس کی آنکھوں میں جگنو اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کی تتلیاں کھیل رہی تھیں۔

"وہ روز اس وقت واک کے لیے نکلتا ہے... نہیں روز نہیں... پانچ دن بعد... آج پورے پانچ دن بعد وہ اس وقت واک کے لیے نکلا تھا۔" اس نے اپنے کپکپاتے ہاتھوں میں میرا بازو جکڑ رکھا تھا۔

"اور تم اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے یہاں پر روز کئی کئی گھنٹے بتاتی ہوگی۔ ہے نا...؟" میرے لہجے میں جانے کیوں ہلکی سی ناگواری اتر آئی تھی۔ شاید میں اسے یوں "خوار" ہوتے دیکھنا پسند نہیں کرتی تھی۔

"ہاں...!" اس نے کسی مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔

"اور جب تک اسے دیکھ نہ لوں بخت... دل کہیں لگتا ہی نہیں۔ تم آؤ نا... میں تمہیں دکھاؤں... میں نے اس کے بہت سے اسکیچز بنائے ہیں... میں نے اسے بہت کم دیکھا ہے مگر اس کے سارے نقش مجھے ازبر ہیں۔ لیکن حیرت کی بات بتاؤں بخت...! میری انگلیاں کپکپانے لگتی ہیں جب میں...."

میں نے طویل سانس لے کر اسے دیکھا۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی شعاعوں میں وہ یوں رنگی تھی جیسے کسی دلہن کی کوری ہتھیلی پر مہندی کا رنگ ٹھہر جاتا ہے۔

وہ رکتی... کہتی، پلکیں اٹھاتی، گراتی، دل کا حال عیاں کیے جا رہی تھی۔ میں نے سر جھکا لیا۔

یہ لڑکی کسی جھیل کنارے اگا ہوا کوئی تنہا سا پھول تھی۔ یا پھر کوئی تتلی... یا پھر وہ موتی جو سیپ کے باطن میں تھا اور پھر کسی غلطی کی پاداش میں انسان بنا دیا گیا... ماہین وجدان کی صورت....

میرے دل پر اوس سی گرنے لگی۔

یہ ہم دونوں کی دوستی میں پہلا موقع تھا کہ میرا دھیان اس کی باتوں پہ ٹھہر نہ سکا۔ مجھ پہ گزری واردات نئی نئی تھی۔ اور میں خواہش مند تھی کہ وہ آج صرف مجھے سنتی... مجھ سے پوچھتی... نکاح کے بعد بلند بخت سے فون پر پہلی بات کیا ہوئی تھی؟ اپنے نام کے ساتھ من چاہے نام کا جڑ جانا تمہیں کیسا لگا...؟ اور پھر میں اسے بتاتی کہ اس رات... اس رات....

"تم سن رہی ہو نا...؟" وہ حنا رنگ لڑکی مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ میں نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔ حالانکہ میں اسے نہیں سن رہی تھی۔

اور یہ سب باتیں تو وہ تب پوچھتی نا جب وہ ایک عام سی لڑکی ہوتی اور وہ عام سی لڑکی نہیں تھی۔ میں نے کہا نا... وہ تو صرف پھول تھی، یا تتلی... یا سیپ میں بند موتی....

☼ ☼ ☼

"بخت آور کا ویزا بن گیا ہے۔ بس اب رخصتی کی تیاری کرو۔" جس پل خالہ کی آواز موبائل پہ گونجی۔ میں امو جان کے شانے سے لگی بیٹھی تھی۔

امو تو یوں ہڑبڑائیں سن کر کہ میرا سر ٹھک سے صوفے پہ گرایا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اتنی جلدی...."

"لیجیے... ابھی جلدی ہے۔" میرے منہ سے پھسلا۔

صد شکر کہ امو نے سنا نہیں۔ وہ تو بہانے گھڑنے میں مصروف تھیں۔

"اللہ کرے کوئی بہانہ نہ سنیں خالہ...! ادھر رخصتی ہو اور ادھر انگلینڈ روانگی... واہ کیا مزا آئے گا۔ خوب گھوموں گی، پھروں گی، عیش کروں گی... نہ امو کی گھوریاں ہوں گی نہ ناراضی کا ڈر...." میں تو جھومتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی آئی۔

اور پھر وہی ہوا جو بلند بخت نے چاہا اور جس کے لیے میں نے دعائیں کیں۔ اسی رات خالہ، چچا آئے اور رخصتی کی تاریخ ٹھہرا گئے۔

میں نے جھٹ ماہین کو میسج کر دیا۔

"خوب رونق لگنے والی ہے۔ میری طرف چلی آؤ فوراً۔" جواب آیا۔

"بجیا کے سسرال والوں کی دعوت ہے، نہیں آسکتی۔" معلوم نہیں کس کیفیت میں میسج کیا گیا تھا۔ مگر مجھے تو خوب ہی سیدھا، صاف کورا سا جواب لگا۔

یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ کیوں آؤں؟ اور رونق کیوں لگ رہی ہے؟

نہیں تو نہ سہی۔" میں نے سر جھٹک کر موبائل ایک طرف رکھا اور انگلیوں پر دن گننے لگی۔

☼ ☼ ☼

"توبہ کس قدر ڈھیٹ اور بے شرم ہیں آج کل کے لڑکے۔" امو جان کسی بات پر جلتی بھنتی اندر آئیں پھر مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

"کیا ہوا...؟" میں گڑبڑائی... شاید کوئی غلطی ہو گئی ہو گی۔

"کچھ نہیں... تم جاؤ... دو کپ چائے بنا کر لاؤ... تمہارے ابا سے کچھ بات کرنی ہے؟" وہ غصے میں بیڈ پہ پڑے کپڑوں کو چھیڑنے لگیں۔ ایک اٹھایا۔ دوسرا رکھ دیا۔ ایک کی تہہ لگائی۔ دوسرا یوں ہی گول مول کر کے چھوڑ دیا۔

"جاؤ بیٹا... مزے دار سی چائے بنا کر لاؤ۔" ابا نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا تو فوراً" ہی باہر نکل آئی اور بے وقوف تھوڑی تھی جو چائے بنانے چل دیتی۔ وہیں دروازے سے کان لگا کر کھڑی رہی۔

"میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ آج کل کے لڑکے۔"

"جی... جی... بے حد ڈھیٹ اور بے شرم ہیں' آگے فرمائیے۔" ابا ہمیشہ کے عجلت پسند۔

"اب یہ اپنا بلند بخت' اسے ہی دیکھ لیں' بخت آور کو ساتھ لے جا کر شاپنگ کرانا چاہتا ہے۔ پہلے اپنی ماں سے فون کرایا۔ اسے تو میں نے ٹال دیا۔ اب خود کل سے میری جان کھائے جا رہا ہے۔ بتائیے ذرا' کوئی تک بنتی ہے۔ دو ہفتے بھی انتظار نہیں کر سکتا۔ رخصتی کے بعد کرتے رہیں شاپنگ۔"

"اُفوہ... ایک تو ان ساٹھ' ستر کی دہائی میں پیدا ہونے والی ماؤں کی دقیانوسیت نہیں جاتی۔" میں نے وہیں کھڑے کھڑے پاؤں پٹخے۔

"تو کیا حرج ہے' جانے دو' کوئی غیر تھوڑی ہیں وہ دونوں۔ پھر بچپن کا ساتھ' یوں خوامخواہ دیواریں کیوں کھڑی کرتی ہو اور اب تو ایک رشتے میں بندھ گئے ہیں۔ پہلے روک ٹوک ہوتی تو کوئی بات بھی تھی۔"

"واہ... میرے سیانے ابا۔"

"اسی رشتے سے تو ڈرتی ہوں۔" امو کی آواز مدھم ہو گئی۔ شاید وہ ابا سے بھی کھل کر نہ کہہ پا رہی تھیں۔

"تمہارے بچے بہت سمجھ دار ہیں' جانے دو۔" ابا کا قطعی انداز۔

"چلیں ٹھیک ہے۔ والد صاحب کی آزادی فکر کا یہ عالم ہے تو میں کاہے کو بری بنوں' جائے۔ مگر اپنی سہیلی کو ساتھ لے کر جائے۔ یوں تو چوبیس گھنٹے دم چھلا بنائے پھرتی ہے اسے۔"

"یاہو...!" امو کی قدموں کی آواز سن کر میں بگٹٹ باورچی خانے کی طرف بھاگی تھی۔

٭ ٭ ٭

موسم بدل رہا تھا۔

پتھریلے راستوں پہ قدم اٹھاتے رکھتے' میں نے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔ تب احساس ہوا۔ انسان کے اندر تبدیلی اتر رہی ہو تو باہر کی تبدیلی کا احساس بہت دیر سے ہوتا ہے۔ میں ازحد خوشی سے زرد' نارنجی اور سرخ پھولوں کو دیکھ رہی تھی جو اپنی لمبی ٹہنیوں کے سہارے فضا میں رنگ بکھیر رہے تھے اور اوائل مارچ کی خوش گوار سی ہوا میں دھیرے دھیرے لہلہانے لگتے تھے۔

میرا رخ ماہین وجدان کے گھر کی طرف تھا۔ تب ہی مجھے یاد آیا۔ ایسی ہی روشن' چمکیلی سی دھوپ بھرپوری وادی میں بکھری ہوئی تھی۔ جب ماہی کے دل سے پھوٹتی خوشی اپنے عروج کو چھونے لگی تو وہ مجھے بھی زبردستی اپنے ساتھ گھسیٹ کر باہر لے آئی۔

"چلو ذرا بیکری تک چلتے ہیں۔"

"اور امور جو کھانا تیار کر رہی ہیں... وہ؟"

"وہ بھی کھالیں گے۔" وہ تب مستی کے عالم میں تھی۔

"لیکن بیکری اتنی دور... پیدل کیسے جائیں گے؟"

"ایسے..." اس نے چٹکی بجائی اور اگلے ہی پل وہ کسی گھر کی بیل بجا رہی تھی۔

"ارے رے رے... یہ کیا کر رہی ہو؟" میں نے اسے باز رکھنا چاہا مگر اس دوران دروازہ کھل چکا تھا۔

"آپ... آپ پھر؟" اس انکل ٹائپ آدمی کا منہ اسے دیکھتے ہی بگڑ گیا تھا۔

"بس... سوری انکل! بس لاسٹ ٹائم' ایمرجنسی ہے پلیز۔"

"دیکھیے محترمہ! یہ میرا گھر ہے کوئی گزرگاہ

نہیں۔"

"صرف ایک بار پلیز۔" میرا ہاتھ دبوچ کر وہ تیزی سے آگے کی طرف بڑھی۔

انکل بے چارے سٹپٹا کر ذرا سا ہی پیچھے ہوئے تھے کہ ماہین وجدان نے انہیں مزید دھکیلا اور گھر کے اندر کی جانب دوڑ لگا دی۔

"رک جاؤ... میں کہتا ہوں رک جاؤ۔" انکل کی گھن گرج عقب میں اور میری چیخ و پکار ساتھ ساتھ... مگر مجال تھی کہ یہ لڑکی رک جاتی۔ مجھے خبر نہ ہو سکی۔ وہ گھر کے اندرونی راستوں سے کیسے گزری... بس اختتام پر ایک لوہے کا چھوٹا دروازہ تھا۔ جس کی چٹخنی اس نے ٹھک سے گرائی اور اگلے ہی پل ہم لوگ باہر... اسی روڈ پر جس پر بیکری موجود تھی۔

ماہین وجدان کے گال تمتما رہے تھے اور وہ ہنسے جا رہی تھی۔ جبکہ میں اس سے خفا تھی، بے حد خفا۔

"یہ کوئی ایڈونچر نہیں ہے۔ سراسر بدتمیزی، بے وقوفی، ہمارے ساتھ کوئی بھی حادثہ ہو سکتا تھا۔" میں نے اس سے باقاعدہ جھگڑا کیا۔

مگر اس پہ اثر کہاں؟

بہت سے بیکری آئٹمز سے بھرے شاپر لے کر ہم واپسی پر طویل راستہ طے کر کے آئے تو وہ مجھے منا چکی تھی اور وہ دن، سارا دن اس نے میرے ساتھ بتایا تھا۔ ہم کمرے میں بند رہے اور اس دن ہم نے بہت سا میوزک سنا اور اپنی پسند کی موویز بھی دیکھیں۔ حتیٰ کہ اس کی مما چوکیدار کے ساتھ اسے لینے آ پہنچی تھیں۔

"اور... آج کل... نہ جانے یہ لڑکی کہاں کھو گئی ہے۔" میں نے راستے بھر میں اس کے لیے بہت سے پھول جمع کر لیے تھے۔

☼ ☼ ☼

جس وقت ڈرائنگ روم میں موجود بہت سے مہمانوں سے بچتی بچاتی میں ماہین کے روم میں آئی۔ وہ بند کھڑکی کے قریب کھڑی تھی اور نگاہیں شیشے کے اس پار نظر آتے مناظر پہ جمی ہوئی تھیں۔

مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی، لیکن یہ مسکراہٹ پھیکی سی تھی۔

اس گرم جوشی اور خوشی کے اظہار سے عاری جس کی میں عادی تھی۔

"خیریت تو ہے۔" وہ نڈھال سی ہو کر میرے گلے لگ گئی تھی۔ مجھے فکرمندی سی ہوئی۔

"ہاں، سب ٹھیک ہے۔ لیکن میں تمہارے لیے بہت اداس ہو رہی تھی۔ آج ہم پورے پانچ دن کے بعد مل رہے ہیں۔"

"اچھا... ہاں... شاید۔" مجھے حیرانی ہوئی۔ اتنے دن کے لیے ہم کبھی ایک دوسرے سے لاتعلق نہیں رہے تھے۔

"کیا بلند بخت کو پانا میرے لیے اتنا اہم تھا کہ اس کے بعد میں سب کچھ بھولنے لگی ہوں۔"

"یہ سب لوگ؟" میں نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔

"وہی بجیا اور ان کے سسرالی رشتے دار، ناران، کاغان کے لیے نکل رہے ہیں۔" بے دلی اس کے لہجے، چہرے، انداز سے بے حد نمایاں ہو رہی تھی۔

"اور تم...؟"

"تمہیں لگتا ہے کہ میں ان کے ساتھ جا سکتی ہوں؟ یہ نیچر کے حسن اور پاکیزگی کو داغ دار کرنے والے ہیں۔ پتھر، پہاڑ، چشمے، پھول، تتلیاں، بھنورے، سبزہ، ہر چیز ان کو دیکھ کر آنکھیں موند لے گی۔ نہ ان سے کوئی بات کرے گا۔ نہ ان کو کوئی سرور پہنچائے گا۔ یہ لوگ بس جائیں گے اور گھوم پھر کر واپس آ جائیں گے۔ سب کے سب ناخالص لوگ۔" وہ دوبارہ کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔

نہ جانے کیوں وہ مجھے بے حد ڈپریسڈ لگ رہی تھی۔ چہرہ سپید اور آنکھیں بے رونق۔

"میرے ساتھ چلو گی... کچھ شاپنگ کرنے؟"

"نہیں، بخت... بجیا کے دونوں بچے یہاں رہیں گے میرے پاس... کچھ بیمار سے ہو رہے ہیں۔ ان کے ساتھ نہیں جا سکتے۔" اس نے کھوئے کھوئے سے انداز میں انکار کیا، پھر ذرا سا چونکی۔

"تم خفا تو نہیں ہو گی نا؟"

"نہیں... میں بھلا کیوں خفا ہوں گی۔" بہت سرسری سے انداز میں، میں نے کندھے اچکائے پھر دروازے کی طرف چند قدم اٹھائے اور پھر اس کی طرف پلٹی۔ وہ نگاہیں مجھ پر ہی ٹکائے کھڑی تھی۔

"تمہیں یہ تو معلوم ہے نا... کہ میری شادی ہو رہی ہے؟" میں نے ذرا رک رک کے سے انداز میں بتایا۔

"شادی..." اس نے بغور مجھے دیکھا اور میں نے اسے۔

اور شاید اسی ایک پل میں ہم دونوں نے اس لاتعلقی کو سوچا جو پچھلے پانچ دن سے ہم دونوں کے بیچ میں تھی۔

ہم دونوں کی آنکھیں ایک ساتھ بھر آئی تھیں اور اس سے اگلے لمحے میں، میں نے اس کا کمرا چھوڑ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"محبت... بہت خودغرض سا جذبہ ہے۔ ہے نا بخت! دیکھو نا، محبت مجھ پہ برسی تو میں کہیں کھو گئی اور محبت تمہارے اندر پھوٹی تو تم بھی مگن ہو گئیں۔ ہم دونوں بیک وقت ایک ہی کیفیت کے زیر اثر رہیں... اور پھر بھی ایک دوسرے کو فراموش کر گئیں۔ کیا تمہیں نہیں لگتا کہ آج ہم بہت دنوں کے بعد پہلے کی طرح ملے ہیں۔ بہت خالص ہو کر۔" وہ میرے سامنے بیٹھی بہت اپنائیت سے کہہ رہی تھی۔

رات بھیگ رہی تھی اور فضا میں قدرے خنکی تھی۔

مایوں کی رسم کے بعد بہت دیر تک سب کزنز نے ڈھولک، ڈانس، گیت، ٹپے جیسا ہلا گلا کیے رکھا اور پھر امو کی ڈانٹ ڈپٹ پر مجھے بیچ میں سے اٹھا کر کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ آرام کی غرض سے اور جب میں بہت شاداں فرحاں اپنے کمرے میں آئی تو یہاں ماہین وجدان موجود تھی۔

وہ میرے لیے بہت سارے اور بہت خوب صورت پھول لے کر آئی تھی جن کی خوشبو سے کمرا مہک رہا تھا۔ اور تب سے اب تک ہم صرف باتیں کر رہے تھے۔

باہر کا شور اور ہنگامہ رفتہ رفتہ دم توڑ گیا تھا۔ کچھ دیر برتنوں کے کھنکھنانے کی آوازیں آتی رہیں اور پھر چہار سو مکمل خاموشی کا راج ہو گیا۔

اس دوران میں نے تو خوب ہی شکوے شکایتیں کر ڈالیں۔

نکاح کے روز اچانک واپسی... شاپنگ پر نہ جانا، شادی کی تیاری میں شمولیت نہ کرنا اور بہت سی دوسری باتیں۔

جواباً وہ بس خاموشی سے مسکراتی رہی۔ کبھی کبھی البتہ مجھے لگا جیسے اس کی آنکھوں میں نمی سی اتر رہی ہو۔

"چلو باہر چلتے ہیں۔" چین تو ماہین وجدان کو کبھی تھا ہی نہیں۔ میں تھکی ہوئی تھی۔ لیکن اس کی خواہش پر ہمیشہ کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔ لان کی گھاس پر رنگ برنگی، چمکیلی پتیاں ابھی بھی گری ہوئی تھیں۔ اسٹیج پر ہر چیز جوں کی توں موجود تھی۔

ہم دونوں نم آلود گھاس پر پیر رکھتے تو کھلی چپلوں میں ہمارے پاؤں ٹھنڈک آلود نمی سے بھیگ سے جاتے۔

چاند پوری طرح روشن تھا۔

"پتا ہے ماہی! آج بخت نے بہت کوشش کی مایوں کی رسم میں شرکت کرنے کے لیے۔ مگر امو جان تو جلاد ہی بن گئیں۔ پکڑ کے چچا جان کو فون کھڑکا دیا کہ میں ایسی بے ہودگی ہرگز برداشت نہیں کروں گی اور چچا جان بھی بڑے ہی بے رحم، اس بے چارے کو اپنے کمرے سے ہلنے ہی نہیں دیا۔" ہم دونوں بہت دھیمی آواز میں بول رہے تھے۔ تب ہی مجھے خیال آیا... تو میں ایک دم اس کی طرف پلٹ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"اور یہ تم نے کیا کیا ماہی! پوری رسم میں ایک بار بھی میرے قریب نہیں آئیں۔ نہ فوٹو، نہ مووی... میں دیکھ رہی تھی تمہیں۔ وہیں ایک کونے میں لگ

کے کھڑی رہیں۔"

"اتنی ڈھیر ساری کزنز تھیں تمہارے آس پاس۔۔۔ مجھ سے یہ ہو نہیں سکا کہ کسی کو ہٹا کر تمہارے ساتھ بیٹھتی۔"

"تو چلو اب تصویر بنالیتے ہیں۔" مجھے ایک دم خیال آیا اور وہ بھی خوش۔

"یہ ٹھیک رہے گا۔ لیکن اس طرح۔۔۔ اونہوں۔۔۔ رکو۔۔۔ کچھ تیاری کر لیتے ہیں۔" جب تک میں کیمرا لے کر آئی۔۔۔ وہ اسٹیج پر یہاں سے وہاں بکھرے دیپ نیم دائرے میں رکھ کر روشن کر چکی تھی اور اس دائرے میں پھولوں کی تازہ اور کاغذ کی چمکیلی پتیاں رنگ بھر رہی تھیں۔

کیمرا فوکس کر کے ہم دونوں اس نیم دائرے میں آسمائی تھیں۔

اور یوں۔۔۔

اس رات ہم دونوں کی سال بھر کی دوستی میں پہلی بار تصویریں بنیں اور اپنی محبت کے خاکے میں ہم نے بڑی چاہت سے رنگ بھرے تھے۔

☼ ☼ ☼

آج مہندی کی رسم تھی۔

ماہی صبح ناشتے کے بعد اپنے گھر چلی گئی تھی۔ اس کی بجیا آج واپس جا رہی تھیں اور اس نے مجھے امید دلائی تھی کہ وہ مہندی کے فنکشن تک ضرور ہی آجائے گی۔ میں شام ڈھلنے تک انتظار کرتی رہی۔ پھر فون کیا جو ریسیو نہ کیا گیا تھا۔۔۔ بعد میں اپنی تیاریوں میں یوں الجھی کہ ذہن سے ہی نکل گیا۔

خالہ کی طرف سے مہندی آئی تھی۔ لہٰذا سارے لڑکے لڑکیاں کپڑے، لتے سنبھالے خالہ کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

خاندان ایک اور گھرانے دو۔

پھر ہماری طرف کا شادی کا اکلوتا فنکشن۔۔۔ ہر کوئی جی بھر کے لطف اٹھا رہا تھا۔ دن میں وادی کی سیر کی جاتی اور شام میں رسموں کا ہنگامہ۔۔۔ گاؤں سے سب ہی لوگوں کی آمد ہو چکی تھی۔ آس پڑوس میں سے صرف لوگ مدعو تھے۔ ان میں سے بھی ماہین وجدان کی اور خود ماہین مہندی میں شریک نہ تھی۔ غالب یہی تھا کہ وہ لوگ بجیا کو رخصت کرنے اسلام آباد گئے ہوں گے۔

رات کو خوب دھوم دھڑ کے سے مہندی لائی گئی تھی۔ ڈھول کی تال نے سوئی سوئی سی وادی کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔ اس پر لڑکوں کی ہاہو۔ میں اور امو کھڑکی سے لگی ساری رونق دیکھ رہی تھیں۔

"ارے۔۔۔" میں بے اختیار ہی سیدھی ہوئی۔ پھر یک لخت ہی آنکھیں بند کر لیں۔

"جل تو جلال تو۔۔۔" مجھے لگا امو بس اب شروع ہوئیں کہ تب۔۔۔

"باز نہیں آیا یہ بھی۔" بڑے لاڈ سے کہا گیا تھا۔

"ہائیں۔۔۔!" میں نے جھٹ سے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ امو زیر لب مسکراتی ہوئی پلٹ رہی تھیں۔

"یہ تو کمال ہو گیا۔" میں جھٹ سے دوبارہ کھڑکی پر جھکی۔

دھمال ڈالنے والوں میں سب سے آگے چچا جان تھے اور سب کے نرغے میں وہ تھا، بلند بخت۔

بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ، دراز قامت بلند بخت۔ جو اتنے بہت سے لوگوں میں سر اٹھا کر چلتا، کس قدر نمایاں لگ رہا تھا۔ میرا دل اس قدر زور سے دھڑکا کہ جی بھر کے اسے دیکھ بھی نہ سکی۔

اس وقت بھی نہیں جب وہ میرے برابر بیٹھا تھا اور اس کا بازو میرے بازو کو چھو رہا تھا۔

اور میں تو بس دل کی دھڑکنوں کو سنبھالے بیٹھی رہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے بخت! میں اپنی بہن اور اس کے شوہر کو سخت ناپسند کرتی ہوں۔ اتنا ناپسند کہ تم اگر چاہو تو اسے نفرت کا نام بھی دے سکتی ہو۔"

یہ ماہین وجدان تھی۔ جو بے حد سادہ سے حلیے میں میرے سامنے بیٹھی تھی اور جو کچھ وہ کہہ رہی تھی۔ وہ کہنے کا موقع تھا یا نہیں۔ اس بات کا اسے

قطعی اندازہ نہ تھا۔ میرے ہاتھوں، پیروں پہ لگی مہندی، میرا بے حد سادہ مگر پرکشش روپ۔۔۔ مہندی کا ایک روز پرانا، قدرے مسلا ہوا سوٹ۔۔۔ اسے میری آرائش یا میری سادگی، کوئی چیز بھی نہ بھائی تھی اور وہ کہے جا رہی تھی۔ اپنے ہی دل کی سب باتیں، ارد گرد سے بے نیاز اور تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے میں نے سکون کا سانس لیا کہ اس وقت سب لوگ مہندی لے کر بلند بخت کی طرف جا چکے تھے۔

اور یہ ہی چند روز ہیں۔ یہ اپنا کتھارسس کر لے۔ بعد میں، میں کہاں اور ماہین وجدان کہاں۔

وہ خاصی مضطرب تھی۔ سو مجھے خاموشی سے اسے سننا تھا۔

"میرے بہنوئی کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ چائے کا کپ تھامنے سے پہلے میری کلائی تھام لیتا۔ بچوں کو پکڑنے، پکڑانے کے بہانے جسمانی قربت کے حصول کی گھٹیا سی کوشش۔۔۔ آخ تھو۔۔۔ اس قدر ناخالص اور مکار شخص۔۔۔ اور میری بہن۔۔۔ کیا اسے یہ سب دکھائی نہ دیتا ہو گا۔ کس قدر معصوم بن کر اس نے ہمیشہ مجھے اپنے شوہر کے سامنے پیش کیا اور مما۔۔۔ انہیں خوب خبر تھی۔ میں اس شخص سے کتنا بھاگتی ہوں۔ وہ مسلسل مجھے پریشرائز کرتی رہیں کہ بجیا اور ان کی فیملی کو کمپنی دوں۔۔۔ یہ پندرہ دن میں نے جس اذیت میں گزارے ہیں۔ تم اندازہ نہیں کر سکتیں۔"

وہ دونوں بازو اپنے سینے پہ لپیٹے، بہت ضبط سے کہہ رہی تھی۔

"اور تمہیں پتا ہے۔ میری ماں اپنی سات سالہ بچی کو تنہا ایک جوان ڈرائیور کے ساتھ اسکول بھیجا کرتی تھی۔ جو اس کی معصومیت سے جی بھر کے لذت حاصل کرتا رہا اور ماں۔۔۔ بے خبر رہی۔" ماہین وجدان کی پلکوں سے آنسو ٹوٹ کر گرے تھے اور ایک لکیر کی صورت اس کی گالوں پر بہتے چلے گئے تھے۔

"اور دنیا میں تم واحد لڑکی ہو۔ پہلی اور آخری ہستی۔ جس سے میں نے یہ سب شیئر کیا ہے۔" وہ اٹھ کر میرے قریب آگئی تھی۔

"تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ پھر تمہارے بچے بھی ہوں گے۔ سنو بخت آور۔۔۔ میں تم سے یہ سب یوں ہی نہیں کہہ رہی۔ میں تمہیں یہ نصیحت کرنا چاہتی ہوں کہ اپنے بچوں کو میری ماں کی طرح تنہا مت چھوڑ دینا۔ زندگی کے تجربات بہت اذیت ناک بھی ہوتے ہیں۔ تم کو امو جان کا سایہ ہمیشہ گراں گزرتا تھا اور میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ تم اپنے بچوں پہ ان ہی کی طرح سایہ فگن رہنا۔ جس طرح تم گھر سے باہر نکل کر بھی امو جان کی دسترس سے آزاد نہ ہو پائی تھیں۔ محبت اور توجہ کی وہی زنجیریں تم اپنے بچوں کو بھی ضرور پہنانا، ضرور۔"

وہ میرے دونوں ہاتھ تھام کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

"اور میں شاید تمہیں کبھی بھی دریافت نہیں کر پائی ماہین وجدان۔۔۔ تم اپنی اذیتوں میں کھوئی تھیں اور میں تمہیں اپنے ہی شکووں کی مار، مارتی رہی۔" میرے دل نے ہوکا سا بھرا تو میں نے اسے ایک ننھی بچی کی طرح اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

"تم نے مجھے بہت سہارا دیا بخت! میری زندگی کے خوب صورت ترین لمحے وہ ہیں جو میں نے تمہارے ساتھ بتائے۔ تم شادی کے بعد چلی جاؤ گی تو مجھے نہیں پتا۔ میں تمہاری دوری کا غم کیسے برداشت کروں گی۔ لیکن اس دوری میں بھی، میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گی بخت آور۔"

وہ کہہ رہی تھی اور ہم دونوں کے آنسو بے اختیار ہو چکے تھے۔

☼ ☼ ☼
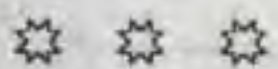
اور پھر میری رخصتی ہو گئی۔

ماہین وجدان سارا وقت میرے ساتھ ساتھ رہی۔ گھر سے پارلر اور پارلر سے ہوٹل تک۔۔۔ ولیمہ چچا جان کی خواہش پر گاؤں میں ہی کیا گیا۔

یہاں سے شادی کے چوتھے روز ہم اسلام آباد آئے اور یہیں سے انگلینڈ۔۔۔ یہاں بلند بخت کا اپنا

اپارٹمنٹ تھا۔

ایک تو نئی نئی شادی۔ اس پر ایک نئے ملک ایک نئے کلچر کو دیکھنے کی خوشی۔ میں نے سارا وقت جیسے ہواؤں میں اڑتے ہوئے گزار دیا۔

ڈھائی، تین ماہ بعد ہم لوگ واپس آئے تو موسم پوری طرح بدل چکا تھا۔ اب وادی میں جھرنے بہنے کا شور سنائی دیتا تھا۔ پہاڑ، پتھر سب سبزے سے اٹے ہوئے تھے اور راستوں پہ خودرو جنگلی پھولوں کی بہتات تھی۔

لکڑی کے گیٹ کو دھکیلتے ہوئے میں گھر میں داخل ہوئی، تو بہت عجیب سا لگا۔ اتنے بہت سے دنوں میں بلند بخت کی رفاقت میں، میں اس قدر مسرور و مسحور رہی کہ اس گھر کی یاد مجھے ایک بار بھی نہ آئی تھی اور اب یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں کئی زمانے بیت گئے ہوں۔

امو جان وہیں درختوں کی جڑوں میں ہی مل گئیں۔ جہاں مجھے توقع تھی کہ ملیں گی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مجھ سے یوں لپٹی تھیں جیسے سالوں کی جدائی رہی ہو ہمارے بیچ۔

"اتنی کٹھور بیٹی بھی ہوگی کسی کی؟ پلٹ کر ہماری خبر بھی نہ لی۔" اتنی محبت، اتنی شیرینی، میری سخت گیر سی امو رجان ان چند دنوں میں ہی اپنے لہجے کی ساری سختی کھو چکی تھیں۔

"ارے کہاں امو! روز تو بات ہوتی تھی۔"

"جانے دو... ہفتے میں بس ایک بار... اچھا بتاؤ... اکیلی کیسے آئی ہو؟ بلند بخت کہاں ہے۔ جس دن ایئر پورٹ پہ تم لوگوں کو لینے گئے، بس سرسری ملاقات ہی ہو سکی اور وہاں کیا کھاؤ پیو گی۔ اگر پہلے بتا دیتیں آنے کا تو اب تک بریانی دم پر ہوتی۔"

امو جان شاید اپنی تنہائی سے اکتا کر معمول سے اونچا اور لگاتار بول رہی تھیں۔ میں بھی ہنستے ہوئے انہیں سنتی رہی۔

باورچی خانے میں چائے اور پاستا بنانے کے بعد ہم لوگ گول کمرے میں تادیر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ بلکہ میں کیا، امو ہی بولتی رہیں۔ خلاف عادت، خلاف معمول اور سر شام جب ہم درختوں تلے چہل قدمی کر رہے تھے۔

امو کچھ کہتے کہتے رک سی گئیں۔ یوں جیسے کوئی بات بھول گئی ہوں۔ لیکن جب بولیں تو بات بدل چکی تھی۔

"وہ تمہاری دوست! کیا نام تھا اس کا؟"

"کون؟ ماہین؟"

"ہاں... کتنی عجیب سی لڑکی تھی ناوہ؟"

"ہاں... عجیب تو ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ لیکن امو کی بات میں کوئی ایسی بات تھی جو مجھے ہلکی سی چبھی تھی۔

"اتنے دنوں میں اس نے مجھ سے ایک بار بھی رابطہ نہیں کیا۔ یہاں آئی تھی میرا پوچھنے؟" میں نے صنوبر کے درخت تلے سرخ پھولوں میں دفن ایک مردہ تتلی کی جھلک دیکھی تو اس ناداں سی لڑکی کو ٹوٹ کر یاد کیا اور جھک کر اس تتلی کو اپنی ہتھیلی پہ رکھ لیا۔

امو کچھ نہیں بولی تھیں۔ میں نے یوں ہی ذرا کی ذرا پلٹ کر انہیں دیکھا۔ وہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے کچلتے ہوئے کافی مضطرب سی لگیں۔ آنکھوں میں ہلکی سی نمی۔ مجھے کوئی غیر معمولی سا احساس ہوا۔

"کیا بات ہے امو جان۔" میں گھبرا سی گئی۔ دل بڑے زور سے دھڑکا تھا۔

"بخت... میری جان!" انہوں نے آگے بڑھ کر میرے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔ ان کے ہاتھ سرد ہو رہے تھے اور کپکپا رہے تھے۔

"ماہین اب اس دنیا میں نہیں رہی۔"

"کتنی عجیب سی لڑکی تھی ناوہ... تھی... تھی۔" کوئی بازگشت سی سنائی دی۔ دماغ میں گڑا کانٹا دل میں گڑ گیا۔

"امو!" بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

امو قریب پڑی کرسی پہ ڈھے سی گئی تھیں۔ اور ان کی آنکھوں سے قطار در قطار بہہ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

جب میری آنکھ کھلی، رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی اور یہ تیسری رات تھی، جو میں ٹرنکولائزر کے سہارے بتا رہی تھی۔ ادویات بھی بس چند گھنٹوں تک اثر کرتیں اور پھر میری آنکھیں نیند بھول جاتی تھیں اور میں ماہین وجدان کو یاد کرنے لگتی تھیں۔ وہ میرے پاس آکھڑی ہوتی تھی۔ میرے پاس بیٹھ جاتی تھی۔ وہ مجھ سے باتیں کرنے لگتی تھی۔ وہ ہنستی تھی اور رو دیتی تھی۔

اور لوگ کہتے تھے ماہین وجدان مر چکی ہے۔

میرے ذرا سا کسمسانے پر ہی بلند بخت جھٹ کروٹ بدل کر مجھ پہ جھک آیا تھا۔ اس کی انگلیاں میرے بالوں کو سرسرا رہی تھی۔ وہ اپنی پوروں سے میرے ماتھے کی دکھتی ہوئی رگوں کو سہلاتا اور میرے سوجے ہوئے پپوٹوں کو... یہ اس کی محبت تھی۔ تسلی اور دلاسے کا انداز... ایسی اپنائیت اور محبت بھرا انداز جسے پاکر میں ہر بار اپنا ضبط کھو دیتی اور میری آنکھیں لہو رونے لگتیں۔

"میں ٹھیک ہوں بخت! تم سوؤ۔" قطرہ قطرہ لہو اپنے اندر اتارتے ہوئے میں نے اسے تسلی دی۔

"بھوک تو نہیں لگ رہی؟ تم رات کچھ کھائے بغیر ہی سو گئیں۔"

"نہیں... ابھی نیند آ رہی ہے۔ تم سوؤ۔ مجھے طلب ہوئی تو کچھ لے لوں گی۔" نہ جانے کیوں میرا دل چاہ رہا تھا۔ یہ شخص کچھ دیر کے لیے میری پروا نہ کرے۔

میں نے کروٹ بدل کر دم سادھ لیا تھا۔ بخت کچھ دیر کروٹیں بدلتا رہا اور پھر شاید میری نیند کا یقین کرتے ہوئے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

میں بہت دھیرے سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ لاؤنج اور برآمدہ عبور کر کے میں سنگی سیڑھیوں پہ آبیٹھی۔ میرے پیر ننگے تھے اور رات کے آخری پہر کی خنکی جذب کر رہے تھے۔ دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر میں بہتی ہوئی رات کو دیکھ رہی تھی۔

کس قدر ناقابل یقین سی بات ہے۔ مجھے ابھی بھی نہیں لگتا کہ ماہین وجدان اس دنیا میں نہیں ہے۔

امو کی بات سن کر دل کی دنیا اس طرح تہہ و بالا ہوئی کہ آج تیسرے دن ہی طبیعت کچھ سنبھل سکی تھی اور میں جان ہی نہ پائی تھی۔ ایسا کیونکر ہوا؟ کیسے ہوا؟ موت برحق ہے۔ لیکن ایسی موت... نہ بیماری، نہ کوئی حادثہ۔ ایک دم قضا نے ہاتھ تھاما اور وہ چل دی۔ میں نے اس کے ساتھ گزارے ہوئے آخری لمحات کو سوچنا چاہا۔ مگر تھکے ہوئے اعصاب ساتھ نہ دے پائے تھے۔

"میں صبح اس کے گھر جاؤں گی۔" میں نے مصمم ارادہ کیا تھا۔

☆ ☆ ☆
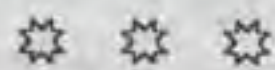
صبح بلند بخت سے بات ہوئی تو اس نے سختی سے منع کر دیا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمہاری طبیعت میں بہتری دیکھی تو چند روز بعد خود ہی لے جاؤں گا۔"

خالہ نے بھی بے حد بھاؤ سے کہا۔

"ان دنوں میں احتیاط بہت ضروری ہے۔ پریگننسی کا آغاز ہے اور تم اتنا بڑا صدمہ دل سے لگا بیٹھیں۔ آخر کو دوست ہی تو تھی۔ کوئی خونی رشتہ تھوڑی تھا۔"

وہ کہتی رہیں... میں سر جھکائے بیٹھی رہی۔ جواباً کوئی دلیل نہ دی۔ ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ بلند بخت نے محسوس کیا تو مجھے امو کی طرف چھوڑ گیا۔ اپنا خیال رکھنے کی ہزار تاکیدوں کے ساتھ...

"میں شام میں لینے آجاؤں گا۔" وہ جاتے جاتے امو کو اشارے سے باہر بلا کر نہ جانے کیا کیا ہدایات دیتا رہا۔

مجھے کچھ کچھ اندازہ تھا... لیکن صرف اس کے جانے کا انتظار تھا۔ سسرال میں تو رشتوں کا لحاظ مانع تھا۔ یہاں امو مجھے کیونکر روک پاتیں... گیٹ سے باہر نکلتے دیکھ کر بے بس سی رہ گئیں۔

اور میں۔۔۔ ان راستوں پر چلتے چلتے کئی بار لڑکھڑائی۔ جو ماہین وجدان کے گھر کو جاتے تھے۔ میرے ساتھ ساتھ اس کے قدموں کی مخصوص سی چاپ ابھرتی۔۔۔ میں چونک کر دیکھتی۔۔۔ تو راستے کی ویرانی مجھے ہولا کے رکھ دیتی۔

راہ میں آنے والے درخت جوں کے توں ایستادہ تھے۔ جن کے تنوں پر ہمارے نام کھدے ہوئے تھے۔۔۔ اور یہ۔۔۔ اس گھر کا دروازہ۔۔۔ جسے ہم نے اس کے "دیوتا" کی کھوج میں کھٹکھٹایا تھا۔

ہوا میں آکسیجن کم ہو رہی تھی۔ میں نے کھل کر سانس لینے کے لیے دوپٹے کی بکل کھول دی۔

"کون تھا وہ؟ اور کہاں ہوگا؟ جو اتنی خالص محبت پا کر بھی محروم رہا؟

اور یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ وہ درخت۔۔۔ جس کے زرد پتوں۔۔۔ میں تتلیوں کے مردہ پروں کو جمع کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"بخت! مجھے لگتا ہے۔۔۔ میں کسی سے محبت کرنے لگی ہوں۔"

میں چلتی جا رہی تھی اور اپنی ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں مسلتی جا رہی تھی۔ جہاں دھند اتنی زیادہ تھی کہ مجھے راستہ بجھائی نہ دیتا تھا۔

گیٹ پر چوکیدار نہیں تھا اور گیٹ کھلا ہوا تھا۔

میرے دوپٹے کا پلو میرے قدموں سے لپٹا جا رہا تھا۔

گھر کی فضا میں موت کے بعد کا سناٹا تھا اور ویرانی تھی۔ جو آنے والے قدموں کی چاپ کو نگلتی تھی اور مزید گہری ہوتی جا رہی تھی۔

سب کمروں کے دروازے بند تھے اور در و دیوار سے ٹپکتی وحشت تصدیق کرتی تھی کہ یہ گھر اپنے سب سے پیارے مکین کو کھو چکا تھا۔

"میں یہاں کس سے ملنے آئی ہوں؟" مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا تو گھبرا کر اونچی اونچی آواز میں رونے لگی۔ پھر پتا نہیں۔۔۔ کس کمرے کا دروازہ کھلا۔

ماہین وجدان کی مما اپنی اجڑی بکھری گود لیے میرے سامنے بالکل خالی ہاتھ کھڑی تھیں۔

"اب آئی ہو۔۔۔ بخت! تم اب آئی ہو۔۔۔ جب کچھ بھی باقی نہیں رہ گیا۔" وہ مجھ سے لپٹ کر ہوکے بھرنے لگی تھیں۔

گھر کی ماتمی فضا کچھ اور سوگوار ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"دنیا میں جب تک پھول کھلتے رہیں گے
تم بھلائی نہیں جاؤ گی
اور لفظ WAS
کبھی تمہارے نام کے ساتھ
نہیں لگ سکے گا۔
اور اسے شکست ہوگی۔"

ایک دوسری نظم

"ایک معصوم نوجوان اکیلی لڑکی
اپنے دونوں بازو مضبوطی سے لپیٹے
برف زاروں میں جمی ہوئی جھیل پر
ننگے پاؤں چل رہی تھی
ایک جگہ سے کمزور برف ٹوٹ گئی
اس معصوم لڑکی کا وجود لمحہ بہ لمحہ
سرد ترین پانی کی گہرائی میں جا رہا تھا
اس نے اپنی بانہیں ایسے کھول دیں
جیسے تتلی اپنے پر کھول دیتی ہے
اس کے دل میں قید جتنے بھی آنسو تھے
وہ سب قیمتی موتی بن گئے
اس کے وجود میں مقید سارے غم
گلاب کے کھلے ہوئے تازہ پھول بن گئے
اس کی ہم سفر سنہری یادیں
رنگوں سے بھری تتلیاں بن گئیں
برف زار کی اس سرد ترین قبر میں
وہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہو چکی تھی۔"

یہ اور اسی طرح کی بے شمار نظمیں۔

میں نے ڈائری بند کی اور دوسری ڈائری نکالی۔ اس کے صفحات نئے اور خوشبودار تھے۔ پہلی سطروں پر نظر ڈالتے ہی معلوم ہو گیا۔ یہ اس "اجنبی دیوتا" کے نام تھی۔ جس کی محبت اپنے دل میں لیے۔۔۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا چکی تھی۔

اور اس میں ہر اس پل، اس گھڑی، اس لمحے کا تذکرہ تھا۔ جب جب ماہین نے اسے دیکھا، سوچا، سراہا یا چاہا۔

"کون تھا وہ؟ کیسے اسے ڈھونڈوں۔۔۔ کیونکر اس تک پہنچاؤں۔۔۔ یہ قیمتی جذبات جو صرف اسی کی امانت ہیں۔"

میں نے بے بسی کی انتہاؤں کو چھوتے ہوئے وہ ڈائری بھی بند کر دی۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی اور یہ ماہین وجدان کا کمرا تھا۔ وہی کمرا جہاں ہم گھنٹوں بیٹھا کرتے تھے اور آج اس کمرے کی فضا میں اجنبیت حد سے سوا تھی۔ میں نے کاغذوں کا ڈھیر سا پلندہ ایک طرف کھسکایا۔

صرف یہ ڈائری تھی جو میں لے کر جا رہی تھی یا "سرد موسموں کی تتلی" کا مسودہ۔۔۔ جس کے زرد ہوتے صفحات میں ایک نیا نکور کاغذ پڑا تھا۔

"بخت کے نام
جب میں اپنی خواب گاہ میں سو جاؤں گی
جس کے دروازے کبھی نہیں کھلتے
تو تم اس کے دروازے پر آنا
اور کوئی پھول مت لے کر آنا
صرف زرد پتے لانا
جو کسی جذبے
کی علامت نہیں ہوتے"

"تمہیں اسے شائع کرانا چاہیے۔"

"ہاں ضرور کرواؤں گی۔ اس کتاب کا انتساب جس کے نام کروں گی۔ وہ مل جائے تب۔" ماضی کا کوئی لمحہ۔۔۔ یاد کے پردے پر لہرایا تو لبوں سے سسکاری سی نکلی تھی۔

"انتساب میرے نام تھا۔ مگر یہ کیسا اظہار تھا؟ کوئی شکوہ تھا یا شکایت۔"

"اور یہ انتساب کب کیا گیا؟ مجھے خبر کیوں نہ ہو سکی؟"

بہت سے سوال تھے۔ جواب کوئی نہ تھا۔

اس کی مما کہتی ہیں۔

"تمہاری شادی کے روز وہ واپس آکر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی اور یہ کوئی خلاف معمول بات نہ تھی۔ وہ زیادہ تر اپنے روم میں ہی رہنا پسند کرتی تھی۔ لیکن رات جب ملازمہ اسے کھانے کا پوچھنے گئی۔ اس کی طبیعت بے حد خراب تھی۔ وہ اپنے دل کو مسلتی اور اپنا سر تکیے سے ٹکراتی جاتی تھی۔ ہم فوراً اسے اسپتال لے گئے اور اگلے چند گھنٹوں میں ڈاکٹرز نے ہمیں اس کی موت کی اطلاع دے دی تھی۔"

میں کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ تب ہی میری نظر دراز میں رکھے چند مزید کاغذات پر پڑی۔

یہ ہاتھ سے بنی ہوئی کچھ تصاویر تھیں۔

"میں نے اس کے بہت سے اسکیچز بنائے ہیں۔" بجلی کا کوندا سا لپکا تھا۔ میں نے جھپٹ کر وہ سارے اسکیچز اٹھا لیے۔

لیڈی ڈیانا۔۔۔ بے نظیر بھٹو، چند تتلیاں، ایک فقیر، پھول اور یہ گلابی کاغذ میں لپٹے چند اور اسکیچز۔

میں نے بہت عجلت میں یہ آخری اسکیچز اپنی طرف سیدھے کیے۔

ایک۔۔۔ دو اور تیسرے پل میں آسمان مجھ پہ ٹوٹ چکا تھا۔

اسکیچز میرے سامنے تھے۔ میرے ہاتھ میں تھے اور بے حد نمایاں، صاف، ایک ایک نقش ابھارتے ہوئے۔

"میں نے اسے بہت کم دیکھا ہے۔ مگر مجھے اس کے سارے نقوش ازبر ہیں۔"

میں نے دوسرا اسکیچ اپنے سامنے کیا۔

"اس کی مسکراہٹ، اس کا چہرہ، نقش ہو گیا ہے دل پر۔"

تیسرا اسکیچ۔۔۔

"میں نے آج شام اسے دیکھا۔۔۔ آج کی رات بہت روشن ہوگی۔"

ایک اور اسکیچ بہت نمایاں، بہت بھرپور۔

"مجھے لگتا ہے' میں چند دن مزید اسے نہ دیکھ پائی تو شاید میرا دل بند ہو جائے گا' دھڑکنا بھول جائے گا۔"

"برف میں منجمد تتلی کسی پُرحرارت لمس سے ایک دم زندہ ہو جائے۔ اسی طرح کل میں بھی زندوں میں ہو گئی بخت آور۔۔۔ اس کی ایک جھلک سے ہی میری آنکھوں میں نور اتر آیا۔"

اسکیچز ختم ہو گئے۔ آوازیں گونجتی رہیں۔

کمرے کی نیم تاریکی میں ماہین وجدان پورے جذب سے کہتی رہی۔ اور میں سنتی رہی ہمیشہ کی طرح۔

میری آنکھ سے بے آواز آنسو نکلا۔ میں نے تمام اسکیچز کو دوبارہ' سہ بارہ دیکھا اور پھر تھک کر اپنا آپ کرسی پر گرا دیا۔

"تو یہ تم تھے' بلند بخت۔۔۔ یہ تم تھے۔"

"تمہاری شادی کے روز۔۔۔" اس کی مما کی آوازیں میرے آس پاس گونج رہی تھیں۔

"سرد موسموں کی تتلی۔۔۔ جو بلند بخت کے نام تھی۔"

"وہ اسکیچز۔۔۔ جو بلند بخت کے تھے۔"

"نظمیں۔۔۔ جو بلند بخت کے لیے تھیں۔"

"ڈائری۔۔۔ جو بلند بخت کی محبت سے آراستہ تھی۔"

میں ایک ایک چیز کو اٹھا کر دیکھتی اور پھر واپس رکھ دیتی تھی۔ آنسو تھم گئے تھے۔ درد بڑھ گیا تھا۔

اس کی تصاویر میرے ساتھ دیکھ کر بلند بخت نے کہا تھا۔

"اچھا۔۔۔ تو یہ تھی تمہاری دوست! خاصی نادان سی لڑکی تھی۔ اکثر ان ہی راستوں پہ دیکھا کرتا تھا اسے۔"

خاصا لاپروا سا انداز تھا بخت کا۔

میں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتی رہی۔

اور تم۔۔۔ تم کیا تھے بلند بخت؟ نادان یا انجان؟

تم اسے انہی راستوں پر چلتے پھرتے دیکھا کرتے تھے اور تمہیں اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ وہ تمہیں کن آنکھوں سے دیکھا کرتی ہے۔ ان آنکھوں سے' جن سے کبھی میں نے بھی تمہیں نہ دیکھا تھا۔

اور اب۔۔۔ یہ سب کچھ میرے پاس تھا۔

ماہین وجدان کی یادیں اور بلند بخت۔

اس کی جدائی کا دکھ۔۔۔ اور اس کی لاعلمی پر پچھتاوا۔

وہ بلند بخت کو دیکھتی رہی' چاہتی رہی' مجھے بتاتی رہی' پھر خبر کیوں نہ ہو سکی۔

میں کبھی بھی جان نہ پائی کہ وہ بلند بخت کو بیان کر رہی ہے۔ بلند بخت کو دیکھنے والی اس کی آنکھ کوئی اور تھی۔ میری آنکھ کوئی اور۔۔۔ بلند بخت کو میں نے ہمیشہ چاہا تھا اور ہمیشہ چاہنا تھا۔ وہ میرے لیے بنا تھا۔

کبھی یہ سوچ اتری ہی نہ تھی کہ اسے کوئی اور بھی چاہ سکتا ہے اور وہ بھی یوں' اتنی شدت سے؟

اور کب کھلا ہو گا ماہین وجدان پہ۔۔۔ کہ ہم دونوں کی محبت ایک ہے؟

"کب اس کے دل نے چوٹ کھائی ہو گی؟

کب درد حد سے سوا ہوا ہو گا؟

مایوں' مہندی اور پھر شادی کے دن تک۔۔۔ کہیں کوئی آثار نظر نہیں آئے تھے۔ میں پہروں بیٹھی سوچتی رہتی۔

اور اس روز وہ سارا وقت میرے ساتھ رہی تھی۔

صبح گھر سے پارلر جانے تک۔

اپنے شہد رنگ گھونگھریالے بالوں کو سجائے ریڈ سلیوز لیس لباس میں گڑیا سا روپ لیے میرے ساتھ ساتھ رہی تھی۔

اور اس روز سے پہلے وہ کبھی اتنا سنوری تھی' نہ اتنی پیاری لگی تھی۔ پارلر میں ہم دونوں باتیں کرتے رہے۔

بیوٹیشن مجھے بار بار ٹوک رہی تھی۔

پھر ایک ہی گاڑی میں پارلر سے ہوٹل تک کا سفر۔۔۔ یوں چمکتا' دمکتا' بشاش سا چہرہ لیے۔

اور وہاں۔۔۔ ڈریسنگ روم میں بھی میرے ساتھ۔۔۔

پھر میں کچھ کزنز کے ساتھ اسٹیج تک آئی تھی۔ جہاں بلند بخت میرے استقبال کے لیے کھڑا تھا اور ان ہی گھڑیوں میں سے کوئی ایک گھڑی ہو گی جو قیامت بن کر ٹوٹی ہو گی۔ جب میں بلند بخت کے ساتھ بیٹھی ہوں

گی۔ اس کا ہاتھ تھام کر زندگی کے نئے سفر کا آغاز کر رہی ہوں گی۔ ہاں۔۔۔ ان ہی میں سے کوئی تو گھڑی۔۔۔ میں نے تھک کر سر تکیے پہ گرا دیا۔

بتانے والے بتاتے ہیں۔ وہ میری رخصتی کے بعد ہی ہوٹل سے نکلی تھی۔ بڑے ضبط اور صبر سے اس نے سہا ہو گا۔ لیکن پھر ہار گئی ہو گی۔

"اور تمہارے غم سے میں ہار گئی ماہین وجدان! کیا ہوتا جو تم ان بہت سی باتوں کا جواب دینے کے لیے زندہ رہتیں۔ چند روز۔۔۔ صرف چند باتوں کے جواب کے لیے۔"

میرا تھکا ہوا ذہن اب ڈول رہا تھا۔ میں نے سختی سے آنکھیں میچ لی تھیں۔

"اس دن مجھے تم سے کہنے کے لیے لفظ نہیں مل رہے تھے
اور میں نے
بہت سے پھول جمع کر کے
تمہاری ہتھیلی پہ رکھ دیے تھے
اور آج بھی مجھے تم سے کہنے کے لیے
لفظ نہیں مل رہے تھے
تو میں نے بہت سے زرد پتے جمع کر کے تمہاری ہتھیلی پر رکھ دیے
وہ لفظ۔۔۔
جو آخری بار کہے ہوتے ہیں
بہت اہم ہوتے ہیں
وہ یادوں میں
زندہ تتلی کی طرح اڑتے پھرتے ہیں
اور کبھی کہیں نہیں بیٹھتے۔"

اور مجھ سے رہا نہیں گیا تھا۔ میں نے ایک ایک چیز بلند کے سامنے رکھ دی تھی۔

ہر پل' ہر لمحہ جو اس کی محبت میں کہا گیا تھا۔ میں نے سب کہہ ڈالا تھا۔

اور ماہین وجدان کا دیوتا کمال کا تھا۔ اس نے دل کی کسی کیفیت کو چہرے تک آنے نہ دیا تھا۔ وہ چپ چاپ جھکی آنکھوں سے سنتا رہا اور اس کی انگلیاں میرے بالوں میں سرسراتی رہیں اور جب وہ بولا تو اس کا لہجہ ٹھہرا ہوا تھا۔

"یہ سب یوں ہی ہونا تھا بخت آور۔۔۔ بالکل اسی طرح۔۔۔ کہ یہ تقدیر کا لکھا تھا اور اسے نہ تم بدل سکتی تھیں' نہ میں۔۔۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو محبت ہم تینوں کی زندگیوں پر عذاب بن کر نازل ہوتی۔ ماہین وجدان کو بس اتنا ہی جینا تھا۔ اتنے خالص جذبات رکھنے والے لوگ اس دنیا کی پرکھ پر پورا نہیں اتر سکتے۔

اور بخت آور۔۔۔ کتنے لوگ ہوتے ہیں ایسے؟ سیکڑوں نہیں' ہزاروں میں ایک۔۔۔ اتنے حساس۔۔۔ اتنے زود رنج۔۔۔ جذبات ناپختہ اور قوت مدافعت زیرو۔۔۔ اس پر تربیتی ماحول کی کمی یا کجی۔۔۔ انہیں ہتھیلی آبلے کی صورت رکھو تو بھی پھوٹ بہتے ہیں۔ کسی ہلکی سی ٹھیس سے بھی۔ جیسے تتلی کے نازک پروں کو کتنی بھی احتیاط سے چھوئیں۔۔۔ ان کے رنگ پوروں پر اتر ہی آتے ہیں۔

یوں ہی۔۔۔ بالکل یوں ہی ماہین وجدان جیسے لوگ ہوتے ہیں۔۔۔ تتلی کی طرح نازک' معصوم' بے ضرر اور بہت ہی خاص۔

ایسے لوگ عام ہو ہی نہیں سکتے۔

جو زرد' تنہا' خزاں رسیدہ درختوں پر عاشق ہوں۔

جن کی آنکھیں درخت سے جدا ہونے والے پتوں پر لہو رونے لگیں۔

جو مردہ تتلیوں کے پروں کو سینت سینت کر رکھتے ہوں۔

جو بدلتے موسموں کی ایک ایک جنبش سے باخبر رہتے ہوں۔

جو رشتوں کے تقدس میں ذرا سی اونچ نیچ برتنے والوں کو ناخالص اور قابل نفرت گردانتے ہوں۔

ایسے لوگ' عام ہو ہی نہیں سکتے۔

ماہین وجدان کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ وہ تو صرف پھول تھی' یا تتلی' یا سیپ میں بند موتی یا پھر آسمان سے بچھڑا کوئی ستارہ۔۔۔ جسے قدرت نے ایک بار پھر آسمان پر ہی سجا دیا۔"

☼

رُخسانہ نگار عدنان

ایک تھی مثال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً "بیٹا بہو سے لگاوٹ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشریٰ کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ذکیہ بیگم اپنے بیٹے عمران کے لیے بھی لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشریٰ اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہیں۔ عاصمہ کو فون کے ذریعے کوئی اطلاع ملتی ہے، جسے سن کر وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

فون پر پتا چلتا ہے کہ شہر آتے ہوئے عفان اور فاروق صاحب ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو گئے۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ، نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط [illegible]
رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشریٰ سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا [illegible]
حمیدہ خالہ، عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زبیر کا اکیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنار[illegible]
جبکہ عاصمہ مجبور ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جا[illegible]
جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ وہ انتہائی ضرورت کے [illegible]
گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔

۵
پانچویں قسط

گھر میں ایک جامد سناٹا تھا' ایک خوفناک خاموشی۔
بشریٰ یوں ہی نیم دراز سی جانے کس وقت صوفے پر پڑے پڑے گہری نیند سو گئی تھی۔
اس کی کی آنکھ اس خوفناک سناٹے کی وجہ سے کھلی تھی۔
کمرے میں دھندلا سا اندھیرا تھا اور سائیں سائیں کرتی چپ۔
وہ ڈر سی گئی۔ اس نے جیسے خوف سے اپنے پیر سمیٹ لیے۔
"مثال!" کمرے میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے آہستگی سے پکارا۔ اس کی پکار کسی سرگوشی کی مانند تھی جیسے اس کے لبوں سے نکلی ہی نہ ہو۔
"سب لوگ کہاں ہیں؟ ابھی کچھ دیر پہلے تو کتنا ہنگامہ شور اور بدمزگی سی تھی سارے گھر میں اور اب عدیل۔۔۔ عدیل کہاں ہیں۔" اسے یاد آیا۔
وہ تینوں لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ جب بشریٰ ان کی لاحاصل بحث سے اکتا کر اپنے بیڈ روم میں آگئی تھی۔ مثال صوفے کے قریب اپنے کھلونے لیے کھیل رہی تھی۔ بشریٰ اکتائی ہوئی سی اس کے پاس بیٹھ گئی۔ مثال اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ بشریٰ غائب دماغ سی سننے گئی۔
اور جانے کب مثال سے باتیں کرتے وہ صوفے کے ہتھے پر سر ٹکائے گہری نیند سو گئی۔
کسی برے خیال کے آتے ہی وہ تیزی سے اٹھ کر باہر جانے لگی۔ صوفے کے پاس زمین پر پڑے مثال کے کھلونے اس کے پاؤں سے ٹکرا کر ایک ناخوشگوار شور کے ساتھ ادھر ادھر بکھر سے گئے۔
اسی وقت باہر ڈور بیل بجی۔
اور پھر بجتی ہی چلی گئی۔ بشریٰ تیزی سے باہر نکلی۔ صوفے پر پڑا اس کا سیل فون بجنے لگا۔
وہ لمحہ بھر متذبذب سی کھڑی رہی۔ پھر مڑ کر سیل اٹھایا تو وہ اتنی دیر میں بند ہو چکا تھا۔ اس نے نمبر دیکھا تو کوئی اجنبی نمبر تھا۔
اس نے سیل مٹھی میں دبایا اور باہر جانے لگی کہ فوزیہ کی دلدوز چیخ نے جیسے اس کے قدم جکڑ لیے۔
"یا اللہ! خیر۔۔۔ آنٹی ٹھیک ہوں۔ فوزیہ ایسے کیوں چیخی۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھے گویا دل کو سنبھالتی کمرے سے نکل آئی۔
دونوں ماں بیٹی لاؤنج ہی میں تھیں۔
فوزیہ کارپٹ پر بیٹھی تھی اور اس کے ہاتھ میں کوئی ادھ کھلا کاغذ تھا۔ فوزیہ کسی بت کی طرح ساکت سی بیٹھی تھی۔

نسیم پھٹی پھٹی آنکھوں سے فوزیہ کو دیکھے جا رہی تھیں۔
بشریٰ کچھ اور خوفزدہ سی ہو گئی۔ "کہیں وہ انہونی تو نہیں ہو گئی۔ جس کے خوف نے ہمارے گھر کا چین، سکون اتنے مہینوں سے غارت کر رکھا تھا۔" اس نے سہم کر سوچا۔
"امی! کیا ہوا؟" فوزیہ ایسے کیوں چیخی تھی؟" اس نے ڈرے ہوئے لہجے میں آگے بڑھ کر پوچھا۔
دونوں ہی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئیں۔ اسی طرح بے جان سی بتوں کی طرح بیٹھی رہیں۔
"فوزیہ! سب ٹھیک ہے نا؟" وہ فوزیہ کے پاس آکر دھیرے سے بولی۔
فوزیہ کے ہاتھ سے کاغذ چھوٹ کر نیچے گر گیا۔
بشریٰ ساکت سی اسے دیکھ کر رہ گئی۔ "تو میرا وہم ٹھیک ہے۔"
اس نے ذرا سی نظریں ترچھی کر کے پتھر کا بت بنی نسیم بیگم کو دیکھا اور پھر ڈرتے ڈرتے فوزیہ کے پاس گرا کاغذ اٹھا لیا۔
"طلاق نامہ۔" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا اور نسیم بیگم جیسے خود پر ضبط کھو بیٹھیں۔ ان کے منہ سے ایک دلخراش چیخ سی نکلی اور وہ صوفے کے ایک طرف گر کر بے ہوش ہو گئیں۔ فوزیہ اسی طرح بت بنی بیٹھی رہ گئی۔
"امی۔۔۔! امی! اٹھیں۔ ہوش کریں امی!" بشریٰ گھبرا کر نسیم بیگم کو بٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔
"یہ تو بے ہوش ہو گئی ہیں۔۔۔" "فوزیہ! دیکھو امی کو کچھ ہو نہ جائے۔
پلیز! کسی ڈاکٹر کو۔ عدیل کو فون کرو۔ کہاں ہے عدیل؟" وہ بے ربط سا بولے جا رہی تھی۔ فوزیہ اسی طرح ساکت بیٹھی تھی۔
وہ جلدی سے عدیل کا نمبر ملانے لگی۔ عدیل کا فون وہیں صوفے کے نیچے کہیں گرا ہوا تھا۔ وہاں سے آتی بپ کی آواز بشریٰ کو پریشان کر گئی۔
عدیل جانے کس پریشانی میں گھر سے نکل کر گئے ہوں گے کہ وہ اپنا سیل بھی یہیں بھول گئے۔ وہ تاسف سے سوچ کر رہ گئی۔ نسیم بیگم ابھی تک بے ہوش تھیں۔
بشریٰ نے جلدی سے عمران کا نمبر ملایا اور اسے صورت حال بتا کر جلدی پہنچنے کی تاکید کی اور پھر فکر مندی سے اسی طرح بے حس بیٹھی فوزیہ کو دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼
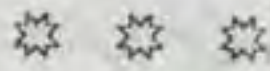
باہر اندھیرا گہرا ہوتا چلا جا رہا تھا۔
جوں جوں گاڑی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ عاصمہ کا دل جیسے بیٹھا جا رہا تھا۔ جانے کیوں اسے کسی ان دیکھے انجانے خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔
اس کے ہاتھوں میں ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔ اس نے سہارے کے لیے ساتھ جڑ کر بیٹھی اریبہ کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینے چاہے اور دوسرے لمحے چونک سی گئی۔
اریبہ ایک طرف لڑھکی گہری نیند سو چکی تھی۔
"اریبہ بیٹا! سو کیوں گئیں؟" وہ اس پر جھکی متفکر سی آہستگی سے بولی۔
اریبہ ماں کی پریشانی سے بے خبر گہری نیند سو چکی تھی۔
"زبیر بھائی! یہ تو سو گئی۔" اس نے زبیر کی بہت گہری معنی خیز خاموشی سے توجہ ہٹا کر بظاہر نارمل انداز میں مخاطب کیا۔ ورنہ زبیر کی مسلسل چپ اسے اندر ہی اندر ڈرا بھی رہی تھی۔

"سونے دیں۔ اسکول سے آکر سوئی جو نہیں ہوگی۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

"نہیں! اسکول سے آکر تو یہ کافی سوئی تھی۔ پھر اب کیوں سوگئی۔ اریبہ میری جان! اٹھو نا۔ نیا گھر نہیں دیکھو..."

اس نے ایک بار پھر اریبہ کو اٹھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ بہت بے سدھ سو رہی تھی۔

"اس طرح تو یہ کبھی نہیں سوئی۔" وہ پریشان سی ہوگئی۔

"سونے دو نا! کیوں اسے ڈسٹرب کر رہی ہو؟" زبیر کا بے تکلفانہ انداز اسے چونکا سا گیا۔

بے اختیار اس نے چادر کے کونے کو چہرے کے ارد گرد کرلیا اور یوں ہی پریشان بھٹکتی نظر جیسے ہی بیک ویو پر پڑی تو اس کی جان ہی نکل گئی۔

زبیر کی آنکھوں میں انوکھی سی چمک تھی اور عاصمہ کے وجود پر جمی نظریں۔ کیا نہیں تھا ان نظروں میں۔ عاصمہ جیسی محتاط عورت جس نے اپنی زندگی میں پہلے باپ بھائی اور پھر شوہر مسرت کے سوا کسی مرد کو قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ مگر پھر بھی وہ ان نظروں کو بہت اچھی طرح پہچان سکتی تھی کہ یہ کسی مرد کی بری نظر تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کی گیلی ہتھیلیوں نے اریبہ کے ننھے ہاتھوں پر اپنی گرفت اور بھی مضبوط کرلی۔

وہ کچھ اور بھی سمٹ کر رہ گئی۔ لیکن وہ نظریں۔۔۔

"زبیر بھائی!" اس نے بے اختیار بھنچی ہوئی آواز میں اسے پکارا۔

"میں گھر واپس جانا چاہتی ہوں۔ مجھے لگ رہا ہے کہ میری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔ میرا بی پی۔۔۔ بی پی لو ہو رہا ہے۔ پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے۔۔۔ تو آپ پلیز مجھے گھر۔۔۔" وہ بہت مشکل سے بول پا رہی تھی گلے میں جیسے بہت سے پھندے تھے۔

"گھر تو آگیا ہے۔ بس دو منٹ کی ڈرائیو اور ہے۔ پھر آپ کو پتا ہے' آپ بار بار تو نکل نہیں سکیں گی۔ بس تھوڑی دیر اور۔" زبیر نے ان ہی نظروں سے اسے دیکھا اور گاڑی کی رفتار بڑھادی۔ عاصمہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

اپنے ساتھ سوئے اس ننھے سہارے کو دیکھا۔ وہ ہوش و خرد سے بے نیاز گہری نیند سو رہی تھی۔

عاصمہ کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔

جب وہ گاڑی میں بیٹھنے کے لیے باہر آئی تھی تو اریبہ زبیر کی دی ہوئی چاکلیٹ مزے سے کھا رہی تھی۔

"تو کہیں اس چاکلیٹ میں کچھ۔۔۔ اریبہ دوپہر میں اسکول سے آکر تین چار گھنٹے سوئی تھی۔ اب دوبارہ اتنی جلدی تو اسے نہیں سونا چاہیے تھا۔" وہ اریبہ کی مدہوشی کو دیکھتے ہوئے جیسے اس کی نیند کی وجہ جاننے کی کوشش کرنے لگی۔

گاڑی اب ایک ویران اندھیری سڑک پر تھی۔ یہ کوئی نئی بستی تھی۔ ارد گرد آبادی بہت کم تھی۔ اگر کچھ مکان بنے بھی تھے تو ان میں زندگی کے آثار نہیں تھے۔

"میرے خیال میں آپ کچھ گھبرا رہی ہیں۔۔۔ ہے نا؟" زبیر کے عجیب سے لہجے نے اس گمبھیر سناٹے کو توڑا تھا۔

عاصمہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"میرے خیال میں گھر کتنا بھی اچھا کیوں نہ ہو۔ مجھے پسند نہیں آئے گا۔ اس لیے پلیز! آپ مجھے واپس گھر چھوڑ دیں یا یہیں ایسے ہی اتار دیں۔" اس نے اریبہ کو اب اپنی گود میں سمیٹ لیا تھا۔ جیسے وہ ابھی واقعی ہی گاڑی روکے گا اور وہ نکل بھاگے گی۔

اگر ایسا ہو بھی جاتا تو بھی اس ویرانے میں اسے کنوینس کہاں سے ملتی۔

لیکن اس وقت وہ ہر طرح کا رسک لینے کے لیے تیار تھی۔ بس اس گاڑی سے اتر جاتی ایک بار۔

"یہاں۔۔۔؟" وہ اچنبھے سے بولا۔ اس کی نظریں صاف عاصمہ کو مذاق اڑاتی محسوس ہوئی تھیں۔

"کیا کریں گی یہاں اتر کر آپ؟" وہ واقعی اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"پلیز! مجھے آپ یہیں ڈراپ کردیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی بے بسی کے گہرے احساس نے اس کی آنکھیں دھندلا دیں آواز میں نمی سی اتر آئی۔

"ڈراپ تو نہیں کرسکتا اب۔" وہ یقیناً "زیر لب" ہی بولا تھا۔ آواز بہت نیچی تھی۔ مگر عاصمہ سن چکی تھی۔

"اگر آپ گاڑی نہیں روکیں گے۔ میں اس طرح اتر جاؤں گی۔" اس نے بے اختیار دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔

"آٹومیٹک لاک ہیں اس کے اور عاصمہ بھابھی آپ کیوں گھبرا رہی ہیں؟ علاقہ تھوڑا کم آباد ضرور ہے۔ لیکن یقین کریں۔ یہاں سارے پلاٹس بک ہو چکے ہیں۔ بلکہ آدھے سے زیادہ تو بن بھی چکے ہیں اور لوگ یہاں آکر رہنے لگے ہیں اس لیے تو آپ کو اتنی کم قیمت میں گھر مل رہا ہے بس یہ دیکھیں۔ آگیا گھر۔ وہ وائٹ گیٹ نظر آرہا ہے نا" اس سرمئی اور نیلے گیٹ سے آگے۔۔۔ وہی تو ہماری منزل ہے۔ بس وہیں تک جانا ہے ہمیں۔"

اس کا لہجہ اور انداز ایک بار پھر بدل چکے تھے۔

عاصمہ نے الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ جیسے فیصلہ نہ کرپا رہی ہو۔ گاڑی اب جیسے ٹوٹی پھوٹی پگڈنڈی سے گزر رہی تھی۔ کیونکہ سڑک تو اب وہاں کوئی نہیں تھی۔

"اس ویرانے میں۔۔۔ میں بچوں کے ساتھ یہاں نہیں رہ سکتی۔ میرے بچے گھر میں اکیلے ہیں اور یہ شخص۔۔۔ اس کی نیت مجھے ٹھیک نہیں لگتی۔ یا اللہ! مجھ پر رحم فرما۔ میں تو پہلے ہی بڑی کڑی آزمائش میں گھری ہوں۔ مجھے خیر و عافیت کے ساتھ میرے بچوں کے درمیان واپس پہنچا۔ میں تجھ سے توبہ کرتی ہوں۔ میں نے تیرے سوا کسی اور کو سہارا جانا۔ برا کیا۔ اے اللہ! مجھے معاف کردے۔ مجھے اور میری بچی کو بچالے۔ اس کی نیت کو پھیر دے۔ اے دلوں کو پھیرنے والے اس شخص کو میرے لیے بے ضرر بنا دے۔ میرے اللہ! ایک بار مجھ پر رحم فرما۔ میں آئندہ تیری حدود نہیں توڑوں گی۔ مجھ پر رحم فرما!" گرم گرم آنسو اس کی آنکھوں سے بہتے چلے گئے۔

گاڑی اس سنسان سے گھر کے سفید گیٹ کے آگے رک چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

نسیم بیگم آئی سی یو میں تھیں۔

انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ ابھی ڈاکٹرز ان کے بچ جانے کے بارے میں پرامید نہیں تھے۔

بشریٰ اور عمران بے چینی سے آئی سی یو کے باہر بیٹھے تھے۔

"عدیل بھائی کے کسی ایسے قریبی دوست کا نمبر جہاں وہ جاسکتے ہوں۔ آپی! تمہیں کچھ تو پتا ہوگا۔" عمران کچھ جھنجلا کر بولا۔

ڈیڑھ گھنٹہ ہونے لگا تھا اور عدیل سے کوشش کے باوجود رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ بشریٰ بہت فکر مند تھی۔ عدیل ایک ذمہ دار شخص تھا۔ وہ یوں گھر میں اتنی بڑی پریشانی کے ہوتے دامن چھڑا کر یاروں دوستوں میں جا کر بیٹھنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اتنا اسے پتا تھا۔

"جو دو ایک دوست تھے' ان سے میں اسپتال آنے سے پہلے بات کرچکی ہوں۔ بلکہ پیغام بھی دے آئی تھی کہ جیسے ہی ان کا عدیل سے رابطہ ہو' وہ انہیں امی کے بارے میں بتادیں۔" وہ گہرا سانس لے کر فکرمندی سے بولی۔

عمران تھوڑی دیر بعد ٹھہر کر بولا۔

"امی کا پھر فون آ رہا ہے۔ پھر انہیں یہی کہنا ہو گا کہ بشریٰ سے کہو گھر چلی جائے۔ آپی میں ہوں نا یہاں۔ تم کیوں نہیں جاتیں؟؟"

عمران جھنجلا کر بولا۔ ذکیہ کی کال اس نے ڈراپ کر دی تھی۔

"فوزیہ کی حالت بھی اچھی نہیں۔ میں بھی گھر جا کر بیٹھ گئی اور خدانخواستہ امی کو کچھ ہو گیا تو تم عدیل کو نہیں جانتے۔ میں ٹھیک ہوں۔ تم کہہ دو امی سے۔" بشریٰ آئی سی یو کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"یہ خوب رہی! بھئی دونوں بہن بھائی غائب ہیں۔ آپ کی ساس صاحبہ جن کی والدہ ہیں۔ انہیں تو کچھ پریشانی نہیں۔ آپ اس حالت میں سب دکھ جھیلنے 'نیک' خدمت گاری بیٹھی ہیں۔" عمران اب چڑ گیا تھا کہ تین گھنٹے سے اس فضول کی بے گار میں پھنسے پڑے ہیں کہ جس خدمت خلق کا اسے کچھ حاصل وصول بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

"امی سے پوچھو' مثال نے کچھ کھایا ہے۔" بشریٰ کو خیال آیا۔

"کھا لیا ہو گا۔ اب اتنی سی بات کے لیے فون کروں۔ میرے خیال میں میں ڈاکٹرز سے پوچھ کر آتا ہوں۔ نسیم آنٹی کی اب کیا کنڈیشن ہے۔" عمران کی طبیعت میں نچلا بیٹھنا محال تھا۔ یوں بھی وہ کسی بھی انتظار کی کیفیت کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ جلد بازی اس کی فطرت کا محور تھی۔ وہ کسی بھی چیز سے کچھ ہی دیر میں اکتا جاتا۔ اب وہ اسپتال سے کھسکنے کے چکر میں تھا۔ بشریٰ جانتی تھی مگر عدیل کے آنے تک عمران کی سب باتیں برداشت کرنا اس کی مجبوری تھا۔

☼ ☼ ☼
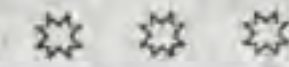
"میں تو حیران ہوں۔ تین سال ہو گئے ہیں اور اس علاقے کا ابھی بھی وہی حال ہے۔ جو تین سال پہلے تھا۔ اکا دکا گھر بنے ہیں۔ وہ بھی ابھی تک بے آباد۔" عدیل نے ساتھ بیٹھے محسن سے کہا۔

"ہاں! شہر کی آبادیوں سے یہ سوسائٹی کافی ہٹ کر ہے۔ بلکہ جنہوں نے گھر بنائے ہیں' وہ بھی انہیں بیچنے کے چکروں میں ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ قیمت وہ بڑھی ہوئی چاہتے ہیں' جو کہ مل نہیں پا رہی۔ سو اکثر گھر بند کر کے شہر کے آس پاس یا کسی اور پر رونق سوسائٹی میں پسند کا پلاٹ لے کر گھر بنا چکے ہیں۔" محسن نے تفصیل سے بتایا۔

باہر گہری رات ہو چلی تھی۔

"چلو! پھر تو میرا فیصلہ ٹھیک ہی ہے۔ اگرچہ میں نے بہت سوچ کر بلکہ یوں سمجھو نیم دلی سے اسے بیچنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اگر مجھے اتنی ایمرجنسی میں ضرورت نہ آ پڑتی تو چند سال اور اسے پڑا رہنے دیتا۔"

"کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میرا سیل گھر ہی میں رہ گیا ہو۔ بہت الجھن سی ہو رہی ہے۔ میں کسی کو بتا کر بھی نہیں آیا کہ کہاں جا رہا ہوں۔" عدیل کو عجیب سی فکر ہو رہی تھی۔ وہ نسیم بیگم اور فوزیہ اس پریشانی میں کوئی بھی آس دلائے بغیر چلا آیا تھا۔ وہ یقیناً "بہت پریشان ہوں گی۔

"فکر نہیں کرو۔ ہمیں زیادہ ٹائم نہیں لگے گا۔ وحید صاحب کاروباری آدمی ہیں اور لین دین میں بڑے صاف ستھرے ہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ آدھی سے زیادہ رقم فوراً" دے رہے ہیں۔ یہ کم ہے کیا؟؟"

"ہوں! یہ تو ہے۔" گاڑی اب پلاٹ کے پاس پہنچ چکی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم سا تھا۔ دور دور تک آبادی کے آثار نہیں تھے۔

"میں نے تو یہ پلاٹ تین سال پہلے بشریٰ کو سرپرائز دینے کے لیے خریدا تھا۔ اچھا ہوا اس نے یہاں آ کر نہیں دیکھا ورنہ وہ فوراً" اسے بیچنے کا مشورہ دیتی۔" ہر طرف پھیلے گھنگھور اندھیرے اور سناٹے کو دیکھ کر عدیل نے دل

میں سوچا۔ اس نے بہت سوچنے کے بعد اپنے لیے خریدے ہوئے اس پلاٹ کو بیچنے کا فیصلہ کیا تھا کہ کسی طرح فوزیہ اور ظہیر کا رشتہ بچ جائے۔ اس کی بہن کا گھر کسی طرح بن ہی جائے۔ اتنی مشکلوں سے ہوا تھا یہ رشتہ۔

"جی! ایسا کہہ رہے ہیں حاجی صاحب۔۔۔ اچھی۔۔۔ جی! وہ تو میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ جی بالکل! میں جانتا ہوں۔ تو چلیں! ٹھیک ہے' پھر کل پر رکھ لیتے ہیں۔" اس نے کچھ مایوس سا ہو کر فون بند کر دیا۔

"کیا ہوا؟" عدیل نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"اچانک انہیں ایک ایمرجنسی کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا پڑ گیا ہے۔ ان کے بہنوئی کا اچانک ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ نہیں آ سکتے۔" محسن نے فون بند کرتے ہوئے عدیل کو بتایا۔

عدیل کو امید تھی' وہ کچھ نہ کچھ پیمنٹ کا انتظام کر کے ہی گھر جائے گا مگر۔۔۔ شاید قدرت کو یہ منظور ہی نہیں تھا۔

"چلو! ٹھیک ہے تو پھر چلیں۔" وہ بے دلی سے بولا۔

"ایسا ہے کہ تم مجھے یہاں سے تیسرے بلاک میں اے زیڈ کے آفس ڈراپ کر دو۔ مجھے اس سے کچھ کام ہے۔ اس کے ساتھ واپس چلا جاؤں گا۔" محسن نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

عدیل نے غائب دماغی کی سی کیفیت میں محسن کو اس کے اسٹیٹ ایجنٹ دوست کے آفس ڈراپ کیا اور پھر ان لوگوں کے روکنے کے باوجود چائے پیے بغیر واپسی کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ جانے اسے کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں کچھ ایسا ویسا ہو گیا ہے۔ وہ جلد سے جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ عجیب وحشت سی اسے گھیرے ہوئے تھی۔ وہ گاڑی تیزی سے چلانے لگا۔

☼ ☼ ☼
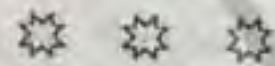
وہ بیرونی لائٹ جلا کے گھر کا گیٹ کھول چکا تھا اور اب اس کے گاڑی سے اتر کر آنے کا منتظر تھا۔

عاصمہ متذبذب تھی۔ گود میں سوئی اریبہ کو لیے ہوئے وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ گاڑی سے اترے یا پھر دروازہ کھول کر دور تک بھاگتی چلی جائے۔ لیکن کتنی دور تک؟ اگر وہ بدنیت ہو چکا ہے تو پھر وہ زیادہ دور نہیں بھاگ سکتی۔۔۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ سب اس کا وہم ہو۔ ایسا کچھ بھی نہ ہو۔

اس نے اپنے وسوسوں کو جھٹلانے کی کمزور سی کوشش کی۔ ورنہ تو اس کا اندر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ یہ سب اس کا وہم نہیں ہے۔

دوسرے لمحے وہ پھر سے ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا تھا۔

عاصمہ نے الجھی ہوئی نظروں سے کھلے گیٹ کو دیکھا اور پھر گاڑی اسٹارٹ کرتے زبیر کو۔

"ہم واپس جا رہے ہیں کیا؟" عاصمہ اپنے لہجے کی لرزاہٹ کو چھپا نہیں سکی تھی۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ بہت مشاقی سے پہلے گاڑی تھوڑی پیچھے کی اور پھر بہت تیزی سے کھلے گیٹ کے اندر لے گیا۔

"یہ' یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ ہمیں واپس جانا ہے ابھی۔ پلیز! گاڑی باہر نکالیں۔۔۔ مجھے گھر جانا ہے ابھی۔۔۔ میں اور نہیں رک سکتی۔" وہ بے قابو ہو کر چیخ ہی پڑی۔

"اریبہ' اریبہ! اٹھو بیٹا! آنکھیں کھولو دیکھو! میں آپ کی ماما۔۔۔" وہ زور زور سے اریبہ کے گال تھپتھپانے لگی۔ اگرچہ اس کا کچھ فائدہ نہیں تھا۔ اریبہ بے سدھ تھی۔

گاڑی گھر کے اندر آ چکی تھی۔

زبیر نے تیزی سے باہر نکل کر گھر کا بیرونی گیٹ بند کر دیا۔

اور عاصمہ کو یوں لگا۔ اس پر باہر جانے کا ہر راستہ بند ہو گیا ہے۔ وہ جیسے پتھرا سی گئی۔

"آجائیں۔۔۔ اریبہ کو یہیں رہنے دیں۔ ہم ذرا سی دیر میں گھر دیکھ کر واپس چلتے ہیں۔ یہ کافی گہری نیند سو رہی ہے۔" زبیر دروازہ کھولے اس سے کہہ رہا تھا۔

"میں اب گھر نہیں دیکھنا چاہتی۔" اس نے لہجے کو مضبوط کرنا چاہا۔ "کیونکہ مجھے یہ گھر نہیں لینا۔ آپ پلیز مجھے واپس لے چلیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہو گی۔" اس نے اگلی سیٹ کی پشت کو بہت مضبوطی سے یوں تھام لیا جیسے اس سے بڑا اور مضبوط سہارا اور کوئی بھی نہیں۔

"دو منٹ لگیں گے بھابھی! اب اتنی دور آئے ہیں تو بس ایک نظر دیکھ لیں۔۔۔ چاہے نہ خریدیں۔۔۔ اور میرا بھی یہی خیال ہے کہ چھوٹے بچوں کے ساتھ اتنی دور گھر لینا مناسب نہیں ہو گا۔" اس کے لہجے میں کہیں جھول نہیں تھا۔

"تو پھر واپس چلتے ہیں۔ کیا ضرورت ہے دیکھنے کی؟" وہ اور رکھائی سے بولی۔ "آپ پلیز! واپس چلیں۔"

"آجائیں نا! میں کہہ رہا ہوں آپ سے 'دو منٹ لگیں گے بس۔ ہو سکتا ہے گھر واقعی آپ کو پسند آجائے۔ آپ یوں ہی ضد لگا کر بیٹھی رہیں گی تو ہم لیٹ ہوتے رہیں گے۔ بہتر ہے مزید ٹائم ضائع نہ کریں۔ مجھے ایک ضروری کام سے بھی جانا ہے۔ آپ کی وجہ سے پہلے ہی خاصا لیٹ ہو چکا ہوں میں۔" اس نے لہجے میں سارے احسانوں کو جتانے والا انداز سمویا تو عاصمہ جیسے ٹھٹک کر رہ گئی۔

"آئندہ زندگی بھر کے لیے سبق ملا ہے۔ کبھی ایسا رسک نہیں لینا۔ یوں اکیلے کسی غیر آدمی کے ساتھ نہ نکلنا چاہے کتنا ہی ضروری کام کیوں نہ ہو۔۔۔ کبھی نہیں۔" وہ خود کو ڈپٹتی جھڑکتی بظاہر محتاط سی گھر کے اندر داخل ہوئی۔

پہلا کمرا شاید لاؤنج تھا۔ خوب صورت ٹائلوں اور لکڑی کے کام سے مزین۔ مگر اس لمحے عاصمہ کے دل کو کچھ بھی نہیں بھا رہا تھا۔ اپنے گھر کی خواہش جیسے کہیں مر سی گئی تھی۔

"کیسا ہے؟" وہ اس کے قریب پہنچا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی ' ایک دم سے کمرے میں۔۔۔ بلکہ سب طرف اندھیرا ہو گیا۔ دروازہ ایک زوردار دھماکے کے ساتھ بند ہو گیا۔

روشنی کا آخری راستہ بھی۔

عاصمہ کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی۔

لیکن ایک مضبوط ہاتھ نے اس کی آدھی چیخ کا گلا وہیں گھونٹ دیا۔ وہ ایک بہت مضبوط گرفت میں آچکی تھی۔ مچھلی کی طرح تڑپتے ہوئے اس نے خود کو اس گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر۔۔۔ اتنے اندھیرے میں ' اس ویرانے میں اکیلے پن کا اور اپنی عزت کے لٹ جانے کا بھیانک احساس پورا زور لگا کر بھی وہ اسے ایک انچ پرے نہ دھکیل سکی۔ اس کی آنکھیں گہری تاریکی میں روشنی تلاشتے جیسے پھٹ سی گئیں۔ وہ کسی بے جان شے کی طرح دیوار کے ساتھ زمین پہ گرتی چلی گئی اور شیطان کا کام آسان ہو گیا۔

آخری خیال جو اس کے دماغ میں آیا تھا کہ اریبہ گاڑی میں ہے اور اس کے بچے پرائے گھر میں اکیلے۔۔۔ اس کے مرنے کے بعد ان چاروں کا کیا بنے گا۔

اسے لگا موت بالکل اس کے پہلو میں اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی ہے اور اس گھور اندھیرے میں اسے دعوت دینے لگی ہے۔

"تم بھی تو اتنے دن عفان کے بغیر جی لیں۔ بچے بھی کسی نہ کسی طرح جی لیں گے۔ تم بس اب کچھ نہیں سوچو۔ صرف میرے بارے میں سوچو۔ اپنی موت کے بارے میں۔"

اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

☼ ☼ ☼
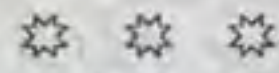
وہ اندھیرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ باہر خنک ہوا چل رہی تھی۔

سردی تو یوں بھی کچھ دنوں سے بہت بڑھ گئی تھی اور اس بار بھی اسے موسم کے بدل جانے کا احساس بہت دنوں بعد ہوا تھا۔

جب یہ سرد ہوا اس کے جسم کو کاٹنے لگی تھی۔

اس کے جسم پر کاٹن کا گھسا ہوا پنک کلر کا سوٹ تھا۔ بہت سوچنے پر بھی اسے یاد نہیں آیا تھا کہ یہ سوٹ کس نے مسترد کیا تھا اور اسے دے دیا گیا تھا۔ اسے یہ تب یاد رہتا ' جب یہ اس کے ساتھ پہلی بار ہوتا۔ اتنے سالوں میں ہمیشہ ایسے ہی تو ہوتا آیا تھا کہ اسے مسترد کی ہوئی چیزیں بڑا احسان جتلا کر دے دی جاتی تھیں۔ کئی بار تو دوسروں کی اترن بھی۔

موسم ایک بار پھر اسے دھوکا دے گیا تھا۔ وہ اپنے کپڑوں میں گرم کپڑے۔۔۔ اگر اس کے پاس کچھ تھے تو وہ ساتھ رکھنا بھول گئی تھی اور اب اس کاٹن کے گھسے ہوئے سوٹ میں اس کے دانت بجنے لگے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ آسمان جو لمحہ بہ لمحہ تاریک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آج صبح ہونے سے پہلے ضرور برسے گا اور وہ سردی کتنی تکلیف دہ ہو گی۔

کتنے دنوں تک تو کسی کو نظر ہی نہیں آئے گا کہ اس کے جسم پر کوئی گرم کپڑا نہیں ہے اور جب نظر آئے گا تو بھی بہت سے دن نظریں چرانے میں گزر جائیں گے اور پھر وہی سولہ تاریخ آجائے گی۔

ایک اور منحوس سولہ تاریخ۔

وہ ایک دم سے اٹھی اور بھاگتی ہوئی کھلے گیٹ سے باہر نکل گئی۔ سمت کا تعین کیے بغیر اندھا دھند ' وہ اندھیرے میں بھاگتی چلی جا رہی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ ایک لڑکی کا یوں اندھیرے میں ' رات کے اس حصے میں اکیلے بھاگنا اور بھاگتے چلے جانا کیسا ہے۔ مگر اس وقت وہ کچھ نہیں سوچ رہی تھی۔ صرف بھاگ رہی تھی۔

بھاگتے بھاگتے اس کے قدم بے اختیار رک گئے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

اس کا جسم زخمی نہیں تھا۔ لیکن جیسے جوڑ جوڑ میں درد ' تکلیف اور اذیت کی شدت اتر آئی تھی۔

نہ جانے کتنے گھنٹے ' کتنے منٹ ' لمحے یا شاید پوری رات گزر چکی تھی۔ اسے یوں اکڑی ہوئی دیوار کے ساتھ اکڑ کر بیٹھے۔

باہر گہرا سناٹا اور گمبھیر خاموشی تھی کہ دور کہیں کتا زور سے بھونکا اور اس کے ذرا دیر بعد کوئی گیدڑ بڑی بری طرح سے رویا تھا۔ اس کے رونے کی آوازیوں تھی جیسے کوئی نوحہ کر رہا ہو۔

بے اختیار اس نے اپنے کندھے کو چھوا۔ جہاں سے قمیص نیچے تک پھٹ چکی تھی اور دکھن کا احساس۔۔۔ اس کے منہ سے بے اختیار کراہ نکلی۔

"میرا دوپٹا۔۔۔ چادر۔۔۔ کہاں ہے؟" اس نے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ کہیں بھی کچھ نہیں تھا۔ سردی سے اس کا پورا دکھتا ہوا بدن اکڑا ہوا تھا۔ نم ماربل کے فرش سے خنکی پھوٹ رہی تھی۔

"اریبہ۔۔۔ اریبہ!" ایک دم سے اس کے ذہن میں کوندا سا لپکا۔

"اریبہ۔۔۔ میری بچی۔۔۔ کہیں وہ اسے تو ساتھ نہیں لے گیا۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں مرجاؤں گی۔ میری گڑیا۔" وہ دیوانہ وار اٹھی اور زور سے کسی چیز سے الجھ کر گر گئی تھی۔ اس کے ماتھے پر بری طرح سے چوٹ لگی۔ اس کی چادر اس کے پیروں میں الجھی تھی۔ وہ چادر یوں ہی ہاتھوں میں پکڑے اندازے سے دروازے کی طرف بڑھی۔

وہ بند کھڑکی تھی۔ وہ دیواروں کو ٹٹولتے ہوئے آنکھیں پھاڑے اندھیرے میں دروازہ ڈھونڈ رہی تھی۔

اس کا ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر پڑا۔ اس نے زور، زور سے اسے گھمایا۔ دروازہ کھل گیا۔

یخ ہوا کا جھونکا دروازہ کھلتے ہی اندر آیا تھا۔ باہر دھیمی دھیمی روشنی تھی، جو کہیں دور سے آ رہی تھی۔

گیٹ کے پاس، جو گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ تھی، جہاں اس شیطان نے گاڑی کھڑی کی تھی، وہ خالی تھی۔

وہ دھک سے کھڑی دیکھتی رہ گئی۔

"میری اریبہ۔۔۔ میری بچی۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھے اس خالی جگہ کو یک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔

"اریبہ۔۔۔ اریبہ!" اس کے منہ سے چیخوں کے ساتھ نکلا اور وہ پاگلوں کی طرح بند گیٹ کی طرف بڑھی اور دوسری بار ٹھوکر کھا کر گر گئی۔

دروازے کے آگے پلو کے پاس اریبہ اوندھی فرش پر پڑی تھی۔ وہ دھک سے رہ گئی اور اس کے پاس وہیں فرش پہ بیٹھ گئی۔

ڈرتے ڈرتے بچی کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کی دھڑکن کو محسوس کرنے لگی۔ بہت خفیف سی دھڑکن چل رہی تھی۔ وہ ابھی تک بے سدھ تھی یا بے ہوش۔ جانے اس نے کیسا نشہ آور چاکلیٹ اسے کھلایا تھا۔

اس نے بے اختیار اریبہ کو اٹھا کر اپنی چھاتی کے ساتھ بھینچ لیا۔ جیسے کوئی برف کی اکڑی ہوئی سل اس نے سینے سے لگالی ہو۔

اریبہ کا لمحہ بہ لمحہ سرد پڑتا وجود اسے ہراساں کیے دے رہا تھا۔ "مگر یہاں سے کوئی بس پتا نہیں ملتی بھی ہے یا نہیں یا کتنی دور۔۔۔ تو کیا میں اس طرح ننگے پاؤں جاؤں گی؟" وہ متذبذب کھڑی تھی۔

دور کہیں وہی گیدڑ پھر رو رہا تھا۔ عاصمہ کا دل جیسے بیٹھ سا گیا۔ اس نے گیٹ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

☼ ☼ ☼

تھکاوٹ اس کی رگ رگ میں دوڑ رہی تھی کہ اب اس سے ایک قدم بھی اٹھانا محال ہو رہا تھا۔ بس دل چاہ رہا تھا۔ یہیں سڑک پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جائے۔ کسی پتھر سے کمر ٹکا کر ہمیشہ کے لیے گہری نیند سو جائے۔

"یا اللہ تو نے آدم کی زندگی کو اتنا مشکل کیوں بنایا؟" شکوہ کرنا اس کی عادت نہیں تھا۔ مگر آج جیسے اس کا دل بھر سا آیا تھا۔

دن بھر کی لاحاصل جدوجہد۔۔۔ سینے سے لگا بے کار کاغذوں کا پلندہ۔۔۔ یہ ذرا سا بوجھ اسے اٹھا کر چلنا محال ہو رہا تھا۔

بس جی یہ ہی چاہ رہا تھا کہ ان کاغذوں کو کسی بھی گندے نالے میں پھینک دے یا جلا ڈالے۔

اسے پتا تھا، ابھی تو وہ یہ تھکن اکیلا ہی جھیل رہا ہے۔ جب گھر پہنچے گا تو اس کی منتظر آنکھوں میں بھی تھکن اتر جائے گی۔ وہ منتظر آنکھیں بن کہے اس کے دل کا سارا احوال پڑھ لیں گی۔

"آخر ایسا کب تک ہوتا رہے گا۔۔۔ کب تک؟"

قدم جیسے من من بھر کے ہو رہے تھے۔ چلنا محال اور رکنا اس سے بھی مشکل۔

گرد سے اٹے جوتوں کو دیکھتے وہ بے اختیار کسی سے ٹکرایا اور لمحہ بھر کو لڑکھڑا کر رہ گیا۔

وہ بھی کسی خوف زدہ ہرن کی طرح آنکھیں پھاڑے اس کی بانہوں کے سہارے سنبھلی، اس کے سینے سے لگی کھڑی تھی۔

اور وہ تو جیسے حیرت اور خوشی سے پتھر کا ہو کر رہ گیا تھا۔

اس قابل نفرت تھکے ہوئے دن کے اختتام پر ایسی انوکھی خوشی اسے مل سکتی ہے۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

اس کے خواب یوں مجسم ہو کر اس کے اتنے قریب بھی آسکتے ہیں۔ وہ اسے محض ایک خیال، ایک خواب ہی تو سمجھتا تھا۔ مگر۔۔۔ اس کے ریشمی بال ہوا سے سرسراتے اس کے گالوں کو چھونے لگے تھے۔ اس کی آنکھیں جیسے مخمور ہونے لگیں۔

دوسرے لمحے اسے زور کا جھٹکا لگا۔

وہ تیزی سے اسے پرے دھکا دے کر جس اندھیری سمیت سے آئی تھی، اسی میں کہیں گم ہو کر اندھیرے کا حصہ بن گئی۔

اور وہ تو جیسے وہاں سے ہلنا بھی بھول گیا کہ بت کی طرح ساکت، بے حس کھڑا تھا۔ ہلکی ہلکی سی اس کے بدن اور لباس کی باس ابھی تک اس کے کہیں آس پاس ہی تو تھی۔

اس نے آنکھیں بند کر کے اپنے ہاتھوں کو آنکھوں سے چھوا۔ اس کے ہاتھوں میں اس کا ایک ریشمی سیاہ بال رہ گیا تھا۔ اسے لگا جیسے اسے ساری دنیا کے خزانے مل گئے ہوں۔ اس بال کو دیکھتے ہوئے سرشار سا وہ کہیں اور ہی پرواز کر رہا تھا۔ اس کی تھکن ان چند خواب آگیں لمحوں نے چھین لی تھی۔

☼ ☼ ☼

ایسا تو اس کے ساتھ زندگی میں کبھی بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ راستہ بھول جائے۔ ایسا نادان بھی نہیں تھا، بے عقل بھی نہیں اور بھلکڑ تو بالکل بھی نہیں۔ اس کے حافظے کا تو یہ حال تھا کہ جس سڑک، گلی سے ایک بار گزر جاتا، دوبارہ اسے کبھی نہیں بھولتی تھی۔

اور آج عدیل اس سوسائٹی میں داخل ہوتے ہوئے جانے کیسے یہاں سے باہر نکلنے کا واپسی کا راستہ بھول گیا اور اس پر مستزاد کہ اس کے پاس سیل فون بھی نہیں تھا۔

کتنے راستے، سڑکیں، گلیاں بدلیں اور پھر سے انہیں رہ گزاروں پر آجاتا۔ جہاں سے کچھ دیر پہلے گزر گیا تھا۔ فیول انڈیکیٹر بھی خطرے کا نشان بنا ہوا تھا۔ مگر رستہ۔۔۔ وہ اب تھک بھی چکا تھا اور ذہنی طور پر کوفت کا شکار بھی۔ اس کی گاڑی کے آگے سیاہ چادر میں لپٹا کوئی خوب ابھرا ہوا وجود آن کھڑا ہوا۔ اگر وہ جمائی لیتے ہوئے بے اختیار چونک کر بریک نہ لگاتا تو شاید اب تک وہ اس وجود کو کچل بھی چکا ہوتا۔ اس نے سخت غصہ میں بریک لگائے۔

وہ کوئی عورت تھی۔ جس نے آدھے سے زیادہ جسم اپنی بڑی سی سیاہ چادر میں چھپا رکھا تھا۔ اس نے گود میں کوئی بچہ اٹھا رکھا تھا شاید۔

رات کے اس پہر۔۔۔ گیارہ بج چکے تھے۔ یہاں اس ویرانے میں تو سمجھو، رات کا تیسرا پہر لگا تھا۔ وہ ڈر سا گیا۔

"بی بی! کیا مرنے کا شوق چرا لیا ہے؟ وہ بھی اس ویرانے میں؟" وہ بظاہر سخت لہجے میں بولا۔

وہ کسی بت کی طرح خاموش تھی۔ سیاہ چادر میں اس کی آنکھیں اور کھڑی ناک کا اندازہ ہو رہا تھا۔

"ہٹیں راستے سے۔ کہیں اور جا کر خودکشی کریں۔" وہ کچھ خائف سے لہجے میں کہہ کر گاڑی اسٹارٹ کر کے جانے لگا۔

عاصمہ نے خوف زدہ نظروں سے دور تک پھیلے گھنگھور اندھیرے، سردی اور اس ویرانے کو دیکھا۔ وہ رات بھر بھی چلتی رہتی تو بھی گھر تک نہ پہنچ پاتی۔ اتنا اندازہ تو اسے ہو ہی گیا تھا۔

"پلیز... پلیز... مجھے صرف... مین روڈ تک چھوڑ دیں۔ مم... میری بچی بیمار ہے۔ اسے ڈاکٹر... اسپتال لے کر جانا ہے اور کوئی کنوینس نہیں۔ مجبوراً" مجھے... پلیز۔" وہ بے اختیار اس کی طرف کی کھڑکی میں جھانک کر گڑگڑاتے ہوئے بولی۔

"تو آپ کے گھر والے کہاں ہیں۔ جو آپ یوں اکیلی اس ویرانے میں بچی کو ساتھ لے کر نکل پڑی ہیں۔" عدیل کا دماغ ابھی بھی ففٹی ففٹی تھا اس عورت کے بارے میں... اماں کہتی ہی ایسے ویرانوں میں راتوں کو چھل پیریاں نکلا کرتی ہیں اور اس نے کون سی چھل پیری دیکھ رکھی تھی۔ یقیناً" کچھ ایسی شکل و صورت اور حلیے کی ہوتی ہو گی۔

"سوری، میں خود لیٹ ہو چکا ہوں، آپ کوئی اور... " وہ رسک نہیں لے سکتا۔ رکھائی سے کہہ کر گاڑی لے جانے لگا۔

"آپ کو خدا... خدا کا واسطہ... آپ کو اپنی ماں، بہن، بیوی اگر آپ کی کوئی بیٹی ہے تو اس کے صدقے پلیز۔ میں یہاں اکیلی ہوں، میرے شوہر کا کچھ دن پہلے انتقال ہوا ہے ورنہ... " اس کے گلے میں پھندا سا پڑ گیا۔

"تو یہاں کیا کر رہی ہیں آپ؟" وہ جھنجلا کر بولا۔

"سمجھیں میری بدنصیبی مجھے یہاں گھیر کر لے آئی۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

"کیا مطلب... آپ یہاں کسی سے ملنے آئی تھیں؟" وہ اسے بغور دیکھ کر بولا۔ ہو سکتا ہے یہ عورت کسی گینگ کی رکن ہو اور اس کے ساتھی یہیں کہیں ویرانے میں... اس نے خوب ہوشیار نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

فی الحال تو ان دونوں کے سوا وہاں اور کوئی ذی روح نہیں تھا۔

"میں آپ کو راستے میں ہی بتا دوں گی، میری بچی ٹھیک نہیں۔ اسے مجھے ڈاکٹر کو دکھانا ہے۔ پلیز... چلیں آپ مجھے مین روڈ پر اتار دیجئے گا۔ میں کوئی کنوینس لے لوں گی۔" وہ مجبوری اور بے چارگی کی انتہا پر تھی۔ ورنہ جانتی تھی۔ اس کا شولڈر بیگ جس میں چند سو روپے تھے۔ اسی منحوس گھر میں کہیں رہ گیا۔ وہ کنوینس کہاں لے سکتی تھی۔

عدیل نے لمحہ بھر کچھ سوچا اور پھر پچھلا دروازہ کھول دیا۔

وہ تیزی سے اریبہ کو گود میں سمیٹے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

اور صد شکر کہ وہاں مکمل اندھیرا تھا۔ اگر وہ اس کو ننگے پاؤں دیکھ لیتا تو یقیناً" اسے کوئی چڑیل ہی سمجھتا۔

اس نے اپنے یخ بستہ اور جگہ جگہ کانٹوں، پتھروں سے زخمی پیروں کو گاڑی کی سیٹس پر جوڑ کر رکھ لیا۔

عدیل نے گاڑی چلا دی اور دل میں دعا مانگنے لگا کہ اب اسے صحیح راستہ مل جائے۔ اتنی دیر سے تو وہ ایکڑوں پر پھیلی سوسائٹی میں بھٹک رہا تھا۔ اب بھی اگر راستہ نہ مل سکا تو یہ عورت جانے کیا سمجھے گی۔

"آپ نے بتایا نہیں، آپ یہاں کیا کرنے آئی تھیں؟" وہ اپنی کمزوری کو چھپاتے ہوئے بیک ویو مرر میں عاصمہ کو دیکھتے ہوئے بولا، جو کونے میں دبکتے ہوئے خود کو سمیٹے جا رہی تھی۔ کچھ غیر معمولی ہی تھا اس کا یوں خود کو چھپانے میں۔ عدیل کو پہلی بار کچھ عجیب سا احساس ہوا۔

"بس یہاں کسی نے گھر کا بتایا تھا کہ سستا اور اچھا مل رہا ہے۔ میں اکیلی آئی تھی۔ واپسی پر رستہ بھول گئی۔" وہ نظریں جھکائے کانپتی آواز میں بے حد آہستگی سے بولی۔ اور عدیل ایک دم سے شاکڈ سا ہو گیا۔

بالکل سامنے مین روڈ کے سائن بورڈز چمک رہے تھے۔

اس نے خدا کا شکر ادا کرنے کے ساتھ دل میں اس عورت کا بھی شکریہ ادا کیا۔ شاید اس کی مدد کرنے کی وجہ سے اسے کھویا ہوا رستہ مل گیا تھا۔ وہ عورت اب بچی کے اوپر چہرہ جھکائے بے حس بیٹھی تھی۔

"آپ کی بچی کو کیا ہوا ہے؟" اسے خیال آیا تو پوچھ بیٹھا۔

"بہت گہری نیند میں ہے۔ میرے ہلانے پر بھی نہیں اٹھ رہی۔" وہ رندھے گلے سے بولی تو عدیل کو اندازہ ہوا وہ رو رہی تھی۔

عدیل الجھن بھری نظروں سے دیکھنے لگا کہ آخر اس عورت کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔

"یہاں قریب ہی میں ایک ڈاکٹر کا کلینک ہے۔ شاید کھلا ہو، اگر آپ کہتی ہیں تو پہلے یہیں چیک کرا لیتے ہیں بچی کو۔" وہ ہمدردی سے بولا۔ دل میں ہی احساس تشکر تھا کہ اس عورت کی وجہ سے ہی وہ اس سوسائٹی سے باہر تو نکل سکا۔

"نہیں شکریہ... میرے خیال میں یہ یوں ہی سو رہی ہے اور کوئی وجہ نہیں۔ گھر جا کر اٹھاؤں گی تو اٹھ جائے گی۔ آپ پلیز مجھے کسی اسٹاپ پر اتار دیں، آپ کی اتنی مدد کا بہت شکریہ۔"

سڑکوں پر اکا دکا دوڑتی گاڑیوں اور لوگوں کو دیکھ کر اسے کچھ اطمینان سا ہوا تھا کہ وہ اب گھر پہنچ سکتی ہے۔

"کوئی بات نہیں، میں آپ کو آپ کے گھر ڈراپ کر دیتا ہوں۔ آپ مجھے ایڈریس سمجھا دیں۔" وہ مروت سے بولا۔

"آپ کو تکلیف ہو گی۔ میں یہاں سے کوئی رکشا لے لوں گی۔" وہ بار بار اپنے چہرے کو چھپا رہی تھی۔

"ایسا کچھ نہیں، اس وقت آپ کو معلوم نہیں کوئی رکشا وغیرہ ملتا ہے یا نہیں، میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔" وہ اصرار سے بولا تو عاصمہ چپ کر گئی۔

وہ بار بار غیر ارادی طور پر اپنے کندھے کو چادر سے ڈھانپتے ہوئے چھو چھو کر دیکھتی تھی۔ عدیل اسے دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ وہ راستے میں اسے ایڈریس سمجھاتی رہی۔

اس کے گھر کے آگے اس نے گاڑی روکی تو وہ اسی طرح بچی کو گود میں سمیٹتے ہوئے گاڑی سے اتر گئی۔

"آپ کا بہت شکریہ۔ آپ کا یہ احسان... میں اس کا بدل نہیں دے سکتی۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ اللہ حافظ۔" کہہ کر وہ عدیل کی طرف دیکھے بغیر چھوٹے سے دروازے کے پہلو میں لگی ڈور بیل دبا کر منہ دروازے کی طرف کر کے ہی کھڑی رہی۔

عدیل دروازہ کھلنے کے انتظار میں کھڑا رہا اور گاڑی ریورس کرتے ہوئے وہ بے اختیار چونک کر رہ گیا۔

وہ عورت ننگے پاؤں تھی۔ اس کی قمیص کا پچھلا دامن ایک طرف سے پھٹ کر نیچے لٹک رہا تھا۔

وہ کھڑا دیکھتا رہ گیا۔

دروازہ کھل گیا تھا۔ ایک بارہ، تیرہ سال کا لڑکا دروازے میں کھڑا تھا۔ دوسرے لمحے وہ اس عورت سے چمٹ گیا اور وہ اسے ساتھ لگائے اندر دھکیلتے ہوئے گیٹ بند کر کے اندر چلی گئی۔

عدیل کتنی دیر وہیں کھڑا رہا۔

"یقیناً" اس عورت کے ساتھ کوئی بہت ناخوشگوار واقعہ ہوا ہے۔ بہت برا اور بدترین۔"

وہ چاہتے ہوئے بھی وہ کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا جو اس کا دل اسے سمجھا رہا تھا۔

وہ سوسائٹی کتنی ویران ہے اور رات کے اس پہر اس عورت کا یوں اکیلے ' ننگے پاؤں ' پھٹے کپڑوں کے ساتھ میرے خدایا... بے چاری دیکھنے میں اچھے گھر کی لگتی تھی اور وہ کہہ رہی تھی کہ اس کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے وہاں کوئی گھر دیکھنے گئی تھی۔ یقیناً" کسی نے گھر کا جھانسا دے کر اس غریب کو لوٹ لیا ہے۔ لمحہ بھر میں پوری کہانی اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔
مگر پھر بھی وہ یہ سب کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ جانے کس درندے نے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا ہو گا۔ خدا اسے غارت کرے۔ وہ افسردہ سا گاڑی تیز رفتاری سے لے گیا۔

☼ ☼ ☼

"مما پلیز... نکل بھی آئیں اتنی شدید سردی میں آپ کیوں نہائے جا رہی ہیں۔ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔ بیمار ہو جائیں گی آپ۔" واثق وقفے وقفے سے باتھ روم کے دروازے پر آ کر پریشان آواز میں ماں کو پکارے جا رہا تھا اور عاصمہ جیسے کچھ بھی نہیں سن رہی تھی۔
وہ یخ پانی کے شاور کے نیچے کپڑوں سمیت بھیگتے ہوئے منہ کے آگے ہاتھ رکھے اپنی چیخوں کو روکتے ہوئے روئے جا رہی تھی۔
ایک ہی کریہہ منظر بار بار اس کی نظروں کے سامنے آئے جا رہا تھا اور زور زور سے اپنا چہرہ ' ہاتھ ' بازو رگڑنے لگتی اور پھر جیسے بے بس سی ہو کر اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔
اس کی بیوگی کو عدت میں ہی داغ لگ گیا تھا اور یہ سب کچھ اس کی نادانی کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ خود کو کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ اگر اس کے بچوں کو پتا چل جائے۔ اگر غلیظ انسان اسے بلیک میل کرنے لگے تو اس کے پاس کیا بچے گا۔
خود کو چھپانے ' اوڑھنے کے لیے بیوگی کی چادر بھی نہیں۔ ابھی تو اس کے شوہر کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا کہ اس نے اس کی ناموس کو کیچڑ میں ملا دیا۔ گھر کی ہوس میں اس نے عدت کے دوران گھر کی دہلیز سے نکلتے ہوئے کچھ بھی نہیں سوچا... کچھ بھی نہیں۔
وہ خود کو معاف نہیں کر سکتی۔ اسے اس گندے وجود کے ساتھ زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اس پر صاف ستھری زندگی کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ اسے مر جانا چاہیے... مر جانا چاہیے۔
وہ ٹھنڈے گیلے فرش پر شاور کے نیچے بیٹھ گئی اور خود کو ختم کرنے کے طریقے سوچنے لگی۔

☼ ☼ ☼

عدیل شاکڈ سا اسپتال کے سفید بستر پر بہت سی مشینوں اور نالیوں کے ساتھ جکڑی ماں کو دیکھتا جا رہا تھا۔
فوزیہ کی طلاق اس کے لیے دوسرا بڑا دھچکا تھا مگر ماں کی یہ حالت جس کی وجہ سے ہوئی کاش وہ اتنا مہذب ' اتنا سلجھا ہوا ' پڑھا لکھا تحمل برداشت والا بزدل انسان نہ ہوتا تو ابھی جا کر اس ظہیر اور اس کی دکان وار ماں کے سینے میں پستول کی ساری گولیاں اتار دیتا۔
لوگ اتنے بے رحم بھی ہو سکتے ہیں ' اسے آج سے پہلے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا۔
لیکن نہیں ایک بے رحمی کا بہت بھیانک منظر تو ابھی وہ دیکھ کر آ رہا تھا۔ جو ظلم اس عورت کے ساتھ ہوا وہ بھی تو کم نہیں تھا اور جو عدیل کی ماں بہن کے ساتھ ہوا۔
اس نے بشریٰ کو گھر بھیج دیا تھا مگر خود اسے چین نہیں آیا تھا۔ فوزیہ کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے

اسے نیند آور انجکشن لگایا تھا مگر جب وہ جاگے گی ۔۔۔ اسے سنبھلنے میں اپنا قصور سمجھنے میں کتنے دن لگیں گے۔

"اور امی کو میں کیسے سنبھالوں گا۔ میری ساری کوششیں بے کار گئیں۔" وہ تھکا ہوا وہیں آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔

اگلے روز وہ تیز بخار میں پھنک رہی تھی۔

چاروں بچے اس کے ارد گرد پریشان صورتیں لیے بیٹھے تھے اور وہ ان کی موجودگی کے خیال سے آنکھوں پر بازو رکھے بدن کی ٹیسوں کو دبائے ہوئے تھی۔

وہ آج انہیں اسکول بھی نہیں بھیج سکی تھی۔ اریبہ صبح اٹھی تو بہت ست اور نڈھال سی تھی۔ اسے ہلکا ہلکا ٹمپریچر بھی تھا۔ وہ تو خود سے بھی نظریں نہیں ملا رہی تھی۔

"نہیں ۔۔۔ اسے اب زندہ نہیں رہنا۔ باپ کے بغیر بھی تو یہ رہ رہے ہیں نا میرے بغیر بھی رہ لیں گے۔" وہ دل میں پکا ارادہ کر رہی تھی۔

"مما! وردہ روئے جا رہی ہے۔ اس نے فیڈر بھی نہیں پیا۔ کچھ کھایا بھی نہیں۔ بتائیں میں اسے کیسے چپ کرواؤں۔" واثق روتی وردہ کو خاموش کرانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہا تھا۔ عاجز سا آ کر بولا۔

"اسے دوسرے کمرے میں لے جا کر سلا دو' وہاں نیند کا سیرپ پڑا ہے' وہ ایک چمچ دے دو اسے' سو جائے گی۔" وہ اسی طرح آنکھوں پر ہاتھ رکھے سرد بے نیاز لہجے میں بولی۔

"مما! یہ صبح سے بھوکی ہے۔ نیند کے سیرپ سے اس کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔" واثق پریشانی سے بولا۔

"مر تو نہیں جائے گی نا ۔۔۔ یا تم مر جاؤ گے اس کو سنبھالتے ہوئے۔ نہیں سنبھلتی تو مجھے کہیں سے زہر لا دو' میں کھا کر سو رہوں۔ خود تو اپنی جان چھڑا کر قبر میں جا سوئے' سب مصیبتیں میرے لیے چھوڑ گئے۔ سیکھو اکیلا رہنا میرے بغیر بھی ۔۔۔ میں بھی ہمیشہ تم لوگوں کا ساتھ نہیں رہوں گی۔" وہ پتا نہیں کیسے اپنا ضبط کھو بیٹھی اور غصے میں بھری بولتی چلی گئی۔

"اگر مما واقعی ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں تو میں ان تینوں کو اور خود کو کیسے سنبھالوں گا۔" واثق ایک دم سے ڈر سا گیا۔

"مما! میں ڈاکٹر کو بلا کر لے آؤں۔ آپ کی طبیعت اچھی نہیں۔ وہ چیک کر لے گا۔" وہ ڈرے ہوئے انداز میں بولا۔

"خراب بھی ہو جائے گی تو بھی اتنی جلدی مرنے والی نہیں۔ بہت سخت جاں ہوں میں ۔۔۔ بے فکر ہو جاؤ۔ موت مجھ پر مہربان نہیں ہو گی۔" وہ سخت اذیت پسند ہو رہی تھی۔

"اور خدا کے لیے اس وردہ کو لے جاؤ یہاں سے ورنہ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔" وردہ کے مسلسل رونے پر وہ زور سے بولی تو واثق اور اریشہ جلدی سے وردہ کو لے کر باہر نکل گئے۔

اریبہ سہمی ہوئی نظروں سے ماں کو دیکھنے لگی۔ عاصمہ نے پھر آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

اگر اریبہ ہوش میں ہوتی اور سب کچھ دیکھا ہوتا اس نے تو شاید میرے لیے مرنے کا فیصلہ کرنا اور بھی آسان ہو جاتا۔

"کیا کروں' کیسے مروں؟ ان چاروں کو کس کے حوالے کر کے جاؤں۔" گرم گرم آنسو اس کی آنکھوں سے پھسلنے لگے۔

وردہ کے رونے کی آواز بند ہو گئی تھی۔ شاید واثق اسے باہر لے گیا تھا۔ وہ صبح سے بھوکی تھی۔ رو کر احتجاج کر رہی تھی اور یہ تینوں بھی تو بھوکے ہیں۔ تھوڑے سمجھ دار ہیں۔ اس لیے وردہ کی طرح رو نہیں رہے۔

"میرے اللہ میں کیا کروں۔"

اس کے آنسو اور بھی شدت سے بہنے لگے۔

☼ ☼ ☼

"بے شک میری بیٹی کی قسمت میں یہی لکھا تھا کہ وہ گھر بیٹھے طلاق کا داغ ماتھے پر لگا لے لیکن میں سمجھتی ہوں اس میں ہمارے شریکوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔" نسیم بیگم ابھی مکمل طور پر روبہ صحت نہیں ہوئی تھیں۔ ذکیہ' بشریٰ' عمران' عدیل' ان کے پاس ہی اسپتال میں بیٹھے تھے جب تکیوں سے ٹیک لگائے ہوئے وہ نقاہت زدہ لہجے میں بولے۔

"پلیز امی! بھول جائیں۔ وہ لوگ میری بہن کے لائق ہی نہیں تھے۔ وہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا ذکر بھی کیا جائے۔" عدیل نے ماں کو سمجھانا چاہا۔

"تم بھول سکتے ہو۔ فوزیہ تمہارے جگر کا ٹکڑا نہیں۔ میں نہیں بھول سکتی' نہ معاف کر سکتی ہوں۔ جن کی وجہ سے میری معصوم بے گناہ بچی کو یہ کالا دن دیکھنا پڑا۔" نسیم بیگم کے لہجے میں پہلے والی سختی در آئی تھی۔

"امی! ڈاکٹر نے آپ کو بہت بولنے اور ٹینشن لینے سے منع کیا ہے پلیز! ابھی کچھ نہیں سوچیں۔" بشریٰ نرمی سے ان کے بال سہلا کر بولی۔

"ہاں تم تو یہ کہو گی تمہارا زیور سمجھو واپس آ گیا۔ دو چار ہفتوں میں ہی یہ عدیل تمہیں نیا زیور بنا دے گا۔ سب کے نقصان پورے ہو جائیں گے بس ایک میری فوزیہ کا نقصان۔" وہ رندھے گلے سے بولیں۔

"امی پلیز ۔۔۔" عدیل نے ماں کو دلاسا دینا چاہا۔

"مگر میں ان لوگوں کو معاف نہیں کروں گی جن کی وجہ سے میری بچی پر یہ داغ لگا۔" وہ سیدھا ذکیہ اور عمران کی طرف دیکھتے ہوئے بے لچک لہجے میں بولیں۔

"بہن! کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ اللہ نے اس میں بھی فوزیہ بیٹی کے لیے کوئی بہتری رکھی ہو گی۔" اب ذکیہ کو کچھ تو بولنا تھا۔

"طلاق میں بہتری ۔۔۔" وہ جیسے تمسخر سے بولیں۔ "پھر تو خدانخواستہ تمہاری بیٹی کو طلاق ہو جائے تو اس میں بھی اللہ کی کوئی بہتری ہو گی کیوں اب کیا کہو گی۔"

اور ذکیہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اتنا سیدھا وار کریں گی' وہ سرخ چہرے کے ساتھ سمدھن کو دیکھ کر رہ گئیں۔

عدیل اور بشریٰ نے بھی ناگواری سے ان کی طرف دیکھا۔

عاصمہ پتھرائی ہوئی نظروں سے سامنے بیٹھی حمیدہ کو دیکھتی رہ گئی۔

"ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے عاصمہ کہ تم ایسی نکلو گی۔ اور تم خدانخواستہ اس دنیا میں پہلی بیوہ تو نہیں ہوئی ہو یہ قیامت تو ہر چوتھے پانچویں گھر میں ٹوٹتی ہے۔ جوان کل کی بیاہی شوہروں کے کفن کی لاج سمیٹے عمریں گزار دیتی ہیں اور تم نے چند دنوں میں ان عزت دار شریف لوگوں کی عزت کی کیسی دھجیاں اڑا دیں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم ایسا گندہ دھندہ کرنے لگو گی۔ ایک کی گاڑی میں جاؤ گی' دوسرے کی گاڑی میں آدھی رات کے بعد واپس آؤ گی۔" وہ پتھر کا بت بنی دیکھتی رہ گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ناولٹ

مہوش افتخار

تیری دسترس میں درماں

بقعہ نور بنے لان میں یک لخت موت کا سا سناٹا چھا گیا تھا۔ ہنستے بولتے مہمانوں سمیت اسٹیج پر موجود کرنل منیر اور ان کی فیملی کو جیسے کسی نے جادو کی چھڑی گھما کے اپنی جگہ پہ ساکت کر دیا تھا۔ سب ہی کی نظریں بلیک سوٹ میں ملبوس نووارد پہ جمی تھیں۔ جو سب پہ طلسم پھونک کر بڑے اعتماد سے سر اٹھائے کھڑا تھا۔ اس کا انداز اور اس کے لہجے کی مضبوطی تمام حاضرین محفل کو یہ بات سوچنے پہ مجبور کر گئی تھی کہ اگر وہ سچ بول رہا تھا تو پھر سامنے اسٹیج پہ کیا ہو رہا تھا؟

"کون ہو تم؟ اور تمہاری جرأت کیسی ہوئی یہ سب بکواس کرنے کی؟"

کرنل صاحب جیسے ہڑبڑا کے ہوش میں آئے تھے تیز قدموں سے اسٹیج کی سیڑھیاں عبور کرتے وہ اگلے ہی پل اجنبی کے مقابل آکھڑے ہوئے تو اس کے خوبصورت لبوں پہ ایک استہزائیہ مسکراہٹ در آئی۔

"یہ دونوں سوال اگر آپ مجھ سے پوچھنے کے بجائے اپنی بھانجی سے پوچھیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔" اس نے ایک گہری نظر اسٹیج پر سجی بنی لیکن پتھرائی ہوئی اجیہ پہ ڈالی تو اس کی پریشان آنکھوں میں بے قراری پھیل گئی۔

"مم۔ مجھ سے کیوں پوچھیں۔ میں تو تمہیں جانتی تک نہیں۔" متوحش نظروں سے سامنے کھڑے اجنبی کو تکتے ہوئے اس کا رنگ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔ جبکہ زبان بے اختیار لڑکھڑا گئی تھی۔ اس کی منگنی کی تقریب میں یہ شخص کیوں اور کس لیے اس سے شناسائی کا دعوا کر رہا تھا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

"بہت ہوگئی بکواس۔" اجیہ کے پہلو میں کھڑا دانش غراتے ہوئے جارحانہ انداز میں نیچے کو لپکا تو انجم منیر کے ساتھ ساتھ اسٹیج پہ موجود باقی افراد خانہ میں بھی ہلچل مچ گئی۔ جبکہ اجیہ... مارے خوف کے اپنے کپکپاتے لبوں پہ سختی سے ہاتھ رکھ لیا۔

"نو باسٹرڈ! تم نے کیا ہمیں جاہل سمجھ رکھا ہے کہ تم جو کچھ بھی کہو گے، ہم اس پہ آنکھ بند کر کے یقین کر لیں گے؟" اس نے تیزی سے آگے بڑھ کے بہنی

کا کالر پکڑ لیا تو ارد گرد موجود مہمان خواتین کی دبی دبی سی چیخیں نکل گئیں۔
"کنٹرول یور سیلف دانش! چھوڑو اسے۔" منیر صاحب نے سرعت سے آگے بڑھ کے بیٹے کو بازو سے پکڑنا چاہا تو وہ ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا گیا۔
"آپ چھوڑیں پاپا! ایسے بلیک میلرز سے نپٹنا مجھے اچھی طرح آتا ہے۔" وہ مقابل کے سپاٹ چہرے پہ نگاہیں جمائے غصے سے دھاڑا تو اجنبی کی سیاہ آنکھوں میں عجیب سی سرد مہری پھیل گئی۔ اگلے ہی پل اس کے مضبوط ہاتھ دانش کے ہاتھوں پہ آٹھہرے۔
"زبان اور ہاتھوں کو لگام دو دانش منیر!" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ دھیمے لیکن انتہائی سرد لہجے میں بولا تو اس کی نظروں اور لہجے کی ٹھنڈک اور ہاتھوں کی مضبوطی نے نجانے کیوں دانش کی گرفت کو کمزور کر دیا۔ جسے محسوس کرتے ہوئے اس نے دانش کے ہاتھ اپنے گریبان سے جھٹک ڈالے۔
"بلیک میلنگ میرا نہیں، تمہارا خاندانی وطیرہ ہے۔ میں جو کرتا ہوں ٹھوس بنیادوں پر کرتا ہوں۔" اس کے چہرے پر نظریں گاڑے وہ آتشیں لہجے میں بولا تو اسٹیج پہ کھڑی اجیہ کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی سیڑھیاں اتر کے دانش کے برابر اور اس اجنبی کے مقابل آکھڑی ہوئی۔ اس کی بے باک نظریں بنا کسی جھجک کے اجیہ کے خوبصورت سراپے پہ آن ٹھہریں۔ جو بغیر آستین کی گولڈن میکسی میں بے حد حسین لگ رہی تھی۔
"اچھا! تو پھر کیا ثبوت ہے تمہارے پاس اس بات کا کہ میں تمہیں جانتی ہوں؟" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ تیز لہجے میں بولی تو اجنبی کے لبوں پہ طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔
"میں جانتا تھا اجیہ ڈیر! کہ مجھے دیکھ کر تمہاری یادداشت کھو جائے گی، اس لیے میں "احتیاط" اپنے ساتھ یہ لے آیا تھا۔"
اس نے یک لخت ہاتھ بڑھا کر کوٹ کی اندرونی جیب میں سے طے شدہ کاغذ نکال کر لہرایا۔ "ہمارا نکاح نامہ۔" اس نے مسکراتے ہوئے اجیہ کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں مارے حیرت کے حلقوں سے ابل پڑی تھیں۔ جبکہ باقی ساری محفل کو یک لخت سانپ سونگھ گیا تھا۔ دانش نے جھپٹ کر ان کاغذوں کو نظروں کے سامنے کیا تو دہشت زدہ سی اجیہ چلا اٹھی۔
"نک۔۔۔ کون سا نکاح؟ کیسا نکاح نامہ؟" وہ زرد چہرہ لیے منیر صاحب کی جانب لپکی۔ "ماموں جانے گاڈ! میں نے آج سے پہلے اس شخص کو کبھی دیکھا تک نہیں۔ یہ۔۔۔ یہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ میں بالکل نہیں جانتی۔ آپ ابھی اسی وقت پولیس کو کال۔۔۔"
"شٹ اپ!" دانش کی اچانک دھاڑ پہ اجیہ کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔۔۔ وہ بے یقین سی اس کی جانب پلٹی۔
"جھوٹی، مکار لڑکی! مہینے سے اس شخص سے نکاح رچا کے بیٹھی ہو اور کہتی ہو کہ تم اسے جانتی تک نہیں؟ اور اگر ایسا نہیں تو یہ دستخط کیا تمہارے فرشتوں نے کیے ہیں؟" دانش نے ہاتھ میں پکڑے کاغذ اس کے منہ پر مارے تو بے یقین کھڑی اجیہ نے بے قراری سے انہیں تھام لیا۔
اس کے پاس کھڑے منیر صاحب اور ان کی فیملی دانش کی بات پہ جیسے ساکت ہو گئے تھے۔ جوں جوں اجیہ کی نظریں تحریر سے پھسلتی گئیں توں توں اس کے چہرے کا رنگ بدلتا گیا، اور اپنے دستخط پہ آکر تو اس کی حالت کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والی ہو گئی۔
"یہ۔۔۔ یہ میں نے نہیں کیے۔" وہ سرسراتے لہجے میں بولی تو اجنبی کا بھرپور قہقہہ دانش کو لب بھینچنے پہ مجبور کر گیا۔
"نہیں۔ میں سچ کہہ رہی ہوں ماموں! یہ سائن میں نے نہیں کیے۔" اجیہ روتے ہوئے کسی ماہی بے آب کی طرح تڑپ کے منیر صاحب کی جانب لپکی تو انہوں نے ایک نظر اس کے ہاتھ میں تھمے کاغذوں پر ڈالی اور پھر شعلے برساتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
"بہت ہو گیا ڈراما اجیہ! اب بکواس بند کرو۔" وہ

دھیمے لیکن انتہائی سرد لہجے میں غرائے تو روتی ہوئی اجیہ جھنجلا اٹھی۔
"آپ لوگ میرا یقین کیوں۔۔۔" اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتی۔ دانش نے آگے بڑھتے ہوئے بے رحمی سے اس کا بازو دبوچ لیا۔
"یقین؟ کس یقین کی بات کر رہی ہو تم؟ تم نے جس طرح میرے جذبات کا مذاق اڑایا ہے۔ جس طرح میرا تماشا بنایا ہے، اس کے بعد میں تمہاری شکل تو دور تمہاری آواز تک نہیں سننا چاہتا۔"
غضب ناک نظروں سے اسے گھورتے ہوئے اس نے پوری طاقت سے اسے قدرے فاصلے پہ کھڑے اجنبی کی جانب دھکیل دیا تو اجیہ کسی بے جان گڑیا کی طرح اس کے سینے سے جا ٹکرائی۔
سرعت سے خود کو سنبھالتے ہوئے اجیہ نے تڑپ کے اس سے الگ ہونا چاہا تو اس نے حظ اٹھاتی نظروں سے اس کے بھیگے چہرے کو تکتے ہوئے اپنے بازو کے مضبوط حصار میں لے لیا۔
"چھوڑو! چھوڑو مجھے ذلیل آدمی!" خود کو چھڑانے کی کوشش میں وہ با آواز بلند چلائی تو مقابل کے لبوں پہ اک استہزائیہ مسکراہٹ در آئی۔
"ہونہہ! رسی جل گئی مگر بل نہیں گیا۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے اجیہ کے ہاتھ میں بھینچا ہوا نکاح نامہ پکڑ لیا۔ "دیکھو لو ڈیر وائف! جس کی خاطر تم نے مجھے دھوکا دیا اس نے کتنے آرام سے تمہیں ڈس اون کر دیا۔"
"مجھے کسی نے ڈس اون نہیں کیا۔ دانش! ماموں! پلیز۔ پلیز! مجھے اس دھوکے باز آدمی سے چھڑائیں۔"
شعلے برساتی نظروں سے اس کے چہرے کو تکتے ہوئے، اس نے بری طرح مچلتے ہوئے ان دونوں سے استدعا کی تو منیر صاحب کا ضبط جواب دے گیا۔ بھری محفل میں اس لڑکی کی وجہ سے جس طرح ان کی عزت کا جنازہ نکلا تھا، اس نے انہیں سر اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔
"بکواس بند کرو اپنی اور نکل جاؤ یہاں سے۔ تم نے ہمارے ساتھ یہ گندا کھیل کیوں کھیلا میں نہیں جانتا۔ لیکن اب کم از کم تمہارے ساتھ ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔ آج سے تم ہمارے لیے مر گئیں۔ تمہارے اس کارنامے کی خبر تمہاری ماں کو بھی دے دی جائے گی۔۔۔ اب دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"
وہ حلق کے بل چلائے تو روتی تڑپتی اجیہ مارے بے یقینی کے ساکت ہو گئی۔
"اب چلنا ہے مائی لویا اور ڈراما کرنا ہے؟" اس کے کان کے قریب جھکتے ہوئے وہ طنزیہ لہجے میں بولا تو پتھرائی ہوئی اجیہ کے بے جان وجود میں جیسے نئی جان پڑ گئی۔
"میں مر جاؤں گی مگر تمہارے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گی۔۔۔ مجھے چھوڑو ذلیل آدمی!"
وہ اس کے گریبان کو نوچتے کھسوٹتے ہوئے چیخی تو وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے لب بھینچ گیا۔ اگلے ہی پل اس نے برق رفتاری سے اس کی کلائی جکڑتے ہوئے ایک جھٹکے سے باہر کی جانب قدم بڑھائے تو اجیہ کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔
"نہیں! میں۔۔۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ مجھے بچاؤ۔ فار گاڈ سیک مجھے بچاؤ دانش! پلیز مجھے بچاؤ۔"
اس کے پیچھے گھسٹتے ہوئے اس نے دیوانہ وار روتے ہوئے دانش کو مدد کے لیے پکارا تھا مگر ان میں سے کسی نے بھی اس کی جانب ایک قدم نہیں بڑھایا۔ یہاں تک کہ وہ روتی پیٹتی، دہائیاں دیتی ان سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

برلن کی فضاؤں میں شام اتر آئی تھی۔ بازغہ خلیل چائے کا کپ لیے اپنے دھیان میں گلاس وال سے باہر نظر آتے وسیع اور خوبصورت لان پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھیں۔ ان کا ذہن آج صبح سے پاکستان میں اٹکا ہوا تھا۔ جہاں آج ان کی بڑی بیٹی اجیہ کی منگنی کی تقریب تھی۔ گو کہ وہ صبح سے وقتاً فوقتاً فون پہ اس سے رابطے میں تھیں، مگر پھر بھی ان کی خواہش تھی کہ

وہ اس اہم موقع پہ اس کے پاس ہوتیں۔ لیکن بھلا ہو اجیہ اور دانش کا جنہوں نے اتنی اچانک ایک دوسرے سے رشتہ جوڑنے کا فیصلہ کیا تھا کہ وہ چاہ کر بھی اپنی مصروفیات ترک نہ کر سکی تھیں۔

اس کی اس جلد بازی پہ خلیل جہانگیر نے ہمیشہ کی طرح انہیں اس کی خود سری کا طعنہ دیا تھا جس میں ان کی دونوں چھوٹی بیٹیاں بھی شامل تھیں۔ مگر اس کے باوجود وہ اندر سے اجیہ کے اس فیصلے پہ خاصی مطمئن تھیں اور نہیں چاہتی تھیں کہ اجیہ یا دانش میں سے کوئی بھی اپنے ارادے کو بدلے اسی لیے انہوں نے اپنے بھائی کو بنا کسی تاخیر کے بچوں کی خواہش پوری کرنے کے لیے کہا تھا۔ لیکن اب ان کا دل رہ رہ کر دونوں کو دیکھنے کے لیے مچل رہا تھا۔

بے اختیار ان کی نگاہیں گھڑی کی جانب اٹھی تھیں، جہاں شام کے سوا چھ بج رہے تھے۔ یعنی پاکستان میں اس وقت رات کے سوا دس کا ٹائم تھا۔ اور فنکشن یقیناً" اپنے عروج پہ تھا، جب ہی کسی نے کافی دیر سے انہیں کال نہیں کی تھی، ورنہ تو پل پل کی خبر انہیں پہنچائی جا رہی تھی۔

رسم کے متعلق سوچتے ہوئے انہوں نے خود کال کرنے کی نیت سے موبائل اٹھایا ہی تھا کہ اسکرین پہ منیر صاحب کا نام جگمگا اٹھا تھا۔ مسکراتے لبوں سے انہوں نے سرعت سے فون کان سے لگایا۔ لیکن دوسری طرف منیر صاحب کو غصے سے چلاتا سن کے ان کی دھڑکن یک لخت تیز ہو گئی تھی۔

"ہیلو! ہیلو بھائی! خیر تو ہے؟ آپ۔۔۔ آپ اتنے غصے میں کیوں ہیں؟" انہوں نے پریشانی سے کہتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا کپ سینٹر ٹیبل پہ رکھ دیا۔

"کیوں، تمہیں سنائی نہیں دے رہا یا میں فارسی بول رہا ہوں؟" وہ بنا کسی لحاظ کے دھاڑے تو انجم بیگم نے آگے بڑھ کر شوہر کے ہاتھ سے فون لے لیا۔

"سنو بازغہ! تمہاری بیٹی پورے شہر کے سامنے ہمارے منہ پہ کالک تھوپ کے اپنے شوہر کے ساتھ چلی گئی ہے۔"

"ش ش۔۔۔ شوہر؟ کون سا شوہر؟" اس عجیب غریب بات پہ بازغہ خلیل کا منہ اور آنکھیں دونوں کھل گئیں۔ "یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟"

"انجان مت بنو۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ تمہیں اپنی بیٹی کے نکاح کی خبر نہ ہو؟" انجم ان کی بات پہ چمک کر بولیں تو اس الزام پہ وہ تڑپ اٹھیں۔

"خدا گواہ ہے بھابھی! مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں۔۔۔ اور ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو سب ٹھیک تھا۔ یہ۔ یہ اچانک۔۔۔" وہ متوحش سی سسک اٹھیں۔

"پلیز بھابھی! مجھے ساری بات بتائیں۔ نہیں تو میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔" وہ اپنی فطرت کے برعکس التجائیہ لہجے میں بولیں تو انجم کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"چلو جی، محترمہ نے ماں کو بھی بتانے کی زحمت نہیں کی۔" انہوں نے باآواز بلند دوسری طرف سنایا تو بازغہ مارے اذیت کے لب بھینچ کر رہ گئیں۔ "ارے تمہاری بیٹی یہاں مہینے بھر سے نکاح رچا کے بیٹھی ہوئی تھی اور۔۔۔" اس کے بعد انہوں نے من و عن پوری بات ان کے گوش گزار کر ڈالی تو ان کا دماغ جیسے سن ہو گیا۔

"کون۔ کون ہے وہ؟" انہوں نے پھنسی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"ہمیں کیا پتا کون ہے وہ۔۔۔ ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ جو کچھ تمہاری بیٹی نے ہمارے ساتھ اور ہمارے بچے کے ساتھ کیا، اس کے بعد وہ بے غیرت لڑکی ہمارے لیے ہمیشہ کے لیے مر گئی۔ آج کے بعد ہمارا تم سے یا تمہاری بیٹی سے کوئی تعلق نہیں۔"

"وہ میرے لیے بھی مر گئی۔" انہوں نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا تو انجم بیگم کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"یہ تم کہہ رہی ہو؟ حیرت ہے۔ حالانکہ تمہارے لیے یہ سب بڑی عام سی بات ہے۔" انہوں نے استہزائیہ لہجے میں کہا تو بازغہ خلیل کو یوں لگا جیسے کسی

نے ان کو پتھر کھینچ کر مارا ہو۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اتنی بڑی بات کہنے والے کا دماغ ٹھکانے لگا دیتیں، مگر فی الوقت تو انہیں ان کی اولاد نے کچھ کہنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

بے اختیار انہوں نے فون کان سے ہٹاتے ہوئے لائن کاٹ ڈالی تھی۔

"اجیہ! میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔۔۔ کبھی نہیں!" دونوں ہاتھوں پہ سر گرائے وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ شخص ارد گرد سے بے نیاز اسے کھینچتا ہوا پارکنگ لاٹ میں لایا تھا۔ جہاں پہلے سے اسٹارٹ کھڑی سیاہ شیشوں والی گاڑی کا دروازہ کھول کے اس نے ایک جھٹکے سے اسے اندر پھینکا تھا اور اس کے سنبھلنے سے پہلے دروازہ بند کر دیا تھا۔

دروازے کے بند ہوتے ہی ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے شخص نے آٹومیٹک لاک لگاتے ہوئے سرعت سے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔ تب ہی روتی ہوئی اجیہ تڑپ کے سیدھی ہوئی تھی لیکن جونہی اس کی نظر اپنے برابر بیٹھے ایک اور آدمی سے ٹکرائی تھی، وہ مارے خوف کے کانپ اٹھی۔

"بی بی! آواز نکالنے کی غلطی مت کرنا۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی پستول اجیہ کی طرف کرتے ہوئے انتہائی سرد لہجے میں کہا تو اس کا چہرہ خطرناک حد تک سفید پڑ گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے اور وہ لہرا کے ایک طرف کو گرتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

شاہی فریش ہو کے ڈائننگ ٹیبل پر آیا تو ثانیہ گرما گرم بریانی کی ڈش اٹھائے اس کے پیچھے چلی آئی۔

"بابا نے کھانا کھایا؟" اس نے کرسی کھینچتے ہوئے پوچھا۔

"بس برائے نام ہی کھایا۔" وہ بوجھل لہجے میں بولی تو وہ اک گہری سانس لیتے ہوئے اپنے لیے پلیٹ میں چاول نکالنے لگا۔ تھوڑے سے چاول ڈال کر اس نے ڈش واپس رکھ دی، ثانیہ نے کباب کی پلیٹ اٹھا کر بھائی کی جانب بڑھائی۔ مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا تو وہ خفگی سے بھائی کو دیکھنے لگی۔

"کھانا تو ڈھنگ سے کھائیں۔ پہلے ہی اتنی دیر سے آئے ہیں آپ۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ واپس رکھ دی۔

"بابا بتا رہے تھے کہ آپ نے اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔" اس نے بھائی کا چہرہ تکتے ہوئے کہا تو وہ نظریں اٹھاتے ہوئے بولا۔

"نہ صرف ہاتھ میں لے لیا ہے بلکہ تقریباً" حل بھی کر لیا ہے۔"

"آج عالیہ پھپھو بھی آئی تھیں۔ بابا اور ڈیڈی سے کہہ رہی تھیں کہ اس بار ان لوگوں کا بالکل لحاظ نہیں کرنا۔ حتیٰ کہ بابا کے کہنے پر بھی ان سے رعایت نہیں برتنی۔" وہ گلاس میں اس کے لیے پانی ڈالتے ہوئے بولی تو شاہی نے ہاتھ میں پکڑا چمچ نیچے رکھ دیا۔

"رعایت تو اب انہیں کسی قیمت پہ نہیں ملے گی۔ کیونکہ اب یہ معاملہ میرے ہاتھ میں ہے۔ دولت، جائیداد سب گئی بھاڑ میں، لیکن جو کچھ انہوں نے بابا کے ساتھ کیا ہے، وہ میں کسی قیمت پہ فراموش نہیں کر سکتا۔" بہن کی طرف دیکھتا وہ سرد لہجے میں بولا تو ثانیہ پریشان ہو گئی۔

"پلیز بھائی! آپ کو ان لوگوں کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں۔"

"بے فکر رہو، اب یہ فتنہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔" وہ غیر مرئی نقطے پہ نگاہیں جمائے مطمئن سا بولا تو ثانیہ متفکر سی اسے دیکھ کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

خلیل اور بچیوں کا سامنا کرنے سے بچنے کے لیے بازغہ ضروری کام کا بہانہ کر کے ملازمہ کو مطلع کرتی گھر سے باہر نکل گئی تھیں۔ یہ بھی شکر تھا کہ جس وقت پاکستان سے فون آیا تھا، گھر پہ ان کے اور نوکروں کے

سوا اور کوئی نہ تھا۔ وگرنہ ان کے لیے تو طعنوں اور باتوں کا نیا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

انہیں خود کو سنبھالنے میں دو ڈھائی گھنٹے لگ گئے تھے۔ مگر اس کے باوجود جب وہ گھر لوٹی تھیں تو خود کو خلیل جہانگیر کی گہری نظروں سے چھپا نہ سکی تھیں۔

"کیا بات ہے تم اتنی چپ چپ سی کیوں ہو؟" انہوں نے ٹی وی دیکھتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے کپ سے کافی کا گھونٹ بھرا۔ انعم اور حبہ دونوں آج اپنی فرینڈز کے ساتھ ڈنر کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ اس لیے فی الوقت وہ دونوں گھر پہ اکیلے تھے۔

"یونہی سر میں درد ہے ذرا۔" وہ ان کی طرف دیکھے بنا بے زاری سے بولیں تو خلیل صاحب کی نظریں استہزائیہ انداز میں ان پہ آٹھہریں۔

"کمال ہے! آج تو تمہاری لاڈلی کی منگنی ہے بھئی۔ پھر تمہارے سر میں بھلا درد کیوں ہونے لگا۔ سب ٹھیک تو ہے؟"

"فار گاڈ سیک خلیل! کبھی تو سیدھی بات کر لیا کرو۔" تیز نظروں سے ان کی طرف دیکھتی وہ چیخ کر بولیں تو خلیل جہانگیر کے لبوں پہ کاٹ دار مسکراہٹ آن ٹھہری۔

"او کے بھئی آئی ایم سوری۔
اب اگر ہماری لاڈلی نے ہمیں نہیں پوچھا تو اس میں اتنا چڑنے والی کون سی بات ہے؟"

"ک۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟" ان کے چہرے کا رنگ یک لخت زرد پڑ گیا تو خلیل صاحب چونک گئے۔

"میرا مطلب تو اس کے خود ہی منگنی کر لینے سے تھا، لیکن لگتا ہے کہ تمہارے ذہن پہ کوئی دوسری بات سوار ہے۔" وہ بغور ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے تو بازغہ دل ہی دل میں انہیں اور اپنی بے وقوفی کو کوستی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میرے ذہن پہ تو اس وقت صرف تم سوار ہو۔" انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"اچھا! اتنی محبت کرتی ہو مجھ سے؟" خلیل جہانگیر دوبدو گویا ہوئے تو بازغہ کا ضبط جواب دے گیا۔ اس شخص سے جیتنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔

"کرتی تھی۔" وہ "تھی" پہ زور دیتے ہوئے بولیں۔ خلیل صاحب مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"غلط فہمی ہے تمہاری۔ تم نے سوائے اپنی ذات اور اپنی خواہشات کے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔ تم ایک خود غرض عورت ہو بازغہ حسین!" انہوں نے طنزیہ نظروں سے بازغہ بیگم کی جانب دیکھا۔

"اور تم ایک موقع پرست اور جھوٹے انسان ہو۔" ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ بنا کسی ہچکچاہٹ کے بولیں تو خلیل صاحب کے چہرے پر حظ اٹھاتی کیفیت در آئی۔

"اور تم موقع شناس۔۔۔ دونوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔" وہ ٹھنڈے لیکن آگ لگاتے لہجے میں بولے تو بازغہ چند لمحے انہیں شعلے برساتی نظروں سے دیکھتی نکل گئیں۔

☆ ☆ ☆

اجیہ کی آنکھ نرم گرم بستر کے زیر احساس کھلی تھی۔ بے اختیار اپنے خشک پڑتے لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے اس نے خالی الذہنی کے عالم میں اپنے اردگرد دیکھتے ہوئے سیدھا ہونا چاہا تھا۔ لیکن جونہی اس کی نظر اپنے قریب راکنگ چیئر پہ بیٹھے چہرے سے ٹکرائی تھی وہ لحظہ بھر کے لیے ساکت ہو گئی تھی۔ اگلے ہی پل اس کی آنکھوں میں پہچان کے رنگ بڑی تیزی سے واضح ہوئے اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے بیڈ کی پشت سے جا لگی۔ اسے اپنی جگہ سے اٹھتا دیکھ کے مقابل کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"کچھ زیادہ ہی نازک مزاج ہو تم۔ خاصا وقت لیا تم نے ہوش سنبھالنے میں۔ لیکن چلو دیر آید درست آید۔ ویلکم ہوم مائی ڈیر!" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ قدرے آگے کو جھکا تو اجیہ نے خود پہ پھیلا کمبل کھینچ کر سینے تک تان لیا۔

"ک۔ کون ہو تم؟" وحشت زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے خائف لہجے میں سوال

کیا۔

"فار گاڈ سیک یار! اب کیا میں پھر سے تمہیں نکاح نامہ نکال کر دکھاؤں؟" وہ یوں گویا ہوا جیسے دونوں کے درمیان برسوں کی شناسائی ہو۔ اس کی بات پہ اجیہ بے اختیار چیخ اٹھی۔

"اسٹاپ اٹ! پلیز اسٹاپ اٹ۔ تم جانتے ہو کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔۔۔ تم ایسا کیوں کر رہے ہو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" بات کرتے کرتے وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی مگر مقابل پہ رتی برابر اثر نہ ہوا تھا۔

"کتنی خوبصورت ہو تم۔ بالکل کانچ کی گڑیا کی طرح۔" اس کے سوال کو مکمل طور پہ نظر انداز کیے وہ گہری نظروں سے اسے تکتا گمبھیر لہجے میں بولا تو اجیہ کے آنسو مارے خوف کے جم سے گئے۔

"دیکھو میرے قریب مت آنا۔" خوف زدہ نظروں سے اس کی جانب دیکھتی وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی تو اس کے لبوں پہ ایک بار پھر مسکراہٹ آگئی۔

"دانش منیر کے تو بازو میں بازو ڈال کر سارے شہر میں گھوما جا رہا تھا اور شوہر پہ ایسی پابندی۔ دیٹس ناٹ فیئر۔"

"تم جانتے ہو کہ نہ تو تم میرے شوہر ہو اور نہ میں تمہاری بیوی۔ پھر تم کیوں۔۔۔ کیوں یہ بات بار بار دہرا رہے ہو؟ میں تو تمہارا نام تک نہیں جانتی۔" اس کی تکرار نے ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے سیل رواں جاری کر دیا تھا۔

"میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ تمہیں رونا کس بات پر آ رہا ہے۔ یہ کہ تم میری بیوی کیوں نہیں یا یہ کہ تم میرا نام کیوں نہیں جانتیں؟" اس کے چہرے پہ نگاہیں جمائے وہ معصومیت کے سارے ریکارڈ توڑتے ہوئے بولا تو اجیہ نے مارے بے بسی کے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

یہ بات تو طے تھی کہ وہ اسے کچھ بھی بتانے والا نہ تھا اور لاعلمی کے اندھیروں میں ان گنت سوالوں سے ٹکراتے رہنے کی اذیت شاید ہر اذیت پہ بھاری تھی۔

"اچھا ایک بات تو بتاؤ۔ تم دانش سے بہت محبت کرتی ہو کیا؟" اس نے اچانک دوستانہ لہجے میں ایک بالکل غیر متوقع سوال کیا تو اجیہ کے آنسو ایک بار پھر تھم گئے۔

چہرے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے اس نے مقابل کی طرف دیکھا، جو منتظر نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اور پھر کچھ سوچتے ہوئے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر بھول جاؤ اسے۔ بلکہ ہر اس چیز، ہر اس رشتے کو بھول جاؤ جو تمہیں عزیز ہے۔ تمہاری خواہشات میں شامل ہے۔ کیونکہ اب تم وہی کرو گی جو میں چاہوں گا۔۔۔ تمہاری خواہشات ترجیحات، ہر چیز میرے تابع ہو گی۔۔۔" اس پہ نظریں جمائے وہ یک لخت اجنبی لہجے میں کہتا، اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تو سراسیمہ سی اجیہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ کر رہ گئی۔

"اب اتنے خوف سے مت دیکھو کہ میرا دل ہی پگھل جائے۔" وہ اچانک اس کے دائیں بائیں ہاتھ جماتے ہوئے جھکا تو اجیہ کا مارے دہشت کے سانس بند ہو گیا۔

سختی سے آنکھیں میچے وہ بری طرح رو دی۔ اور جب اس نے کتنی دیر بعد ہمت کر کے آنکھیں کھولی تھیں تو خود کو کمرے میں تنہا پا کے حیران رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

اتوار کا دن تھا۔ "حسن ولا" کے سب مکین گھر پہ تھے۔ لیکن اس کے باوجود در و دیوار پہ عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مگر جب شام میں عالیہ اور مہناز پھپھو اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ چلی آئیں، تو تھوڑی دیر کے لیے ماحول پہ چھایا بوجھل پن جیسے ختم ہو گیا تھا۔ بابا بھی اپنے سب بچوں کو اکٹھا دیکھ کے بہت دنوں بعد ان کے درمیان آ بیٹھے تھے، وگرنہ اسی دن کے بعد سے تو جیسے انہیں چپ سی لگ گئی تھی۔ کھانا پینا، ہنسنا بولنا وہ ہر بات بھول کے بس سوچوں میں گم رہنے لگے تھے۔ ان کے چہرے کی تھکاوٹ، آنکھوں کی کھوئی کھوئی سی کیفیت ہر بار شاہی کو نئے سرے سے

اذیت میں مبتلا کر دیتی تھی۔ اسے رہ رہ کے اس دن پہ افسوس ہونے لگتا تھا۔ جب وہ اپنے دادا، باپ اور چچا کے ساتھ نہ تھا۔ ورنہ اپنے بزرگوں کے ساتھ زیادتی کرنے والے کا اس پل وہ حشر کرتا کہ دنیا دیکھتی۔
بابا کی حالت دیکھتے ہوئے وہ بظاہر تو خاموش ہو گیا تھا مگر اس نے اگلے دن سے ہی سارا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔
اب بھی وہ سب کے درمیان بیٹھا اس بارے میں سوچ رہا تھا۔ جب بابا کے پکارنے پہ وہ اپنے دھیان سے چونک اٹھا۔
"شاہی بچے! بہروز بتا رہا تھا کہ اس کے سارے معاملات تم دیکھ رہے ہو؟" انہوں نے اپنے مخصوص نرم لہجے میں سوال کیا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"لیکن مجھے اس کورٹ کچہری کے چکر میں نہیں پڑنا۔ میں نے اس کا مطالبہ پورا کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔" کسی کی طرف دیکھے بنا انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو جہاں سب چونک گئے، وہیں شاہی نے اپنے لب سختی سے بھینچ لیے۔ اسے بابا سے اسی درجہ جذباتی فیصلے کی امید تھی۔
"آپ جانتے ہیں کہ اس کا مطالبہ ناجائز ہے۔ شرعی اعتبار سے اس کا اس جائیداد میں کوئی حق نہیں بنتا۔ باقی جو کچھ نجیب کا تھا، وہ اس کی زندگی میں ہی اجڑ گیا۔ وہ لوگ نہیں مانتے" نہ سہی۔ ہم عدالت میں ثابت کر دیں گے۔ اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کس طرح اس کا مطالبہ پورا کریں گے؟" عالیہ پھپھو نے بابا کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ وہ لحظہ بھر کو خاموش ہو گئے۔
"میں نے اپنا حصہ اس کے نام کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد انہوں نے شاہی کے خدشے کی تصدیق کر ڈالی تو وہ اک گہری سانس کھینچ کے رہ گیا۔ جبکہ باقی سب ان کے اس فیصلے پہ ششدر رہ گئے۔
"آفرین ہے بابا! یعنی آپ اس ناہنجار کے حوالے اپنا سب کچھ کرنے چلے ہیں جسے آپ سے محبت تو دور انسیت تک نہیں۔ جس کی نگاہ میں آپ کے لیے پہچان ہے اور نہ کوئی لحاظ۔ اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ آپ کا یہ قدم اس کے دل میں گھر کر لے گا تو یہ سب سے بڑی غلط فہمی ہے آپ کی۔ محبتوں کی اقدار اس کے خون میں شامل نہیں۔" غصے سے کھولتی ہوئی تیز لہجے میں بولیں تو شہباز حسن بہن کی تائید کرتے ہوئے بولے۔
"مہناز ٹھیک کہہ رہی ہے بابا! آپ کا یہ فیصلہ ان کے لالچ کو ہوا دینے کے سوا اور کچھ نہیں کرے گا۔"
"تو کیا چاہتے ہو تم لوگ۔ جا کے ان کے خلاف عدالت میں کھڑا ہو جاؤں؟" وہ یک لخت غصے سے بولے۔
"بالکل! جب انہیں کسی چیز کی شرم لحاظ نہیں تو ہم کیوں ہچکچائیں۔ بلکہ اچھا ہے، چار لوگوں کے درمیان جب پچھلے کرتوت کھلیں گے تو خود ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ اچھی طرح مزاج صاف ہو جائے گا۔" عالیہ نے غصے سے سر جھٹکا۔ داؤد صاحب کے چہرے پہ بے بسی پھیل گئی۔
"تم کیوں نہیں سمجھتیں عالی! میں اس کے دل میں اپنے بچے کے لیے مزید نفرت نہیں بڑھا سکتا۔ میں اس کے سارے گلے شکوے دور کر دینا چاہتا ہوں۔ میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ میرے لیے وہ ہر چیز سے بڑھ کے اہم ہے۔" بات کرتے ہوئے ان کا لہجہ بھرا گیا۔ شاہی کے لیے مزید وہاں بیٹھنا مشکل ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے وہ کتنی ہی دیر سے ایک ہی رخ پہ بیٹھی ہوئی تھی۔ ذہن سوچ کے گھوڑے دوڑا دوڑا کے اب بالکل تھک چکا تھا۔ کھڑکی کے کھلے پردوں سے اندر آتی دھوپ دن چڑھ آنے کی اطلاع دے رہی تھی۔ یہ سوال کہ وہ شخص رات بھر اس کے ساتھ اس کمرے میں موجود تھا یا نہیں؟ اس کے لیے سب سے زیادہ پریشانی اور اذیت کا باعث بنا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنا یہ مسئلہ کیسے حل کرے۔ تب ہی دروازے پہ دستک کی آواز نے اسے بری طرح چونکا دیا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے خوف زدہ نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا۔
اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا اور ایک عورت نے اندر جھانکا۔ اجیہ کو اپنی طرف دیکھتا پا کے وہ مسکراتی ہوئی اندر چلی آئی۔
"سلام بی بی جی۔ میرا نام ہاجرہ ہے۔ میں یہاں کام کرتی ہوں۔ صاحب کا فون آیا تھا۔ کہہ رہے تھے کہ میں آپ سے ناشتے وغیرہ کا پوچھ لوں۔ وہ آپ کے لیے کافی سارا سامان بھی دے گئے ہیں۔ اگر آپ پہلے نہانا دھونا چاہتی ہیں تو میں آپ کی چیزیں یہاں لے آؤں؟" اس کی طرف دیکھتی، وہ بالکل نارمل لہجے میں بولی تو خائف سی اجیہ سوچ میں پڑ گئی۔
"پتا نہیں اس آدمی نے اپنے ملازموں کو اس کے بارے میں کیا بتایا تھا اور کیا نہیں۔ اور پتا نہیں یہ اس کی یہاں رات بھر موجودگی کے بارے میں کچھ جانتی بھی یا نہیں؟"
"تم۔ تم یہیں رہتی ہو؟" اس نے اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے سوال کیا۔
"نہیں جی! میں تو یہاں دو، تین دن بعد آ کے صفائی کر جاتی ہوں۔ یہاں زیادہ تر کوئی ہوتا جو نہیں۔ لیکن پرسوں صاحب مجھے، میرے شوہر اور بچوں کو کچھ دنوں کے لیے یہاں لے آئے تھے۔ تاکہ آپ کو کوئی مسئلہ نہ ہو۔" اس نے تفصیل سے جواب دیا تو اجیہ نے اپنا لب چباتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔
"را۔ رات کب آئے تھے تمہارے صاحب؟" اس نے۔ جھجکتے ہوئے پوچھا۔
"رات کو تو جی وہ آئے ہی نہیں۔ صبح سات بجے کے بعد آئے تھے۔"
اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے سادگی سے جواب دیا تو اجیہ کی اٹکی ہوئی سانس بحال ہو گئی۔ بے اختیار اس نے بیڈ کی پشت سے سر ٹکا کر اک گہری اطمینان بھری سانس لی تو بے چاری ہاجرہ پریشان ہو گئی۔
"بی بی جی! آپ کی طبیعت ٹھیک تو ہے نا؟" وہ چند قدم بڑھاتی بیڈ کے پاس چلی آئی۔ اجیہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"میں آپ کے لیے ناشتا لاتی ہوں۔ ایسا نہ ہو، آپ پھر سے بے ہوش ہو جائیں۔" وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بنا تیزی سے پلٹ کر باہر نکل گئی۔
اور چونکہ اجیہ دوبارہ ہوش و حواس سے بیگانہ نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس لیے ہاجرہ کے ناشتا لانے پہ اس نے خاموشی سے چند لقمے زہر مار کر لیے تھے۔
"بی بی جی! آپ اب کپڑے بدل کے آرام کر لیں۔" وہ اس کے سامنے سے ٹرے اٹھاتے ہوئے بولی۔ اجیہ کی نظریں اپنی خوب صورت اور قیمتی میکسی پہ جا ٹھہریں۔ بے اختیار اس کے دل میں اک ہوک سی اٹھی۔
کتنے شوق اور خوشی سے دانش نے اس کے لیے یہ میکسی شہر کے ایک مشہور ڈیزائنر کے آؤٹ لٹ سے خریدی تھی۔ بلکہ یہی کیا، ان دونوں نے اپنے اس فنکشن کو یادگار بنانے کے لیے ہر چیز میں ہی بھرپور دلچسپی لی تھی۔ انہیں کیا خبر تھی کہ انہیں اپنی وہ خوشی نصیب ہی نہیں ہونا تھی۔ ان کے سب ارمان، خواہشات نہ صرف بکھر گئی تھیں بلکہ جدائی جیسی جان لیوا اذیت بھی بالکل اچانک ان کا مقدر بنا دی گئی تھی۔ اتنی اچانک کہ اجیہ کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب اس کے ساتھ بیت چکا ہے۔ وہ ایک ہی جھٹکے میں نہ صرف اپنی خوشیوں۔ بلکہ اپنے رشتوں اور اعتبار سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی۔ اس کے اپنوں نے اسے بالکل تنہا چھوڑ دیا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ مدد کے لیے کسے پکارے؟ کیونکہ جو ثبوت وہ شخص اپنی جیب میں لیے پھر رہا تھا، اس کے ہوتے ہوئے تو کم از کم نہ تو وہ کسی کو اپنا یقین دلا سکتی تھی اور نہ ہی کسی سے مدد کی امید کر سکتی تھی۔ پتا نہیں اس کی زندگی برباد کرنے والے کا مقصد کیا تھا۔

☼ ☼ ☼
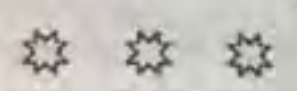
"مبارک ہو بھئی! ہماری اجیہ نے منگنی کے بجائے

ڈائریکٹ شادی کرلی ہے۔" خلیل صاحب نے ناشتے کی میز پہ بیٹھتے ہوئے مصنوعی بشاشت سے ڈائننگ روم میں موجود تینوں افراد کو مطلع کیا تو ایک پل کو جہاں انعم اور حبہ اپنی جگہ پہ ساکت رہ گئیں' وہیں بازغہ بیگم کی "کاٹو تو بدن میں لہو نہیں" والی کیفیت ہوگئی۔

"کیا؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں پاپا؟" انعم نے ہاتھ میں پکڑا سلائس پلیٹ میں رکھ دیا۔

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں بیٹا! مبارک باد دو اپنی ماں کو' جس نے اتنی بڑی بات کی ہمیں ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ لیکن یہ بھول گئی تھی کہ نہ تو مجھے بے وقوف بنانا آسان ہے اور نہ ہی مجھے پاکستان فون کرنے کی کوئی ممانعت ہے۔" انہوں نے تیز نظروں سے بازغہ بیگم کو گھورتے ہوئے کہا۔ انعم کی حیران آنکھیں ماں کی جانب اٹھ گئیں۔

"ممی! آپ کو پتا تھا؟"

"ہاں!" انہوں نے نظریں چراتے ہوئے چائے کا کپ اٹھا کر لبوں سے لگالیا۔ انعم کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔

"دس از ٹو مچ! آپ نے اتنی اہم بات ہم سے چھپائی۔ ہم نے کیا اجیہ یا دانش کو کھا جانا تھا؟ یا ان کی خوشیوں کو نظر لگا دینی تھی؟"

"دانش کہاں سے آگیا بھئی؟ وہ بے چارہ تو بیٹھا تمہاری بہن اور ماں کی جان کو رو رہا ہے۔" خلیل صاحب نے اچانک بیچ میں ٹکڑا لگایا تو انعم کو ایک اور جھٹکا لگا۔

"کیا مطلب؟" وہ الجھ کر باپ کا چہرہ تکنے لگی۔

"مطلب یہ میری جان! کہ تمہاری بہن صاحبہ منگنی کا ڈراما تو دانش کے ساتھ رچا رہی تھیں۔ مگر وہ مہینہ بھر پہلے کسی اور کے ساتھ نکاح کرچکی تھیں اور کل جب وہ آدمی بھری محفل میں نکاح نامہ لے کے پہنچ گیا تو تمہاری ماں کی لاڈلی سرے سے انکاری ہوگئی۔"

"واٹ؟" اب کے انعم اور حبہ دونوں مارے حیرت کے چلا اٹھیں۔ بازغہ نے ہاتھ میں پکڑا کپ میز پر پٹخ دیا۔

"اسی۔۔۔ اسی لیے نہیں بتایا تھا میں نے کہ یہ شخص میری جان کو آجائے گا۔" انہوں نے لال بھبوکا ہوتے ہوئے خلیل جہانگیر کی طرف دیکھا۔ انعم غصے سے کہہ اٹھی۔

"فار گاڈ سیک ممی! پاپا کو الزام دینا بند کریں۔ آپ کی ان ہی طرف داریوں نے آج ہمیں یہ دن دکھایا ہے۔ آپ نے اجیہ کے معاملے میں ہمیشہ پاپا کی نیت پہ شک کیا ہے۔ آپ نے کبھی ان کی ایک نہیں سنی۔"

"ہاں! میں ہی بری ہوں۔ تمہارا باپ تو بڑا نیک اور انصاف پسند آدمی ہے۔۔۔ میں پوچھتی ہوں' جب تم لوگوں کو اجیہ سے کوئی سروکار نہیں تو اب تم لوگوں کو کیوں اس کا درد اٹھ رہا ہے؟ وہ چھپ کر شادی کرے یا بھاڑ میں جائے۔ تم میں سے کسی کو اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔"

گود میں رکھا نیپکن ٹیبل پہ پٹختے ہوئے' وہ تن فن کرتی ڈائننگ روم سے باہر نکل گئیں۔ خلیل صاحب نے شکایتی نظروں سے بیٹیوں کی جانب دیکھا۔

"دیکھی اپنی ماں کی حرکت؟ بجائے اپنی غلطی ماننے کے اس نے پھر سے وہی ہلیلہ گیم شروع کیا۔"

"میری تو یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ اجیہ اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا سکتی ہے؟ اس نے تو خود اپنی مرضی سے دانش سے رشتہ جوڑا تھا۔" اب تک خاموش تماشائی بنی بیٹھی حبہ نے بے یقین سے لہجے میں کہا تو خلیل صاحب نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔

"ہونہہ! یہ سب اسے ورثے میں ملا ہے۔"

"پلیز پاپا! میں مانتی ہوں کہ ممی کی غلطی ہے۔ مگر آپ مزید انہیں کچھ نہ کہیے گا۔ وہ پہلے ہی بہت اپ سیٹ ہوں گی۔" انعم نے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے ملتجی لہجے میں کہا تو خلیل صاحب سر جھٹک کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"غلط فہمی ہے تمہاری۔ تمہاری ماں اپ سیٹ ہونے والوں میں سے نہیں' اپ سیٹ کرنے والوں میں سے ہے۔"

وہ نیچے رکھا بریف کیس اٹھا کر دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ انعم اور حبہ ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔ انہوں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ اپنے ماں باپ کو یونہی ایک دوسرے کے بخیے ادھیڑتے دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

اجیہ کو کمرے میں پڑے ہوئے سارا دن گزر گیا تھا۔ مگر اس نے اپنی جگہ سے ہل کے نہ دیکھا تھا۔ حالانکہ کمرے کا دروازہ بھی کھلا تھا اور گھر میں ہاجرہ بھی موجود تھی۔ مگر اس نے کھڑکی سے اٹھ کر باہر جھانکا تک نہیں۔ لیکن جب رات میں نو، سوا نو کے قریب نیچے مین گیٹ پہ کھٹ پٹ کے بعد، پورچ میں کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی تھی۔ تب غیر ارادی طور پہ اس کی ساری حسیات بیدار ہو گئیں۔

بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے وہ تیز قدموں سے کھڑکی کی جانب بڑھی۔

گاڑی میں سے اسے اترتا دیکھ کے اجیہ کی دھڑکنیں بے اختیار تیز ہو گئیں۔ سرعت سے پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے اپنے اردگرد دیکھا۔ اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بھاگ کر دروازہ مقفل کر دیا تھا۔

چند لمحوں کے توقف کے بعد باہر راہداری میں بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اجیہ کا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔ وہ کسی طور بھی اس شخص کے لیے دروازہ نہیں کھولنا چاہتی تھی۔ دوسری جانب قدموں کی آواز دروازے کے بالکل قریب آ کے رک گئی۔ اگلے ہی پل دروازے کا ہینڈل نیچے ہوا اور پھر شاید اسے بھی دروازہ مقفل ہونے کا احساس ہو گیا تھا۔ کیونکہ ہینڈل ایک دو بار اوپر نیچے ہونے کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ اس سے پہلے کہ اجیہ سکھ کا سانس لیتی "کی ہول" میں کھٹ پٹ ہوئی تھی اور اجیہ کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ دروازہ کھول کے اندر چلا آیا۔

"تم نے ناحق زحمت کی۔ اس گھر کے سارے دروازوں کی چابیاں میرے پاس ہیں۔" وہ پلٹ کے دروازہ مقفل کرتا بے نیازی سے بولا۔ اجیہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"لاک کھولو!" وہ اسے تنفر سے دیکھتے ہوئے تحکم لہجے میں بولی تو اس نے مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بازو پہ پڑا کوٹ ــــ صوفے پہ اچھال دیا۔

"کیوں؟ تمہیں ڈر لگ رہا ہے کیا؟"

"شٹ اپ! تم اگر یہ سمجھتے ہو کہ اس سارے تماشے کا کلائمکس کہیں کسی گندے ارادے میں تمہاری کامیابی ہے تو یاد رکھنا! میں تمہیں یا خود کو مار تو دوں گی مگر تمہیں تمہارے کسی برے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی!" وہ انگلی اٹھائے تیز لہجے میں بولی تو مقابل کے لبوں پہ پھیلتی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"تم تو کسی مڈل کلاس گھرانے کی باحیا لڑکی کی طرح بات کر رہی ہو۔ جبکہ تم تو خود ایک بے حد لبرل ماں کی الٹرا ماڈرن بیٹی ہو۔ اس کی نہ تو خود کوئی حد تھی اور نہ ہی اس نے تمہیں کسی حد کی تمیز سکھائی ہے۔" پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ انتہائی پرسکون لہجے میں بولا تو اجیہ سر تا پا سلگ اٹھی۔

"ہاؤ ڈیر یو! تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری ماں کے بارے میں ایسی بات کرنے کی؟"

"میں نے تو صرف سچائی بیان کی ہے۔ اب تمہیں کڑوی لگی ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔" وہ کندھوں کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے بولا تو اجیہ غصے سے چلا اٹھی۔

"گیٹ آؤٹ! آئی سیڈ گیٹ آؤٹ فرام مائی روم!"

"یور روم؟ کیا بات ہے بھئی!" اس نے ستائشی لہجے میں کہتے ہوئے اجیہ کی جانب دیکھا۔

"لیکن اچھا لگا تمہارا یہ استحقاق۔ کیونکہ آج کے بعد میرا سب کچھ تمہارا اور تم سر تا پا میری ہو۔" گہری نظروں سے اسے تکتے ہوئے اس نے پلک جھپکنے میں درمیانی فاصلہ عبور کرتے ہوئے اجیہ کو دیوار سے لگا دیا تو بے یقین سی اجیہ کی سانس ایک پل کے لیے رک سی گئی۔

"چھوڑو! چھوڑو مجھے ذلیل انسان!" اگلے ہی لمحے وہ وحشت زدہ سی اپنے دونوں بازو اس کی گرفت سے نکالنے کو پورا زور لگاتے ہوئے چلائی تھی۔ لیکن اس پہ تو جیسے کوئی اثر ہی نہیں ہوا تھا۔

"بس اتنی سی طاقت ہے؟ تم تو مجھے مارنے چلی تھیں۔" حظ اٹھاتی نظروں سے اسے دیکھتا وہ طنزیہ لہجے میں بولا تو اجیہ مارے بے بسی کے پھپھک کر رو پڑی۔

"چھوڑ دو، پلیز! مجھے چھوڑ دو۔"

"گو کہ مجھے تم سے محبت نہیں۔ مگر ایک بات ماننی پڑے گی۔ تم ہو بلا کی خوب صورت۔" اس کے رونے کی پروا کیے بنا بے باک نگاہوں سے اسے تکتے ہوئے اس نے یک لخت ہاتھ بڑھا کے اجیہ کے چہرے پہ آئی لٹیں پیچھے ہٹانا چاہیں تو اس نے اپنے آزاد ہونے والے ہاتھ سے اس پہ حملہ کر دیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس کے ناخن اسے چھو پاتے، مقابل نے دانت پیستے ہوئے سرعت سے اس کی دونوں کلائیاں جکڑ کر دیوار سے لگا دیں۔

"تمہارے خیال میں اگر اس سارے تماشے کا کلائمکس اس سین پہ ہونا تھا مس اجیہ! تو یہ تمہاری بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ کیونکہ جہاں تمہاری عقل ختم ہوتی ہے، وہاں سے اس کھیل کا آغاز ـــــــ ہوتا ہے۔" اس پہ جھکے وہ انتہائی نفرت سے بولا تو اجیہ کا روتا بلکتا وجود چند لمحوں کی بے یقینی کے بعد ساکت ہو گیا۔ جب کہ وہ اس کی کلائیاں جھٹکتا پیچھے ہٹ گیا تھا۔

"تم جیسی لڑکیوں کو منہ لگانا تو دور، میں تمہاری طرف دیکھنا بھی اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ یہ سب میں نے تم پہ تمہاری اوقات واضح کرنے کے لیے کیا ہے۔ یہ بتانے کے لیے کیا ہے کہ تم میرے رحم و کرم پہ ہو اور تمہارے پاس میری بات ماننے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔" اس پہ نگاہیں جمائے وہ بے لچک انداز میں بولا۔ بے حس و حرکت کھڑی اجیہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔

"کیا؟ کیا چاہتے ہو تم؟" اسے اپنی آواز کسی کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔

"میرے صرف دو مطالبے ہیں۔۔۔" اور اس کے مطالبات سن کے اجیہ شاکڈ رہ گئی تھی۔

"ک۔۔۔ کون ہو تم؟ اور کس کے کہنے پہ یہ سب کر رہے ہو؟" اس کی شناخت اجیہ کے لیے اب بے حد ضروری ہو گئی تھی۔

"میرا آئیڈینٹیٹی بھی جلد پتا چل جائے گا۔ تم بس ذہنی طور پہ خود کو تیار کر لو۔"

وہ پلٹ کے صوفے کی جانب بڑھ گیا۔ اپنا کوٹ اٹھا کے وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا بت بنی اجیہ کے سامنے آ کھڑا تو اس کی نظریں بے اختیاری کے عالم میں اس کے خوبرو چہرے پہ آ ٹھہریں۔

"یہاں فون نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ملازموں سے کسی مدد کی امید مت رکھنا۔ وہ تمہیں میری حالات کی ماری منگیتر سمجھتے ہیں۔ جو مجھے بے حد عزیز ہے۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ سفاکی سے مسکرایا۔

"گیٹ پہ نہ صرف چوکیدار موجود ہے۔ بلکہ میرے جانے کے بعد کتے بھی کھول دیے جائیں گے۔ اس لیے جان من! کوئی بھی بے وقوفی کرنے سے پہلے دوبار ضرور سوچ لینا۔" اک گہری نظر اس پہ ڈالتا وہ مضبوط قدموں سے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ اجیہ کی نظروں نے کسی معمول کی طرح اس کا پیچھا کیا۔

"اور ہاں۔" وہ یک لخت پلٹا۔ اجیہ کی خالی نگاہیں ایک بار پھر اس کے چہرے کی جانب اٹھ گئیں۔ "مجھے تم صبح ان کپڑوں میں نظر نہ آؤ۔ میں تمہیں اپنی پسند کے لباس میں دیکھنا چاہوں گا۔" اس پہ ایک آخری نظر ڈالتے وہ دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔ تو اجیہ اپنے سنسناتے ہوئے ذہن کے ساتھ کارپٹ پہ گر سی گئی۔

"یہ۔۔۔ یہ سب۔۔۔؟" اس نے اپنا سر کانپتے ہاتھوں سے تھام لیا۔ بے یقینی اتنی شدید تھی کہ اس کی آنکھیں برسنا بھول گئی تھیں۔

"ممی! آپ۔۔۔ آپ کہاں ہیں ممی؟ خدا کے لیے مجھے ان درندوں سے بچائیں۔۔۔ پلیز ممی! میرے پاس

آجائیں۔" وحشت زدہ سی وہ یک لخت بلند آواز میں ماں کو پکارتی پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔

☼ ☼ ☼

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ مگر بازغہ خلیل کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ حالانکہ دن بھر وہ بے حد مصروف رہی تھیں۔ جسمانی طور پہ بھی اور دماغی طور پہ بھی۔ مگر اس کے باوجود بستر پہ لیٹتے ہی ان کی ساری سوچیں ایک ہی نقطے پہ مرکوز ہو گئی تھیں۔ انہیں پتا بھی نہیں چلا تھا اور آنسو ان کے چہرے کو بھگوتے' ان کے بالوں میں جذب ہونے لگے۔

کتنی ہی دیر وہ یونہی بے آواز روتی رہیں اور ان کی زندگی کا ساتھی ان سے ہاتھ بھر کے فاصلے پہ بے خبر سوتا رہا تھا۔ وہ تھک کر اٹھ بیٹھیں۔ ایک نظر گہری نیند میں ڈوبے خلیل جہانگیر پہ ڈالتے ہوئے انہوں نے سائیڈ ٹیبل پہ رکھا لیمپ روشن کیا۔

دراز کھول کے وہ اپنی نیند کی دوا ڈھونڈ رہی تھیں۔ جب کھٹ پٹ کی آواز اور کمرے میں پھیلی روشنی سے خلیل صاحب کی آنکھ کھل گئی۔

"کیا پرابلم ہے؟ کیوں ڈسٹربنس پھیلا رکھی ہے؟" مندی مندی آنکھوں سے ان کی پشت کو دیکھتے ہوئے انہوں نے بے زاری سے سوال کیا۔ ان کی اس درجہ بے حسی پہ بازغہ سرتاپا سلگ اٹھیں۔ ایک جھٹکے سے پلٹتے ہوئے انہوں نے اپنے نام نہاد شوہر کی جانب دیکھا۔

"تمہیں نہیں معلوم کیا پرابلم ہے؟" وہ غصے سے کھولتے ہوئے بولیں تو خلیل جہانگیر کی آنکھوں میں بھی غصہ پھیل گیا۔

"بہت اچھی طرح معلوم ہے۔ لیکن یہ تمہارا اپنا درد سر ہے۔ ہمارا اب اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس لیے اپنا شور شرابا بند کرو اور باہر جا کے غم مناؤ۔" تیز لہجے میں کہتے وہ بے نیازی سے ان کی جانب سے رخ موڑ گئے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی بازغہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"تم رنجیدہ ہو اور میں سو جاؤں۔ ایسا بھلا ہو سکتا ہے کبھی۔" یک لخت محبت کی چاشنی میں ڈوبی نرم آواز ان کے دل و دماغ میں گونجی تو بازغہ بری طرح چونک گئیں۔

"یہ بھلا میں کیا سوچنے بیٹھ گئی؟"

خود کو سرزنش کرتے ہوئے انہوں نے گھبرا کے دراز میں ہاتھ مارا اور مطلوبہ شیشی کے ہاتھ میں آتے ہی ایک کے بجائے دو گولیاں پانی کے ساتھ نگل لیں۔ آج انہیں یہ اچانک کیا ہوا تھا' وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھیں۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح وہ اپنی ہار تسلیم کر چکی تھی۔ اس شخص نے حقیقتاً" اپنی بات ماننے کے سوا اس کے پاس کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا۔ اسی لیے اس نے کسی کٹھ پتلی کی مانند اس کی ہدایت کے مطابق نہا دھو کے اس کے لائے ہوئے کپڑوں میں سے ایک جوڑا زیب تن کر لیا۔

وہ اپنے ناشتے کے آخری مراحل میں تھی' جب ہاجرہ نے آ کے اسے اس کا پیغام دیا۔

"بی بی جی! آپ کو صاحب نیچے بلا رہے ہیں۔" اور وہ بلا چوں و چرا اٹھ کے اس کے ساتھ چل دی۔ اس نے اپنے کمرے کے باہر پہلی بار قدم رکھا تھا۔ مگر اس کا ذہن اتنا منتشر تھا کہ اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کے اپنے اردگرد نہیں دیکھا تھا۔ بس خاموشی سے ہاجرہ کے پیچھے چلتی وہ اس کے روبرو آ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے صوفے پہ براجمان تھا۔

"تم اتنی ہی بد تہذیب ہو یا تمہیں کسی نے سلام کرنا سکھایا ہی نہیں؟" ہاجرہ کے باہر جاتے ہی وہ گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ وہ اندر ہی اندر کلس اٹھی۔

"کیوں بلایا ہے مجھے؟" اس کے طنز کو نظر انداز کیے اس نے سپاٹ لہجے میں استفسار کیا۔

"یہ دیکھنے کے لیے کہ تم میں ایک اچھی بیوی بننے کے گٹس ہیں یا نہیں؟" اس پہ نگاہیں جمائے وہ نہایت اطمینان سے بولا تو اجیہ سلگ اٹھی۔

"کیا بکواس ہے یہ؟"

"اوں ہوں! اچھی بیویاں اپنے شوہر سے اس طرح بات نہیں کرتیں۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "ویسے تم پہ یہ رنگ اور یہ لباس دونوں ہی بہت جچ رہے ہیں۔" دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا وہ اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔ جو سرخ اور سیاہ کڑھائی والے سوٹ میں واقعی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

"اپنی حد میں رہو! اور بتاؤ کہ مجھے یہاں کس لیے بلایا ہے؟" غصے سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے اس نے کڑے لہجے میں اپنا سوال دہرایا۔

"پھر کیا سوچا تم نے۔ میری بات ماننی ہے یا۔۔۔؟" اس نے قصداً" اپنی بات ادھوری چھوڑتے ہوئے اجیہ کی طرف دیکھا۔

"میں۔۔۔ میں تیار ہوں۔" نظریں چراتے ہوئے اس نے اپنی ہمت مجتمع کر کے جواب دیا۔ مقابل کے لبوں پہ بھرپور مسکراہٹ آن ٹھہری۔

"گڈ! تو پھر چلو کام شروع کرتے ہیں۔" اس نے بائیں ہاتھ سے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔ متذبذب سی اجیہ لب چباتی صوفے کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"بھئی! مبارک ہو آپ سب کو۔" بہروز اور شہباز حسن آگے پیچھے لاؤنج میں داخل ہوئے تو وہاں موجود سب ہی افراد ان کی جانب متوجہ ہو گئے۔ یقیناً" کوئی بڑی خوش خبری تھی۔ جو وہ دونوں بھائی سب کام چھوڑ چھاڑ گھر بھاگے آئے تھے۔

"انہوں نے کیس واپس لے لیا ہے۔" بہروز صاحب نے مسکراتے ہوئے سب کو مطلع کیا تو مارے حیرت کے سب گنگ رہ گئے۔

"کیا؟ لیکن آپ کو کیسے پتا چلا؟" جبین بیگم نے شوہر کی جانب دیکھا۔

"اصغر صاحب آئے تھے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ ان کے وکیل کا فون آیا تھا۔ وہ کیس واپس لے رہے ہیں۔" بہروز حسن نے اپنے وکیل کا حوالہ دیا تو فاطمہ بیگم حیرت زدہ سی بولیں۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ لوگ بنا کسی مطالبے یا بات چیت کے اپنا ہی دائر کیا ہوا مقدمہ کیسے واپس لے سکتے ہیں؟"

"یہی تو ہماری بھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔" وہ بھابھی کی جانب دیکھتے صوفے پہ بیٹھ گئے۔

"تم لوگوں کی بات ہوئی شاہی سے؟" اب تک خاموش بیٹھے داؤد صاحب نے سوال کیا۔

"تفصیل سے تو نہیں۔ لیکن بات ہوئی ہے شاہی سے۔ وہ ایک پارٹی کے ساتھ مصروف ہے۔ کہہ رہا تھا کہ شام میں گھر آ کے بات کرے گا۔" انہوں نے باپ کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا تو وہ الجھے الجھے سے کسی سوچ میں ڈوب گئے۔

"وجہ چاہے کچھ بھی ہو۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اس بلا سے جان چھوٹی۔" مطمئن سی جبین بیگم نے مسکرا کر کہا تو فاطمہ بھی مسکرا دیں۔

"صحیح کہہ رہی ہیں آپ۔ میرے خیال میں ہمیں عالی آپا اور ممتاز کو بھی یہ خوش خبری دے دینی چاہیے۔" انہوں نے دونوں نندوں کا حوالہ دیا۔

"بالکل۔" جبین نے دیورانی کی تائید کی۔ بہروز صاحب مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا بھئی! تم لوگ جا کے اطلاعات دو۔ ہم دونوں فیکٹری چلتے ہیں۔" ہلکے پھلکے لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے داؤد صاحب کی طرف دیکھا' جو کسی سوچ میں ڈوبے بیٹھے تھے۔

"خیر تو ہے بابا! آپ اتنے چپ چپ سے کیوں ہیں؟"

"یہی سوچ رہا ہوں کہ یہ سب کیسے ہوا؟" انہوں نے نظریں اٹھاتے ہوئے بیٹے کا چہرہ دیکھا۔

"یہ تو اب شاہی ہی بتا سکتا ہے۔"

"اور اگر یہ سب اس کے بھی علم میں نہ ہوا تو۔۔۔؟"

"تو پھر ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔" وہ دھیرے سے بولے تو داؤد صاحب خاموش ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

اجیہ نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے نمبر ملا کے موبائل کان سے لگایا۔ اپنے منہ سے اپنی ماں کو ایسی اذیت دینے کے خیال سے بار بار اس کی آنکھیں بھر رہی تھیں۔ مگر وہ اپنے برابر بیٹھے شخص کے ہاتھوں اس قدر مجبور ہو گئی تھی کہ وہ چاہ کر بھی اپنی ماں کو اس تکلیف سے نہیں بچا سکتی تھی۔

دوسری طرف سے کال ریسیو کرلی گئی تھی۔ اجیہ کا دل اچھل کے حلق میں آگیا۔

"ہیلو!" بازغہ کی "ہیلو" کے جواب میں اس نے پھنسی ہوئی آواز میں "ہیلو" کہا تو اس کے برابر بیٹھے شخص نے اچانک ہاتھ بڑھا کے اس کا ٹھنڈا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی اس حرکت پہ اجیہ نے تڑپ کے آنسو بھری آنکھیں اٹھائیں۔ مگر اس کی نظروں سے چھلکتی تنبیہہ نے اسے اس حرکت کا مقصد اچھی طرح سمجھا دیا۔

"ہیلو ممی!" اس پر سے نگاہیں ہٹا کر اجیہ نے اب کے اپنی تمام تر ہمت مجتمع کرتے ہوئے کہا۔ دوسری طرف بازغہ کا پورا جسم کان بن گیا۔

"کون... اجیہ بول رہی ہو؟" انہوں نے بے قراری سے استفسار کیا۔ اجیہ نے اپنی سسکی کا گلا گھونٹنے کو اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبا لیا۔

"ہیلو اجیہ!" دوسری طرف سے بازغہ کی بے چین پکار سنائی دی تو اس کے برابر بیٹھے شخص نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے اسے بولنے کا اشارہ دیا۔

"ج... جی ممی!"

"ممی کی بچی۔ اتنا سب کرنے کے بعد تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھے فون کرنے کی؟ سارے جہاں کی خاک میرے سر میں ڈلوانے کے بعد تم نے مجھے اب کس لیے فون کیا ہے... ہاں؟" اس کی آواز سنتے ہی بازغہ بے اختیار پھٹ پڑیں۔ ان کا یوں بری طرح چلانا اس کے برابر بیٹھے شخص کے لبوں پہ بڑی بھرپور مسکراہٹ بکھیر گیا۔

"مم... میں آپ سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔" وہ اٹکتے ہوئے بولی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ انہیں کیا جواب دے۔

"میری جان مزید جلانا رہ گئی تھی کیا' جو مجھ سے بات کرنا چاہ رہی تھیں... ارے! میں پوچھتی ہوں کہ اگر یہی گل کھلانا تھا تو دانش کے ساتھ کون سا ڈراما رچا رکھا تھا؟ تمہیں یہ گھٹیا حرکت کرتے ذرا حیا نہ آئی؟ یا پھر جس کے ساتھ منہ کالا کیا تھا' اس سے دل بھر گیا تھا؟"

"فار گاڈ سیک ممی! پلیز اسٹاپ اٹ۔" اجیہ یک لخت چلاتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تو اس شخص نے تیزی سے ہاتھ بڑھا کے موبائل اس سے لے لیا۔ اجیہ نے سسکتے ہوئے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

"کب سے ڈانٹے جا رہی ہیں میری اجی کو۔ اب بس بھی کریں نا ممی جی۔" اس نے "ممی جی" پہ زور دیتے ہوئے کہا۔ بازغہ ایک پل کو حیران رہ گئیں۔ لیکن اگلے ہی پل ان کا خون کھول اٹھا۔

"تمہاری جرات کیسے ہوئی مجھ سے مخاطب ہونے کی؟ ذلیل' کمینے انسان۔"

"جرات کی کیا بات کرتی ہیں ممی جی! ذرا اپنے بھائی اور بھتیجے سے پوچھیں۔ وہ آپ کو بتائیں گے کہ کتنا جری ہوں میں۔" ان کی حالت سے حظ اٹھاتا وہ مسکرا کر بولا تو بازغہ کے تلووں سے لگی اور سر پہ بجھی۔

"جانتی ہوں تم جیسوں کی اوقات۔ نہ جانے کس گھٹیا خاندان کی پیداوار..."

"اوں ہوں! خاندان تک مت پہنچیں ممی جی۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی گم گشتہ رشتہ ہی نکل آئے۔" ایک نظر روتی ہوئی اجیہ پہ ڈال کر اس نے جتاتے ہوئے لہجے میں انہیں ٹوکا تو بازغہ بری طرح چونک گئیں۔

"کیسا رشتہ؟"

"وہی کوئی بھولا پرانا' بے حد قریبی رشتہ۔" اس نے قصداً انہیں جلانے کو پراسرار لہجے میں کہا۔ بازغہ کا ضبط جواب دے گیا۔

"بکواس بند کرو اپنی اور سیدھے طریقے سے بتاؤ! کون ہو تم؟"

"غصہ نہ کریں ممی جی! ایسا نہ ہو کہ آپ سچ کی تاب نہ لا سکیں اور سیدھا اوپر..." وہ بے اختیار قہقہہ لگا کے ہنس پڑا تو اپنے دھیان میں روتی ہوئی اجیہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"زوار علی نام ہے میرا... محترمہ بازغہ خلیل صاحبہ! زوار علی... کچھ یاد آیا؟" اجیہ کی آنسو بھری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنا تعارف کروایا تو جہاں دوسری طرف سناٹا چھا گیا۔ وہیں ایک نام اجیہ کے ذہن کے کسی کونے سے نکل کر ہر بھید کھول گیا۔

"ہیلو... مسز خلیل آپ زندہ ہیں یا... چچ چچ... سچ بڑا ترس آرہا ہے مجھے آپ پہ۔ آپ کی زندگی بھر کی محنت پہ پانی پھر گیا اور آپ کی بیٹی کو آپ کے دشمنوں سے محبت ہو گئی۔ کب' کیسے یہ ایک بڑی عجیب سی کہانی ہے۔ لیکن مختصر یہ کہ آپ کی لاڈلی نے آپ کی دشمنی کو آگے بڑھانے سے انکار کر دیا۔ یقین مانیں! اجیہ نے ہر بات جانتے بوجھتے ہوئے مجھ سے رشتہ جوڑا ہے۔ کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ بھی اب اپنی شکست تسلیم کر..." اس کی بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔

"لو... انہوں نے فون ہی بند کر دیا۔ شاید ہمت جواب دے گئی بے چاری کی۔" خود کلامی کرتے ہوئے اس نے موبائل ایک طرف رکھ کے بت بنی بیٹھی اجیہ کی جانب دیکھا۔

"کہو ڈارلنگ! کیسا لگا سرپرائز؟" اس نے فاتحانہ مسکراہٹ لیے سوال کیا۔ تو شاک کے عالم میں بیٹھی اجیہ پھٹ پڑی۔

"بے حد گھٹیا' گرا ہوا اور بزدلانہ... ایسا قدم تم جیسے ذلیل اور کمینے لوگ ہی اٹھا سکتے ہیں۔" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے' وہ بھرپور نفرت سے بولی مگر مقابل پہ اس کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اس کی جانب دیکھتا یوں ہی مسکراتا رہا۔

"نہیں میری جان... ایسا قدم ہم صرف تم جیسے ذلیل اور کمینے لوگوں کے لیے ہی اٹھاتے ہیں۔ تم اور تمہاری ماں جیسی بے لگام مخلوق کو اس کی اوقات یاد دلانا مجھے اچھی طرح آتا ہے۔ تم نے کیا سوچا تھا کہ تم جو چاہو گی' وہ کر گزرو گی اور کوئی تمہیں پوچھے گا بھی نہیں...؟ نہیں اجیہ صاحبہ! ہر بار ایسا نہیں ہوتا۔ تم نے اس عذاب کو خود دعوت دی ہے۔ اب سزا بھگتنے کے لیے بھی تیار ہو جاؤ۔" اس کے چہرے پہ نظریں گاڑے وہ سفاک لہجے میں بولا اجیہ کے پورے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔

"دیکھو! تم نے جو کہا تھا' وہ میں نے کر دیا۔ اب مجھے جانے دو۔"

"تو جاؤ نا سویٹ ہارٹ! کس نے روکا ہے؟" اس نے استہزائیہ انداز میں اجیہ کی طرف دیکھا۔ "لیکن ایک بات ہے۔ تم جاؤ گی کہاں؟ تم کیا سمجھتی ہو کہ میں نے تم سے تمہاری ماں کو یوں ہی فون کروایا تھا؟" اس نے طنزیہ مسکراہٹ لبوں پہ لیے سوال کیا۔ "تو مائی انوسینٹ ڈول! میں تمہارے اپنے ہاتھوں سے اس تابوت میں آخری کیل ٹھکوانا چاہتا تھا۔ تاکہ کوئی بھی کبھی تمہاری مدد کے لیے نہ آسکے۔ اب تمہارا ہر راستہ مجھ تک آتا ہے اور میں تم پہ پورا پورا حق رکھتا ہوں۔ آفٹر آل تمہارا شوہر جو ہوں۔" اس کے فق ہوتے چہرے پہ نگاہیں جمائے وہ آخر میں بھرپور انداز میں مسکرایا۔

اجیہ کو ہفت آسمان اپنی نگاہوں میں گھومتے محسوس ہوئے تھے۔ کس قدر مکار تھا یہ شخص اور کتنی مربوط پلاننگ تھی اس کی۔ وہ تو حقیقتاً "کہیں کی بھی نہیں رہی تھی۔

"نہیں... کچھ نہیں لگتے تم میرے۔ کوئی حق نہیں ہے مجھ پہ تمہارا۔" نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ جیسے پاگل ہونے کو تھی۔

"تو ٹھیک ہے۔ شادی کرلو مجھ سے۔" اس کی

طرف دیکھتا وہ نہایت اطمینان سے بولا۔ اجیہ مارے حیرت کے گنگ ہو گئی۔

"ایک بات یاد رکھنا اجیہ! یہ نکاح میری نہیں تمہاری مجبوری ہے۔ کیونکہ میں تو اپنا کام نقلی نکاح نامے سے بھی چلا لوں گا۔" اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں جھانکتا' وہ سپاٹ لہجے میں اسے باور کرواتا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"تمہارے پاس دس منٹ ہیں۔ اچھی طرح سوچ لو۔" فیصلے کا اختیار اسے سونپ کے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا تھا۔

ساکت بیٹھی اجیہ کو اپنا آپ مکڑی کے ایسے جال میں پھنستا محسوس ہو رہا تھا۔ جس میں سے نکلنے کا ہر راستہ لحظہ بہ لحظہ بند ہوتا جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

بازغہ کے بے جان ہاتھوں سے فون پھسل کر ان کے قدموں میں پڑا تھا۔ لیکن انہیں کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ ان کے کانوں میں صرف ایک ہی بازگشت تھی۔

"آپ کی بیٹی کو آپ کے دشمنوں سے محبت ہو گئی ہے۔"

"یہ... یہ کیا ہو گیا؟ اجیہ... اجیہ نے کیسے؟" شل ہوتے ذہن کے ساتھ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

"یا اللہ! میں خلیل' منیر' سب کو کیا منہ دکھاؤں گی؟ میں ان سے کیا کہوں گی کہ اجیہ نے زوار' زوار علی سے شادی..." انہوں نے بے اختیار اپنے بال دونوں مٹھیوں میں جکڑ لیے۔

"اور وہ لوگ جنہیں میں نے ساری زندگی کسی قابل نہیں جانا تھا۔ وہ... وہ کیسے ہنستے ہوں گے مجھ پہ کتنا مذاق اڑاتے ہوں گے میری بے وقوفی کا۔" ان کے اندر برپا شکست اور شرمندگی کا طوفان حد سے گزرنے لگا۔ انہوں نے ہاتھ مار کر سائیڈ ٹیبل پہ سجی کتنی ہی چیزیں گرا دیں۔

"اللہ تجھے غارت کرے اجیہ! تو نے اپنی ماں کو دھوکہ دیا۔ مجھ سے غداری کی۔ میں تجھے کبھی نہیں بخشوں گی دھوکے باز لڑکی۔ کبھی نہیں۔" کف اڑاتی وہ اس پل جیسے خود سے بھی بے گانہ ہو گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

قاضی اور گواہوں کے روبرو' سپاٹ چہرے اور خالی آنکھوں والی اجیہ نے بالکل میکانکی انداز میں ساری کارروائی نپٹائی تھی۔ یوں جیسے وہ اپنی زندگی کا نہیں۔ بلکہ کسی اور کی زندگی کا فیصلہ کر رہی ہو۔

وہ دس منٹ جو زوار علی نے اسے خیرات میں سوچنے کے لیے دیے تھے۔ وہ اگر یہ تکلف نہ بھی کرتا۔ تب بھی اجیہ کا یہی فیصلہ ہونے والا تھا۔ اپنا سب کچھ گنوانے کے بعد اس میں اپنی عزت اور وقار گنوانے کا حوصلہ نہ تھا۔ اسی لیے اس نے اپنی زندگی اپنے ہاتھوں داؤ پہ لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔

لیکن نکاح کے بعد جب وہ اس کے سامنے آیا تھا۔ تب اجیہ کو اس حقیقت کا احساس بڑی شدت سے ہوا تھا کہ وہ خو کو کس حد تک بے دست و پا کر چکی تھی۔

"ہاں تو مسز اجیہ زوار! کیسا محسوس کر رہی ہیں آپ خود کو اپنے دشمن کو سونپ کے؟" وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے مقابل آ کھڑا ہوا اجیہ کی آنکھوں سراسیمگی اتر آئی۔ مگر اس نے کمال ہمت سے خود کو سنبھالا تھا۔

"ایک بات یاد رکھنا زوار علی! تمہاری دھوکے بازی نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ تم غلط تھے... ہو اور رہو گے... کیونکہ اگر تم حق پہ ہوتے تو کبھی ایسے اوچھے ہتھکنڈوں کا سہارا نہ لیتے اور میں دھوکے بازوں کے ساتھ سوائے نفرت کے دوسرا کوئی رشتہ کبھی نہیں بناؤں گی۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتی وہ حوصلے سے بولی تو زوار کے لبوں پہ اک استہزائیہ مسکراہٹ آن ٹھہری۔

"تمہارے منہ سے غلط اور صحیح کی بات کچھ جچتی نہیں اجیہ صاحبہ! لیکن بے فکر رہو۔ میں تمہارے ساتھ نفرت کا رشتہ بھی نہیں رکھنا چاہوں گا۔ کیونکہ میرے نزدیک تم جیسی بے حس لڑکی کسی جذبے' کسی رشتے کے لائق نہیں ہے... ویسے بھی میں نے تمہیں عزت اور مان دینے کے لیے نہیں اپنایا۔ میں نے بازغہ خلیل کو ایک ناقابل فراموش شکست اور تمہیں ایک ناقابل فراموش سبق دینے کے لیے اپنایا ہے۔ اس لیے اپنی اوقات مت بھولو اور چلنے کی تیاری کرو۔"

"کہاں؟ کہاں لے جانے لگے ہو مجھے؟" اس کی بات پہ اجیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے اپنا بدترین خدشہ صحیح ثابت ہوتا نظر آ رہا تھا۔

"میں نے کہا نا اپنی اوقات مت بھولو۔ میں نے تمہیں سوال کرنے کا کوئی حق نہیں دیا۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ سرد لہجے میں بولا۔ اجیہ کا چہرہ فق ہو گیا۔

"نہیں... میں کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"اچھا...!" زوار نے اک طنزیہ نظر اس کی اڑی رنگت پہ ڈالی۔ اگلے ہی لمحے وہ اس کی کلائی جکڑے کسی بے جان گڑیا کی طرح اسے کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔

☼ ☼ ☼

عالیہ اور مہناز اتنی خوشی کی خبر سن کے پہلی فرصت میں دوڑی چلی آئی تھیں۔ ان کے آنے سے "حسن ولا" میں اتری رونق دوچند ہو گئی تھی۔ بہروز اور شہباز حسن بھی گھر جلد واپس آ گئے تھے۔ سب ہی خوش اور مطمئن تھے۔ لیکن ایک اہم سوال ان سب ہی کو بے چین کیے ہوئے تھا۔

"پتا نہیں' یہ شاہی کہاں رہ گیا ہے؟" شہباز صاحب نے ایک نظر گھڑی پہ ڈالتے ہوئے کہا شام کے ساڑھے چھ بج رہے تھے۔

"آپ ذرا پتا تو کروائیں' کس پارٹی کے ساتھ گیا ہے؟" متفکر سی جبین نے کہتے ہوئے بہروز حسن کی جانب دیکھا۔ تب ہی باہر گیٹ پہ جانا پہچانا سا ہارن سنائی دیا۔

"لو... آ گیا تمہارا لاڈلا۔" بہروز صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سب کی نظریں داخلی دروازے کی جانب اٹھ گئیں۔ جو چند لمحوں میں وا ہوا اور شاہی اندر داخل ہوا۔

"السلام علیکم!" لاؤنج میں موجود سب چہروں کو دیکھتے ہوئے اس نے بھرپور مسکراہٹ لیے سلام کیا تو سب ہی کھل اٹھے۔

"وعلیکم السلام... کدھر رہ گئے تھے بیٹا؟" وہ حسب عادت سب سے پہلے بابا جان کی طرف بڑھا انہوں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے اسے پاس بٹھا لیا۔

"بس بابا! ایک بہت ضروری کام آ گیا تھا۔ اسی لیے دیر ہو گئی۔ ویسے آپ سب کو بہت مبارک ہو۔" اس نے چمکتا چہرہ لیے تمام حاضرین محفل کی جانب دیکھا۔ داؤد حسن بے اختیار خاموش ہو گئے۔

"خیر مبارک بیٹا... لیکن یہ سب ہوا کیسے؟" شہباز صاحب نے خوشگوار حیرت سے بھتیجے کی جانب دیکھا۔ شاہی کے لبوں پہ اک گہری مسکراہٹ آن ٹھہری۔

"ان کے اپنے انداز سے ڈیڈی۔"

"کیا مطلب؟" شہباز صاحب نے الجھ کے بہروز حسن کی طرف دیکھا۔ جبکہ ثانیہ کے ذہن میں دو' تین دن پیشتر کی گفتگو تازہ ہو گئی تھی۔ اس نے یک لخت پریشان نظروں سے بھائی کا چہرہ دیکھا۔ جس پہ عجیب سے تاثرات سجے تھے۔

"یہ تو اب مجھے بھی نہیں پتا ڈیڈی!" اس نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔ بہروز صاحب کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔

"کیا بدتمیزی ہے شاہی! سیدھے طریقے سے بتاتے کیوں نہیں کہ کیا ہوا ہے؟" تب ہی باہر کچھ عجیب سی آواز آئی تھیں اور اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھتا' لاؤنج کا دروازہ ایک جھٹکے سے دھکیل کے کوئی آندھی طوفان کی طرح اندر داخل ہوا تھا اور سب کے منہ مارے حیرت کے کھل گئے تھے۔ نہ صرف آنے والے کو دیکھ کر۔ بلکہ اپنے سامنے موجود عجیب سے منظر پہ بھی۔

"تایا... یہ... یہ تو..." مہناز نے پھٹی پھٹی بے یقین

آنکھوں سے عالیہ کی طرف دیکھا۔ جو شاید خود بھی پہچان کا مرحلہ طے کر چکی تھیں۔ ان کے علاوہ کسی اور نے پہچانا تھا یا نہیں۔ لیکن سوائے شاہی اور سہمی ہوئی لڑکی کے، سب ہی دہل کے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جبکہ بہروز اور شہباز حسن تیزی سے آگے بڑھے۔

"زوار! چھوڑو اسے۔" انہوں نے روتی، بلکتی اجیہ کو اس کی مضبوط گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر وہ ان کی مداخلت کی پروا کیے بنا اسے کھینچتا ہوا لاؤنج کے وسط میں لے آیا اور ایک جھٹکے سے اسے ایک طرف رکھے صوفے پہ پھینک دیا۔

"آپ لوگ سب حیران تھے نا کہ کیسے ہوا کیس کا فیصلہ؟" اس نے غصے سے سب کی جانب دیکھا۔

"ایسے ہوا کیس کا فیصلہ" اس نے اجیہ کی طرف شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا۔ سب کے دل دھک سے رہ گئے اور وہ سب، جو زوار کے ساتھ آنے والی کو پہچان نہ سکے تھے یا سرے سے ہی اس سے واقف نہ تھے، بنا کسی تعارف کے اسے جان گئے تھے۔

"یہ لاتوں کے بھوت ہیں۔ باتوں سے ان پہ بھلا کیا اثر ہوتا تھا۔" اس نے کھا جانے والی نظریں سے روتی ہوئی اجیہ کو دیکھا۔ بہروز صاحب غصے سے اس کے مقابل آکھڑے ہوئے۔

"تمہاری جرات کیسے ہوئی، یہ سب کرنے کی؟ کس سے پوچھ کر تم نے اتنا بڑا قدم اٹھایا۔ ہاں؟ بلکہ تمہیں اس سارے معاملے میں کودنے کی دعوت کس نے دی تھی؟"

"میں نے بتایا تھا بھائی کو۔" شاہی یک لخت اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ سب کی نظریں اس پہ جا ٹھہریں۔

"تو تم نے سارا معاملہ اپنے ہاتھ میں لینے کے بجائے اس کے ہاتھ میں سونپ دیا؟" بہروز حسن نے تیز نظروں سے چھوٹے بیٹے کو گھورا۔

"جی... کیونکہ میرے بجائے اس معاملے میں ان کا فیصلہ زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔" اس نے ایک نظر اجیہ پہ ڈالتے ہوئے کہا تو زوار تیز لہجے میں بولا۔

"میں اس گھر کا بڑا بیٹا ہوں پاپا! آپ مجھے اس گھر کے معاملات سے الگ نہیں کر سکتے۔"

"اور کیا خوب سلجھایا ہے تم نے اس گھر کا معاملہ لے کر زبردستی اس بچی کو اٹھا لائے ہو۔" انہوں نے اشتعال سے اسے دیکھا۔

"زبردستی نہیں لایا اس بچی کو۔" اس نے لفظ "بچی" کو غصے سے ادا کیا۔ نکاح کیا ہے میں نے اس سے۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا تو سوائے ایک شاہی کے، باقی سب کی آنکھیں ابل پڑیں۔ داؤد حسن بے اختیار پاس رکھے صوفے پہ گر سے گئے تھے جبکہ جبین بیگم سینے پہ ہاتھ رکھے پیلی پڑ گئیں۔

"جی! نکاح کیا ہے اور وہ بھی زور زبردستی۔" روتی ہوئی اجیہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی چلائی۔ "آپ لوگ اتنے گرے ہوئے اور لالچی نکلیں گے، میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔" اس نے نفرت بھری نظروں سے سب کی طرف دیکھا۔ داؤد صاحب نے مارے کرب کے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"تمہاری چھوٹی سوچ اس سے آگے بڑھ بھی نہیں سکتی اجیہ صاحبہ! حالانکہ میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ یہ تمہاری بے لگامی کی سزا ہے۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے محترمہ! کہ وہ بے بنیاد مقدمہ تو ہمیں ویسے بھی جیت جانا تھا۔ ہاں! لیکن جو کچھ تم نے میرے دادا، باپ اور چچا کے ساتھ کیا۔ جس طرح تم نے انہیں سب کے سامنے ذلیل کیا۔ وہ ناقابل معافی تھا۔ یہ ہمارے بڑوں کی اعلا ظرفی تھی کہ وہ آج تک تمہیں اور تمہاری ماں کو معاف کرتے چلے آئے تھے۔ لیکن ہر زیادتی اور ہر صبر کی ایک حد ہوتی ہے اور تم نے اس دن وہ حد پار کر لی تھی۔" اسے بازو سے پکڑ کے وہ ایک جھٹکے سے اپنے روبرو کرتا ہوا بولا۔ اجیہ غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے دھاڑی۔

"بہت اچھا کیا تھا میں نے۔ یہ لوگ اسی قابل۔" اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کر پاتی، زوار کا ہاتھ پوری طاقت سے اس کے چہرے پہ پڑا۔ اتنی شدت سے کہ زوار کی چین والی گھڑی کھل کے اس کی ہتھیلی تک آگئی تھی۔ جبکہ اجیہ نیچے جا گری تھی۔

"زوار!" سب کی چیخیں نکل گئیں۔ شہباز صاحب سرعت سے بلکتی ہوئی اجیہ کی جانب بڑھے تھے۔ جبکہ شاہی نے تیزی سے آگے بڑھ کے بھائی کا بازو پکڑا تھا۔

"چھوڑو مجھے شاہی... آج میں اسے بتاتا ہوں کہ یہ کس قابل ہے۔" وہ خود کو چھڑاتے ہوئے غصے سے بولا۔ داؤد صاحب کا ضبط جواب دے گیا۔

"بہت ہوا تماشا! میں مزید اب ایک لفظ برداشت نہیں کروں گا۔" ان کی بارعب آواز لاؤنج میں گونجی تو سب ہی اپنی جگہ پہ ساکت ہو گئے۔

"زوار! تم ابھی اس وقت اجیہ کو منیر کے گھر واپس چھوڑ کے آؤ۔" انہوں نے **حکمیہ** لہجے میں کہتے ہوئے پوتے کی جانب دیکھا۔ تو وہ خود کو سنبھالتے ہوئے مودب، لیکن اٹل لہجے میں بولا۔

"معذرت کے ساتھ بابا... لیکن یہ اب یہیں رہے گی۔ انہی لوگوں کے درمیان جن سے اسے شدید نفرت ہے۔ یہی اس کی سزا ہے۔"

"دیکھو بیٹا! یہ رشتے ناتے دلوں کے سودے ہوا کرتے ہیں۔ انہیں زور زبردستی نہیں جوڑا جا سکتا۔ اس کے دل میں ہمارے لیے کوئی جگہ نہیں... کوئی بات نہیں... اس نے جو کچھ بھی کیا۔ میں اس کے لیے اسے معاف کر چکا ہوں۔ تم بھی اسے معاف کر دو بیٹا!" موقعے کی نزاکت دیکھتے ہوئے داؤد صاحب نے اب کے نرم لہجے میں اسے سمجھایا تو زوار کے لبوں پہ اک پھیکی سی مسکراہٹ آن ٹھہری۔

"یہ آپ کی اعلا ظرفی اور محبت ہے بابا! لیکن میں نہ تو آپ جتنا اعلا ظرف ہوں اور نہ ہی اتنی اچھائی کا قائل کہ لوگ میری نیک نیتی اور بھلائی کو میری کمزوری سمجھنے لگیں۔ بازغہ خلیل نے ہماری عزت و ناموس کو کئی مرتبہ چوٹ پہنچائی ہے۔ مگر اب اور نہیں۔ میں نے اس کھیل کو ایسا انجام دیا ہے کہ وہ اب مرتے دم تک کبھی اس شکست کو نہیں بھولے گی۔"

"لیکن مجھے اس عورت کی بیٹی، بہو کے طور پہ قبول نہیں۔" جبین تیزی سے زوار کی طرف بڑھتے ہوئے غصے سے چلائیں۔

"تو کس نے کہا، یہ آپ کی بہو ہے؟ آپ کی بہو وہی ہوگی، جسے آپ سب خود بیاہ کر لائیں گے۔"

"کیوں ہمارا تماشا بنواتے ہو زوار! خدا کے واسطے اس لڑکی کو واپس چھوڑ کے آؤ۔" وہ پھپھک کے رو پڑیں۔ زوار ایک پل کو لب بھینچ کے رہ گیا۔

"ایک بات تو طے ہے امی! کہ یہ اب یہاں سے کہیں نہیں جائے گی... اور اگر آپ لوگوں نے مجھے بہت مجبور کیا تو میں اسے لے کر ایسی جگہ چلا جاؤں گا کہ آپ سب دوبارہ کبھی میری شکل نہیں دیکھ سکیں گے۔" سرد و سپاٹ لہجے میں اپنی بات مکمل کر کے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر کی جانب بڑھ گیا۔ سب اس نئی افتاد پہ سر پکڑ کے بیٹھ گئے۔ جبکہ داؤد حسن کی تھکی تھکی سی نظریں بے اختیار پھوٹ پھوٹ کے روتی اجیہ

پہ جا ٹھہری تھیں۔

"جاؤ بیٹا! اسے اندر لے جاؤ۔" صوفے پہ گرتے ہوئے انہوں نے بنا کسی کو مخاطب کیے دل گرفتی سے کہا۔ چند لمحوں کی پس و پیش کے بعد ثانیہ' علینہ کو لیے آگے بڑھی۔ لیکن جوں ہی انہوں نے اسے ہاتھ لگایا' وہ بے اختیار چلا اٹھی۔

"خبردار! جو تم میں سے کسی نے مجھ سے ہمدردی جتانے کی کوشش کی۔ مجھے تم سب دھوکے بازوں سے نفرت ہے۔ شدید نفرت۔" دونوں ہاتھوں میں سر گرائے وہ با آواز بلند رونے لگی۔ داؤد صاحب کا چہرہ آن واحد میں پھیکا پڑ گیا۔ وہ بمشکل تمام اپنی ہمت جمع کرتے ہوئے اٹھے۔ لب دانتوں تلے دبائے کھڑا شاہی ان پہ نظر پڑتے ہی چونک گیا۔

"بابا! آپ ٹھیک تو ہیں؟" اس نے سرعت سے آگے بڑھ کے انہیں تھاما تو سب ہی پریشان سے ان کی جانب لپکے۔

"مجھے کمرے میں لے چلو۔" وہ کمزور سے لہجے میں بولے۔ شاہی سمیت سب ہی انہیں لیے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ روتی ہوئی علینہ پانی لینے کے لیے کچن کی طرف بھاگی۔

انہیں بیڈ پہ تکیوں کے سہارے بٹھا کر پانی پلاتے ہوئے یک لخت عالیہ بیگم کی آنکھیں بھی چھلک پڑیں ندامت سے ان کی سمت تکتا شاہی لب بھینچ کر رہ گیا۔

"شاہی!" داؤد صاحب نے دھیرے سے اسے پکارا تو وہ بے اختیار ان کے قریب ہوا۔

"جی بابا۔۔۔"

"تمہیں اس سب کے بارے میں علم تھا نا؟" اس کا چہرہ تکتے ہوئے انہوں نے آہستگی سے پوچھا۔

"جی بابا!" وہ بے اختیار نظریں چرا گیا تو بہروز صاحب کی مارے غصے کے مٹھیاں بھینچ گئیں۔

"تم نکاح میں بھی شریک تھے؟" ان کی آواز میں موجود تھکن جیسے دوچند ہو گئی تھی۔

"جی۔۔۔" شاہی کا سر اس کے سینے سے جا لگا تھا۔ کمرے میں بوجھل سی خاموشی چھا گئی۔

"تم لوگ جاؤ۔ میں کچھ دیر اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ شکستہ سے بولے تو شاہی تڑپ اٹھا۔

"پلیز بابا۔۔۔ ہمارا مقصد آپ کو۔۔۔"

"شاہی۔۔۔ میں نے کہا نا سب جاؤ یہاں سے۔" انہوں نے دھیمے۔ لیکن سخت لہجے میں کہتے ہوئے پلکیں موند لیں تو نہ چاہتے ہوئے بھی سب کو باہر جانا پڑا۔

غیر مرئی نقطے پہ نگاہیں جمائے داؤد صاحب کے ذہن میں بے اختیار اجیہ کا نفرت میں ڈوبا چہرہ گھوم گیا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

کتنی آرزو تھی ان کی کہ وہ اس کی ہر بدگمانی' ہر نفرت کو دور کر کے مرنے سے پہلے ایک بار' سے اپنے سینے سے لگا سکیں۔ مگر ان کی بدقسمتی کہ ان کی یہ آرزو اب بھی پوری نہیں ہونے والی تھی۔ حتیٰ کہ وہ اس وقت بھی شدید خواہش کے باوجود اپنے سامنے بلکتی اجیہ کو اٹھا کے خود سے لگا نہ سکے تھے۔ اسے اپنے ہونے کا یقین نہیں دلا سکے تھے۔

اپنی اس درجہ بے بسی پہ ان کے آنسوؤں میں شدت در آئی اور بے اختیار وہ وقت انہیں یاد آنے لگا جب زندگی ان تمام تکلیفوں سے عاری بہت ہلکی' بہت خوب صورت تھی۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ)

مہ وش ملک

موسم سرما اپنے عروج پہ تھا۔ ساتھ ساتھ امتحانات کا موسم بھی۔ جیسے ہی امتحانات ختم ہوئے بچوں نے گھومنے پھرنے اور نانا کے گھر جانے کی رٹ لگا دی۔ شگفتہ نے نعمان کو بچوں کا مطالبہ پہلے ہی سے بتا رکھا تھا۔ جیسے ہی نعمان نے پروگرام ترتیب دیا' فواد' جواد' صبا تینوں بچوں نے خوشی سے بے قابو ہو کر سارا گھر سر پہ اٹھا لیا۔ جواد اور صبا نے دانیہ اور دانیال کو اپنے جانے کا بتایا۔ دانیہ اور دانیال بھی ساتھ جانے کو ہمکنے لگے۔ دانیہ کو تو پچھلا تجربہ اور ماں کی نصیحتیں یاد تھیں۔ وہ تو چپ کر گئی۔ مگر دانیال افشین کو آوازیں دیتا باورچی خانے میں آگیا۔

"امی! جواد، فواد سب گھومنے جارہے ہیں۔ ہم بھی ان کے ساتھ چلے جائیں صرف دو دن کی تو بات ہے۔ جانے دیں نا' وہاں کوئی شرارت کوئی بدتمیزی نہیں کریں گے' پکا وعدہ۔" نو سالہ دانیال نے چہرے پہ حد درجہ معصومیت سجاتے ہوئے افشین سے التجا کی۔

افشین جو ہانڈی کے لیے مسالا بھون رہی تھی۔ دانیال کی بات سنی ان سنی کردی۔ دانیال نے افشین کے اور قریب ہوتے ہوئے پھر التجا کی۔ جواد' فواد' صبا تینوں دروازے میں کھڑے پرشوق التجائیہ نگاہوں سے پھپھو کے فیصلے کے منتظر تھے۔ دانیہ نے بھی آگے بڑھ کر بھائی کا ساتھ دیا۔

افشین کے لیے بچوں کی اس طرح کی فرمائش آزمائش بن جایا کرتی تھی۔ جو اسے ہمیشہ ایک دوراہے پہ لا کھڑا کرتی۔ فیصلے کے دوراہے پہ اسے وہ فیصلہ کرنا تھا جو فاصلے کم کرسکے۔ مگر ہر گزرتے دن کے ساتھ یہ فاصلے بڑھتے ہی جارہے تھے۔

انسان کبھی کبھی کتنا بے بس ہوجاتا ہے۔ کھائی اور آگ میں سے کسی ایک کم نقصان والی چیز کا انتخاب بذات خود ایک پل صراط بن جاتا ہے۔

افشین نے بھی دو سال پہلے اپنی دانست میں ایک مستحکم اور مستحسن فیصلہ کرکے اپنے محبتوں اور ریاضتوں سے بنائے گھر کو اپنے دو معصوم بچوں سمیت پار کرکے والدین کی دہلیز پہ آبیٹھی تھی مگر ان دو سالوں کے سات سو تیس دنوں کے ہر ہر لمحے اسے یہ احساس ہوا کہ اس کے فیصلے کی فصل شاید ہی کوئی پائیدار پھل لاسکے۔

افشین ڈوئی رکھ کر دانیال کی طرف متوجہ ہوئی اور پیار سے سمجھانے لگی۔

"بیٹا! آپ کو نزلہ بھی ہے اور میتھس کا پیپر بھی ٹھیک نہیں ہوا تو کیوں نہ ہم ان چھٹیوں سے فائدہ اٹھائیں اور میں آپ کو میتھس کی تیاری کروادوں تاکہ آپ فائنل میں دوبارہ پوزیشن لے سکیں۔"

دانیال نزلے کی وجہ سے پہلے ہی سے چڑچڑا ہورہا تھا۔ اوپر سے افشین کے اس پڑھائی زدہ انکار کو سن کر مزید بگڑنے لگا۔

"امی! آپ ہر دفعہ ایسی ہی باتیں کرکے کہیں نہیں جانے دیتیں۔ دو دنوں سے کچھ نہیں ہوتا' میں واپس آکر پڑھ لوں گا۔ آج اگر ہم اپنے گھر ہوتے تو بابا کے ساتھ گھومنے جاتے۔ آپ نہ خود کہیں لے کر جاتی ہیں۔ نہ کسی اور کے ساتھ جانے دیتی ہیں۔"

جن بچوں کی خاطر اس نے یہ سب کیا۔ افشین کو لگا آج پھر وہ ان بچوں کی عدالت میں مجرم بن گئی ہے اور آزمائش سزا بن گئی ہے۔ صبا اور جواد نے بھی افشین سے دانیہ اور دانیال کو ساتھ بھیجنے کا کہا۔ اتنے میں شگفتہ بھی باورچی خانے میں آگئی' جو سارا منظر دیکھ چکی تھی۔ وہ بچوں کو نظر انداز کرکے آٹا گوندھنے لگی۔ سب بچوں نے ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی شہر پائی اور افشین کی منت کرنے لگے۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔" شگفتہ نے اپنے بچوں کو گھر کا۔ "چلو جاؤ یہاں سے۔"

بچے ایک دم خاموش ہوگئے۔ جواد نے ماں کے غصے کو نظر انداز کرکے شگفتہ سے کہا۔ "امی! آپ پھپھو سے کہیں' دانیہ اور دانیال کو ہمارے ساتھ بھیج دیں۔"

"جواد! خوامخواہ ضد نہیں کرو۔ دانیال کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ پھپھو ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ جاؤ باہر جاکر کھیلو۔"

افشین بچوں کو لے کر باہر آگئی۔

"تم تینوں کی ضرورتیں ہی پوری نہیں ہوتیں کہ اب ان دو کو بھی پالنا پڑ گیا تو ہوگئی پوری۔"

شگفتہ تیز تیز بڑبڑا رہی تھی۔ اس کی آواز باہر تک صاف سنائی دے رہی تھی۔ شگفتہ بظاہر کھلے دل کی مالک تھی۔ اس نے افشین اور اس کے بچوں کو اپنے اور اپنے بچوں کے حصے کا حصہ دار سمجھ کر کبھی بیر نہیں رکھا مگر جہاں دو برتن ہوں' وہ ٹکراتے ضرور ہیں۔ اور ان سے آواز بھی پیدا ہوتی ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ جاڑے کی ایک جامد سی شام تھی۔ تمام دن کی تھکاوٹ کے بعد افشین کا سر درد سے بوجھل ہورہا تھا۔ وہ جلد ہی بستر پہ لیٹ گئی اور بچوں کو بھی ہوم ورک ختم کرکے لیٹنے کو کہا۔ دانیال اور دانیہ ہوم ورک ختم کرکے کھسر پھسر کررہے تھے۔ جیسے ہی انہیں باہر سے بچوں کی آوازیں آئیں انہوں نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

آج جواد اور فواد کی دیرینہ خواہش پوری ہوگئی تھی۔ نعمان نے انہیں ویڈیو گیم لا کردی تھی۔ نعمان' شگفتہ بچے سب خوشی خوشی اسے آن کرنے میں لگے تھے۔ دانیال اور دانیہ بھی ان کی خوشی میں شریک ہوگئے۔ نعمان نے دونوں بھانجے' بھانجی کو بھی ساتھ بٹھالیا۔ کافی دیر تک جب دونوں بچے واپس نہ آئے تو افشین بمشکل اٹھی اور انہیں سونے کے لیے واپس لائی۔

اگلے دن اسکول سے واپسی پہ جواد اور فواد دونوں گیم لگا کر بیٹھ گئے۔ دانیال بھی اسکول سے آتے ہی ان کے کمرے کی طرف لپکا۔ پہلے تو تینوں خوشی خوشی کھیلتے رہے لیکن جب فواد کم اسکور کرنے لگا اور دانیال جیتنے لگا تو فواد نے غصے میں آکر دانیال کے ہاتھ سے ریموٹ کھینچ لیا۔

"چھوڑو میرا ریموٹ۔ یہ میرا ہے تمہارا نہیں۔"

"کیوں چھوڑوں تم گیم ہار رہے ہو۔ تم چھوڑو۔"

دانیال نے ریموٹ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے گاڑی کی اسپیڈ بڑھاتے ہوئے کہا۔ فواد نے دوبارہ دانیال کے ہاتھ سے ریموٹ کھینچا۔

"اٹھو یہاں سے یہ میرا ہے۔ میرے بابا لائے ہیں۔" دانیال مزید تن کر بیٹھ گیا۔ جواد بھی بھائی کی طرف داری کرتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھ گیا اور دانیال کے پاؤں کو ٹھوکر مار کر اس کے ہاتھ سے ریموٹ کھینچنے لگا۔

"اپنے گھر جاؤ۔ اپنے بابا سے کہو تمہیں بھی ایسی گیم لادیں۔ میری گیم مجھے واپس کرو۔" فواد نے غصے میں آکر دانیال کے بال کھینچنا شروع کردیے۔ دانیال کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

افشین شور کی آوازیں سن کر بچوں کے کمرے کی طرف دوڑی۔ جہاں تینوں آپس میں دست و گریبان تھے۔

دانیال! چھوڑو بھائیوں کو" افشین نے زور سے دانیال کو کہا۔ اتنے میں شگفتہ بھی آگئی۔ اس نے جواد' فواد دونوں کو پیچھے ہٹانے کی کوشش کی۔ دانیال نے زور سے مکا فواد کی پیشانی پہ دے مارا۔ جس سے وہ مزید بپھر گیا۔

"مجھے مارتے ہو۔ ٹھہرو میں تمہیں سبق سکھاتا ہوں۔ گھر ہمارا' چیزیں ہماری اور مار بھی ہم کھائیں۔"

جواد' فواد دونوں نے دانیال کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ اس کا سر دیوار سے جا ٹکرایا اور خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ افشین کو اپنا خون نچڑتا ہوا محسوس ہوا۔ شگفتہ سخت بدحواسی کے عالم میں باہر بھاگی۔ پٹی اور روئی لاکر افشین کو دی۔ افشین نے اینٹی سیپٹک پٹی کرکے خون بند کیا اور دانیال کو اٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ اس کے ماتھے پہ پانچ ٹانکے لگے۔

ڈھلتے سورج کی مدھم پڑتی نارنجی شعاعوں کے ساتھ افشین گھر میں داخل ہوئی تو سامنے لگے ستون کے ساتھ چمٹی دانیہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے دانیہ! یہاں کیوں کھڑی ہو؟ نانو کہاں ہیں؟"

پیچھے سے امی کی آوازیں آنے لگیں' جو دانیہ کو ڈھونڈتی اسی طرف آرہی تھیں۔ افشین اور دانیال کو دیکھ کر وہ ان کی طرف لپکیں۔ دانیال جو افشین کے کندھے پہ بے سدھ پڑا تھا۔ اس کے ماتھے پہ پیار کرنے لگیں۔

"دانیال ٹھیک تو ہے خطرے کی تو کوئی بات نہیں نا؟"

افشین نے نفی میں سر ہلایا اور دانیہ کو اشارہ کرکے اندر آگئی۔ دانیال کو بیڈ پر لٹا کر رضائی اوڑھائی۔ امی اس کے لیے گرم دودھ میں ہلدی ڈال کرلے آئیں اور چمچے سے گھونٹ گھونٹ پلانے لگیں۔ تھوڑی دیر میں دانیال سو گیا۔ دانیہ بھی سو گئی تھی۔

"افشین! اٹھو کھانا کھالو' پھر سو جانا۔"
"امی! مجھے بھوک نہیں ہے۔" افشین نے بے خیالی میں جواب دیا اور وضو کے لیے اٹھ گئی۔ نماز پڑھنے کے بعد کتنی دیر وہ سجدے میں دعا کرتی رہی اور بے آواز آنسو اس کے دامن دل کو تر کرتے رہے۔

وہ سونے کے لیے لیٹی تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس نے دانیال کو اٹھ کر دیکھا۔ وہ پر سکون سو رہا تھا۔ وہ دوبارہ بستر پر آکر لیٹ گئی۔

"یہ میرا گھر ہے' تم اپنے بابا سے کہو تمہیں اپنی گیم لا کر دیں۔ یہ میرے بابا لائے ہیں۔ تم اپنے گھر جاؤ' اپنے بابا سے کہو....."

"یہ میرا گھر ہے' یہ میرے بچے ہیں.... کماؤں میں کھاؤ تم۔ میری کمائی سے بنے گھر میں اکڑ کر پھرتی ہے۔ دفعان ہو جاؤ یہاں سے اور بچوں کو بھی لے جاؤ۔ جب انہیں تمہارے بھائی پالیں گے تو میں دیکھوں گا کتنے دن وہ انہیں کھلاتے ہیں۔ سارے کس بل نکل جائیں گے۔ مجھے تو سب میرے بھائی لا کر دیتے ہیں۔" اطہر نے افشین کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

آج کا منظر اور دو سال پہلے کا منظر افشین کے ذہن و دل پہ پھر سے تازہ ہو گیا۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگی۔

"کیا بات ہے افشین! نیند نہیں آرہی۔" امی نے اس کی بے چینی بھانپتے ہوئے کہا۔

"بس ایسے ہی امی!" وہ ٹال گئی۔

"افشین بیٹا! کیوں سوچ سوچ کر کڑھتی ہو۔ بچوں کی آپس کی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہیں۔ تھوڑی دیر میں وہ سب کچھ بھول کر پھر سے شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ تمہارے جانے کے بعد جواد اور فواد دونوں میرے پاس آئے تھے معذرت کرنے۔" انہوں نے چاروں قل پڑھ کر افشین پر دم کیے' پھر گویا ہوئیں۔

"دیکھو افشین! سگے بہن' بھائی بھی آپس میں کتنا لڑتے ہیں اور اگر کزنز اس طرح آپس میں لڑ پڑیں تو وہ بھی برداشت کر لینا چاہیے' نا کہ اسے انا کا مسئلہ بنا کر سر پر سوار کر لیں۔ میں دیکھ رہی ہوں' تم بچوں کے معاملے میں بہت حساس ہوتی جارہی ہو۔"

"یہی تو امی! میں بھی سوچتی رہتی ہوں کہ بچے اب بڑے ہو رہے ہیں۔ میں اس طرح سے نہ بھی سوچوں تو انہیں خود ہر بات کا احساس ہوتا ہے اور پھر مجھے بھی وہ یہ احساس دلاتے ہیں۔ دانیہ بات بات پہ کہتی ہے چلیں! اپنے گھر واپس چلیں۔ بابا سے کہیں ہمیں بھی فلاں فلاں چیز لا کر دیں۔ میں ان کی ہر خواہش پوری کرتی ہوں۔ میں مانتی ہوں بھائی اور بھابھی بھی ان کا خیال رکھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی کوئی خلا ہے ان کے اندر جو مجھے لگتا ہے' ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑا ہو رہا ہے۔"

امی نے متفکر نگاہوں سے افشین کی طرف دیکھا۔

"افشین! دو سال ہو گئے' اطہر نے مڑ کر خبر نہ لی۔ چلو تمہارا نہ سہی' اپنے بچوں ہی کا خیال کرتا۔ اس بے حس شخص کے ساتھ کیسے گزارہ کرو گی۔"

افشین کے حلق میں کانٹے اگ آئے۔ اطہر کے ساتھ گزرے آٹھ سال اس کی آنکھوں کے سامنے آگئے۔

افشین مشرقی عورتوں کی طرح ایک صابر شاکر بیوی تھی۔ جس نے شوہر کی اطاعت و خدمت اور بچوں کی بہترین تربیت کو ہی اپنی زندگی کا حاصل سمجھا۔ اس نے اطہر سے کبھی بے جا مطالبے نہ کیے۔ جو لا دیا' اس پہ شکر کیا۔ جو نہ دیا' اس پہ شکوہ نہیں۔ لیکن اطہر نے اس کی اس اچھی عادت سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور کبھی ڈھکے چھپے' کبھی اعلانیہ افشین سے مطالبے کرتا کہ وہ اپنے بھائیوں سے پیسے لا کر دے اور ساتھ اپنی مردانگی و وقار کا یہ کرشمہ اونچا رکھتا کہ میں تو ان سے تمہارا حصہ مانگ رہا ہوں۔ جس پر وہ سانپ بنے بیٹھے ہیں۔ حالانکہ افشین کے حصے کے پیسے تو اس کے بھائی والد کی وفات کے وقت ہی اسے دے چکے تھے۔ جسے اطہر ہڑپ کر چکا تھا۔ شروع شروع میں تو افشین' اطہر کے مطالبے پورے کرتی رہی' لیکن آہستہ آہستہ اس نے انکار کرنا شروع کر دیا جو اطہر کی انا پر بڑا گراں گزرتا اور یہ بوجھ وہ افشین کو مار پیٹ کر اتارتا۔

افشین تعلیم یافتہ تھی۔ بچوں کی بڑھتی ضروریات اور اطہر کی خود غرضیوں نے بالآخر افشین کو اسکول کی نوکری پہ مجبور کر دیا۔ بجائے احسان مند ہونے کے اسے ایک اور طریقہ ہاتھ آگیا۔ کبھی وہ اسے طعنہ دیتا کہ معاشی خود مختاری ملنے پہ اس کی گردن میں سریا آگیا ہے۔ کبھی یہ طعنہ ملتا کہ کمانے کے بہانے سیر سپاٹے ہوتے ہیں۔ گھر اور شوہر کی کوئی فکر نہیں۔ حالانکہ نادانستگی میں بھی افشین نے کبھی گھر اور شوہر کے معاملے میں کوئی کمی' کوئی کوتاہی ہونے نہ دی تھی۔

ہر لڑکی شادی و شوہر کے حوالے سے خوش کن سپنے سجا کر سسرال جاتی ہے۔ لیکن جب وہ ماں بنتی ہے تو صرف ماں ہی بن کر سوچتی' پہنتی' کھاتی اور زندہ رہتی ہے۔ افشین نے بھی اپنے بچوں کی خاطر ہر زہر' امرت سمجھ کر اپنے اندر اتار لیا۔ لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ اسے یہ احساس شدید تر ہوتا گیا کہ بچوں کا باپ ان کی تربیت سے یکسر غافل ہے۔ وہ ان کے اخراجات سے بھی ہاتھ کھینچنے لگا ہے۔ اطہر کی ہر بات میں روک ٹوک اور شکی فطرت نے افشین کی روح تک جلا ڈالی۔ اس نے یہ بھی برداشت کر لیا۔ پھر اسے اطہر کی کچھ لڑکیوں سے دوستی کا پتا چلا۔ عورت مرد کی ہر برائی برداشت کر لیتی ہے۔ مگر ہر جائی پن نہیں۔ افشین نے بڑھتے ہوئے بچوں کا خیال دلا کر اطہر کو اس کی رنگین مزاجیوں سے روکنے کی کوشش کی۔ مگر بجائے باز آنے کے وہ اور بگڑ گیا۔ افشین کی کوشش ہوتی' وہ اس معاملے میں بچوں کے سامنے کوئی بات نہ کرے۔ مگر تنہائی میں بھی اطہر اتنا شور ہنگامہ کرتا اپنی پارسائی کے دعوے اتنے زور و شور سے کرتا کہ بچے نہ سمجھتے ہوئے بھی سب سمجھ جاتے۔

اطہر کی روز' روز کی لڑائیوں' شور شرابے کے نتیجے میں بچے' باپ سے دور ہونے لگے۔ گھر سے نکل جانے کی دھمکیوں نے افشین کو سوچنے پہ مجبور کر دیا کہ باپ کے ہوتے ہوئے بھی اگر بچوں کو ایسی یتیمی کی زندگی بسر کرنا ہے تو اس سے بہتر ہے کہ وہ انہیں لے کر میکے چلی جائے۔ جہاں اسے یہ گمان تھا کہ بچوں کو ہر طرح کا ذہنی' قلبی' روحانی اور کسی حد تک مالی تحفظ بھی حاصل ہوگا۔ کچھ عرصہ تو اس طرح سے ہوا۔ مگر پھر اس گمان کے آئینے میں بھی بال آنا شروع ہو گئے اور یہ حقیقت شدت سے اس پہ واضح ہو گئی کہ اپنی چیز اپنی ہوتی ہے۔ مانگے کی اور تقسیم ہوئی چیزیں نہ باعث اطمینان ہوتی ہیں' نہ باعث تحفظ۔ خواہ ہیرے ہی کی کیوں نہ ہوں۔

☼ ☼ ☼

"دانیہ بیٹا! کیوں تنگ کر رہی ہو۔ چلو! جلدی کرو۔ اسکول سے دیر ہو رہی ہے۔ بھائی ہوتا ہے نا تمہارے ساتھ۔" افشین نے پیار سے دانیہ کو سمجھایا۔

"بس! میں نے کہہ دیا ہے' نہیں جاؤں گی' نہیں جاؤں گی۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ بھائی تو دوستوں کے ساتھ کھیلنے میں لگا رہتا ہے۔ اسے کہاں کچھ پتا چلتا ہے اسٹاپ پہ اتنے بڑے بڑے دو مونچھوں والے لڑکے تھے۔"

دانیہ نے ہاتھ لمبا کر کے ان کا قد بتایا۔

"وہ مجھے تنگ کر رہے تھے۔ میں ڈر کر بھائی کے پیچھے کھڑی ہو گئی تو وہ اونچا اونچا ہنسنے لگے اور وہ۔ وہ۔"

دانیہ نے ہچکیوں میں رونا شروع کر دیا۔ "وہ جو گلی کے کونے میں دکان ہے۔ جہاں سے بھائی بسکٹ خریدتا ہے۔ اس کا دکان دار روز مجھے کہتا ہے' اندر آجاؤ۔ میں تمہیں آئس کریم دوں گا بے بی۔"

افشین کے اردگرد بم پھٹنے لگے۔ جس امان کی خاطر اس نے گھر چھوڑا تھا۔ وہ تو یہاں بھی میسر نہیں۔ بلکہ بے امانی اور بے ایمانی کی مزید نئی نئی قسمیں اس کے سامنے آرہی تھیں۔ اس کے دل میں وسوسوں کے ناگ پھن پھیلائے بھاگنے دوڑنے لگے۔ وہ وہیں صوفے پہ بیٹھ گئی۔ دانیہ کو گلے سے لگایا۔ اس کے آنسو صاف کیے۔

نعمان کے بچوں کی وین لگی ہوئی تھی۔ اس نے افشین سے کہا۔ وہ اپنے بچوں کو بھی اس پر بھیج دیا

کرے۔ مگر بھائی پر مزید بوجھ پڑنے کے خیال سے افشین نے بچوں کو پیدل ہی اسکول بھیجنے فیصلہ کرلیا۔ محلے کے اور بچے بھی ان کے ساتھ جاتے۔ اس لیے اسے تسلی رہتی تھی۔ مگر اب یہ تسلی بھی گئی۔

"دانیہ! میں خود تم دونوں کو اسکول چھوڑ کر آیا کروں گی۔ چلو! اٹھو' تیار ہو۔"

"اور واپس بھی لے کر آئیں گی؟" دانیہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے! اٹھو' جلدی کرو۔" افشین نے ان دونوں کو ناشتا کرایا۔ عبایا پہنا اور انہیں اسکول چھوڑنے چل پڑی۔

سامنے سے آتے موٹر سائیکل کو دیکھ کر دانیہ نے ماں کا بازو ہلا کر اسے متوجہ کیا۔

"امی! وہ دیکھیں۔ سعدیہ اب اپنے بابا کے ساتھ اسکول آتی ہے۔ پہلے وہ بھی ہمارے ساتھ جاتی تھی۔ اسے بھی لڑکے تنگ کرنے لگے تو اس کے بابا اسے خود اسکول چھوڑنے آنے لگے۔ امی! آپ بھی بابا سے کہیں' مجھے اسکول چھوڑ آیا کریں اور واپس بھی لایا کریں پہلے کی طرح۔" دانیہ نے فٹ پاتھ کے بیچ میں کھڑے ہو کر افشین سے ایک اور مطالبہ کردیا۔

"دانیہ! یہاں کہاں کھڑی ہو گئی ہو۔ جلدی چلو صرف پانچ منٹ رہ گئے ہیں۔ میں جو چھوڑنے آئی ہوں' یہ کافی نہیں ہے کیا؟"

دانیہ خاموشی سے ماں کے ساتھ چل پڑی۔ اسکول کے گیٹ میں داخل ہوتے ہی دانیہ کہنے لگی۔

"امی! آپ اگر واپسی پہ خود نہ آئیں تو میں بھائی کے ساتھ نہیں آؤں گی۔"

"بے فکر رہو۔ میں خود آؤں گی۔" دانیہ کے دھمکی دینے پر افشین نے اسے اطمینان دلایا۔

☼ ☼ ☼

سارا رستہ' سارا دن دانیہ کے تین جملے "مجھے لڑکے تنگ کرتے ہیں' دکان والے نے مجھے اندر آنے کو کہا۔ بابا سے کہیں مجھے اسکول چھوڑ کر آیا کریں۔" افشین کے اعصاب پہ سوار رہے۔

واپسی پہ دانیہ صبح کی باتوں کو بھول کر ایک اور کہانی سنا رہی تھی۔

"امی! اگلے ہفتے میرا ریڈ ڈے ہے۔ مجھے ریڈ کلر کے کپڑے چاہیے۔ فریش اسٹرابیری جوس اور بارہ ایپلز چاہیے۔" افشین کو خاموش پا کر دانیہ کو لگا' جیسے اس کی ماں نے کچھ سنا ہی نہیں۔ اس نے دوبارہ ساری بات بتائی۔

"اچھا بیٹا! لے دوں گی۔" کہہ کر افشین نے دانیہ کو تو مطمئن کردیا۔ مگر خود مضطرب ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

رات کو اس نے کچھ جھجکتے ہوئے نعمان سے پندرہ سو روپے مانگے۔ نعمان نے موبائل پہ انگلیاں چلاتے چلاتے پوچھا۔

"کس لیے چاہئیں؟"

"دانیہ کے اسکول میں ریڈ کلر ڈے ہے۔ اس کے لیے کچھ چیزیں لینی ہیں۔"

"یہ اسکول والے بھی سمجھتے ہیں' پیسے درختوں کے ساتھ لگتے ہیں' جو ہر دوسرے دن اس طرح کے چونچلے کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ہم بچوں کو اسکول پڑھنے کے لیے بھیجتے ہیں' چونچلوں کے لیے نہیں۔"

افشین کی بھی یہی رائے تھی۔ مگر وہ اس وقت بحث کے موڈ میں نہیں تھی۔

"افشین! تمہیں تو معلوم ہے' میری کمائی بھی اور اخراجات بھی۔ ابھی مہینے کا آغاز ہے اور میری جیب میں صرف تین' چار ہزار روپے ہیں اور گیس کا پانچ ہزار بل ابھی واجب الادا ہے۔"

"کوئی بات نہیں بھائی! وہ میں نے امی سے بھی مانگے تھے۔ مگر ان کے پاس بھی نہ تھے تو میں نے سوچا' آپ سے پوچھ لیتی ہیں۔ چلیں! اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے۔ وہ کوئی اور سبب پیدا کردے گا۔"

افشین شرمندہ شرمندہ سے قدم اٹھاتی باہر نکل آئی۔ نعمان نے کچھ سوچ کر اسے آواز دی۔ افشین' نعمان سے نظریں ملائے بغیر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ نعمان نے جیب سے تین سو روپے نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیے۔

"فی الحال میرے پاس یہی ہیں۔ ان میں گزارہ کرلو۔"

افشین جب اطہر سے بچوں کے خرچ کے لیے پیسے مانگتی تو وہ منظر بھی ایسا ہی ہوتا۔ مگر آج بھائی سے مانگنے میں ہتک اور حزن کا رنگ نہایت نمایاں تھا۔

افشین' امی بچوں کے کپڑے استری کرکے امی کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ وہ آنکھیں موندے کوئی وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ افشین کا روم روم بے حد تھک چکا تھا وہ ماں کے سینے سے لگ کر ساری تھکاوٹ اتارنا چاہتی تھی۔ جوان بیٹیاں والدین کی دہلیز پہ آکر بیٹھ جائیں تو والدین کے سینے اتنے تھکن زدہ ہو جاتے ہیں کہ پھر حساس بیٹیاں انہیں مزید نہیں تھکاتیں۔ افشین بھی یہی سوچ کر خاموش ہو گئی۔

امی نے آنکھیں کھولیں تو سامنے اسے متفکر پایا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں اور اسے سینے سے لگالیا۔ ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ افشین بے بسی سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جب کچھ بوجھ ہلکا ہوا تو انہوں نے اس کے سر پہ پیار کیا اور ہمت و حوصلے کی دعا دی۔

"امی! میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں! کہو بیٹا۔"

"امی! امتیاز چاچو جن کے توسط سے یہ رشتہ آیا تھا۔ آپ اگر ان سے بات کریں کہ وہ بیچ میں پڑ کر اطہر کو سمجھائیں کہ وہ ہمیں گھر واپس لے جائیں؟"

امی خاموش ہو گئیں۔ وہ جانتی تھیں کہ اطہر کسی کی بات ماننے والا نہیں۔ مگر افشین کا دل رکھنے کے لیے انہوں نے ایسے کسی خدشے کا اظہار نہیں کیا۔

"ٹھیک ہے افشین! تم نے اگر گھر واپس جانے کا فیصلہ کرلیا ہے تو یقیناً سوچ سمجھ کر درست ہی فیصلہ کیا ہوگا۔ میری زندگی کا کیا بھروسا ہے۔ آج ہے' کل نہیں۔ ایک بھائی تمہارا نوکری کے سلسلے میں کبھی ایک شہر کبھی دوسرے شہر ہوتا ہے۔ نعمان کے بھی اپنے سو خرچے' سو مسئلے ہیں۔ اطہر جیسا بھی ہے' ہے تو تمہارے بچوں کا باپ نا اور جو بچے' باپ کے زیر سایہ پلتے ہیں' ان کی اٹھان ہی الگ ہوتی ہے۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ میں ابھی امتیاز کو فون کرکے کہتی ہوں۔" وہ فون کرنے اٹھ گئیں۔

امتیاز صاحب' اطہر کے گھر گئے۔ ہر ممکن طریقے سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر اطہر بجائے بات سمجھنے کے اپنے ہی شکوے' شکایتوں کی پٹاری کھولے بیٹھا رہا اور اس بات پہ مصر رہا کہ افشین خود گئی ہے۔ وہ اس کی منتیں کرنے نہیں جائے گا۔ جب امید کی کوئی کرن نظر نہ آئی تو امتیاز صاحب نے نہایت بے بسی سے افشین اور اس کی والدہ سے معذرت کرلی۔

☼ ☼ ☼

شیشے کے امتحان میں افشین نے انا کی پہلی کرچی پہ پاؤں رکھا اور گھر واپس جانے کا فیصلہ کرلیا۔

اطہر گھر پہ ہی تھا۔ بچوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ باپ کو دیکھتے ہی وہ اس سے لپٹ گئے اور بے تحاشا پیار کرنے لگے۔ اطہر کو اس ساری صورت حال کی توقع نہ تھی۔ پھر بچوں کو دیکھ کر دل پسیج گیا۔

"بابا! آپ ہمیں لینے کیوں نہیں آئے؟ ہم نے وہاں آپ کو بہت یاد کیا۔ کیا ہم آپ کو یاد نہیں آئے؟"

بچے اطہر کے ساتھ چمٹے اندر چلے گئے۔ افشین "خوش آمدید" سننے کی خوش فہمی میں سراپا سماعت بنی صحن میں ساکت ہو گئی۔

"کیوں نہیں! بابا کو اپنے پیارے بچے بہت یاد آتے تھے۔ لیکن وہ جو تمہاری ماں ہے نا۔ اسے بہت گھمنڈ تھا۔ اپنے باپ' بھائی کے گھر جا کر عیش کرنے کا۔ چلو! جلدی عقل ٹھکانے پر آگئی۔"

"بابا! پکا وعدہ کریں۔ آپ ہمیں گھر سے دوبارہ جانے نہیں دیں گے۔ مجھے اسکول بھی خود چھوڑ کر آئیں گے اور آئس کریم بھی دلائیں گے؟" دانیہ نے ایک سانس میں کئی وعدے لے لیے۔

شیشے کے امتحان میں افشین نے عزت نفس کی

دوسری کرچی پہ پاؤں رکھا۔ خوش فہمی کے ہما کو سر سے اڑایا۔ ساکت وجود کو یہ سوچ کر جنبش دی کہ جب کھائی اور آگ میں سے کھائی چن ہی لی ہے تو پھر پڑیاں اور مان ٹوٹیں گے تو۔ پھر کیوں نابہادری اور سمجھ داری سے ان پر پھائے رکھے جائیں۔ ٹوٹی ہوئی چیزیں تو دوبارہ جڑ بھی سکتی ہیں۔ مگر جلی ہوئی دوبارہ جلا نہیں پا سکتیں۔"

افشین نے رب رحیم سے استقلال و آسانیوں کی دعا مانگی اور بیگ اٹھا کر اندر آگئی۔ اس نے دوبارہ اطہر کو سلام کیا۔ اس نے افشین سے نظریں ملائے بغیر سر کو ہلکی سی جنبش دی اور پھر بچوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"چلو بچو! بابا کو تنگ نہیں کرو۔ منہ ہاتھ دھولو۔ اطہر! آپ بھی فریش ہو جائیں۔ میں کھانا بناتی ہوں۔"

افشین باورچی خانے میں آئی تو کاؤنٹر پہ گندے برتنوں کا پھیلاوا پڑا ہوا تھا۔

افشین نے سبزی کی ٹوکری سے ڈھونڈ کر چند آلو نکالے۔ اس نے جلدی سے آلو کی بھجیا بنائی۔ پیٹی کی تہہ میں تھوڑا سا آٹا تھا۔ اسے گوندھ کر روٹی بنائی۔ کھانا لگانے کے لیے دسترخوان کو ہر جگہ ڈھونڈا۔ مگر وہ نہ ملا۔ الماری سے ایک صاف سی چادر نکالی۔ اس پر کھانا چن کر اطہر اور بچوں کو آواز دی۔

اطہر اور بچے باتیں کرتے رہے اور وہ فقیرنی بنی بیٹھی رہی کہ شاید اس کے کاسے میں بھی چند بول پڑ جائیں۔ شیشے کے امتحان میں اس نے خودداری کی تیسری کرچی پہ پاؤں رکھا۔

"اطہر! کیسا بنا کھانا؟ آپ کو میرے ہاتھ کا ذائقہ یاد تو آتا ہوگا۔" افشین نے بہت مان اور محبت سے پوچھا۔

اطہر ایسے انجان بن گیا' جیسے سنا ہی کچھ نہ ہو۔ افشین نے اس خاموشی کو طنز سے زیادہ بہتر جانا اور برتن اٹھا کر چلی گئی۔

اطہر بچوں کے بیگ کھول کر بیٹھ گیا اور دو سالوں کی رپورٹ کرید کرید کر پوچھنے لگا۔ افشین نے شکر ادا کیا۔ بچوں نے بھی "سب اچھا ہے" کی رپورٹ پیش کی۔

افشین بچوں کو ان کے کمرے میں سلا کر اپنے کمرے میں آگئی۔ وہ اطہر سے ادھر ادھر کی باتیں کر کے ہر ممکن طریقے سے اس کا موڈ اچھا کرنے کی کوشش میں ہلکان ہوتی رہی۔ مگر "ہوں' ہاں" سے زیادہ اس نے کوئی بات نہ کی۔ الماری ٹھیک کر کے کپڑے ترتیب سے رکھ کر وہ سونے کے لیے بیڈ پہ آکر لیٹ گئی۔

مرد کے دل میں عورت کے لیے بھلے عزت نہ ہو۔ محبت نہ ہو۔ مگر وہ اس سے اپنی ہر ضرورت اور مسرت حاصل کرنا کبھی نہیں بھولتا۔

اطہر نے کمرے کی لائٹ بند کر دی۔

☼ ☼ ☼

افشین نے گھر کو نئے سرے سے گھر بنایا۔ اطہر بچوں کو اسکول سے لانے' لے جانے لگا۔ بچوں کے ساتھ اس کا رویہ کافی مشفقانہ ہو گیا۔

البتہ افشین کے ساتھ اس کا رویہ ویسا ہی لیا دیا سا رہتا۔ کبھی کبھی اپنی دھن میں ہوتا تو اگلے پچھلے سارے حساب چکا دیتا۔ ایک بڑی مثبت تبدیلی جو اس میں آئی کہ اس کی رنگین مزاجیوں میں کافی حد تک کمی آگئی تھی۔ بلکہ نہ ہونے کے برابر ہو گئی تھیں اور یہ افشین کی دعاؤں اور صبر کی دوسری بڑی کامیابی تھی۔ افشین کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ اپنی راج دھانی میں ہے۔ جہاں اس کے بچوں کے روم روم سے تحفظ اور اعتماد جھلکتا تھا۔ جس کے سامنے چھوٹی چھوٹی تلخیاں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔

اطہر کو سرتاپا بدلنا ناممکن تھا۔ مگر اس کے اپنے وجود کے دو ٹکڑوں اور تیسرا جو اس کے اندر سانس لے رہا تھا' ان کی بہترین تربیت افشین کے لیے ممکن تھی۔ بچوں کو بہترین انسان بنانا افشین کی اولین ذمہ داری تھی اور یہی اس سے تقاضا بھی کہ

یہی زیست ہے۔ یہی عورت کی معراج ہے۔ یہی امتحان ہے شیشے کا۔

☼

لکھا ہے حضرت سعدی نے اک حکایت میں
"پڑا دمشق میں اک بار اس بلا کا قحط
وہاں کے اہلِ وفا عشق تک بھلا بیٹھے
حصارِ حلقۂ بے چہرگی میں جا بیٹھے"
نہیں وہ قحط کا عالم ہماری دُنیا میں
بہت سے لوگ ہیں نالاں اگرچہ "حصے" پر
کہیں زیادہ کہیں کم سہی مگر پھر بھی
ہے رزق سب کو میسر زمیں کے تختے پر
تو پھر یہ کیسے ہوا آج بھی زمانے میں
سرورِ عشق کو خلقت بھلائے بیٹھی ہے
ہر اک راہ پہ کاسے سجائے بیٹھی ہے
جو ہوتے حضرت سعدی تو اب وہ یوں لکھتے
"دمشق وقت میں اب کے عجیب قحط پڑا
کہ عشق بھولنے والے دعا بھی بھول گئے
دلوں سے غم ہوا رخصت تو شرم آنکھوں سے
کہ خود میں گم ہوئے ایسے' خدا بھی بھول گئے"

امجد اسلام امجد

نہ جی بھر کے دیکھا نہ کچھ بات کی
بڑی آرزو تھی ملاقات کی

شب ہجر تک کو یہ تشویش ہے
مسافر نے جانے کہاں رات کی

مقدر مری چشم پر آب کا
برستی ہوئی رات برسات کی

اُجالوں کی پریاں نہانے لگیں
ندی گنگنائی خیالات کی

میں چپ تھا تو چلتی ہوا رک گئی
زبان سب سمجھتے ہیں جذبات کی

کئی سال سے کچھ خبر ہی نہیں
کہاں دن گزارا کہاں رات کی

بشیر بدر

یوں بھی نہیں کہ میرے بُلانے سے آگیا
جب وہ نہیں سکا تو بہلنے سے آگیا

ہم کرکے بات پھنس گئے اپنے ہی جال میں
کیا پلٹ کے تیر نشانے سے آگیا

آتا نہ تھا کبھی ہمیں اپنا خیال کچھ
اتنا بھی اس کو پاس بٹھانے سے آگیا

کیا لاتعلقی سے ہوا فائدہ ہمیں
کیا اس کے ہاتھ بات بڑھانے سے آگیا

کچھ اور بھی سپنو لیے حق دار تھے ظفر
میں اپنے آپ اُٹھ کے خزانے سے آگیا

ظفر اقبال

کہیں چھت تھی، در و دیوار تھے، کہیں ملا مجھ کو گھر کا پتا دیر سے
دیا تو بہت زندگی نے مجھے، مگر جو دیا وہ دیا دیر سے

ہوا نہ کوئی کام معمول سے، گزرے شب و روز کچھ اس طرح
کبھی چاند چمکا غلط وقت پر، کبھی گھر میں سورج اگا دیر سے

یہ سب اتفاقات کا کھیل ہے، یہی ہے جدائی، یہی میل ہے
میں مڑ مڑ کے دیکھا کیا دور تک، بنی وہ خموشی صدا دیر سے

کہیں رک گئے راہ میں بے سبب، کبھی وقت سے پہلے گھر آئی شب
ہوئے بند دروازے کھل کھل کے سب جہاں بھی گیا میں گیا دیر سے

سجا دن بھی، روشن ہوئی رات بھی، بھرے جام لہرائی برسات بھی
رہے ساتھ کچھ ایسے حالات بھی، جو ہونا تھا جلدی، ہوا دیر سے

بھٹکتی رہی یوں ہی ہر بندگی، ملی نہ کہیں سے کوئی روشنی
چھپا تھا کہیں بھیڑ میں آدمی، ہوا مجھ میں روشن خدا دیر سے

ندا فاضلی

صبا سحر

طبی پیشہ

"نکل جاؤ یہاں سے، مجھے تو آج معلوم ہوا ہے کہ تم گورکن ہو۔ حالانکہ تم کہتے تھے کہ تم ڈاکٹر ہو۔" لڑکی کے باپ نے غصے سے چلاتے ہوئے نوجوان کو گھورا۔
"جناب! میں نے آج تک خود کو ڈاکٹر نہیں کہا۔" نوجوان نے اعتماد سے وضاحت دینے کی کوشش کی۔ "میں تو ہمیشہ سے یہی کہتا آرہا ہوں کہ میری روزی کا دارومدار طبی پیشے کی مہارت پر ہے۔"

الماس تنویر۔ ہزارہ

حق دار

ایک خاتون کو اس کی پڑوسن نے نیک دلی سے یہ اطلاع دی کہ اس کا شوہر کلفٹن پر سنہرے بالوں والی ایک لڑکی کے ساتھ گھوم رہا تھا۔
"مجھے معلوم ہے، میرے شوہر کی تنخواہ بے حد کم ہے، جو وہ ہر ماہ میرے ہاتھ پہ رکھ دیتا ہے۔ میں اسے روزانہ دفتر جاتے ہوئے بس کا کرایہ اور چائے کے پیسے دیتی ہوں۔ پچاس سال کی عمر میں اگر سنہرے بالوں والی کوئی لڑکی بغیر معاوضے کے اس کے ساتھ گھوم پھر سکتی ہے تو میرا شوہر یقیناً "اس تفریح کا حق دار ہے۔" خاتون نے نہایت سکون سے جواب دیا۔

سلمٰی امتیاز۔ لیبر اسکوائر

گفٹ

شوہر کی سالگرہ پر بیوی نے بہت محبت سے پوچھا۔
"میں آپ کو کیا گفٹ دوں؟"
"تم مجھے پیار کرو۔ میری عزت کرو اور میرا کہنا مانو۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔" شوہر نے بھی بہت محبت سے جواب دیا۔
"نہیں۔ میں تو گفٹ ہی دوں گی۔" بیوی نے اٹھلا کر جواب دیا۔

ہما ساجد۔ کراچی

بے چارگی

ڈور ٹو ڈور اشیا فروخت کرنے والے دو سیلز مین بہت عرصے بعد ایک دوسرے سے ملے تو حال احوال کے بعد کام کے بارے میں دریافت کرنے لگے۔
"آج کا دن تو بہت ہی برا گزرا۔" ایک سیلز مین نے حالات کا شکوہ کرتے ہوئے کہا۔ "کہیں ڈانٹ پھٹکار سننے کو ملی تو کہیں گالیاں۔ کہیں لوگوں نے منہ بنا کر دروازے بند کرلیے اور کہیں لوگ خوب گرجے۔ فروخت کچھ بھی نہ ہوا۔"
"ویسے کیا فروخت کررہے ہو آج کل؟" دوسرے سیلز مین نے تاسف سے پوچھا۔
"اخلاق سنوارنے والی کتابیں۔" پہلے سیلز مین نے افسردگی سے جواب دیا۔

نور جہاں تجمل۔ میٹرول

واضح اشارہ

ایک لڑکی اپنے فلیٹ میں رات کے وقت اپنے مکالمے کی ریہرسل کررہی تھی۔ اس کا مکالمہ تھا۔

"اب مجھے آپ کو شب بخیر کہہ دینا چاہیے۔" وہ فقرے کے ایک ایک لفظ پر زور دے کر یاد کر رہی تھی۔ صبح ناشتے کے وقت لڑکی کا پڑوسی جو پتلی دیواروں سے ملحقہ فلیٹ میں رہتا تھا پاس آیا اور کہنے لگا۔
"میرے خیال میں آپ کے رات والے مہمان کو رخصت ہونے کے لیے کسی صاف اور واضح اشارے کی ضرورت تھی۔"

لبنیٰ اسرار۔ مردان

علیحدگی

عدالت میں علیحدگی کا کیس تین سال تک چلا۔ شوہر اور بیگم سے علیحدگی کے کاغذات پر دستخط کروالیے گئے۔ دستخط کے بعد بیوی نے شوہر کو مخاطب کر کے کہا۔
"ایک بات صاف صاف بتا دوں... اگر تم نے ماہانہ اخراجات کی ادائی میں ایک دن کی بھی تاخیر کی تو میں علیحدگی منسوخ کر کے تمہارے گھر رہنے آجاؤں گی۔"

عظمیٰ ظہور۔ بشام

بری خبر

ایک بڑے بزنس مین کا دفتری ملازم اس کے بنگلے پر پہنچا اور بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہو کر غمزدہ لہجے میں بولا۔
"بیگم صاحبہ! سیٹھ صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔"
بیگم صاحبہ نے ہلکی سی چیخ ماری۔ چند آنسو بہائے پھر سنبھل گئیں۔ ملازم نے تھوڑی دیر بعد دوبارہ ادب سے کہنا شروع کیا۔
"بیگم صاحبہ! بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ نے یہ خبر سننے کے بعد بڑی جلدی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ ویسے سیٹھ صاحب زندہ ہیں۔ دراصل اسٹاک مارکیٹ میں ان کا سارا سرمایہ ڈوب گیا ہے۔ وہ کنگال ہو گئے ہیں۔ لیکن انہوں نے کہا تھا کہ یہ بری خبر میں آپ کو ایک دم نہ سناؤں بلکہ آہستہ آہستہ آپ کو ذہنی طور پر تیار کر کے سناؤں..."

حنا شاہد۔ اورنگی ٹاؤن

وجہ تسمیہ

ایک دفتر کا ڈائریکٹر دوسرے دفتر کے ڈائریکٹر سے پوچھ رہا تھا۔ "ارے بھئی! تم نے اپنی سیکریٹری کو نوکری سے کیوں نکال دیا۔"
"اسے کسی بھی لفظ کی اسپیلنگ ہی نہیں آتی تھی۔ جب بھی میں کوئی لیٹر ڈکٹیٹ کروانے بیٹھتا وہ ہر لفظ کی اسپیلنگ مجھ سے پوچھنے لگتی تھی۔" دوسرے ڈائریکٹر نے غصے سے جواب دیا۔
"یہ تو واقعی بڑا مسئلہ تھا۔ بار بار کی مداخلت سے تمہیں کوفت ہوتی ہوگی۔" پہلے ڈائریکٹر نے ان کا مسئلہ بھانپتے ہوئے ہمدردی سے کہا۔
"مداخلت کی تو خیر کوئی بات نہیں... لیکن میرے پاس اتنا وقت تھوڑی ہوتا کہ میں ہر لفظ کی اسپیلنگ کے لیے ڈکشنری دیکھتا رہتا۔" دوسرے ڈائریکٹر نے بیزاری سے جواب دیا۔

جیا ممتاز۔ گلستان جوہر

کار آمد

ایک بزنس مین نے دوسرے بزنس مین سے کہا۔
"تم نے اپنے بیٹے کو بھی اپنی فرم میں رکھ لیا ہے۔ اس کے کالج کی تعلیم یقیناً اس کے کام آرہی ہوگی۔"
"ہاں بالکل۔" دوسرے بزنس مین نے جواب دیا۔ "دفتر میں جب بھی کوئی میٹنگ ہوتی ہے تو کولڈ ڈرنکس یا چائے وغیرہ کا انتظام وہی کرتا ہے۔"

ثنا عمر۔ نارتھ ناظم آباد

بہترین حل

لڑکے نے اپنی گرل فرینڈ سے پریشانی کے عالم میں کہا۔ "ڈارلنگ! ہماری محبت کے چرچے بہت عام ہو گئے ہیں۔ سب کو پتا چل گیا ہے۔ ہم اب اس طرح نہیں رہ سکتے۔ میرا خیال ہے ہمیں اب شادی کر لینی چاہیے۔"
"ہاں میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔" گرل فرینڈ اپنے دوست کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے بولی۔ "اس کا بہترین حل یہی ہے کہ تم بھی شادی کر لو اور میں بھی۔"

روا سہیل۔ برنس روڈ

امکان

ایک شخص گدھے پر سوار کہیں جا رہا تھا۔ سامنے سے ایک شخص آرہا تھا جو عمدہ گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ آدمی اپنے گدھے سے اترا اور گھڑ سوار کے سامنے مؤدب سا ہو کر کہنے لگا۔
"جناب والا! کیا آپ میری سواری سے اپنی سواری تبدیل کرنا چاہیں گے۔"
"ہرگز نہیں۔ کیا تم احمق ہو؟" گھڑ سوار نے غصے سے کہا۔
"نہیں۔" گدھے کے مالک نے جواب دیا۔ "مگر میں نے سوچا کہ شاید آپ ہوں۔"

حمیرا شیراز۔ کراچی

وجہ

ایک مشہور کھلاڑی نے انٹرویو کے دوران اپنی ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا۔ صحافی نے بوکھلا کر پوچھا۔
"جناب! اس اچانک فیصلے کی وجہ؟"
"دراصل میرے چچا نے سلیکشن بورڈ سے استعفیٰ دے دیا ہے۔" کھلاڑی نے اطمینان سے کہا۔

شمائلہ فتانی۔ صدر

طلاق

"آخر تم مجھ سے چاہتی کیا ہو۔" روز روز کی لڑائی سے اکتائے ہوئے شوہر نے چیخ کر کہا۔
"میں اب تمہیں مزید برداشت نہیں کر سکتی۔ میں تم سے طلاق چاہتی ہوں۔" بیوی نے بھی جواباً چلا کر کہا۔
"اوہ! اللہ کا شکر ہے۔" شوہر نے اطمینان کا سانس لیا۔
"میں سمجھا کہ تم میرا عالی شان مکان اپنے نام کروانا چاہتی ہو۔"

رفعت اخلاص۔ بنارس

ہنی مون

ایک نیا شادی شدہ جوڑا کسی تفریحی مقام پر ہنی مون منانے گیا۔ ہوٹل کے منیجر نے جب بغیر پوچھے ان کا نام رجسٹر میں درج کر لیا تو بیوی نے حیران ہو کر منیجر سے پوچھا۔
"آپ کو میرے شوہر کا نام کیسے معلوم ہوا؟"
"یہ تو ہمارے پرانے کسٹمر ہیں۔ ہر سال ہنی مون منانے کے لیے ہمارے ہی ہوٹل میں قیام کرتے ہیں۔" منیجر نے متانت سے جواب دیا۔

سائرہ عمران۔ بلدیہ ٹاؤن

آثار قدیمہ

"مجھے ایسی جگہ ملازمت مل گئی ہے۔ جہاں آثار قدیمہ کی حفاظت کی جاتی ہے۔" ایک شخص نے اپنے دوست کو بتایا۔
"اچھا... ایسی کون سی جگہ ہے۔" دوست نے اشتیاق سے پوچھا۔
"بیوٹی کلینک" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

تبسم عابد۔ پاپوش نگر

حادثہ

بیوی "آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے ہمیں کیا کرنا چاہیے" شوہر "آؤ آج ہم اس حادثے کی یاد میں دو منٹ کی خاموشی اختیار کرتے ہیں"

اقرا اکرم۔ گاؤں سلیاں شریف

☼

شگفتہ جاہ

باتوں سے خوشبو آئے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد مبارک سنا ہے۔

"علم کو اس غرض سے حاصل نہ کرو کہ علماء کے مقابلے میں فخر کا اظہار کرو، یا کم عقل لوگوں سے بحث کرو، یا لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرو۔ جس نے یہ کام کیا، وہ جہنمی ہے۔"

فیصلہ،

ایک مرتبہ سمرقند کے بادشاہ کی خدمت میں ایک خوبصورت لڑکے کو چوری کے الزام میں پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔

لڑکا نوجوان تھا۔ مصاحبوں اور درباریوں کو اس کی حالت پر رحم آیا۔ چنانچہ سب نے مل کر رحم کی درخواست لکھی اور بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔

بادشاہ نے درخواست کی پشت پر لکھا۔

"انصاف کے ساتھ سزا میں رحم و کرم کی گنجائش نہیں۔ چور کے ہاتھ کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ صاحب مال کے دل کی حالت کا خیال رکھنا چاہیے تاکہ اس کے غم و الم کا اندازہ ہو سکے۔"

اقوال سعدیؒ،

٭ جو ہوش میں ہو وہ کبھی تکبر نہیں کرتا۔

٭ عقل مند اس وقت تک نہیں بولتا جب تک خاموشی نہ ہو جائے۔

٭ بخیل آدمی کی دولت اس وقت زمین سے باہر آتی ہے جس وقت وہ خود زمین میں چلا جاتا ہے۔

٭ اگر انسان غم اور خوشی کی بلندی سے بلند ہو جائے تو آسمان کی بلندی بھی اس کے قدموں کے نیچے آ جائے۔

٭ جس نے علم حاصل کیا اور عمل نہ کیا وہ اس آدمی کی مانند ہے جس نے ہل چلایا اور بیج نہ بکھیرا۔

نوال افضل گھمن۔ گجرات

اللہ کے حکم کی تعمیل،

بخارا کا گورنر ایک مرتبہ حج کرنے جا رہا تھا۔ اس شان سے کہ ایک سو اونٹوں پر اس کا سامان لدا تھا۔ خود ایک آرام دہ عماری میں بیٹھا تھا اور عالموں اور اماموں کی ایک جماعت ہم رکاب تھی۔

عرفات کے نزدیک پہنچے تو ایک درویش نظر آیا۔ بھوکا، پیاسا، پیروں میں آبلے پڑے ہوئے اور کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ اس نے بخارا کے گورنر کو اس ٹھاٹھ سے جاتے دیکھا تو اسے مخاطب کر کے بولا۔

"مجھے اور آپ کو برابر ثواب ملے گا۔ حالانکہ آپ اتنے آرام کے ساتھ سفر کر رہے ہیں اور میں اس مصیبت کے ساتھ گرتا پڑتا جا رہا ہوں۔"

گورنر نے جواب دیا۔ "میرا اور تمہارا ثواب ہرگز برابر نہیں ہو سکتا۔

اگر مجھے پتا ہوتا کہ میرا اور تمہارا درجہ برابر ہے تو میں کبھی بھی اس صحرا میں نہ آتا۔"

درویش نے پوچھا۔ "کیوں؟"

گورنر نے کہا۔ "اس لیے کہ میں اللہ کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں اور تم اس کے حکم کے خلاف چل رہے ہو۔ اللہ نے حکم دیا ہے کہ اگر تم استطاعت رکھتے ہو تو حج کرو۔ میں حج کی استطاعت رکھتا ہوں اور تم جیسوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ "اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔" مجھے اللہ تعالیٰ نے بلایا ہے اور تمہیں معذور رکھا ہے۔"

اللہ کے حکم کی تعمیل سب سے افضل نیکی ہے۔

نمرہ، اقراء۔ کراچی

صبر،

٭ انسان کو اس بات پر صبر کرنے کے لیے کہا گیا ہے جو اسے پسند نہ ہو اور جس کا ہونا ناگزیر ہو۔

٭ ہر وہ عمل جو برداشت کرنا پڑے، صبر کے ذیل میں آتا ہے۔ ناقابل برداشت کوئی واقعہ نہیں ہے۔ سانحہ ہو یا حادثہ جس کے ساتھ پیش آ رہا ہو وہ تو اس میں سے گزر رہا ہے۔ رو کر یا خاموش رہ کر۔

غصے پر قابو پانا،

ایک آدمی کو غصہ بہت آتا تھا۔ غصے میں بے قابو ہو کر وہ برا بھلا کہتا۔ جب غصہ اترتا تو اسے پشیمانی ہوتی۔ وہ غصے پر قابو پانا چاہتا تھا لیکن کامیاب نہ ہوتا۔ ایک دن اس نے سنا کہ دوسرے گاؤں میں ایک عالم رہتا ہے۔ لوگوں کے مسئلے حل کرتا ہے۔ اس نے سوچا چلو میں بھی اپنا مسئلہ پیش کر کے دیکھتا ہوں شاید کچھ ہو جائے۔

وہ اس بزرگ کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ مجھے بے حد غصہ آتا ہے۔ اس بزرگ نے جواب دیا۔

"جب تمہیں غصہ آئے تو تم جنگل میں جا کر درخت میں کیل ٹھونکنا۔"

اس نے کہا۔ "یہ کون سا حل ہے؟"

اس بزرگ نے کہا۔ "تم یہ کر کے تو دیکھو۔"

آخر اس نے یہی کیا۔ اسے جب بھی غصہ آتا وہ جنگل کی طرف دوڑتا اور تیزی سے کیلیں درخت میں ٹھونکتا جاتا۔ آخر دن گزرتے گئے۔ وہ روزانہ جب غصہ آتا تو یہی عمل دہراتا۔ آخر ایک دن اس کا غصہ کم ہو کر ختم ہو گیا۔ اور اس نے جنگل جانا چھوڑ دیا۔ ایک دن وہ دوبارہ بزرگ کے پاس گیا اور کہا۔

"میرا غصہ ختم ہو گیا ہے۔"

بزرگ نے کہا۔ "مجھے اس جگہ لے چلو جس جگہ تم نے کیلیں ٹھونکی ہیں۔"

وہ دونوں وہاں چلے گئے۔ بزرگ نے دیکھا ایک درخت تقریباً آدھا کیلوں سے بھرا پڑا ہے۔ بزرگ نے کہا۔

"اب ان کیلوں کو نکالو۔"

اس نے بہت مشکلوں سے وہ کیلیں نکال لیں۔ تو دیکھا وہاں چھوٹے بڑے بے حد سوراخ تھے۔ بزرگ نے کہا۔

"یہ وہ سوراخ ہیں جو تم غصے میں آ کر لوگوں کے دلوں میں کرتے تھے۔ دیکھو کیل تو نکل گئے مگر سوراخ باقی ہیں۔"

وہ شخص بے حد شرمندہ ہوا۔ اس نے اللہ اور بندوں سے معافی مانگی اور اس بزرگ کا شکریہ ادا کیا جس نے اسے آئینہ دکھایا۔ اس لیے ہمیں بھی چاہیے بولتے ہوئے دیکھ لیا کریں اور غور کریں سوچیں کہ ہم نے لوگوں کے دلوں میں کیلیں تو نہیں ٹھونکیں۔ اگر وہ کیلیں نکل بھی گئیں تو نشان باقی رہ جائیں گے۔

نورین شفیع۔ ملتان

برا دوست،

برا دوست کوئلے کی طرح ہوتا ہے۔ جب گرم ہوتا ہے تو ہاتھ جلا دیتا ہے۔ اور جب ٹھنڈا ہوتا ہے تو ہاتھ کالے کر دیتا ہے۔

نوال افضل گھمن۔ گجرات

مطالعہ،

مشہور شاعر شہید کسی کتاب کے مطالعہ میں محو تھا اتنے میں ایک جاہل شخص آیا اور سلام کر کے بولا۔

"تنہا بیٹھے ہو؟"

شہید نے جواب دیا۔ "تنہا تو اب ہوا ہوں۔ کیونکہ تمہاری وجہ سے کتاب بند کرنا پڑی۔"
عائشہ۔ گوجرہ

علم کی عزت،

ابو قلابہ ایک نابینا عالم تھا جس کی خلیفہ ہارون الرشید بہت عزت کرتا تھا۔ ایک روز ہارون الرشید سے ملنے آیا۔ جب کھانا کھا چکے تو ہارون الرشید نے خود اس کے ہاتھ دھلائے اور حاضرین کو اشارہ کر دیا کہ اسے نہ بتایا جائے۔

جب وہ ہاتھ دھو چکا تو کسی نے اس کو بتا دیا کہ خود ہارون نے اس کے ہاتھ دھلائے ہیں۔ یہ سن کر ابو قلابہ نے علم کی اس عزت پر خلیفہ کو بہت دعائیں دیں۔
مدیحہ یوسف۔ فیصل آباد

موتی مالا،

- تمام لوگوں میں نیک کام پر سب سے زیادہ قادر وہ شخص ہے جسے غصہ نہ آئے۔
- سب سے زیادہ سخت گناہ وہ ہے جو اس کے

* یہ زندگی ہماری خواہشات کے مطابق نہیں ہوتی۔ جہاں ہماری پسند کی چیز ہمیں میسر نہ آئے، وہاں صبر کام آتا ہے۔
* کوئی زندگی ایسی نہیں جو اپنی آرزو اور اپنے حاصل میں مکمل ہو۔ برابر ہو۔ کبھی آرزو بڑھ جاتی ہے کبھی حاصل کم رہ جاتا ہے۔ صبر کا خیال ہی اس بات کی دلیل ہے کہ انسان جو چاہتا ہے وہ اسے ملا نہیں۔ تلقین صرف یہ ہے کہ ہو جانے والے واقعات پر افسوس نہ کرو بلکہ صبر کرو۔
* تکلیف ہمارے اعمال سے آئے یا اللہ کے حکم سے مقام صرف صبر ہے۔

(واصف علی واصف۔ دل، دریا، سمندر سے اقتباس)
ندا، فضہ۔ کراچی

دوست اور تنہائی،

ایک دانشور کا قول ہے۔
"اگر تمہیں اپنی طبیعت، حیثیت، شخصیت، قابلیت اور مزاج کے مطابق ساتھی نہ مل سکے تو زندگی کا سفر تنہا کاٹو، اس لیے کہ بے وقوف ناپسند اور مطلب پرست ساتھی سے تنہائی بہتر ہے۔ ایسا شخص جس سے ملنے کے بعد تم ضبط کی آخری حدوں کو چھونے لگو، تمہارے اندر زہر اور کڑواہٹ ہی دوڑ رہی ہو، جو کبھی تمہاری پسند اور سوچ کے معیار پر پورا نہ اترا ہو، وہ شخص کبھی بھی دوست کہلانے کے قابل نہیں ہے۔ اس سے تنہائی ہزار درجے بہتر ہے۔
آمنہ اجالا۔ ڈہرکی

بدترین قاتل،

زندگی میں تین بدترین قاتل ہیں۔
زیادہ سوچنا خوشی کو مار دیتا ہے۔ عدم تحفظ کا احساس ہمت کو ختم کر دیتا ہے اور جھوٹ اعتماد کو کھا جاتا ہے۔

دعا اور بددعا،

ایک بزرگ کسی گاؤں سے گزرے۔ گاؤں والوں نے ان کی خاطر تواضع کی تو بزرگ نے خوش ہو کر دعا دی۔
"اللہ تعالیٰ تمہارے ہاں ایک رہنما پیدا کر دے۔" بزرگ اگلے گاؤں میں گئے تو اس گاؤں والوں نے بہت برا سلوک کیا۔ تب بزرگ نے ناراض ہو کر بددعا دی۔
"اللہ تعالیٰ آپ کے گھر گھر میں رہنما پیدا کر دے۔"
عائشہ۔ گوجرہ

شکیلہ ______ رحیم یار خان

وہ اچھا ہے تو بہتر، بُرا ہے تو بھی قبول
مزاجِ عشق میں عیبِ یار نہیں دیکھے جاتے

کرن، بینش ______ فیصل آباد

نہ جانے کیا کہا تھا ڈوبنے والے نے سمندر سے
کہ لہریں آج تک ساحل پہ آکے سر پٹختی ہیں

سارہ شعیب ______ کراچی

اسی عرصۂ شب تار میں یونہی ایک عمر گزر گئی
کبھی وعدۂ وصل بھی دیکھتے یہ جو آرزو تھی وہ مر گئی

انیقہ انا ______ چکوال

وہ فیصلہ نہ کرتی تو کیا کرتی
میں ہواؤں سا پاگل، وہ چراغ سی لڑکی

فوقیہ رباب چیمہ ______ بورے والا

مجھے وہ لاکھ تڑپائے مگر اُس شخص کی خاطر
میرے دل کے اندھیروں میں دعائیں رقص کرتی ہیں
اُسے کہنا کہ لوٹ آئے سلگتی شام سے پہلے
کسی کی خشک آنکھوں میں صدائیں رقص کرتی ہیں

فائزہ عباس ______ کراچی

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تری رہگزر پھر بھی

ثمینہ اکرم ______ کراچی

بہت دِنوں میں محبت کو ہو سکا معلوم
جو تیرے ہجر میں گزری وہ رات رات ہوئی

نوشین اقبال نوشی ______ گاؤں بدو مرجان

بچھڑتے وقت کسی سے ہمیں بھی یہی گماں تھا
کہ زخم کیسا بھی ہو، عمر بھر نہیں رہتا

ثمینہ کوثر ______ ڈوگہ گجرات

مسافر تھے، رستے بدلتے رہے
مقدر میں چلنا تھا، چلتے رہے
وہ کیا تھا کہ جس کو گنوا تو دیا
مگر عمر بھر ہاتھ ملتے رہے

امینہ رؤف ______ جہلم

خلقت شہر میں جس ہار کے چرچے ہیں بہت
میں وہ بازی کبھی کھیلا بھی نہیں تھا شاید
ایک بادل کہ میرے نام سے منسوب ہوا
میرے صحرا میں تو برسا بھی نہیں تھا شاید

آسیہ جاوید ______ علی پور چٹھہ

صبح اس کی ہے، صبا اس کی ہے، سورج اس کا
جو اندھیرے میں کوئی دیپ جلا آئے گا
اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آئی برسوں
جو گیا ہی نہیں، وہ لوٹ کے کیا آئے گا

عائشہ ارما ______ پشاور

اس کی بالک ہٹ کے آگے گھر چھوڑا، بیراگ لیا
دیکھیں کیا دن دکھلاتا ہے اب یہ موہ کھ من بایا
لاکھ جتن سے جڑ نہ سکے گا، پہلے بتلائے دیتے ہیں
ٹوٹ گیا تو ٹوٹ گیا بس من کا یہ درپن بابا

نمرہ، اقرأ ______ کراچی

جو میری ہم سفر رہی، وہ میری زندگی نہ تھی
وہ میری بے بسی نہ تھی جو راہ میں بھٹک گئی
اُٹی ہوئی تھی دھوپ سے جو رہگزر تھی سامنے
دیارِ دل میں کون تھا کہ چاندنی چٹک گئی

تبصیر نشاط

کھسیانی بلی

معروف اداکارہ میرا سے کون واقف نہیں۔ ان کی اداکاری "آن دی کیمرہ" اتنی عروج پر نہیں ہوتی، جتنی کہ "آف دی کیمرہ" ہوتی ہے۔ بڑی اسکرین پر فلموں اور ڈراموں کی تعداد کم ہے۔ تاہم نجی زندگی کے ڈرامے لاتعداد ہیں۔ ان ڈراموں کی ویورشپ اسکرین کے ڈراموں سے زیادہ ہے۔ کیونکہ ان ڈراموں کو کوریج بھی زیادہ ہی ملتی ہے نا۔

حالیہ انتخابات میں میرا کی والدہ بھی شریک تھیں۔ میرا ان کی انتخابی مہم بڑے زور و شور سے چلا رہی تھیں کہ وہ انتخابی مہم ادھوری چھوڑ کر اچانک امریکا اور پھر کینیڈا چلی گئیں۔ اپنے جانے کی وجہ میرا نے یہ بتائی کہ وہاں انہیں شہزاد رفیق کی فلم "عشق خدا" کے ورلڈ پریمیر میں شرکت کرنا ہے۔ والدہ کی انتخابی مہم ادھوری چھوڑ کر جانے کا یہ خاصا معقول جواز تھا۔ ہر طرف میرا کی واہ واہ ہو گئی کہ میرا نے اپنی ذاتی زندگی پر اپنی پروفیشنل لائف کو ترجیح دی اور ذاتی رشتوں کے مقابلے میں اپنے فرض کو مقدم جانا۔ مگر جناب! بعد میں یہ بھید کھلا کہ میرا کے جانے کی وجہ تو کچھ اور ہی تھی۔

دراصل میرا نے کینیڈین شہریت کے لیے درخواست دے رکھی ہے۔ میرا کے پی آر سی کی گارنٹی راجہ خالد پرویز نے لی تھی۔ جی جی! یہ وہی خالد پرویز ہیں جو میرا کے مبینہ منگیتر کیپٹن نوید پرویز کے والد بزرگوار ہیں۔ عام طور پر بہوئیں سسرال میں قدم رکھنے کے بعد وہاں اپنے شوہر کے اس کے گھر والوں سے جھگڑے کراتی ہیں (سب نہیں کہ بہت سی اچھی اور نیک بہوئیں ہوتی ہیں) مگر جناب! اپنی میرا چونکہ عام خواتین سے زیادہ باصلاحیت ہیں کہ ان کی اداکاری کو باقاعدہ صدارتی سند بھی حاصل ہے۔ لہٰذا انہوں نے سسرال میں قدم رنجہ فرمانے سے پہلے ہی باپ بیٹے یعنی خالد پرویز اور نوید پرویز میں اختلافات کرا دیے۔ اس وقت معاملہ چونکہ میرا کے اپنے مفاد کا تھا۔ لہٰذا وہ تمام باتیں بھول کر خالد پرویز کے پاس پہنچ گئیں۔ تاہم خالد پرویز کچھ نہیں بھولے تھے۔ انہوں نے میرا کی مزید ضمانت دینے سے انکار کر دیا۔ میرا کینیڈا گئیں اور وہاں بھی کوششیں کیں۔ مگر وہ ہمارا

ملک تو تھا نہیں۔ لہٰذا میرا ناکام ہو کر لوٹ آئیں۔

پاکستان پہنچتے ہی میرا نے وطن کی محبت میں ایک جذباتی بیان داغ دیا کہ مجھے کسی ملک کی شہریت حاصل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میرا جینا، مرنا تو میرے اپنے وطن میں ہے۔ (میرا کے اس بیان نے ثابت کر دیا ہے کہ ان سے بہتر کوئی اداکارہ نہیں اور وہ "پرائڈ آف پرفارمنس" کی واقعی حق دار تھیں۔ تاہم اگر آپ کو اس بیان کے بعد کوئی "کھسیانی بلی" یاد آجائے تو جناب! غلط تو پھر آپ بھی نہیں ہیں جی۔)

یادیں

گزشتہ دنوں ہر طرف انتخابات کی گہما گہمی رہی۔ اس حوالے سے اپنے چاچا جی (المعروف) یعنی مستنصر حسین تارڑ کو بھی ماضی کی کچھ یادوں نے آگھیرا۔ وہ بتاتے ہیں کہ۔

"میں 1988ء کی پی ٹی وی الیکشن نشریات میں میزبانی کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ یہ نشریات مسلسل جاری تھیں۔ ہر کوئی اپنے کام میں تن دہی سے مصروف تھا۔ ایسے میں کسی کو بھی کھانے پینے کا ہوش نہیں تھا۔ میرے ساتھ مہتاب راشدی میزبانی کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ ہمیں بھی باقاعدہ کھانے پینے کا موقع کم ہی مل رہا تھا۔ مگر ہم مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے فرائض نبھا رہے تھے۔ ایک دن بھوک نے زیادہ ستایا تو میں ایک وقفے کے دوران اٹھا اور باہر سے ایک کلو سیب خرید لایا۔ وہ سیب میں نے اپنی دراز میں چھپا دیے۔ اسی دوران کیمرہ ہم پر آگیا۔ مہتاب راشدی نے کیمرے میں مخاطب ہو کر الیکشن کے نتائج اور پھر ان کا تجزیہ بیان کرنا شروع کر دیا۔ مجھے چونکہ بھوک کچھ زیادہ ہی لگی تھی۔ لہٰذا میں نے ایک سیب نکالا اور کھانا شروع کر دیا۔ میرے سیب کھانے کی آواز مہتاب راشدی کے کانوں میں پہنچی تو ان کی توجہ بٹ گئی۔ وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر فوراً مجھ سے مخاطب ہو گئیں۔

"تارڑ صاحب! ایک سیب ہمیں بھی عنایت فرما دیجیے۔"

اسی وقت کنٹرول روم سے ایگزیکٹو پروڈیوسر ظہیر بھٹی کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

"تارڑ! یہ کیا کر رہے ہو؟ آن ایئر سیب کھا رہے ہو۔ انتہا ہے بدتمیزی کی...... بند کرو سیب کھانا۔"

میں نے ان کی بات سنتے ہی کیمرے کی طرف دیکھا اور ناظرین کو مخاطب کر کے کہا۔

"خواتین و حضرات! ہم لوگ دن رات اپنے فرائض کی انجام دہی پر کمربستہ ہیں۔ اس دوران ٹیلی ویژن والے ہمیں کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں دے رہے...... تو ہم کیا کریں؟ اب یہ ہمیں اپنے سیب بھی نہیں کھانے دیتے۔"

یہ کہہ کر میں نے وہ سیب میز پر رکھ دیا۔ ابھی پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ میرے کانوں میں ظہیر بھٹی کی آواز دوبارہ آئی۔

"تارڑ پلیز! وہ سیب پھر سے کھانا شروع کر دو۔ مجھے اتنے احتجاجی فون آ رہے ہیں کہ لائن ہی بلاک ہو گئی ہے۔"

(پی ٹی وی کا وہ دور بھی کیا سہانا دور تھا کہ جب ٹی وی پر دکھائے جانے والے پروگراموں میں تہذیب و اقدار کو اس قدر اہمیت دی جاتی تھی کہ پروگرام پیش کرنے والوں پر "غیر انسانی وجود" ہونے کا گمان گزرتا تھا۔ اب آپ پروگراموں میں سب کچھ تلاش کر سکتے ہیں ..... سوائے تہذیبی روایات و اقدار کے۔)

☆ ☆ ☆

کچھ ادھر ادھر سے

☆ جنرل مشرف اپنی ذات ' مقام اور صلاحیتوں کا بھی ادراک نہیں رکھتے۔ انہوں نے فوج کے ادارے کو بھی بڑی آزمائشوں سے دوچار کر دیا ہے۔ اللہ جانے ہمارے ریٹائرڈ جرنیلوں کو یہ بات کیوں سمجھ میں نہیں آتی کہ طاقت ان کی ذات میں نہیں۔ بلکہ وردی میں ہوا کرتی ہے۔

(سلیم صافی۔ جرگہ)

☆ صرف پیپلز پارٹی کے دور میں 124 ارب روپے کے قرضے معاف ہوئے اور اکثریت پارٹی کے اہم عہدے داروں اور وزیروں کی تھی۔ سب کی ملوں کے پیسے نیشنل بینک سے معاف ہوئے۔

(رؤف کلاسرا۔ راز و نیاز)

☆ ڈرون طیاروں کے ذریعے نشانہ بنانے کی ذمہ

داری نبھاتے ہوئے میں سب کچھ دیکھ رہا ہوتا تھا۔ بچوں ' عورتوں اور عام معصوم لوگوں کے چیتھڑے اڑتے دیکھ کر سر چکرا گیا۔ عجیب کیفیت میں مبتلا ہوں اسی لیے نوکری چھوڑ دی ہے۔

(ڈرون آپریٹر برانٹ کا اعتراف)

☆ مبصرین اور دانش ور کہتے ہیں کہ عمران خان نے ایلیٹ کلاس کو باہر نکالا۔ مگر ہماری ناقص رائے یہ ہے کہ اس کا سہرا صدر زرداری کے سر جاتا ہے۔ انہوں نے ان کے ایئر کنڈیشنڈ بند کیے تو یہ بلبلا کر باہر نکلے اور پھر اسٹائل مارنے کے چکر میں عمران خان کے پیچھے لگ گئے۔

(سہیل احمد ۔۔۔ چٹکیاں)

☆ یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ شاہ رخ کو پاکستان چلے جانا چاہیے ۔ میری وفاداری پر شک کیا جاتا ہے جب میرے بارے میں ایسا سوچا جاتا ہے تو تنگی میں زندگی گزارنے والے مسلمان کی بھارت سے وفاداری کو کون تسلیم کرے گا۔

(شاہ رخ خان کا اعتراف)

☆ 40 سال پہلے ہماری پریم کہانی چل رہی تھی امیت جی سائے کی طرح ساتھ لگے رہتے تھے۔ کاش! وہی دن لوٹ آئیں۔ اب تو کئی کئی دن بیت جاتے ہیں ہم ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھ پاتے۔

(جیہ بہادری کا شکوہ)

☆ مشرف نے اپنے دور اقتدار کے دنوں میں شراب اور کتوں سے اپنی رغبت کا برملا اظہار کیا۔ دنیا میں ان کا آئیڈیل مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک تھا۔ جسے مؤرخ فری میسن کا ایجنٹ اور اسلام کا دشمن گردانتے ہیں۔ جس نے اسلام کے شعائر ختم کرنے کی کوشش کی۔ عربی زبان میں اذان پر پابندی اور سر عام خواتین سے حجاب اتروا کر جلانا اس کی چند مثالیں ہیں۔

(معین کمالی۔ کالم پناہ)

☆

قاضی واجد

"کیسے مزاج ہیں۔ آج کل ایک ' دو ڈراموں میں آپ کو دیکھ رہے ہیں۔ بہت اچھا محسوس ہو رہا ہے۔ آپ اب کم کیوں آتے ہیں؟"

"بہت شکریہ۔۔۔ بس آپ کو تو پتا ہے ہمیشہ سے میری یہ عادت رہی ہے کہ کم کام کرو۔ تو بس اس لیے کم کم آتا ہوں۔"

"آپ نے زندگی کا ہر دور دیکھا ہے۔ کس دور کو بہتر پایا آپ نے؟"

"زندگی کا ہر دور ہی بہترین اور یادگار ہوتا ہے۔ بچپن اپنے لحاظ سے خوب صورت تھا۔ جب شرارتیں کرتے تھے۔ والدین کی ڈانٹ اور پیار دونوں ہی شامل

دستک دستک دستک

شاہین رشید

ہوتے تھے۔ پھر جوانی تگ و دو کا دور تھا۔ کچھ حاصل کرنے ' کچھ بننے کا دور تھا۔ وہ بھی بہت خوب صورت دور تھا۔ اب موجودہ دور بھی بہت حسین ہے۔ یہ وہ دور ہوتا ہے ' جب انسان ساری زندگی کی جدوجہد کا پھل کھاتا ہے۔"

"کچھ کھویا پایا یا پایا ہی پایا؟"

"جب تک انسان زندگی میں کچھ کھوتا نہیں ہے۔ کچھ پانے کا مزا بھی نہیں آتا۔ میں نے بھی زندگی میں بہت محنت کی۔ جدوجہد کی۔ تب ایک اچھی زندگی کا مزا لیا۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ کھویا کم اور پایا زیادہ ہے۔"

"خوش ہیں اپنی زندگی سے؟"

"بہت خوش ہوں۔ اللہ نے عزت ' شہرت اور بھی سب کچھ دیا۔ ایک اچھی فرماں بردار بیوی دی۔ بیٹی جیسی نعمت دی۔ ہم نے اس کی شادی کی۔ وہ بھی اپنی زندگی میں ماشاء اللہ بہت خوش ہے۔"

"زندگی کے کس اصول نے آپ کو کامیابی کی راہ دکھائی۔"

"وقت کی پابندی اور سچ۔۔۔ میں سمجھتا ہوں ' یہ کامیابی کی کنجی ہے۔ میں نے ہمیشہ ان دونوں چیزوں کو اپنایا۔ وقت کی اتنی پابندی کی کہ آج تک کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملا اور کبھی جھوٹ بول کر آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں اپنے ان اصولوں پر بہت خوش بھی ہوں اور کامیاب بھی۔"

"وقت کے ساتھ ساتھ انسان کے مزاج میں تبدیلی آتی ہے۔ مزاج میں تیزی آئی یا نرمی؟"

"یہ تو وقت اور حالات پر منحصر ہوتا ہے۔ میں تو ہمیشہ سے ہی نرم مزاج رہا ہوں اور مجھے اللہ نے صبر کی نعمت بہت دی ہے۔ کبھی غصہ آ بھی جائے تو خاموشی

اختیار کرلیتا ہوں۔"

"پھر بھی کب غصہ آتا ہے؟ کب احساس ہوتا ہے کہ کچھ غلط ہو رہا ہے؟"

"غصہ تو خیر ہمیشہ ایک ہی بات پر نہیں آتا۔ لیکن جب لوگوں کو مسلسل جھوٹ بولتے دیکھتا ہوں' بے ایمانی کرتے دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ نہ صرف غلط ہو رہا ہے۔ بلکہ بہت غلط ہو رہا ہے اور اس کا اثر نئی نسل پر بھی پڑ رہا ہے۔"

"آپ کے کام پر تنقید تو نہیں ہوتی ہوگی۔ کیونکہ اب تو آپ خود بھی ایک اکیڈمی کی صورت اختیار کرچکے ہیں؟"

(قہقہہ) "ہاں! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اب تنقید کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ لیکن میں نے تو کبھی بھی تنقید کو مائنڈ نہیں کیا۔ ہمیشہ تنقید کو پوزیٹو وے میں ہی لیا ہے اور کچھ نہ کچھ سیکھا ہی ہے۔"

"انسان کی شخصیت کو کیا باتیں بہت نمایاں کرتی ہیں؟"

"ایمان داری' دیانت داری' اچھے دوستوں اور لوگوں کی صحبت' اچھا مطالعہ وغیرہ وغیرہ۔"

"فارغ اوقات میں بیگم کے ساتھ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں؟"

"بالکل بٹاتا ہوں۔ مجھے کوکنگ کا شوق ہے اور کوکنگ میں ہی کبھی کبھی بیگم کا ساتھ دے دیتا ہوں۔"

"کس بات سے بہت پریشان ہوجاتے ہیں؟"

"اپنے ملک کے حالات دیکھ کر... اپنے پیارے شہر کراچی کے حالات دیکھ کر... نہ جانے کب حالات بدلیں گے۔ نہ جانے کب شہر کی رونقیں لوٹ کر آئیں گی۔ جانے کب نفرتیں دور ہوں گی اور پتا نہیں کب اللہ تعالیٰ ہم سب کی دعائیں قبول کرے گا۔"

"آپ تو بچپن سے ہی اس فیلڈ سے وابستہ ہیں۔ "قاضی جی کا قاعدہ" پھر ڈرامے' پھر ٹی وی پہ آمد... اس فیلڈ کا ماحول تو بالکل گھر جیسا ہی لگتا ہوگا؟"

"جی بالکل... مگر اب بہت سے لوگ ہم سے جدا بھی ہوگئے ہیں' بچپن کی بہت یاد آتی ہے۔ بڑا اچھا وقت گزارا ہے ہم نے سب کے ساتھ اور اب بھی اللہ کا شکر ہے بہت اچھا وقت گزر رہا ہے۔"

عائزہ خان

"کیا حال ہیں... آج کل تو ماشاء اللہ ہر دوسرے ڈرامے میں نظر آرہی ہیں... تھکن نہیں ہوجاتی کیا؟"

"جی! اللہ کا شکر ہے اور جناب! یہ جو آپ ڈرامے دیکھ رہی ہیں۔ یہ بس ایک ساتھ ہی چلنے شروع ہوگئے ہیں۔ ورنہ میں اتنا مسلسل کام نہیں کرتی۔ اپنے ہر ڈرامے کے بعد ایک' دو ماہ کا گیپ ضرور دیتی ہوں۔ کیونکہ نہ صرف اپنی ذاتی زندگی کو انجوائے کرنا چاہتی ہوں۔ بلکہ اپنی پڑھائی پر' جو کہ اب ختم ہونے والی ہے' بھرپور توجہ دیتی ہوں۔"

"گویا آپ سوشل ہیں؟"

"سوشل ہوں' مگر اپنی فیملی کی حد تک۔ شوبز کی تقریبات میں نہیں جاتی۔ بس کام سے فارغ ہوکر گھر کی راہ لیتی ہوں۔ کیونکہ مجھے گھر آکر بہت سکون ملتا ہے۔ خاص طور پر اپنے کمرے میں۔"

"شوبز کے لوگوں سے کیسا تعلق ہے؟"

"سب سے بہت اچھا ریلیشن ہے۔ سیٹ پہ سب سے بہت گپ شپ رہتی ہے۔ مگر بس صرف سیٹ کی حد تک' اس سے آگے نہیں۔"

"آپ نے کہا کہ آپ شوبز کی تقریبات میں نہیں جاتیں۔ میں نے تو مارننگ شو میں بھی آپ کو بہت کم دیکھا ہے' کیوں؟"

"اس لیے کہ مجھے مارننگ شو میں جانا پسند نہیں ہے۔ مجھے صبح کے یہ شو بے معنی سے لگتے ہیں۔ شادی' ناچ گانے' کوئی تعمیری بات نہیں ہوتی۔ کوئی تعمیری کام نہیں ہوتا۔"

"ہاں... یہ تو ہے... ویسے میں نے دیکھا ہے کہ عموماً شوبز میں آنے کے بعد لڑکیاں کہتی ہیں کہ ہم تو یہ بننا چاہ رہے تھے۔ وہ بننا چاہ رہے تھے۔ لیکن شوبز میں آگئے... ایسا ہی ہے؟"

"جی جی... ایسا ہی ہے... اور لڑکیاں ایسا کہتی ہیں تو ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ میرا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ابو انجینئر ہیں تو میرا بھی دل چاہتا تھا کہ میں انجینئر بنوں۔ مگر جب اس فیلڈ میں آئی تو لائن بدل لی اور بی بی اے کیا مارکیٹنگ میں۔"

"کیا بات شوبز میں لے کر آئی؟ پیسہ' شہرت یا شوق؟"

"کچھ بھی نہیں جناب! میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اس فیلڈ میں آؤں گی۔ ہاں! اس فیلڈ میں سب کی شہرت دیکھ کر رشک بہت آتا تھا۔ مگر کبھی سوچا نہیں تھا کہ میں بھی اس فیلڈ میں آجاؤں... بس پتا نہیں کیسے ایک کمرشل کی آفر آگئی' جو کہ آصف رضا میر کے ساتھ تھا۔ بس پھر میرا کام ختم ہوا اور آصف رضا میر کا کام شروع ہوا۔ انہوں نے ہی میرے والد کو فورس کیا کہ عائزہ کو اس فیلڈ میں آنے کی اجازت دیں اور والد صاحب نے بہت سوچ بچار کے بعد اجازت دی اور یوں آپ کے سامنے ہوں۔"

"آپ کا پہلا ڈراما "صندل" تھا۔ مگر شہرت "ٹوٹے ہوئے پر" نے دی۔ اب اچھا لگتا ہے کہ اس فیلڈ میں آگئی ہو؟"

"ہاں جی! اچھا تو بہت لگتا ہے۔ مگر ایسا پچھتاوا نہیں ہوتا کہ میں پہلے کیوں نہ آگئی۔ اگر میں پہلے آنے کا سوچتی بھی یا اتفاق سے آفر آبھی جاتی تو گھر والے کبھی راضی نہ ہوتے۔ وہ یہی کہتے کہ پہلے اپنی تعلیم پوری کرو۔ آپ کو پتا ہے' اپنی تعلیم کے دوران میں نے بھرپور طریقے سے کام نہیں کیا۔ بس بہت ضروری پروجیکٹ کرلیتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ میں جس وقت آئی ہوں' وہ ہی بہترین ٹائم تھا۔"

"کبھی آپ کو بہت زیادہ ماڈرن رول میں نہیں دیکھا' وجہ؟"

"ہاں جی... وجہ شاید چہرے کی معصومیت ہے۔ (ہنستے ہوئے) ویسے میں نہیں چاہتی کہ لوگ میرے

بارے میں کوئی غلط رائے دیں۔ میں ہمیشہ اچھے اور پوزیٹو رول کرنا چاہتی ہوں۔ بہت زیادہ ماڈرن تو میں عام زندگی میں نہیں' تو بھلا ڈراموں میں ایسے رول کیسے کرسکتی ہوں۔ میرا بڑا اچھا امیج ہے سب کے دلوں میں۔ اسے برقرار رکھنا چاہتی ہوں۔"

"آپ بہنوں' بھائیوں میں بڑی ہیں۔ ماشاء اللہ سے آپ کے چار بہن' بھائی ہیں' تو آپ کی شہرت' عزت دیکھ کر کسی اور کا بھی دل چاہا اس فیلڈ میں آنے کا؟"

"ہاں جی... میری چھوٹی بہن شاید اس فیلڈ میں آئے۔ باقیوں نے تو ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا ہے۔"

"فارغ اوقات کے کیا مشاغل ہیں؟"

"میوزک سے دل بہلاتی ہوں۔ اچھا میوزک میری کمزوری ہے۔"

"شادی اپنی پسند سے کریں گی؟"

"نہیں... اپنے والدین کی پسند سے۔ کیونکہ وہ بہتر فیصلہ کرسکتے ہیں میرے حق میں۔"

نوشین شاہ

"جی نوشین! کیا حال ہیں۔ آج کل تو تواتر کے ساتھ اسکرین پہ نظر آرہی ہیں؟"

"جی... شروع شروع میں کام کم کیا۔ مگر پھر سوچا کہ جب اس فیلڈ میں آہی گئی ہوں تو کیوں نہ مسلسل کام کروں۔ مگر میرا اسکرین پہ اتنا آنے کا مطلب یہ نہیں کہ میں ہر ایک کو "یس" کردیتی ہوں۔ جو کام یا جو رول مجھے اچھا لگتا ہے، وہ ہی کرتی ہوں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک کے بعد ایک ڈرامے اسکرین پر آرہے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے لگ رہا ہوتا ہے کہ ہم مسلسل کام کررہے ہیں، جبکہ ایسا کچھ نہیں ہے۔"

"اب تک کیا کیا کرچکی ہیں؟"

"اف... فہرست بہت لمبی ہے۔"

"آپ نے کہا کہ جو رول مجھے اچھا لگتا ہے، میں وہ ہی لیتی ہوں۔ آپ مطمئن ہیں اپنے کام سے؟"

"نہیں... مطمئن کون ہوتا ہے اپنے کام سے۔ ہر دم آگے سے آگے جانے کی خواہش ہوتی ہے۔ کچھ کرکے دکھانے کی خواہش ہوتی ہے اور میری بھی خواہش ہے کہ میں اس فیلڈ میں آگے سے آگے جاؤں۔"

"ہمارے یہاں عموماً" ایسا ہوتا ہے کہ جو فنکار کسی رول میں ہٹ ہوجائے، پھر اسے مسلسل ویسے ہی رول ملنے لگتے ہیں اور فنکار اسے قبول بھی کرلیتے ہیں تو ایسا کیوں ہے؟"

"ایسا کیوں ہے... یہ تو مجھے نہیں معلوم... لیکن میں اس بات کا بہت خیال رکھتی ہوں کہ جس کردار میں ہٹ ہوئی ہوں۔ وہ کردار دوبارہ نہ لوں۔ ایسا ہوتا ہے کہ آپ کو بار بار ایک جیسے کرداروں کی آفرز آتی ہیں۔ لیکن اب یہ فنکار کا کام ہے کہ وہ اپنی پرفارمنس میں ورائٹی کو اہمیت دے۔"

"اپنے ڈرامے دیکھتی ہیں؟ اگر دیکھتی ہیں تو کیسا لگتا ہے؟"

"جی! جی... بالکل دیکھتی ہوں اور بہت غور سے دیکھتی ہوں۔ کیونکہ میں اپنی خامیاں تلاش کرتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ اس سے پہلے کہ کوئی مجھے بتائے، میں خود دیکھ کر محسوس کروں کہ میں نے کہاں غلطیاں کی ہیں۔ انسان کو اپنی غلطیوں پر خود ہی نظر رکھنی چاہیے۔"

"کوئی ایسی پرفارمنس جو یادگار بن گئی ہو؟"

"ہاں... مجھے یاد ہے کہ "مرزا صاحباں" کی ریکارڈنگ تھی۔ میں اور سرمد گھوڑے پر تھے کہ اچانک گھوڑا بدک گیا اور بھاگنے لگا۔ اس کی اچانک کی حرکت پر ہم دونوں اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پائے اور گر گئے۔ کافی چوٹیں آئی تھیں۔ یہ حادثہ تو ہمیشہ یاد رہے گا۔"

"اب تو شوبز پروفیشن بن گیا ہے تو پروفیشن سمجھ کر آئی تھیں آپ یا شوقیہ آئی تھیں؟"

"میں تو شوقیہ آئی تھی۔ کیونکہ مجھے اداکاری کا تو جنون کی حد تک شوق ہے اور سب لڑکیوں کے ساتھ جیسا ہوتا ہے، ویسا میرے ساتھ بھی ہوا کہ گھر والوں نے اعتراض کیا کہ کیوں آئیں اس فیلڈ میں۔ لیکن

میرا جنون دیکھا۔ میری عزت دیکھی تو پھر کچھ نہیں کہا۔ اب اللہ کا شکر ہے کہ سب سیٹ ہے۔"

"آسانی کس میں ہے؟ ماڈلنگ میں یا اداکاری میں؟"

"یہ تو سب کو ہی پتا ہے کہ آسانی کس میں زیادہ ہے۔ ماڈلنگ میں پیسہ بھی زیادہ ہے اور آسانی سے ہو بھی جاتا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا کہ اداکاری میرا جنون ہے۔ سو مجھے اداکاری میں ہی زیادہ مزا آتا ہے۔ مگر میں ماڈلنگ بھی نہیں چھوڑ سکتی۔"

"اداکاری، ماڈلنگ، فلم... سب میں اداکاری ہی تو ہوتی ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"جی! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں... بہت سے لوگ ان تینوں شعبوں میں ایک ساتھ کام کررہے ہیں۔ کسی نے ماڈلنگ سے آغاز کیا اور پھر اداکاری کی طرف آئے۔ کوئی اداکاری سے ماڈلنگ کی طرف گیا۔ ہر فیلڈ کا اپنا مزا ہے۔ بشرطیکہ آپ کو کام کرنے کا جنون ہے تو۔"

"کس کے ساتھ اداکاری کرکے مزا آیا اور کس کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے؟"

"اگر آپ اداکاروں کے بارے میں پوچھ رہے ہیں تو یہ بتانا مشکل ہے... اور کس کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے تو اس کی فہرست بھی لمبی ہے۔ ہاں! اگر آپ ڈائریکٹرز کی بات کریں تو ان کے بارے میں بھی بتانا مشکل ہے۔ لیکن پھر بھی مجھے بابر جاوید، سرمد کھوسٹ اور دو، تین ڈائریکٹرز ہیں جن کے ساتھ کام کرکے اچھا لگتا ہے۔ اگر کبھی فلم کروں گی تو صرف شعیب منصور کے ساتھ کروں گی۔ فلم کے لیے بہترین ڈائریکٹر ہیں۔"

"دیکھا گیا ہے کہ چند ڈراموں میں کام کرنے کے بعد لوگ خود بھی ڈائریکٹر اور پروڈیوسر بن جاتے ہیں۔ آپ کا ایسا ارادہ ہے؟"

"نہیں... میرا فی الحال ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے اور ڈائریکٹر بننا تو بہت مشکل کام ہے۔ اس کے لیے تو باقاعدہ پڑھائی بھی کرنی پڑتی ہے اور ٹریننگ بھی لینی پڑتی ہے۔ ہاں البتہ پروڈکشن کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔ مگر فی الحال نہیں۔"

"اور زندگی کیسی گزر رہی ہے؟ شاپنگ وغیرہ کا شوق ہے اور عموماً" کہاں سے شاپنگ کرنا پسند کرتی ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔ زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے۔ شاپنگ کا شوق ہے۔ مگر فضول میں ونڈو شاپنگ کا شوق نہیں ہے۔ جب ملک سے باہر جاتی ہوں تو پھر جی بھر کے شاپنگ کرتی ہوں۔ کیونکہ باہر سے شاپنگ کا مزا ہی کچھ اور ہے۔ لندن اور نیویارک میرے پسندیدہ شہر ہیں اور میں ان جگہوں پر اکثر جاتی رہتی ہوں۔"

فضل بن ربیع کی گرفتاری

تاریخوں میں لکھا ہے کہ فضل بن ربیع، ہارون الرشید کا وزیر تھا۔ ہارون الرشید کے دو بیٹے تھے محمد امین اور مامون۔ ہارون کی وفات کے بعد محمد امین خلیفہ ہوا تو دونوں بھائیوں میں اقتدار کے لیے جنگ ہوئی فضل نے مامون کے خلاف اور امین کی فتح کے لیے ہر امکانی کوشش کی۔ مگر اس میں ناکامی ہوئی مامون کے اقبال کا ستارہ بلند ہونے لگا اور امین کے اقتدار کی شمع بجھ گئی تو فضل جان کے خوف سے کہیں جا چھپا۔

مامون کا ایک قدیمی خدمت گار معیل شاہک نامی تھا۔ امیر المومنین مامون نے اس سے کہا۔

"آج سے تیرا اس کے سوا کوئی کام نہیں کہ جس طرح بھی ہو فضل بن ربیع کا کھوج نکالے۔"

شاہک نے دوسری تدبیروں کے علاوہ بارہا منادی بھی کرائی کہ جو شخص فضل کو پکڑ کر لائے گا یا پتا بتائے گا ایک ہزار دینار انعام پائے گا۔ مگر یہ تمام کوششیں اکارت گئیں اور اس کا پتا نہ ملنا تھا نہ ملا۔

منادی ہوتے چار سال کا عرصہ گزر چکا تھا کہ ایک دن فضل گوشہ نشینی اور تنہائی سے اکتا کر ساربانوں کے بھیس میں ایک گون (بار بردار جانور پر سامان لادنے کا تھیلا جو ٹاٹ یا رسیوں سے بنا ہوتا ہے) کندھے پر اٹھائے اپنے خفیہ مسکن سے باہر نکلا تاکہ کسی اور جگہ جا کر چھپ رہے۔ اتفاق سے مامون کی فوج کے دو سپاہی ایک پیادہ اور ایک سوار کہیں جا رہے تھے۔ پیادے نے فضل کو پہچان لیا اور سوار کو بتایا۔

سوار بہت خوش ہوا اور گھوڑا دوڑا کر فضل کے پیچھے ہو لیا۔ فضل کے قریب پہنچا تو اس نے گون اس کندھے سے اٹھا کر دوسرے کندھے پر رکھ لی۔ اس حرکت سے سوار کا گھوڑا چمکا اور اسے گرا کر ایک طرف بھاگ گیا۔

اس سے پہلے کہ سوار سنبھلتا فضل قدم بڑھا کر کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ ایک جگہ ایک مکان کا دروازہ کھلا نظر آیا۔ اندر ایک بڑھیا بیٹھی تھی۔ فضل نے اس سے کہا۔

"اماں! مجھے چند روز کے لیے اپنے گھر میں چھپا لو تو بڑا احسان ہو۔"

بڑھیا کو اس پر رحم آیا۔ کہنے لگی "آجاؤ، اوپر والی کوٹھڑی خالی ہے اس میں جا کر چھپ جاؤ۔"

اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ فضل جلدی سے اس کوٹھڑی میں جا گھسا۔ ابھی وہ مشکل سے کوٹھڑی میں گھسا ہی ہو گا کہ وہی سوار اس مکان میں داخل ہوا اور بڑھیا سے بولا۔

"کیا بتاؤں، آج تو سونے کی چڑیا ہاتھ آ کر نکل گئی۔ فضل بن ربیع کو میں نے پکڑ ہی لیا ہوتا، مگر قسمت خراب تھی، میرا گھوڑا چمکا اور مجھے گرا کر بھاگ گیا اور اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا فضل کہیں غائب ہو گیا۔ لاکھ ڈھونڈا مگر پتا نہ چلا۔ خدا جانے زمین کھا گئی یا آسمان۔"

فضل نے جو یہ بات سنی، بے چارے کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ حیرت سے بت بن کر رہ گیا۔ سانس روکنے کی کوشش کی تو چھینک آ گئی۔ سوار نے چھینک کی آواز سنی تو بڑھیا سے پوچھا "اندر کون ہے؟"

بڑھیا نے جواب دیا "میرا بھتیجا ہے۔ برسوں کا پردیس گیا اب واپس ہوا تھا کہ راستے میں چور مل گئے۔ بے چارے کا سارا سامان چھین لیا۔ کپڑے تک اتروا لیے۔ ننگا اندر بیٹھا ہے۔ شرم کے مارے باہر نہیں آ سکتا۔"

سوار نے کہا "میرے کپڑے لے جا کر پہنا دو اور باہر بلاؤ۔"

بڑھیا نے جواب دیا۔ "ابھی بلاتی ہوں مگر غریب نہ جانے کتنے دن کا بھوکا ہے۔ اتنی تکلیف کرو کہ یہ میری انگوٹھی لے جاؤ اور اسے بازار میں گروی رکھ کر کچھ کھانے کے لیے لے آؤ۔"

ادھر سوار انگوٹھی لے کر بازار کی طرف چلا۔ ادھر بڑھیا تیزی سے فضل کے پاس پہنچی اور بولی۔

"تم وہی مفرور فضل ہو جس کی گرفتاری کے لیے ہزار دینار کا انعام مقرر ہے؟"

فضل نے اقرار کیا تو کہنے لگی۔ "تم نے ہماری باتیں سن لی ہوں گی۔ اسے میں نے دھوکے سے بازار بھیجا ہے۔ خیریت چاہتے ہو تو فوراً" کہیں بھاگ جاؤ۔"

فضل اس ناگہانی مصیبت سے بچ کر باہر نکلا تو حیران تھا کہ اب کہاں جائے؟ مگر بلا ارادہ بھاگا چلا جا رہا تھا۔ چلتے چلتے ایک عالی شان مکان کے پاس پہنچا۔ تیز رفتاری کی وجہ سے تھک چکا تھا۔ سوچا کہ تھوڑی دیر اس مکان کی دیوار کے سائے میں ستالوں۔ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ فضل ڈرا کہ کوئی اور سوار اسے نہ پہچان لے۔ جلدی سے مکان کی ڈیوڑھی میں ہو گیا۔

بد قسمتی سے وہ سوار اسی مکان کے دروازے پر آکر رکے۔ فضل اپنی شومئی قسمت کو کوسنے لگا۔ اتنے میں شاہک گھوڑے سے اتر کر ڈیوڑھی میں داخل ہوا۔ ایک ہی نظر میں فضل کو پہچان گیا۔ بولا۔

"تم کہاں سے آٹپکے؟"

فضل نے جواب دیا۔ "تقدیر کا تیر ہوں۔ جہاں آ گرا، آگرا۔"

شاہک خوش ہو کر اسے اندر لے گیا اور اپنے خاص کمرے میں لے جا کر بٹھایا۔ پھر اس کے لیے کھانا منگوایا اور فضل سے کہا۔

آپ میرے گھر آئے ہیں۔ اس لیے مہمان ہیں۔ "بسم اللہ کیجیے۔"

فضل نے پوچھا۔ "یہ زندوں کا کھانا ہے یا مردوں کا؟"

جواب ملا "زندوں کا۔"

شاہک نے تین دن تک اسے مہمان رکھا۔ پھر بولا "اب تم اپنی جان بچا کر بھاگ جاؤ میں پہلے کی طرح تمہیں تلاش کرتا رہوں گا۔"

فضل وہاں سے رخصت ہو کر باہر آیا۔ کسی ٹھکانے کی تلاش میں جا رہا تھا کہ ایک سوداگر کا خیال آیا جو قریب ہی رہتا تھا اور فضل نے اپنی وزارت کے دنوں میں اس پر بہت احسان کیے تھے۔ ڈھونڈتا ہوا اس کے مکان پر پہنچا۔ آواز دی۔ سوداگر باہر آیا اور فضل کو دیکھ کر بہت خوشی ظاہر کی۔ گھر کے اندر لے گیا اور کسی اچھی جگہ بٹھا کر دوڑا ہوا مامون کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے فضل کے ہاتھ آنے کا ماجرا کہہ سنایا۔ شاہک مامور کیا گیا کہ فضل کو سوداگر کے گھر سے جا کر لائے۔

شاہک فضل کو گرفتار کر کے مامون کی خدمت میں لے گیا۔ بد نصیب قیدی نے تخت کی طرف نظر اٹھائی تو کانپ اٹھا اور زندگی سے مایوس ہو کر رہ گیا۔ ہمت کر کے سر جھکایا اور کانپتی ہوئی آواز میں سلام کیا۔

امیر المومنین مامون سجدہ شکر بجا لایا اور پھر سلام کا جواب دے کر بولا۔

"آگے آؤ اور پہلے دن سے لے کر آج تک جو کچھ تم پر گزری ہے من و عن کہہ سناؤ۔"

اس پر فضل نے اپنی سرگزشت کہنی شروع کی۔ جب بڑھیا کے انگوٹھی گروی رکھنے کا ذکر آیا تو مامون نے خزانچی کو حکم دیا کہ ایک ہزار دینار اس بڑھیا کو پہنچاؤ اور اس سے کہو کہ وہ اپنی انگوٹھی چھڑا لے۔"

جب فضل نے شاہک کے ہاں پہنچنے اور اس کی مہمان نوازی کا واقعہ سنایا تو مامون بولا "اگر وہ ایسا نہ کرتا تو ہمارا منظورِ نظر نہ ہوتا۔"

سب سے آخر میں سوداگر کا تذکرہ آیا تو مامون نے ناراض ہو کر حکم دیا۔ "اسے فوراً" شہر سے نکال دیا جائے کہ ایسے بد عہد اور احسان فراموش کا ہمارے ملک میں کچھ کام نہیں ہے۔"

پھر فضل سے بولا۔

"جس وقت تجھے آتے دیکھا تو میں نے سجدہ شکر ادا کیا اور خدا سے عرض کی کہ الٰہی! تیرا کوئی بندہ مجھ سے زیادہ گنہ گار نہ ہو گا اور میرا کوئی نوکر فضل سے زیادہ خطاوار نہیں۔ میں فضل کو معاف کرتا ہوں تو فضل کے طفیل میں مجھے معاف کر دے!"

✡

شعاع کے ساتھ

اِدارہ

پشمینہ ورد گ..... اٹک

(1) شعاع سے میری وابستگی سات سال پرانی ہے۔ میں جب کلاس سیونتھ کی اسٹوڈنٹ تھی تمیں نے باقاعدہ شعاع پڑھنا شروع کیا۔ اب میں فورتھ ایئر میں ہوں۔ کہتے ہیں بچے کی پہلی درس گاہ ماں کی گود ہوتی ہے۔ مجھے اس بات سے انکار نہیں ہے۔ اماں کی اہمیت لازم و ملزوم ہے 'لیکن میں اپنی اولین درس گاہ شعاع کو سمجھتی ہوں۔ شعاع نے بہت چھوٹی عمر میں مجھے وہ سب کچھ سکھایا۔ جو بعض اوقات بڑی سے بڑی ڈگری نہیں سکھا پاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شعاع نسلوں کی تربیت کر رہا ہے۔

(2) میری صبح 'عموماً" صبح سویرے ہی ہو جاتی ہے۔ نماز اور تلاوت سے فراغت کے بعد میں چھت پہ چلی جاتی ہوں۔

دوبارہ سونے کی نسبت میں چھت پر چلے جانے کو ترجیح دیتی ہوں۔ صبح کا وہ وقت جب ابھی صحیح طرح روشنی نہیں پھیلی ہوتی 'چار سو چھائی پر سکون خاموشی اور پرندوں کی مخصوص ہلکی ہلکی چہچہاہٹ 'مجھے یہ منظر بہت دلکش لگتا ہے۔

چھت پہ بغیر جوتوں کے چہل قدمی کرنا اور ارد گرد کے سبزہ زار مناظر سے لطف اندوز ہونا میری فیورٹ ہابی ہے۔

پھر جب شرقی افق سے سورج اورنج کلر کے خوب صورت گولے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے تو میں اس کو اس وقت تک دیکھتی رہتی ہوں 'جب ہلکی ہلکی کرنیں میری آنکھوں پر پڑنا شروع نہیں ہو جاتیں۔ میں جب بھی اس انداز میں صبح کرتی ہوں 'میرا باقی سارا دن بہت خوب صورت گزرتا ہے۔ (کبھی کبھی اس معمول میں وقفہ بھی آجاتا ہے)

جب نیچے آتی ہوں تو ناشتا تیار ہوتا ہے۔ اس کے بعد ظاہر ہے معمول کی صفائی ستھرائی اور پھر کوکنگ۔ ان دونوں کاموں کا مجھے بہت شوق ہے۔ کالج کھلے ہونے پر ناشتے کے بعد تیاری کرکے کالج کی دوڑ لگاتے ہیں۔

کالج میں سوائے پیریڈز کے باقی سارا وقت بہت اچھا گزرتا ہے اور کبھی کبھار کلاس بنک کرنے کا مزا ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ دراصل کالج میں اگر دل پر پتھر رکھ کے پڑھنا چاہیں بھی تو فرینڈز کا جم غفیر پڑھنے نہیں دیتا۔ (بارہ لڑکیوں پر مشتمل ہمارا گروپ) شرارتوں اور غیر نصابی سرگرمیوں میں ہمارے گروپ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ جن میں پیش پیش میں اور عالیہ ہوتے ہیں۔

کالج سے واپسی پہ کھانا کھا کے سو جاتی ہوں۔ شام کو چائے کے ساتھ اسنیکس وغیرہ کھاتے ہوئے ٹی وی دیکھتی ہوں۔ مغرب کی نماز کے بعد کھانا اور پھر کالج کا کام۔

شعاع کے لیے میں بیچ بیچ میں سے بطور خاص وقت نکالتی رہتی ہوں۔ ہاں! البتہ رات کو میں پڑھائی کے علاوہ کچھ نہیں کرتی۔ ابھی طالب علمی کا زمانہ ہے اس لیے زیادہ ذمہ داریاں نہیں ہیں۔ ہاں! اتوار والے دن موڈ ہو تو اچھی سی ڈش ضرور ٹرائی کرتی ہوں۔

(3) نہیں جی 'کبھی کسی کردار میں اپنی جھلک نظر نہیں آئی۔ یا شاید کبھی نوٹ ہی نہیں کیا۔ اصل میں 'میں بہت مختلف لڑکی ہوں۔ شرارتوں میں اپنی مثال

آپ ضرور ہوں۔ لیکن اندر سے بہت حساس اور سنجیدہ سی لڑکی ہوں۔ اکثر تنہائی کے اوقات میں سوچتی بہت ہوں۔ خصوصاً" کائنات اور اپنی تخلیق کے بارے میں۔

پسندیدہ تحریریں تو بہت ساری ہیں۔ لیکن مجھے ان میں بیشتر کے نام یاد نہیں۔ "کی جاناں میں کون' مصحف' جنت کے پتے' پیر کامل' من و سلویٰ' من شرما خلق' دربار دل' جو چلے تو جاں سے گزر گئے' زرد موسم' ذاسی ڈھولن یار دی' ریگ زار تمنا" یہ بلاشبہ بہترین تحریریں ہیں۔ صرف یہی نام ذہن میں آسکے 'جو بھولنے والے نہیں۔ پسندیدہ مصنفات صرف اور صرف عمیرہ احمد 'تنزیلہ ریاض (اتنا بڑا نام تو میں بھول ہی گئی) انیسہ سلیم 'ثمینہ عظمت علی 'فوزیہ فرخ 'ماہا ملک 'رخسانہ نگار 'سویٹ اور کیوٹ سی جبین سسٹرز اور فائزہ دی گریٹ (فائزہ آپی! مجھے آپ سے ملنے کا بہت شوق ہے) ان سب کی کسی بھی تحریر سے میں کبھی بور نہیں ہوئی۔ (مجھے وہ تحریریں زیادہ اچھی لگتی ہیں جو نسبتاً" کم رومانس پر مبنی ہوں)

نئی مصنفات میں سے ام ثمامہ 'شہزادی عباس' عنیقہ محمد بیگ 'سدرہ سحر عمران اور آمنہ ریاض کی ہر تحریر مجھے اچھی لگتی ہے۔ اس کے علاوہ سمیرا یونس اور سمیرا گل بھی اچھا لکھتی ہیں۔ لیکن کم لکھتی ہیں۔ نمرہ احمد 'فرحت اشتیاق اور نگہت سیما کا طرز تحریر مجھے ہضم نہیں ہوتا ہے۔ البتہ نمرہ احمد کے مذکورہ دو ناول میسج کے اعتبار سے بہت زبردست اور بے مثال ہیں۔

(۴) خوبیاں تو دوسرے ہی بتا سکتے ہیں اور خامیاں ڈھیروں کے حساب سے ہیں۔ کیا کیا بتاؤں؟

پتا نہیں 'یہ میری خوبی ہے یا خامی کہ میں کمپوزڈ بہت ہوں۔ اپنا ذاتی راز کسی سے بھی شیئر نہیں کرتی۔ ویسے کہنا تو نہیں چاہیے۔ لیکن میرے اندر ایک خوبی یہ بھی ہے کہ الحمدللہ! میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نماز کی بہت پابندی کرتی ہوں۔ چاہے کہیں بھی 'کسی بھی حال میں ہوتی ہوں۔ نماز پر No سمجھوتا... ہو سکتا ہے 'میری وجہ سے اللہ تعالیٰ کسی اور کو بھی توفیق دے دے۔ ورنہ میں اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی قائل نہیں ہوں۔

خامیوں میں ٹاپ آف دی لسٹ "غصہ" ہے۔ جذباتی بہت ہوں۔ بعض ایسی باتیں ہوتی ہیں جو مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں۔ اس لیے روتی ہوں اور چیختی چلاتی ہوں۔ جذبات میں آکر غلط فیصلے بھی کر جاتی ہوں۔ اعتبار کسی پر بھی نہیں کرتی۔ خصوصاً" اجنبیوں پر۔ باقی ساری خامیاں موجود ہیں سوائے ضدی اور انا پرست نہیں ہوں۔ مخلص ہوں 'بددعا کسی کو نہیں دے سکتی۔ معاف جلدی کر دیتی ہوں۔ ایک خامی جس کا ذکر کرنا نہیں بھولوں گی۔ بدگمان جلدی ہو جاتی ہوں۔ میرے خیال میں اپنی خوبیاں اور خامیاں انسان خود بہتر طور پر بتا سکتا ہے کیونکہ جتنا زیادہ انسان خود اپنے آپ کو جانتا ہے اور کوئی جان ہی نہیں سکتا۔

فرینڈز نے تو کبھی تعریف کی ہی نہیں۔ ایک ٹیچر نے کہا تھا۔ میرے منہ پر نہیں۔ بلکہ کچھ اور اسٹوڈنٹس کے سامنے) وہ بہت جینئس ہے۔ میری دعا ہے 'وہ زندگی کے ہر میدان میں کامیاب ہو۔" یہ جملہ میرے لیے متاع حیات ہے۔

(5) ساون ..... ؟ ایسا ہے کہ بارش مجھے کالج میں انجوائے کرنے کا زیادہ مزا آتا ہے۔

ساون میں تو ظاہر ہے چھٹیاں ہوتی ہیں۔ اس لیے ہم دسمبر اور جنوری کی ہلکی ہلکی بوندا باندی کو بھی بہت انجوائے کرتے ہیں۔

بارشوں کے موسم میں کبھی کبھار کچن میں ٹرائی مارتے ہوئے ایک عدد ڈش بھی ایجاد کر ہی لیتی ہوں۔

(6) لطیفے پڑھ تو لیتی ہوں۔ لیکن یاد نہیں رہتے اور نہ ہی میں ان کو انجوائے کرتی ہوں۔ بہت سارے شعر ہیں جو اکثر گنگناتی رہتی ہوں۔

☼

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

ٹھنڈائی

اجزا :

تازہ دودھ	ایک لیٹر
پانچوں مغزیات	تین کھانے کے چمچے
بادام	آٹھ دانے
خشخاش	دو کھانے کے چمچے
کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
سونف	ایک کھانے کا چمچہ
سبز الائچی	پانچ دانے
عرق گلاب	پانچ کھانے کے چمچے
کیوڑہ	چند قطرے
زعفران	ایک چٹکی
چینی	حسب ضرورت

ترکیب :

باداموں کو گرم پانی میں کچھ دیر بھگو کر اس کے چھلکے اتار لیں۔ ایک کپ دودھ میں تمام اجزا ڈال کر خوب بلینڈ کر لیں۔ پھر ململ کے کپڑے سے چھان کر باقی دودھ میں شامل کر دیں۔ چار پانچ گھنٹے فریج میں رکھ کر خوب ٹھنڈا کریں اور پیش کریں۔ گرمیوں کا فرحت بخش مشروب تیار ہے۔

لہسنی روٹی

اجزا :

آٹا	دو کپ
لہسن پیسٹ	دو چائے کے چمچے
ہرا دھنیا	تھوڑا سا
زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
سرخ مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
گھی	حسب ضرورت

ترکیب :

آٹا میں ایک چمچہ لہسن پیسٹ، دھنیا، مرچ، نمک اور دو چمچے تیل یا گھی ملا کر پانی سے نرم سا گوندھ کر ململ کے کپڑے سے ڈھانپ کر رکھ دیں۔ آدھے گھنٹے بعد تھوڑا تھوڑا گھی لگا کر روٹی پکا لیں۔ ایک چمچہ تیل میں باقی لہسن پیسٹ اور زیرہ ڈال کر تھوڑا سا فرائی کریں اور گرم روٹی پر پھیلا دیں۔ اگر پسند کریں تو تھوڑا سا پنیر بھی ڈال لیں۔ مزا دوبالا ہو جائے گا۔ آم کے اچار یا کیری کی چٹنی کے ساتھ نوش کریں۔

چکن دو پیازہ

اجزا :

چکن	ایک کلو
پیاز	آدھا کلو
ٹماٹو پیسٹ	دو کپ
لہسن ادرک پیسٹ	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
زیرہ اور سونف	ایک ایک چائے کا چمچہ
پسی ہلدی اور پسا دھنیا	آدھا آدھا چائے کا چمچہ
پسی سرخ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
دار چینی	ایک بڑا ٹکڑا
تیزپات	دو چھوٹے پتے
لونگ اور کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

تیل گرم کر کے پیاز اور سارا گرم مسالا ڈال کر فرائی کریں۔ پھر لہسن ادرک پیسٹ ڈال کر بھونیں۔ گوشت کے ساتھ، نمک، ٹماٹو پیوری اور دیگر پسا ہوا مسالا ڈال کر اچھی طرح مکس کریں اور ہلکی آنچ کر کے ڈھکن بند کر دیں۔ دس منٹ بعد اتنا بھونیں کہ مسالا گھی چھوڑ دے۔ کترے ہوئے دھنیے اور ہری مرچ سے سجاوٹ کریں اور نان کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

اچاری دال

اجزا :

مسور کی دال	آدھا پاؤ
پیاز	ایک عدد
ٹماٹر	ایک عدد
ادرک	ایک بڑا ٹکڑا
آم کا اچار	دو کھانے کے چمچے
پسی سرخ مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
قصوری میتھی	آدھا چائے کا چمچہ
زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
ثابت سرخ مرچ	چار عدد
تیزپات	تین عدد
رائی اور کلونجی	ایک ایک چٹکی
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

دال کو پریشر ککر میں گلا لیں۔ پتیلی میں تیل گرم کر کے تیزپات، کلونجی، ثابت سرخ مرچ، زیرہ اور رائی ڈال کر کڑکڑائیں۔ پھر پیاز اور ٹماٹر چوکور کاٹ کر ڈال لیں۔ تھوڑا سا فرائی کرنے کے بعد اچار اور دیگر تمام مسالے شامل کر کے دو منٹ تک پکائیں کہ روغن آنے لگے، پھر نمک، دال اور حسب ضرورت پانی ڈال کر ایک ابال آنے تک پکانے کے بعد پانچ منٹ کے لیے ہلکی آنچ پر چھوڑ دیں۔ ڈش میں نکال کر کتری ہوئی ادرک سے سجاوٹ کریں اور نان یا ابلے چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

ادارہ

خوبصورتی کے لیے غسل

غسل صرف صحت کے لیے ہی نہیں بلکہ خوب صورتی کے لیے بھی بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ غسل سے جسم میں خون کے دورانیے میں اضافہ ہوتا ہے جس سے جسم میں چستی اور توانائی آتی ہے۔ جسم کے مسام اچھی طرح کھل جاتے ہیں اور سارے فاسد مادے باہر آجاتے ہیں اور جسم تر و تازہ ہو جاتا ہے۔ غسل سے ذہنی تناؤ بھی دور ہوتا ہے۔ پرانے وقتوں میں غسل کے لیے بڑا اہتمام کیا جاتا تھا اور بہت ساری جڑی بوٹیوں سے خاص طریقوں سے غسل کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اب اگرچہ وہ اہتمام اور تکلف نہیں رہا اور نہ اتنی فراغت کہ ان روایتی غسل کے طریقوں کی جھنجھٹ اٹھائیں۔ تاہم گھر میں کیے جانے والے چند آسان اور مفید قسم کے غسل کے طریقے پیش ہیں۔

نمکین پانی سے غسل

ایک بالٹی میں آٹھ دس چمچے نمک ملالیں۔ نمکین پانی سے غسل کرنے سے جسم کے مردہ خلیے ختم ہو جاتے ہیں۔ تکان دور ہوتی ہے۔ پسینے کی بدبو ختم ہو جاتی ہے۔ زچگی کے بعد نمکین پانی سے غسل کرنے سے پیٹ کی جھریاں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔

چکنائی والا غسل

غسل سے قبل جسم پر زیتون یا بادام کے تیل سے مالش کر کے (موسم کے حساب سے ٹھنڈے یا گرم پانی سے) غسل کیا جائے تو جلد تندرست، ملائم اور چمک دار ہو جاتی ہے۔ گرم پانی سے غسل کی صورت میں تکان اور موٹاپا بھی دور ہوتا ہے۔

اسٹیم باتھ (بھاپ غسل)

یہ غسل کا ایک خاص اور مفید طریقہ ہے۔ اس سے جسم میں انوکھی تازگی آتی ہے۔ غیر ضروری چربی کم ہوتی ہے۔ ہاتھ پاؤں کی سوجن، درد اور تکان ختم ہوتی ہے۔ اسٹیم باتھ پندرہ دن میں ایک بار ضرور لینا چاہیے۔ اس کا طریقہ نہایت آسان ہے۔

ایک بڑے ٹب میں کھولتا ہوا گرم پانی لیں۔ اسے رسی کی چارپائی کے نیچے رکھ دیں۔ دروازہ بند کر کے کپڑے اتار کر لیٹ جائیں۔ اوپر ایک پتلی چادر اوڑھ لیں۔ بھاپ سے آپ کے جسم کے تمام مسام اچھی طرح کھل جائیں گے۔ ان سے پسینہ نکلے گا۔ تھوڑی دیر بعد کروٹ بدل لیں۔ اس طرح جسم کے تمام حصوں کو اچھی طرح بھاپ دلائیں۔ یہ عمل اس وقت تک کرتے رہیں جب تک پانی ٹھنڈا نہ ہو جائے۔ اس کے بعد تولیے سے اچھی طرح جسم خشک کر کے کپڑے پہن لیں اور تقریباً" دو گھنٹے تک ہوا میں نہ جائیں ورنہ بدن درد کی شکایت ہو جائے گی۔

مگر یاد رکھیں۔۔۔!!!

(1) زیادہ گرم پانی سے غسل نہ کریں کیونکہ زیادہ گرم پانی جلد کو جھلسا دیتا ہے اور خاص طور پر بالوں کو بہت نقصان پہنچاتا ہے۔

(2) بہتر ہو گا کہ پانی میں عرق گلاب اور لیموں کا رس بھی ملالیں۔

(3) غسل سے قبل بدن پر ہلدی کا لیپ کرنے سے جلد میں نئی چمک آتی ہے۔

(4) صابن کے بجائے بیسن، آٹا یا سوجی سے میل صاف کرنا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔

(5) ہفتے میں ایک بار جسم پر ابٹن کا مساج کر کے غسل کرنا خوب صورتی کی ضمانت ہوتا ہے۔

(6) جسم کے اندرونی حصے، انگلیوں کے درمیان اور کان کو اچھی طرح خشک کریں ورنہ انفیکشن ہونے کا خطرہ ہو گا۔

(7) غسل کے بعد روئیں دار تولیے سے جسم خشک کریں۔